# اردو صحافت کے دوسو سال

(سیمینار میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ)

حصہ دوم

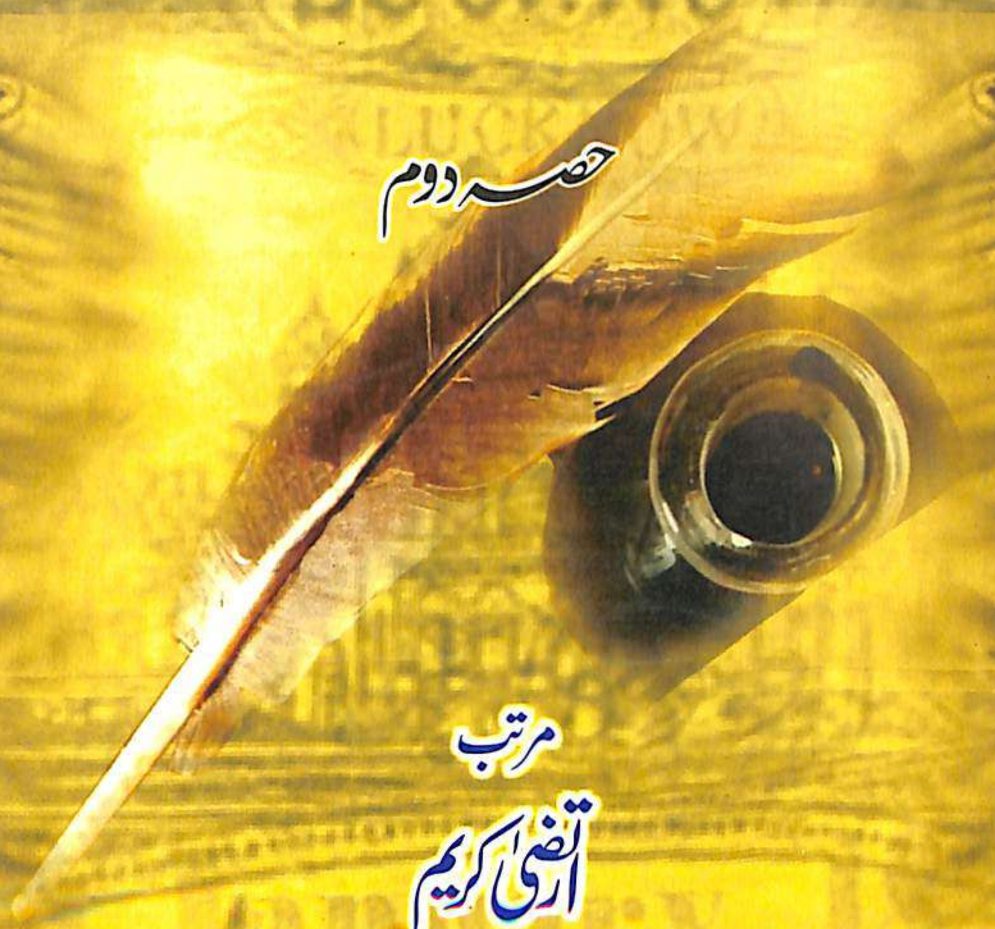

مرتب

ارتضیٰ کریم

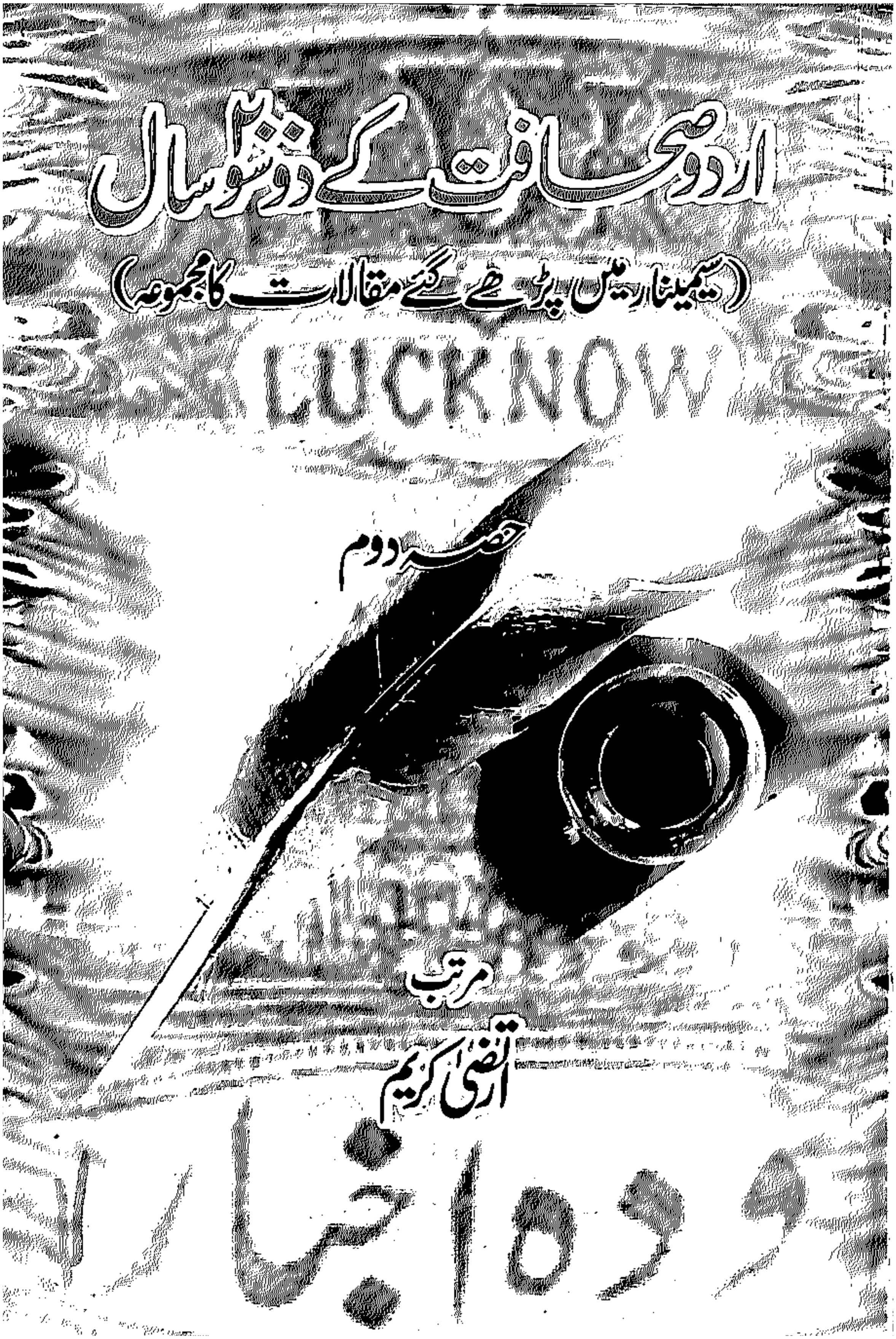


# اردو صحافت کے دو سو سال

(سیمینار میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ)

حصہ دوم

مرتب

ارتضیٰ کریم

# اردو صحافت کے دوسو (۲۰۰) سال

(سمینار میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ)

حصہ دوم

مرتب

ارتضیٰ کریم

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی


| | | |
|---|---|---|
| پہلی اشاعت | : | 2017 |
| تعداد | : | 550 |
| قیمت | : | -/435روپے فی سیٹ |
| سلسلۂ مطبوعات | : | 1943 |

**Urdu Sahafat Ke Do Sau Saal (Part-II)**

Compiler: **Irteza Karim**

ISBN for Set :978-93-5160-184-5

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066 فون نمبر: 26109746
فیکس: 26108159 ای۔میل: ncpulsaleunit@gmail.com
ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: سلاسار امیجنگ سسٹمس، D-31، ایس ایم اے انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی۔110033
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, Natural Color کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

# پیش لفظ

اردو صحافت نے اپنے دو سو سالہ سفر میں بہت سی صعوبتیں سہی ہیں، نشیب وفراز دیکھے ہیں، پابندی، ضبطی اور ضمانت کی سزائیں جھیلی ہیں مگر صحافت کے پایہ استقامت میں لرزش نہیں آئی۔ انیسویں صدی سے اکیسویں صدی تک اردو صحافت کا سفر تسلسل اور تواتر کے ساتھ جاری ہے اور اب نئے عہد میں جدید ترین تکنیکی وسائل اور آلات کی وجہ سے اردو صحافت انقلابی تبدیلیوں کی نئی تاریخ اور کامرانی کی نئی عبارت لکھ رہی ہے۔

محققین کے مطابق اردو صحافت کا آغاز 27 مارچ 1822 کو ہفت روزہ 'جام جہاں نما' کلکتہ سے ہوا۔ جس کے مالک ہری ہردت اور مدیر منشی سدا سکھ رائے تھے۔ اس اخبار کو کمپنی سرکار کی سرپرستی حاصل تھی۔ یہ بنیادی طور پر فارسی کا اخبار تھا اور اس میں اردو کی حیثیت ایک ضمیمے کی سی تھی۔ کچھ محققین کا یہ بھی خیال ہے کہ 1794 میں شائع ہونے والا ٹیپو سلطان کا ہفت روزہ 'فوجی اخبار' اردو کا اولین اخبار ہے اور ایک تحقیق یہ بھی ہے کہ ہندوستانی پریس کلکتہ سے شائع ہونے والا مولوی اکرام علی کا اخبار 'اردو اخبار' اردو کا پہلا اخبار ہے جو 1810 میں شائع ہوا۔ ان تحقیقات کی روشنی میں دیکھا جائے تو اردو صحافت کی تاریخ 200 سال سے کچھ آگے بڑھ جاتی ہے۔

اردو صحافت کے آغاز کی کوئی حتمی تاریخ نہیں ہے اس لیے قطعیت کے ساتھ کسی سنہ کا تعین مشکل ہے۔ پھر بھی قیاسی تاریخ کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو صحافت نے دو سو سالہ

مدت میں تیزی کے ساتھ ترقی کی منزلیں طے کی ہیں اور تہذیب وتمدن، ثقافت اور سماجی قدروں کی عکاسی اور اپنے عہد کی تاریخ مرتب کی ہے۔

اردو صحافت کو ہم مختلف ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں:

1810 سے 1857 کی صحافت کا جائزہ لینے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں اردو اخبارات کی خاصی تعداد تھی۔ ان میں 'سید الاخبار' دہلی، 'اسعد الاخبار' آگرہ، 'زبدۃ الاخبار' آگرہ، 'کوہ نور' لاہور، 'عمدۃ الاخبار' بریلی، 'صدر الاخبار' آگرہ، 'کریم الاخبار' دہلی، 'طلسم لکھنؤ' اور 'صادق الاخبار' دہلی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ان اخبارات میں بھی 'دہلی اردو اخبار' کو اہمیت حاصل ہے کہ اس کے مدیر مولوی محمد باقر تھے جنھیں انگریزوں کی مخالفت کی پاداش میں جامِ شہادت نوش کرنا پڑا۔ وہ اردو کے پہلے شہید صحافی ہیں۔ مولوی محمد حسین آزاد کے والد مولوی باقر دلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ صحافت میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ 'دہلی اردو اخبار' کو آج بھی صحافت میں ایک مینارۂ نور کی حیثیت حاصل ہے۔ سرسید احمد خاں کے بھائی سید محمد خاں نے 1838 میں 'سید الاخبار' نکالا جو اردو کا ایک بڑا اخبار تھا۔ 1852 میں 'فوائد الناظرین' اور 'قران السعدین' جیسے اخبارات شائع ہوئے جس کے مدیر ماسٹر رام چندر تھے۔ اسی دور کے اخبار میں 'کوہ نور' لاہور بھی ہے جو ہرسکھ لال کی ادارت میں 1850 سے شائع ہو رہا تھا۔ یہ عوام کا مقبول اخبار تھا اور تحریکِ آزادی کا علمبردار۔ 1823 سے 1857 تک ہندوستان کے مختلف علاقوں سے اردو اخبارات شائع ہوتے رہے جن میں سب سے زیادہ اخبارات آگرہ سے شائع ہوئے۔ نئی تحقیق کے مطابق مدراس سے تقریباً 16 اردو اخبارات شائع ہوئے جن میں 1841 میں شائع ہونے والا ہفت روزہ 'جامع الاخبار' مدراس کا پہلا اخبار ہے جس کے مدیر سید رحمت اللہ تھے۔ اس کے علاوہ 1848 میں اعظم الاخبار، 1849 میں آفتاب عالم تاب، رئیس الاخبار، تیسیر الاخبار، عمدۃ الاخبار، 1850 میں مخزن الاخبار، 1851 میں تعلیم الاخبار، نعیم الاخبار، 1853 میں امیر الاخبار، 1854 میں مرأۃ الاخبار، قاصد الاخبار، صبح صادق، 1856 میں طلسمِ حیرت، مظہر الاخبار اور 1857 میں خلاصۃ الاخبار شائع ہوتے رہے۔
پنجاب سے اس دوران جن اخبارات کی اشاعت عمل میں آئی ان اخبارات نے قومی جذبات

اور احساسات میں انقلابی روح پھونکی اور حکومت انگلشیہ کے خلاف جذبات کو بیدار کرنے میں اہم رول ادا کیا۔

1857 سے 1900 تک بہت سے اخبارات شائع ہوئے جن میں اردو کا اولین اردو روزنامہ 'اردو گائیڈ' ہے جو 1858 میں مولوی کبیر الدین احمد خاں کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ 'اکمل الاخبار' ایک اہم اخبار تھا جو 1886 میں جاری ہوا۔ اس کے روح رواں حکیم محمود احمد خان تھے۔ یہ ایسا اخبار تھا جس سے مرزا غالب کو بھی دلچسپی تھی۔ منشی میاں داد خاں سیاح اور بہاری لال مشتاق کو لکھے گئے خطوط سے اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ 1871 میں 'اخبار عام' جاری ہوا جس کی روزانہ اشاعت 1893 میں دو ہزار سے زیادہ تھی۔ یہ مقبول اخبار تھا۔ سوم آنند نے لکھا ہے کہ ''جب لاہور کا مشہور انگریزی اخبار 'سول اینڈ ملٹری گزٹ' صرف سو دو سو چھپتا تھا تو اس کی روزانہ اشاعت دو ہزار سے بھی زیادہ تھی۔''

اسی دور میں منشی نولکشور کی ادارت میں ہفت روزہ اودھ اخبار لکھنؤ سے جاری ہوا جو 1874 میں روزنامے کی شکل اختیار کر گیا۔ یہ اردو کا ایک مکمل اور مقبول ترین اخبار تھا جس میں تمام طرح کے موضوعات اور مضامین کا احاطہ کیا جاتا تھا۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار کا 'فسانۂ آزاد' بھی اسی میں قسط وار شائع ہوا۔ 1877 میں منشی سجاد حسین کا 'اودھ پنچ' بھی ایک مقبول اخبار تھا۔ ہندو مسلم اتحاد کا علمبردار اس اخبار نے بھی صحافتی دنیا میں اپنا نقش چھوڑا ہے اور آج بھی اس اخبار کے حوالے سے تحقیقی مضامین اور مقالے لکھے جاتے ہیں۔ 1866 میں شائع ہونے والے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے بھی صحافت کو نئی سمت اور نئی رفتار دی۔ لاہور کے 'پیسہ اخبار' کا شمار بھی اس دور کے اہم اخباروں میں ہوتا ہے۔ یہ 1887 سے شائع ہونا شروع ہوا۔ پیسہ اخبار نے صحافت کو ایک معیار و وقار عطا کیا۔ قیمت کم ہونے کی وجہ سے یہ اخبار عوام میں بہت مقبول تھا۔ اس کے علاوہ بھی اس دور میں بہت سے اخبارات شائع ہوتے رہے۔

1901 سے 1947 کے دور کو اردو صحافت کا عہد زریں کہا جا سکتا ہے۔ اس دور میں بڑے اہم اخبارات شائع ہوئے جن میں 'زمیندار' لاہور، 'اردوئے معلی' علی گڑھ، 'الہلال' کلکتہ، 'ہمدرد' دہلی، 'مدینہ' بجنور، ہفت روزہ 'سچ' لکھنؤ، 'الجمعیۃ' دہلی، 'الہند' کلکتہ، 'پرتاپ' لاہور، 'ملاپ' لاہور،

'انقلاب' ممبئی، 'عصر جدید' کلکتہ، 'آزاد ہند' کلکتہ، 'پاسبان' بنگلور، روزنامہ 'روشنی' سری نگر، روزنامہ 'خدمت' سری نگر، روزنامہ 'مسلمان' مدراس، روزنامہ 'اتحاد' پٹنہ، روزنامہ 'ندیم' بھوپال، روزنامہ 'ہندوستان' ممبئی اہم ہیں۔ہفت روزہ 'زمیندار' لاہور 1903 میں منشی معراج الدین احمد خان نے کرم آباد سے شائع کیا تھا۔ ان کے صاحب زادے مولانا ظفر علی خان نے اسے روزنامے کی شکل دی۔ یہ تحریک آزادی کا حامی اخبار تھا اسی وجہ سے اس اخبار کی ضمانتیں بار بار ضبط ہوتی رہیں اور ادارتی عملے کو بھی قید و بند کی مشقتیں جھیلنی پڑیں۔ اس اخبار کی روزانہ اشاعت 30000 تیس ہزار تھی۔ مولانا حسرت موہانی کے 'اردوئے معلیٰ' کی اشاعت کا آغاز بھی 1903 میں ہی ہوا۔ اس اخبار میں مولانا عصری مسائل، سماجیات، ادب کے علاوہ صحت عامہ اور کھیل کے صفحات بھی شامل کیا کرتے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار 'الہلال' کا اجرا 13 جولائی 1912 کو کلکتہ سے ہوا۔ یہ اپنے عہد کا بہت ہی مقبول اخبار تھا۔ اس وقت اس کی اشاعت 26000 کے قریب تھی۔ 'الہلال' نے اردو صحافت کو ایک اعلیٰ معیار عطا کیا۔ حکومت مخالف سرگرمیوں کی وجہ سے اس اخبار پر بھی قدغنیں لگتی رہیں۔ حکومت برطانیہ بھی اس اخبار سے گھبراتی تھی اور بار بار ضمانتیں طلب کرتی تھی۔ یہ اخبار بھی تعطل کا شکار رہا۔ گیارہ سال کے بعد 10 جون 1927 کو اس کا دوبارہ اجرا ہوا اور 9 دسمبر 1927 کو ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ اسی دوران مولانا ابوالکلام آزاد نے 'البلاغ' کے نام سے ایک اخبار 12 نومبر 1915 کو جاری کیا۔ ان دونوں اخبارات نے اردو صحافت میں جو نقوش قائم کیے ہیں وہ ہمیشہ تابندہ رہیں گے۔ مولانا محمد علی جوہر نے یکم جون 1913 کو 'ہمدرد' کے نام سے ایک اخبار جاری کیا۔ یہ اردو کا واحد اخبار تھا جس نے رائٹر اور ایسوسی ایٹڈ پریس کی خدمات حاصل کی تھیں۔ یہ ایک سنجیدہ اور برطانیہ مخالف اخبار تھا۔ پچیس ہزار کے قریب اس کی اشاعت تھی۔ 'ہمدرد' بھی 9 سال تک بند رہا۔ اس کا دوبارہ اجرا 9 نومبر 1924 کو ہوا اور 12 اپریل 1929 کو ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ ہمدرد نے اردو صحافت کو ایک نیا مزاج اور معیار عطا کیا۔ آج کی صحافتی تاریخ اور تحقیق میں 'ہمدرد' کی حیثیت مسلم ہے اور اس کے حوالے سے تحقیقات کا سلسلہ جاری ہے۔ 'مدینہ' (بجنور) بھی ایک ایسا اخبار ہے جس کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ یکم مئی 1912 کو یہ بجنور شہر سے شائع ہونا شروع ہوا۔ اس کے مالک مولوی مجید حسن بجنوری

تھے۔ یہ اخبار برطانیہ مخالف تھا اور عوام میں بہت مقبول بھی۔ 1940 تک آتے آتے اس کی اشاعت ایک لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ یہ اخبار اتنا انقلابی تھا کہ انگریز حکومت نے پنجاب میں اس کے داخلے پر پابندی لگا دی۔ اس اخبار سے بڑے ذی علم اور اہل قلم حضرات وابستہ تھے جن میں آغا رفیق بلند شہری، امین احسن اصلاحی، نصر اللہ خاں عزیز، حامد الانصاری غازی، ابوسعید بزمی اہم ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کا ہفت روزہ 'سچ' بھی جنوری 1925 سے شائع ہونا شروع ہوا۔ یہ اخبار ہندو مسلم اتحاد کا حامی اور اسم با مسمیٰ تھا۔ اس نے ہمیشہ ہی سچ لکھا ہفت روزہ 'سچ' بھی اپنی صحافتی اہمیت اور معنویت کی وجہ سے آج صحافتی تحقیق کے حوالوں میں شامل ہے۔ اس اخبار نے بھی اردو صحافت کے معیار و وقار کو بلند کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اسی دور میں 'جنگ' دہلی، 'صدائے عام' پٹنہ، 'پربھات' لاہور، 'اجیت' لدھیانہ، 'قومی آواز' لکھنؤ، 'نوائے وقت' لاہور اور 'انقلاب' ممبئی جیسے اخبارات شائع ہوئے جن میں قومی آواز کو اس اعتبار سے اہمیت حاصل ہے کہ اس نے اردو صحافت کو نئی بلندی عطا کی اور حیات اللہ انصاری کی ادارت نے صحافت کو نئے رنگ و روپ سے روشناس کرایا۔ 'قومی آواز' اپنی معیاری زبان اور مضامین کی وجہ سے آج بھی ایک مثال اور نمونے کی حیثیت رکھتا ہے۔ بہت سی نئی صحافتی اصطلاحات اور لفظیات، قومی آواز نے وضع کیں جو آج صحافت میں رائج ہیں۔ انقلاب ممبئی کا شمار بھی اردو کے اہم اور مقبول ترین اخباروں میں ہوتا ہے۔ اس کی اشاعت کا آغاز 1938 سے ہوا۔ مولوی عبدالحمید انصاری اس کے بانی مدیر تھے اور اس کی ادارت سے فضیل جعفری، خالد انصاری، ہارون رشید علیگ، حسن کمال جیسے نامور صحافی وابستہ رہے ہیں۔ اب یہ اخبار دہلی اور دیگر شہروں سے بھی شائع ہوتا ہے۔ جنگ کا شمار بھی اہم اخبارات میں ہوتا ہے جو دہلی سے 1942 میں نکلنا شروع ہوا۔ اس کے مدیر خلیل الرحمن تھے اب یہ اخبار پاکستان کے اہم اخبارات میں سے ایک ہے جو امریکہ اور دیگر علاقوں سے بھی شائع ہوتا ہے۔ یہاں تمل ناڈو مدراس سے شائع ہونے والے روزنامہ 'مسلمان' کا ذکر بھی ضروری ہے جو 1927 سے پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ یہ تمل ناڈو کا واحد اردو روزنامہ ہے جو نامساعد حالات کے باوجود نکل رہا ہے۔

1947 سے 1990 میں بھی بہت سے اہم اخبارات شائع ہوئے جن میں ہند سماچار، 'سیاست' حیدرآباد، 'سالار' بنگلور، 'منصف' حیدرآباد، 'آبشار' کلکتہ، 'عکاس' کلکتہ، 'اخبار مشرق'

کولکاتا'، 'عزائم' لکھنؤ، روزنامہ 'ساتھی' پٹنہ، روزنامہ 'سنگم' پٹنہ، 'قومی تنظیم' پٹنہ، 'عظیم آباد ایکسپریس'، روزنامہ 'ایثار' پٹنہ، 'فاروقی تنظیم' پٹنہ، روزنامہ 'پندار' پٹنہ، اردو ایکشن' بھوپال، 'اردو ٹائمز' ممبئی، ہفت روزہ 'اخبار عالم' ممبئی وغیرہ اہم ہیں۔ ہند سماچار کا آغاز جالندھر سے 4 مئی 1948 کو ہوا۔ اس کے ایڈیٹر لالہ جگت نارائن تھے۔ 1949 میں اس کی اشاعت 1800 تھی اور 1965 میں سات ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ سیاست حیدرآباد سے 15 اگست 1949 میں نکلنا شروع ہوا۔ میر عابد علی خان اور محبوب حسین جگر کی ادارت میں اس اخبار نے کامیابی کی نئی منزلیں طے کیں۔ یہ آج بھی حیدرآباد کے اہم اخباروں میں شمار کیا جاتا ہے اور اس کے ایڈیشن مشرق وسطٰی سے بھی شائع ہوتے ہیں۔ روزنامہ سالار کرناٹک کا ایک بڑا اخبار ہے۔ جس کے بانی مدیر 'سوغات' کے مدیر نامور ناقد محمود ایاز تھے۔ انھوں نے 2 فروری 1964 کو اس اخبار کی اشاعت کا آغاز کیا جو اس وقت کرناٹک کا مقبول ترین اخبار ہے۔ منصف حیدرآباد نے بھی صحافت میں نئی تاریخ رقم کی ہے۔ یہ وہاں کے اہم اخبارات میں سے ایک ہے۔ ہفت روزہ 'بلٹز' بمبئی، ہفت روزہ 'آئینہ'، ہفت روزہ 'نشیمن'، ہفت روزہ 'نئی دنیا' بھی اسی دور کے اخبارات ہیں۔ ان تمام اخبارات نے مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کیے ہیں۔ ظ انصاری کی ادارت میں ہفت روزہ آئینہ 1965 میں منظر عام پر آیا۔ یہ ایک مثالی اخبار تھا جس نے اپنی طباعت، مواد، پیش کش کی وجہ سے قارئین کو اپنی طرف متوجہ کیا اور اس نے ایک نئی مثال قائم کی۔ 1963 میں ممبئی سے ہفت روزہ بلٹز کی اشاعت شروع ہوئی۔ انور عظیم اس اخبار کے پہلے ایڈیٹر تھے۔ 'بلٹز' عوام وخواص کا ایک مقبول ترین اخبار تھا۔ اس کی اشاعت ایک لاکھ ستر ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ اس اخبار کا آخری صفحہ آزاد قلم کے عنوان سے خواجہ احمد عباس لکھا کرتے تھے اور اس کالم کی وجہ سے اس کے قارئین کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ اس اخبار کا اپنا ایک مخصوص مزاج تھا۔ اس اخبار کا قارئین کو بے چینی سے انتظار رہتا تھا۔ بنگلور سے 'نشیمن' 26 جنوری 1962 کو نکلنا شروع ہوا۔ عثمان سعید مرحوم اس کے بانی مدیر تھے۔ اس اخبار نے بھی عوام میں اپنی ایک الگ پہچان بنائی۔ یہ اخبار اتنا مقبول تھا کہ بہت سے علاقوں میں یہ بلیک میں حاصل کرنا پڑتا تھا۔ اس کا خاص کالم 'چھیڑ انھیں' عوام وخواص میں بہت ہی مقبول تھا۔ دہلی سے 'نئی دنیا' 16 جولائی 1951 سے نکلنا شروع ہوا۔ یہ پہلے روزنامہ تھا مگر 1971 میں ہفت روزہ

ہو گیا۔اس کے بانی مدیر مولانا عبدالوحید صدیقی تھے اس اخبار نے بھی عوام میں اپنی مقبولیت اور پہچان قائم کی۔اس کی اشاعت بھی لاکھوں کے قریب تھی۔

1990 سے 2015 دور میں بہت سے اخبارات شائع ہوئے جن میں راشٹریہ سہارا ایک اہم نام ہے جس کی اشاعت جون 1999 سے ہوئی۔ یہ اخبار پہلے لکھنؤ سے شائع ہوا اور پھر دہلی اور اس کے بعد مختلف شہروں سے اس کی اشاعت شروع ہوئی۔اس اخبار نے بھی اپنی الگ شناخت قائم کی ہے اور اس کا شمار اردو کے کثیر الاشاعت اخباروں میں ہوتا ہے۔اس اخبار کے علاوہ اور بھی اخبارات مختلف ریاستوں اور شہروں سے شائع ہو رہے ہیں ان میں 'اودھ نامہ' لکھنؤ، 'آگ' لکھنؤ، 'متاع آخرت' کانپور، 'اورنگ آباد ٹائمز' اورنگ آباد، 'ایشیا ٹائمز' کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ دہلی سے بھی بہت سے اخبارات شائع ہو رہے ہیں جن میں ہفت روزہ خبردار جدید، روزنامہ ہمارا سماج، صحافت، جدید خبر، روزنامہ خبریں، ہندوستان ایکسپریس، سیاسی تقدیر، ہند نیوز قابل ذکر ہیں۔

اکیسویں صدی میں نئی ٹکنالوجی کی وجہ سے اردو اخبارات کو بہت سی سہولتیں میسر ہیں۔ اب اردو اخبارات کو خبروں کے حصول میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ بہت سی خبر رساں ایجنسیاں ہیں جن میں یو این آئی اردو ایک ایسی ایجنسی ہے جس پر زیادہ تر اردو اخبارات کا انحصار ہے۔

اردو کے دوسو سالہ صحافتی سفر پر نگاہ ڈالی جائے تو بہت سی حقیقتیں سامنے آتی ہیں۔ایک بڑی حقیقت یہ ہے کہ 1823 سے 1900 تک شائع ہونے والے تقریباً 25 فیصد اردو اخبارات کے مالکان ہندو تھے اور پڑھنے والوں کی اکثریت ہندو طبقے پر مشتمل تھی اور ایک خوش کن حقیقت بقول ممتاز صحافی جمنا داس اختر یہ ہے کہ ''انقلاب زندہ باد کا نعرہ برصغیر میں دینے والے اردو صحافیوں نے نامساعد حالات کے باوجود برطانوی سامراج کے خلاف جنگ میں جو نمایاں حصہ لیا اس کی کوئی مثال کسی دوسری زبان کے صحافی پیش نہیں کر سکتے'' اور افسوس ناک حقیقت یہ ہے کہ مشرقی پنجاب جو کبھی اردو صحافت کا گہوارہ تھا اب وہاں سے اردو صحافت تقریباً غائب سی ہو گئی ہے اور یہ بھی ایک تشویش ناک بات ہے کہ 1857 میں جن شہروں سے کثیر تعداد میں اخبارات شائع ہوتے تھے وہاں سے اب اردو کا کوئی اخبار شائع نہیں ہوتا۔امرتسر، انبالہ، جھجر، شملہ، کرنال، کپورتھلہ وغیرہ سے کثیر تعداد میں اخبارات شائع ہوتے تھے مگر شاید اب یہ علاقے اردو خواندگی

سے بھی محروم ہیں۔ امرتسر سے ہفت روزہ 'باغِ نور' (1851)، 'تحفۂ پنجاب' (1875)، 'ہندو پرکاش' (1873)، 'سفیر ہند' (1877)، 'ریاض ہند' (1886)، 'امرتسر گزٹ' (1888)، 'عزیز الہند' (1889) ہفت روزہ 'وکیل' (1895) ہفت روزہ 'جہاں نما' (1895)، ہفت روزہ 'مسلمان' (1902)، اور دیگر اخبارات شائع ہوتے تھے۔ شملہ سے پندرہ روزہ 'چمن ہند' (1886)، ہفت روزہ 'بہار شملہ' (1886)، 'شملہ گزٹ' (1889)، 'پائے تخت' (1899)، جھجر سے ہفت روزہ 'ہریانہ پنچ' (1884)، پندرہ روزہ 'ہریانہ اخبار' (1884)، انبالہ سے ہفتہ وار 'مرچنٹ' (1886)، ہفتہ وار 'انبالہ گزٹ' (1888)، ہفتہ وار 'خیر اندیش' (1889)، ہفت روزہ 'لسان الہند' (1889) جیسے اخبارات نکل رہے تھے مگر اب ان علاقوں میں اردو اخبارات کی رسائی بھی دشوار ہوگئی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اردو صحافت کی کوئی مبسوط تاریخ نہیں لکھی گئی اور نہ ہی مختلف ادوار میں قومی شعور کی بیداری میں اردو صحافت کے مکمل کردار کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے صحافت کے وسیع تر کردار سے روشناس کرانے ہی کے لیے ہندوستان کے مختلف شہروں (کولکاتا، سری نگر، پٹنہ، ممبئی) میں جشنِ صحافت کے علاوہ 'اردو صحافت کے دو سو سال' کے موضوع پر عالمی اردو کانفرنس (5 تا 7 فروری 2016) کا بھی انعقاد کیا گیا جس میں ملک و بیرونِ ملک کے ماہرینِ صحافت اور دانشورانِ ادب و ثقافت نے پرمغز مقالے پڑھے۔

یہ کتاب صحافت پر منعقدہ مختلف سیمناروں میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ ہے۔ ان کے علاوہ کچھ اور مضامین بھی بطورِ خاص اس میں شامل کیے گئے ہیں اور ان تمام مضامین کی ترتیب اور تصحیح کے لیے ماہرین کی خدمات بھی لی گئی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اردو صحافت کے باب میں اس کتاب کی حیثیت دستاویزی اور حوالہ جاتی ہوگی۔

قومی اردو کونسل صحافت سیریز کے تحت کچھ اور کتابیں بھی شائع کرنے جارہی ہے، یہ اس سلسلے کی پہلی کتاب ہے!

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

ڈائرکٹر

# فہرست

## چھٹواں باب

### خواتین، اطفال اور اردو صحافت


| | | |
|---|---|---|
| 51- روزنامہ آفتاب: کشمیر میں اردو صحافت کا روشن باب | پروفیسر ناصر مرزا | 563 |
| 52- اردو صحافت اور صحافتِ نسواں (انیسویں صدی کے حوالے سے) | ڈاکٹر جمیل اختر | 571 |
| 53- اردو صحافت میں خواتین کا حصہ | پروفیسر قمر جہاں | 607 |
| 54- ادبی رسائل اور خواتین کی خدمات | مہرین قادر حسین | 615 |
| 55- اردو صحافت: خواتین اور اطفال | خیال انصاری | 621 |


## ساتواں باب

### اردو صحافت: سائنس، قانون اور دیگر موضوعات


| | | |
|---|---|---|
| 56- قانونی صحافت کی پیچیدگیاں ملکی و عالمی تناظر میں | خواجہ عبدالمنتقم | 631 |

| | | |
|---|---|---|
| 57- اردو صحافت اور سائنس | ڈاکٹر رفیع الدین ناصر | 641 |
| 58- الیکٹرانک میڈیا اور اردو صحافت | انیس رفیع | 649 |
| 59- اردو صحافت اور حکومتِ ہند | ڈاکٹر ابرار رحمانی | 657 |
| 60- اردو صحافت اور جدید ٹیکنالوجی | قطب الدین شاہد | 665 |
| 61- اردو صحافت اور عصری چیلنجز (نئی تکنیک اور ٹیکنالوجی کے حوالے سے) | ڈاکٹر ریحان انصاری | 675 |
| 62- اردو صحافت اور انفوٹین مینٹ | شیخ الماس حسین | 685 |


## آٹھواں باب

### علمائے کرام اور اردو صحافت


| | | |
|---|---|---|
| 63- اردو صحافت اور مذہبی اتحاد | پروفیسر قدوس جاوید | 695 |
| 64- ماضی کی اردو صحافت میں علما کا حصہ | سہیل انجم | 709 |
| 65- اردو صحافت اور علمائے کرام | ڈاکٹر رشید احمد | 717 |


## نواں باب

### ادبی صحافت


| | | |
|---|---|---|
| 66- ادبی صحافت کے مسائل | ابوالکلام قاسمی | 739 |
| 67- اردو کی ادبی صحافت کا تدریجی ارتقا | عزیز نبیل | 745 |


## دسواں باب

### کاروانِ صحافت


| | | |
|---|---|---|
| 68- صحافیانِ صف شکن اور آزمائش دار و رسن | پروفیسر شاہد حسین | 773 |

| | | | |
|---|---|---|---|
| 69- | عبدالماجد دریابادی با اصول صحافت کا صاحب اسلوب علمبردار | پروفیسر تحسین فراقی | 789 |
| 70- | بہار کے چند گمنام صحافی | ڈاکٹر منظر اعجاز | 801 |
| 71- | مولانا علی میاں ندوی اور اردو ایڈیٹرس کانفرنس | عبدالعزیز | 807 |
| 72- | الرفیق۔۔۔ عبدالسلام رفیق | پروفیسر ایاز رسول نازکی | 811 |


## گیارھواں باب

## اردو صحافت مسائل و امکانات


| | | | |
|---|---|---|---|
| 73- | نیا ترسیلی بیانیہ اور اردو صحافت | پروفیسر شافع قدوائی | 819 |
| 74- | اردو صحافت اور امکانات | شاہد لطیف | 825 |
| 75- | اردو صحافت: بے انتہا مسائل، بے شمار امکانات | زین شمسی | 833 |
| 76- | اردو صحافت مسائل کے گھیرے میں | ڈاکٹر سید شجاعت بخاری | 843 |
| 77- | اردو صحافت اور خبر رساں ایجنسیاں | نوشاد مومن | 851 |
| 78- | اردو صحافت کے اقتصادی مسائل، مشکلات اور حل | ڈاکٹر جوہر قدوسی | 861 |
| 79- | جموں و کشمیر میں اردو صحافت اور روزگار | پروفیسر شہاب عنایت ملک | 873 |
| 80- | اردو صحافت کی معاشیات | رضوان اللہ آروی | 879 |
| 81- | اردو صحافت اور اشتہارات | مشتاق احمد نوری | 887 |
| 82- | اردو صحافت اور ایڈورٹائزنگ | عظمت جمیل صدیقی | 891 |

| | | |
|---|---|---|
| 83- اردو اخبارات اور خبر رساں ایجنسیاں | احمد جاوید | 895 |
| 84- اردو قارئین کی قوت خرید | محمد شعیب عالم | 905 |
| 85- اردو اخبار کا قاری | سید فیروز اشرف | 911 |
| 86- اردو صحافت اور مالی مشکلات | جہانگیر قاطمی | 919 |
| 87- اردو صحافت بحوالہ زبان، معیار، ترجمہ اور ادارت | اشرف استھانوی | 923 |
| 88- اردو صحافت کے چند ناخوشگوار پہلو | پروفیسر مصطفیٰ حسین | 931 |
| 89- اردو صحافت اور مالی بحران | شکیل رشید | 935 |
| 90- کتابیات صحافت | حیدر علی | 941 |

# چھٹواں باب

## خواتین، اطفال اور اردو صحافت

# روزنامہ آفتاب:
# کشمیر میں اردو صحافت کا روشن باب

پروفیسر ناصر مرزا

روزنامہ آفتاب کے بانی و مدیر خواجہ ثناء اللہ بٹ (2009-1922) دنیائے صحافت میں اَن مٹ نقوش چھوڑ ے۔ خداداد صلاحیتوں سے متصف مدیر موصوف نے نصف صدی پر محیط اپنے صحافتی کریئر میں کئی معرکے سر کیے، کئی سنگ ہائے میل طے کیے۔ نہ صرف اخبار آفتاب کی صورت میں ایک ہردل عزیز عوامی ترجمان کی داغ بیل ڈالی بلکہ عصری تقاضوں سے آشنا اردو صحافت کے لیے رہنما نقوش قائم کیے۔ بلاشبہ انھوں نے کشمیر میں اردو صحافت کے نئے دَور کی بنیاد رکھی اور اس ناطے وہ ''بابائے صحافت'' کہلائے جانے کے حقدار ہیں۔

خواجہ صاحب ایک Legend تھے۔ وہ انسانی حقوق کے علمبردار، عظیم کشمیری صحافی تھے، جنھوں نے ساری عمر صحافت کے سنگلاخ میدان میں اپنی صلاحیتوں سے یادگار کردار ادا کیا۔ ان کی قوتِ مشاہدہ گہری اور قوتِ فکر تیز تر تھی۔ اس دور میں جب وہ سرِ محفل تھے، وہ افقِ صحافت پر چھائے رہے اور انھوں نے کشمیر میں اردو صحافت کا ایک سنہرا باب رقم کیا۔

## پہلی کرن:

جولائی 1957 میں اخبار ''آفتاب'' کا پہلا شمارہ 'نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر' کا دردمندانہ پیغام لیے اُفقِ کشمیر پر نمودار ہوا۔ اسی پیغام کی صدائے بازگشت بعد کے شماروں میں سنی گئی جبکہ اسی جستجو میں ''آفتاب'' ہر صبح طلوع ہوتا رہا۔ اس کی پہلی کرن پڑتے ہی عوام و خواص اس کے گرویدہ ہو گئے۔ ''ایک چُپ سو سُکھ'' کے اُس دور میں جب بات کرنی بہت مشکل تھی اُنھوں نے عوامی احساسات کو زبان عطا کرنے والی صحافت شروع کر کے عوام کے دل جیت لیے۔ اُنھوں نے نصف صدی سے زائد عرصے تک اپنے مخصوص کالم ''خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے'' میں مزاح کے ساتھ ساتھ طنز کے گہرے نشتر سے عصری درد و کرب کی تصویر کشی کی۔ یہ ایک طویل آزاد نظم تھی جو وہ قسط وار قارئین کی نذر کرتے تھے۔

اُفقِ کشمیر پر ''آفتاب'' 53 برس تک ان کے زیرِ ادارت آب و تاب کے ساتھ چمکتا رہا۔ اس طرح اُنھیں کشمیر کا ایسا پہلا صحافی ہونے کا اعزاز حاصل ہوا جس نے ایک اخبار کا اجرا کیا اور اُسے شب و روز محنت شاقہ سے نصف صدی سے زائد عرصہ تک آندھیوں اور طوفانوں کے باوجود قائم و دائم رکھا۔ خواجہ صاحب ایسے پہلے مدیر تھے جنھوں نے آفسیٹ پرنٹنگ اور رنگین طباعت سے اخبار کو مزین کیا اور ٹیلی پرنٹر سروس سے استفادہ کیا۔ نیز اُنھوں نے اخبار کی ترسیل میں ہاکروں کی خدمات اور ہوم ڈیلیوری سروس شروع کرنے میں اولیت حاصل کی۔ بحیثیت صحافی وہ کسی سے مرعوب نہ ہوئے جبکہ ان کا رُعب اعلیٰ ایوانوں میں عیاں تھا۔ کشمیریوں کی تین نسلیں ان کی فکر سے متاثر ہوئیں۔

یہ امر قابلِ ذکر اور لائقِ توجہ ہے کہ ''آفتاب'' کا اجرا ایک انقلابی قدم تھا۔ نیز یہ اس خلا کو پُر کرنے کا ایک برمحل اقدام تھا جو پنڈت پریم ناتھ بزاز کے ''ہمدرد'' کی اشاعت بند ہونے سے پیدا ہوا تھا۔ اخبار ''آفتاب'' کو ہم عصر دنیا کس نظر سے دیکھتی تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے، کہا جاتا ہے کہ اخبار کی پہلی کاپی جب پریس مالک کو دکھائی گئی تو وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ اوّلین شمارے میں ہی بیباک تحریر دیکھ کر وہ ہکا بکا رہ گیا۔ 'یہ تو بغاوت ہے' وہ کہہ اُٹھا۔ بہر حال آفتاب طلوع ہوا انشاءاللہ کبھی نہ غروب ہونے کے لیے۔

میرا خیال ہے کہ خواجہ صاحب کے انداز بیان کی دلکشی، جذبات وخیالات کی روانی اور تحریر میں ایک (Respective) مخصوص زاویۂ نگاہ ہونے کی وجہ سے اخبار ''آفتاب'' کو کامیابی کے مدارج طے کرنے میں کافی مدد ملی۔ درحقیقت سماج کی تشکیل اخبار سے ہوتی ہے اور اخبار کی تشکیل سماج سے ہوتی ہے۔ (A Newspaper informs and forms a Community and aCommunity informs and forms a Newspaper). یہ بات اخبار ''آفتاب'' پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ اس نے کشمیریوں کو صحافتی دنیا میں ایک پہچان عطا کی جبکہ خود ''آفتاب'' کے عناصر ترکیبی میں 'کشمیر' ایک اہم عنصر قرار پایا۔

**مثالی مدیر:**

خواجہ صاحب خداداد صلاحیتوں سے لیس تھے۔ اپنی ذات میں ایک انجمن، وہ بلاشبہ ایک ادارے سے بڑھ کر تھے۔ ''آفتاب'' محض ایک اخبار کا ہی نام نہیں تھا۔ بلکہ یہ میرے خیال میں وادیٔ گل پوش میں صحافت کی اوّلین درس گاہ تھی جہاں سے اکتسابِ فیض کر کے کئی اصحابِ فن صحافت سیکھ کر نکلے اور مقامی، قومی اور بین الاقوامی سطح پر شہرت پائی۔

ان سے فیضیاب ہونے والوں کی فہرست طویل ہے۔ صحافت کے اس بہترین استاد سے استفادہ کرنے والوں میں نامور صحافی یوسف جمیل، ایڈیٹر گریٹر کشمیر فیاض کلو اور موجودہ ایڈیٹر آفتاب ظہور ہاشمی نمایاں نظر آتے ہیں۔ خواجہ صاحب صحافیوں کے صحافی، مدیروں کے مدیر اور استادوں کے استاد تھے۔ ان میں ایک مثالی ایڈیٹر کی خوبیاں تھیں، وہ بہتر سے کم تر پر راضی نہیں ہوتے۔ وہ صحافت کی اعلیٰ قدروں کے امین اور پاسبان بنے رہے۔

**ذاتی تجربہ:**

کبھی ان سے ملاقات کا موقع ملا۔ اُنھوں نے مجھے انتہائی شفقت سے نوازا۔ ان کی مجالس میں علم وعرفان اور شعور وآگہی کے پھول ہی مہکتے تھے۔ خواجہ صاحب کی حسِ ظرافت اپنی مثال آپ تھی جبکہ ان کا طنز لاجواب تھا۔ اُنھوں نے کشمیر میں صحافت کو مضبوط بنیاد فراہم کرنے کے لیے جو خدمات انجام دیں وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔ وہ کشمیر کاز کے ایک اہم وکیل تھے۔

کشمیریوں کا عروج وترقی ان کا مطمحِ نظر تھا۔ وہ کشمیریوں کے جائز حقوق کے تحفظ کی جدوجہد میں پیش پیش تھے۔ اصلاحِ معاشرہ ان کی آرزو تھی، جبکہ کشمیر کو گہوارۂ امن دیکھنا ان کا خواب تھا۔ مشکلات کے باوجود اور تند و تیز آندھیوں کے باوصف وہ 53 سال اپنے محاذ پر ڈٹے رہے۔

## پہلی جنوری تجدید عہد کا دن:

ہر سال کی ابتدا میں ''آفتاب'' کے اداریے میں اس عہد کی تجدید ہوتی تھی کہ اخبار عوام کے جائز مفادات کے تحفظ کی کوششوں کے لیے وقف رہے گا۔ خواجہ صاحب نے اخبار کے لیے ایک لحاظ سے اپنی ذات سے بھی دوری اختیار کر رکھی تھی۔ پروفیشن کے ساتھ اتنا لگاؤ شاذ ہی کہیں اور ملتا ہے۔ ذاتی آرام و آسائش کو تج کر وہ فقیرانہ زندگی گزارتے ہوئے ''آفتاب'' کو آب و تاب دیتے رہے۔ کشمیر پر ان کی گرانقدر تصانیف ''عہد نامۂ کشمیر''، ''کشمیر 1947 تا 1975'' کشمیر کی تاریخ کو سمجھنے کے لیے اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں۔

خواجہ صاحب قوم کشمیر کے ساتھ ہو رہی ناانصافیوں پر آواز اُٹھاتے تھے تو ساتھ ساتھ قوم کو اپنی غلطیوں کی اصلاح کی ترغیب بھی دیتے تھے۔ وہ اکثر اقبال کے الفاظ میں بتاتے تھے:

افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو

اور یہ کہ ؎ ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

وہ عوامی اُبال کے مواقع پر ''گیت گایا پتھروں نے'' سے صورت حال کی عکاسی کرتے۔ نیز ''اور مارا گیا خطّی کا جانہ'' کہہ کر صورت حال کے دوسرے پہلو کو اُجاگر کرتے۔ وہ اداروں کی کوتاہی، سسٹم کی ناکامی کے ساتھ ساتھ افراد کی کم کوشی پر بھی نالاں تھے اور اقبال کے حکیمانہ اشعار کی روشنی میں معاملات کو سمجھنے پر زور دیتے اور یہ سوال کرتے نظر آتے:

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں

کہ درویشی بھی عیاری ہے، سلطانی بھی عیاری

خواجہ صاحب ایک کشمیر دوست صحافی تھے۔ اخبار ان کے لیے صرف ایک کاروبار نہ تھا بلکہ سیاست و معیشت اور معاشرت میں بہتری اور اصلاحِ احوال کا ایک ممکن ذریعہ۔ 1953 میں مظفر آباد سے جو اخبار انھوں نے جاری کیا اس کا نام ''کشمیر'' تھا۔ جبکہ 1957 میں حد متارکہ پار کر کے جب وادی

لوٹ آئے تو اہلِ کشمیر کو "آفتاب" کا تحفہ دیا۔

## درویش بادشاہ:

خواجہ صاحب صحافت کی دنیا کے درویش بادشاہ تھے۔ انھیں صحافت کی خاطر ذاتی آرام وآسائش کی پروا نہ تھی۔ وہ صحافتی خدمات کے عوض مالی فوائد کے متلاشی نہ تھے۔ مضامین کے بدلے زمین و جائداد یا عہدوں و مناصب کے خواہش مند نہ تھے۔ خبروں اور تبصروں کے عوض بینکوں سے قرضوں کے سائل نہ تھے۔ نئے نوٹوں کی خوشبو انھیں ایمانداری سے ہٹا نہیں سکتی تھی۔ کھنکتے سکوں کی چھن چھن انھیں غفلت میں نہیں ڈال سکتی تھی۔ انسان دوستی ان کا شیوہ تھا۔ ضمیر کی آواز پر کان دھرنا ان کا لائحۂ عمل تھا۔ بیباکی ان کا شیوہ تھا۔ وہ ہمارے بلبل ہزار داستان تھے۔ ہر روز نئے انداز میں نت نئے موضوعات کو زیر بحث لاتے تھے۔ وہ کشمیر دوست صحافت کے صفِ اول کے اولوالعزم قلمکار تھے۔

خواجہ صاحب کو جو عوامی مقبولیت نصیب ہوئی وہ بس ان کا ہی خاصہ ہے۔ ایسی پذیرائی معاصرین میں شاید ہی کسی کے حصے میں آئی۔ وہ ایک ایسے قلمکار تھے جن کی تحریریں ذوق وشوق سے پڑھی جاتی تھیں۔ ان کا خصوصی کالم "خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے" عوام وخواص میں یکساں طور پر مقبول تھا۔ گو ان کی آرا سے بعض اوقات اختلاف کی گنجائش بھی ہوا کرتی تھی، تاہم عام کشمیری اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ ان کے طنز ومزاح سے عام کشمیری کی افسردگی کو تبسم عطا ہوتا تھا اور اس کی پژمردگی، شگفتگی میں بدل جاتی تھی۔

## میں بھی حاضر تھا وہاں:

خواجہ صاحب کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے کچھ اصحاب دانش کے ہمراہ یہ ناچیز ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ زیرِ علاج تھے۔ تاہم ہشاش بشاش نظر آئے۔ دورانِ گفتگو تشدد کی کسی واردات کا ذکر چھڑ گیا۔ خواجہ صاحب نے پُرخیال انداز میں کہا "تشدد اس مسئلے کا حل نہیں" محفل پر سکوت طاری ہوا۔ کوئی کچھ نہ بولا۔ دراصل ان کی بارُعب شخصیت کے سامنے مقرروں کی قوتِ گویائی جواب دے دیتی تھی۔ قدرے توقف کے بعد میں نے جسارت کی پوچھا "کیا عدمِ تشدد اس مسئلے کا حل ہے" جہاندیدہ مدیر نے بلاتوقف جواب دیا "عدم تشدد بھی اس کا حل نہیں"۔ پھر

وضاحت کی کہ مسئلہ کس قدر پیچیدہ ہے! وہ ایک فقرے میں سیکڑوں گتھیاں سلجھا دیتے تھے۔ ہزاروں اسرار بیانی کرتے تھے، کبھی کبھی اس طرح کہ مخاطب کے چودہ طبق روشن ہو جاتے تھے۔

**حیرت انگیز امرِ واقعہ:**

اپنے ہم پیشہ معاصرین کے برعکس اور صحافتی روتوں کے باوصف خواجہ صاحب بہت کم اپنے دفتر سے باہر نکلتے تھے۔ راقم الحروف کے والدِ نسبتی معروف صوفی بزرگ مرحوم پیرزادہ بدرالدین کے خواجہ صاحب کے ساتھ اچھے مراسم تھے۔ پیرزادہ صاحب خلوص، خدا ترسی اور پارسائی کی بنا پر شہر خاص میں بنظر استحسان دیکھے جاتے تھے۔ خواجہ صاحب وقتاً فوقتاً ان کے اصلاحی مضامین خاص اہتمام کے ساتھ ''آفتاب'' میں شاملِ اشاعت کرتے۔ نیز عیدین کے موقعوں پر خصوصی کالم میں ان کے نام بھی عید مبارک درج کرتے۔ پیرزادہ صاحب موصوف کہا کرتے تھے کہ ''خواجہ صاحب کی بہت سی آنکھیں اور بہت سے کان ہیں'' گو وہ دفتر سے بہت کم باہر نکلتے ہیں، لیکن باہر کی دنیا کے بارے میں کسی اور سے زیادہ جانتے ہیں۔ یہ ایک حیرت انگیز امر واقعہ تھا۔ اس دفتر میں رہتے ہوئے باہر کی دنیا کے بدلتے حالات کی نبض پر ہاتھ تھا۔ اقتدار کے گلیاروں میں سرخ قالین ان کی قدم بوسی کو ترستے تھے۔ دنیا ان کے دفتر کا طواف کرتی تھی لیکن وہ اس سے بے نیاز اپنے فرائض منصبی ادا کرنے میں منہمک تھے۔ وہ ایک ایسی شخصیت تھی جن کے بارے میں حکیم الامت نے فرمایا:

قوموں کی تقدیر وہ مرد درویش
جس نے نہ ڈھونڈی سلطاں کی درگاہ

**صاحب اوّلیت نابغہ:**

کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ صحافت میں ''آفتاب'' میں چھپی جامع خبریں، زوردار سرخیاں، متوازن اداریے، فکر انگیز مزاحیہ کالم زیر بحث آتے رہتے تھے۔ سال 2000 میں راقم الحروف کو شوق ہوا کہ خواجہ صاحب کے شایانِ شان ایک سوانحی خاکہ شعبے سے شائع ہونے والے جریدے ''میڈیا ٹائمز'' کی زینت بنے۔ خیال یہ تھا کہ اکابرین صحافت سے نئی نسل بشمول زیر تربیت صحافی آشنا ہو جائیں اور بالخصوص خواجہ صاحب کی قابلِ قدر اور لائق تحسین صحافتی خدمات

سے متعارف ہو جائیں۔

چنانچہ ایک ہونہار طالب علم ظفر اقبال، جو اب NDTV کے جموں میں مقیم نمائندے ہیں، کے سپرد یہ کام ہوا۔ میگزین کے چیف ایڈیٹر کے طور پر میں نے اس کا مسودہ دیکھا اور اس کا عنوان Pioneering Genius (صاحب اوّلیت نابغہ) تجویز کیا۔ رسالہ چھپ کر آ گیا تو خواجہ صاحب کی خدمت میں پیش کرنے کی سعی کی۔ کچھ جھجھک آڑے آ رہی تھی۔ تاہم چھپنے کے بعد چھپنے کی صورت نہ تھی۔ چنانچہ ایک شام خواجہ صاحب کی خدمت میں رسالہ پیش ہوا۔ انھوں نے رسالہ ہاتھوں میں لیا، مضمون پڑھا اور پُر وقار خاموشی کے ساتھ ٹیبل پر رکھا۔ اس لیے خواجہ صاحب کا سکوت ہمارے لیے حوصلہ افزا تھا اور باعثِ تسکین بھی کہ ایک عہد آفریں شخصیت نے ان کے متعلق ایک طالب علم کی طالب علمانہ تحریر کو شرف قبولیت بخشا ہے۔

بہر حال لازم ہے کہ خواجہ صاحب اور اس قبیل کی اور قد آور شخصیات کی حیات اور ان کے کارناموں پر تحقیق ہو، ان کے صحافتی کردار کا مطالعہ کیا جائے، ان کی شگفتہ تحریروں کی بازیافت ہو اور نئی نسل کو ان عبقری شخصیات سے متعارف کرانے کے لیے اقدامات کیے جائیں۔

## ''اُسے کہنا کہ لوٹ آنا''

مرحوم کی وفات پر ناچیز نے اپنے لکھے مضمون کو عرش صدیقی کے ان اشعار پر ختم کیا۔ مرحوم مدیر کی جدائی کا درد اپنا ہی درد سمجھتے ہوئے انھوں نے کہا اُسے کہنا دسمبر آ گیا ہے؛ اگر جو خون جسموں میں سویا ہے وہ پھر نہ جاگے گا، اُسے کہنا ہوائیں سرد ہیں اور زندگی کہرے کی دیواروں میں لرزاں ہے۔ اُسے کہنا کہ گر سورج نہ نکلے گا تو کیسے برف پگھلے گی؟ ''اُسے کہنا کہ لوٹ آنا''

# اردو صحافت اور صحافتِ نسواں
## (انیسویں صدی کے حوالے سے)

ڈاکٹر جمیل اختر

خواتین کے ذریعہ تخلیق کردہ ادب ہو یا صحافت انھیں ہمارے اہل علم و دانش نے کبھی قابل اعتنا ہی نہیں سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ ادب اُردو میں ان کے ذکر تک کو لا حاصل سمجھا گیا۔ شاعری، نثر، فکشن اور تنقید کی جتنی بھی کتابیں لکھی گئیں ان میں بھی سوائے چند کے (بیسویں صدی کی خواتین) کسی اور کا ذکر نہیں ملتا۔ دورِ حاضر میں ادب کی کوئی ایسی تاریخ نہیں ہے جس میں خواتین کی ادبی حیثیت کو عہد بہ عہد تسلیم کیا گیا ہو۔ اردو ادب کی تاریخ پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دور ایسا نہیں گزرا جس میں خواتین نے شاعری نہیں کی یا شعر نہیں کہے۔ تاہم ان میں سے کچھ کا ہی سرسری ذکر تذکروں میں موجود ہے۔ اور زیادہ تر لکھنے والی خواتین کا کام اور نام ریکارڈ پر نہیں ہے۔ فکشن ہی کو لیجیے اس صنف میں خواتین نے انیسویں صدی کے ربع آخر ہی سے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ افسانے اور ناول کے ساتھ ساتھ مضامین اور بچوں کی کہانیاں بھی لکھی گئیں۔ بچوں کا اخبار 'پھول' اور خواتین کے رسالے 'شریف بیبیاں'، 'تہذیب نسواں' اور دیگر نسوانی جرائد

کے اوراق اس بات کی شہادت کے لیے کافی ہیں کہ ہماری زبان میں کیسی اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں والی خواتین موجود تھیں جو اواخر انیسویں صدی میں دھوم مچا رہی تھیں۔ یعنی جن کی شہرت آسمان پر تھی۔ 1898 میں 'تہذیب نسواں' نکلا جس کی ایڈیٹر محمدی بیگم (شمس العلماء مولوی ممتاز علی کی بیگم اور سید امتیاز علی تاج کی والدہ) تھیں۔ محمدی بیگم اپنے وقت کی معروف ادیبہ تھیں۔ انھوں نے تین ناول صفیہ بیگم (1913) 'آجکل' اور 'شریف بیٹی' تصنیف کیے۔ اسی طرح بیگم ممتاز علی ایڈیٹر 'مشیر مادر' لاہور (1905) مسز خاموش ایڈیٹر 'پردہ نشیں' آگرہ (1905) بھی اپنے وقت کی قابل قدر ادیبہ تھیں۔ اکبری بیگم (والدہ افضل علی) اور بنت نذر الباقر (بیگم سجاد حیدر یلدرم اور والدہ قرۃ العین حیدر) بھی انہی اولین ادیباؤں میں شامل تھیں۔ بنت نذر الباقر کا ناول 'اختر النساء بیگم' کتابی صورت میں دار الاشاعت پنجاب لاہور سے 1911 میں شائع ہوا تھا، جبکہ یہ ناول پہلے قسط وار تہذیب نسواں میں شائع ہو چکا تھا اور بے حد مقبول ہوا تھا۔ انھوں نے شروع میں نذر زہرہ بیگم کے نام سے بھی لکھا ہے اور شادی کے بعد نذر سجاد حیدر کے نام سے۔ ایسے اور بھی بہت سے نام ہیں جیسے اکبری بیگم جن کا ناول 'گودڑ کا لال' 1907 میں ہی شائع ہو چکا تھا۔ آبرو بیگم (ہمشیرہ ابوالکلام آزاد)، راحت خاتون (بیگم بدرالدین طیب جی)، زہرا فیضی، نثار فاطمہ اور سید سجاد حیدر یلدرم کی چچازاد بہنیں وغیرہ ایسی خواتین تخلیق کاروں کے بے شمار نام ہیں جو انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے ربع اوّل سے پیش کیے جاسکتے ہیں، جو افسانہ نگار، ناول نگار، مضمون نگار، کہانی کار، شاعرہ اور بچوں کا ادب لکھنے والیوں کی شکل میں ہمارے سامنے موجود تھیں۔ خواتین تخلیق کاروں کے اتنے جگمگاتے روپ ہمارے سامنے موجود ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ادبی تاریخ نگاروں نے انھیں نظر انداز کیا۔

اُردو ناول کی تاریخ ہو یا افسانے کا عہد بہ عہد جائزہ، مضمون نگاری کی صنف کا بیان ہو یا بچوں کے ادب کی تاریخ کا ذکر، دبستان شاعری کا معاملہ ہو یا ادب کی کسی بھی صنف کی تاریخ خواتین کے ذکر سے عام طور پر گریز کا رویہ ہی دیکھنے کو ملتا ہے، جبکہ ڈپٹی نذیر احمد، عبدالحلیم شرر اور مرزا رسوا کے عہد میں بھی خواتین تخلیق کار افسانے اور ناول لکھ رہی تھیں، جس طرح نذیر احمد کے یہاں ناول کے ابتدائی خد و خال تلاش کیے گئے۔ عبدالحلیم شرر اور مرزا رسوا تک ناول ... بیاد کھڑی

کی گئی۔ ہمارے ادبی تاریخ داں کی نظر اس عہد کی خواتین لکھنے والیوں کی طرف کیوں نہیں گئی۔ ان کا ذکر کر کے غیر معیاری قرار دے کر ہی سہی بات ختم کر دیتے تو کم از کم تاریخ میں ان کا ذکر اس صنف کی کاوش کے سلسلے میں تو ہو جاتا لیکن ایسا بھی نہیں ہوا۔ تخلیق کار خواتین کی بات آتی ہے تو اردو ناول اور افسانے کا سفر رشید جہاں اور عصمت چغتائی سے شروع ہوتا ہے اور ان سے قبل کی لکھنے والیوں کا ذکر تک نہیں ہوتا۔

صحافت نسواں کی تاریخ پر نظر دوڑائیں تو ان میں خواتین کے رسائل و جرائد کا ذکر خال خال ہی ملتا ہے۔ اخبارات و رسائل کا سب سے پہلا تذکرہ اختر الدولہ محمد اشرف نقوی نے ''اختر شہنشاہی'' کے نام سے مرتب کیا ہے۔ یہ 1888 میں شائع ہوا اور 1887 تک 1518 مطابع گل دستوں، اخبارات و رسائل کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔ اس میں صرف پانچ خواتین سے متعلق ہیں۔ اس کے بعد مولانا امداد صابری کی پانچ ضخیم جلدوں میں ''تاریخ صحافت اُردو'' ہے۔ اس میں ابتدائے صحافت سے 1930ء تک کے تقریباً ڈھائی ہزار اخبارات و رسائل اور گل دستوں کا تذکرہ ہے لیکن خواتین کے صرف 27 اخبارات و رسائل کا ذکر ہے اور وہ بھی بے حد مختصر اور سرسری سا۔ پاکستان میں ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے ''صحافت پاک و ہند میں'' اور ڈاکٹر طاہر مسعود نے ''اُردو صحافت انیسویں صدی میں'' جیسی بڑی جامع اور وقیع کتاب تصنیف کی لیکن ان دونوں حضرات نے نسوانی اخبارات و رسائل کا تذکرہ کرنے کی زحمت ہی نہیں کی۔ جب صحافت کی تاریخ پر اتنی معرکتہ الآرا کتابوں کا یہ عالم ہے تو دوسری چھوٹی موٹی کتابوں کا ذکر ہی کیا۔ صحافت کی دوسری کتابوں میں بھی خواتین کے اخبارات و رسائل کا ذکر برائے نام کیا گیا ہے۔ جیسے یہ موضوع توجہ کے قابل تھا ہی نہیں۔ تحقیق میں یہ موضوع ''اَن چھوا'' ہی رہا۔ صحافت کی تاریخ لکھنے والے محققین نے ادب کی تاریخ لکھنے والوں کی ہی پیروی کی اور اس اہم موضوع کو جانے ان جانے نظر انداز کر دیا۔ جبکہ اچھے خاصے پڑھے لکھے بلکہ اہلِ علم حضرات بھی صحافت کے باب میں خواتین کے کردار اور کارناموں سے عام طور پر واقف نہیں ہیں۔ ابھی تک صحافت نسواں پر کوئی تحقیقی کام اس نوعیت کا نہیں ہو سکا جو اس تشنگی کو دور کر سکے جس کا احساس اس طرف توجہ کرنے پر بار بار ہوتا ہے۔

ہندوستان میں مطبوعہ اردو صحافت کی ابتدا انیسویں صدی کے نصف اول میں ''جامِ جہاں نما'' (1822) کلکتے سے ہوئی۔ لیکن مجلاتی صحافت کا آغاز ذرا اور دیر سے ہوا۔ مجلاتی صحافت کی ابتدا ماہنامہ 'خیر خواہ ہند' سے ہوئی جو 1837 میں مرزاپور سے ایک پادری آر۔ سی۔ ماتھر نکالتے تھے۔ اس ماہ نامے کی زبان اردو تھی اور اس کا مقصد عیسائیت کی تبلیغ تھا۔ اس میں مضامین اگرچہ اُردو ہی میں ہوتے تھے، لیکن فارسی، رومن اور دیوناگری رسم الخط میں چھاپے جاتے تھے۔ 1857 کی جنگ آزادی کے دوران یہ رسالہ بند ہو گیا اور 1861 میں دوبارہ جاری ہوا۔ گارساں دتاسی اپنے خطبات میں اس کا مقصد اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''رسالہ ''خیر خواہِ ہند'' مرزاپور سے 1837 سے فارسی اور لاطینی حروف میں شائع ہوتا تھا بند ہو گیا۔ یہ رسالہ لندن کی مشنری سوسائٹی کے پادری مارتھر کے زیرِ ادارت تیرہ سال سے جاری تھا۔ یہ صاحب بہت سی مذہبی کتابوں کے مصنف ہیں جو ہندوستانی میں لکھی گئیں اور اُس بائبل کے مرتب ہیں جو ہندوستانی زبان میں رومن خط میں لکھی گئی ہے، جس کی تین ہزار کاپیاں لندن میں شائع ہوئی ہیں اور اُس کے حاشیے پر اصل انجیل ہے۔ صرف امریکن مشنری سوسائٹیوں نے اس اخبار کو چلایا ہے، جیسا کہ میں نے اپنے 1853 کے لیکچر میں بیان کیا تھا، بلکہ ہر فرقے کے پروٹسٹنٹ مشنریوں کے مضامین بھی فراخ دلی سے شائع کیے جاتے تھے۔ اس رسالے کا مقصود تبلیغ مذہب اتنا نہ تھا جتنا کہ دیسیوں میں علم کی اشاعت۔''

مولانا امداد صابری کے بیان کے مطابق اس رسالے میں برطانیہ کے قدیم باشندوں کے حالات اور دُخانی جہاز، ٹائپ اور لیتھو طریقۂ طباعت وغیرہ پر مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس رسالے کے دو مجموعے ''منتخب العلم'' اور ''مفرح القلوب'' کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ اس طرح ادبی و علمی صحافت کا آغاز ''خیر خواہِ ہند'' سے ہوتا ہے۔

اس کے بعد 1845 میں دو پندرہ روزہ رسالے 'قران السعدین' اور 'فوائد الناظرین'

ماسٹر رام چندر کی نگرانی میں نکلے۔ یہ دونوں رسالے علمی اور تعلیمی نوعیت کے تھے اور دہلی کالج نے نکالے تھے۔ یہیں سے 1847 میں 'محبِ ہند' کے نام سے ایک ماہ نامہ رسالہ بھی جاری ہوا جو باتصویر تھا اور جس میں تاریخی، علمی اور سائنسی مضامین کے ساتھ ساتھ ادبی مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ گویا محبِ ہند نے ادبی رسالے کی بنیاد ڈالی اور اس سے ادبی جریدہ نگاری کی ابتدا ہوتی ہے، جس کا سہرا ماسٹر رام چندر کے سر جاتا ہے۔ ماسٹر رام چندر کے بعد دوسرا اہم نام سرسید کا ہے جنھوں نے 'تہذیب الاخلاق' کے ذریعے ادبی جریدہ نگاری کو فروغ دیا۔ اس بامعنی ابتدا کو میر ناصر علی دہلوی، عبدالحلیم شرر اور حسرت موہانی نے فکر انگیز مثبت جہت دی۔ انھوں نے 'صلائے عام'، 'دل گداز' اور 'اردوئے معلی' جیسے رسائل سے ادب کو نہ صرف فروغ دیا بلکہ ذہنی، فکری، تہذیبی اور ادبی رہنمائی کا فریضہ بھی سرانجام دیا۔

انیسویں صدی میں پریس کی آمد کے ساتھ ہی صحافت کی دنیا میں زبردست انقلاب آیا۔ روز نامے، ہفت روزے، پندرہ روزے کے ساتھ ساتھ بے شمار رسائل بھی ملک کے کونے کونے سے نکلنے لگے، جس سے فکر و خیال کی سطح پر علم و ادب کی دنیا میں زبردست تبدیلی رونما ہوئی۔ روز افزوں نئی نئی معلومات سے ذہن و فکر کے دریچے وا ہوئے۔ خزینۂ معلومات کی درآمد سے علم و ادب کی شاخیں پھوٹنے لگیں اور نئے نئے علوم وجود میں آنے لگے جس سے روز مرہ کی انسانی زندگی، سماجی رویے اور سیاسی تقاضے سبھی کچھ بدلنے لگے تو ضرورت محسوس ہوئی کہ نئی آگہی سے اس ملک کی خواتین کو بھی روشناس کرایا جائے تا کہ گھر اور سماج میں عدم توازن پیدا نہ ہو اور ایک متوازن سماج بنا رہے۔ لہٰذا شعور و آگہی کی اس روشنی کو عورتوں تک پہنچانے کا فریضہ پہلے تو مردوں نے ادا کیا۔ لیکن جب کچھ عورتوں کو عصری آگہی کا شعور حاصل ہو گیا تو انھوں نے خواتین کے بیچ بیداری پیدا کرنے کا ذمہ اپنے سر لے لیا۔ پھر بھی مرد انھیں تعاون دیتے رہے۔ گویا اس طرح زنانہ رسائل کی داغ بیل پڑی اور زنانہ صحافت کی ابتدا ہوئی۔

اواخر انیسویں صدی میں تعلیم نسواں کی تحریک کو گھر گھر پہنچانے اور عورتوں میں بیداری پیدا کرنے کے لیے زنانہ رسائل کے اجرا کی ضرورت محسوس کی جانے لگی اور اس میں پہل عیسائی مشنریوں کی طرف سے ہوئی اور 5 مارچ 1884 کو لکھنؤ سے اردو اور ہندی میں پندرہ روزہ 'رفیق

نسواں' اصلاحی اور تبلیغی ضرورتوں کے لیے جاری کیا گیا۔ اسی سال یعنی یکم اگست 1884 میں دہلی سے سید احمد دہلوی نے پندرہ روزہ جریدہ 'اخبار النساء' جاری کیا جسے سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری ان کے حوصلے پست نہیں ہوئے ان سے حوصلہ پاکر دوسرے نسوانی رسائل میدان میں آئے۔ پھر لاہور سے شریف بی بی (1893) حیدرآباد سے معلم نسواں (1894) لاہور سے 'تہذیب نسواں' (1898) لکھنؤ سے 'پردہ عصمت' (1900) دہلی سے 'شمس النہار' (1902) کے بعد دیگرے جاری ہوئے۔

ان سبھی نسوانی رسالوں کا مقصد ایک ہی تھا۔ عورتوں کے اندر دینی اور تعلیمی بیداری پیدا کرنا، جہالت کی تاریکی اور توہم پرستی سے انھیں باہر نکالنا۔ پردے کی بے جا قیود و بند سے اس صنف کو آزادی دلانا۔ شرعی پردہ کی حدود کے اندر تعلیم گاہ جانے کا راستہ ہموار کرنا اور معاشرے کو اس بات کے لیے تیار کرنا کہ وہ عورتوں کی تعلیم کے لیے موثر اور ٹھوس قدم اٹھائے تاکہ گھر اور باہر میں توازن پیدا ہو سکے اور ایک بہتر سماج کی تشکیل کی راہ ہموار ہو سکے۔ لہٰذا تحریک نسواں اور تعلیم نسواں کے حامی زیادہ تر بزرگوں نے رسالے کو موثر ذریعہ بنایا اور تعلیم کی بھرپور وکالت کی۔ معلم نسواں، تہذیب نسواں اور پردۂ عصمت کو ان میں خاص امتیاز حاصل ہے۔ یہ تینوں رسالے انیسویں صدی کے اواخر میں اس وقت منظر شہود پر آئے جب اس تحریک کو ایک طاقتور سہارے کی سخت ضرورت تھی اور ان رسالوں نے مخالفت کے باوجود چند برسوں میں ایسی صحت مند فضا بندی کی کہ تعلیم سے رغبت کی ہوا چل پڑی۔ مسلم سماج میں عورتوں کی تعلیم کے لیے ماحول بہت حد تک سازگار ہو گیا اور پھر یہ سلسلہ سست رفتاری ہی سے سہی چل پڑا۔

شیخ عبداللہ نے بھی اپنی تحریکِ تعلیم نسواں میں جان ڈالنے کے لیے ایک نسوانی رسالہ کے اجرا کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا اور بالآخر جولائی 1904 میں 'خاتون' کے نام سے ایک ماہنامہ رسالہ علی گڑھ سے جاری کیا۔ اس رسالے کے اجرا سے تحریک تعلیم نسواں کے مشن کو کامیابی اور تیزی کے ساتھ آگے بڑھانے میں بے حد مدد ملی جس کے نتیجے میں آخرکار 19 اکتوبر 1906 میں مدرسۂ نسواں علی گڑھ میں قائم ہوا۔

علی گڑھ میں مدرسۂ نسواں کا قیام خواتین میں تعلیم کو عام کرنے کے لیے کئی معنوں میں

مفید ثابت ہوا۔ ایک تو مخالفت کا طوفان تھا۔ دوسرے ان حلقوں کو بڑی حد تک خاموش کر دیا جو خواتین کی تعلیم کے حامی تو تھے لیکن خواتین کے گھروں سے باہر نکل کر تعلیم حاصل کرنے کو مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کا عوام میں اب بھی اثر موجود تھا۔ اور یہ لوگ بیسویں صدی کے آغاز میں بھی تعلیم کے لیے عورتوں کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت دینے پر تیار نہیں تھے۔ لیکن علی گڑھ میں بورڈنگ ہاؤس کے قیام کے ساتھ جب اس مہم کا آغاز ہوا تو مخالف حلقہ اس کی کوئی پرزور مخالفت نہیں کر سکا اور حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے خاموشی اختیار کرنا ہی بہتر سمجھا۔ اس سے لڑکیوں کی تعلیم کی راہ میں حائل ایک بڑی رکاوٹ کے خاتمے میں بڑی حد تک مدد ملی۔

بیسویں صدی کے اوائل عشرہ میں ہی تحریک میں مزید تیزی پیدا کرنے کے لیے ہندوستان کے طول و عرض سے کئی رسائل و جرائد اس مقصد کے تحت نکالے گئے۔ علامہ راشد الخیری نے ماہنامہ 'عصمت' جاری کیا۔ جسے 'تہذیب نسواں' کے بعد خواتین میں بے حد پذیرائی حاصل ہوئی۔ عصمت خواتین کے رسائل میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ان تمام رسائل نے مل کر ہندوستان کے طول و عرض میں نسوانی تعلیم کے پیغام کو گھر گھر پہنچا دیا۔ اس طرح تحریک تعلیم نسواں اور بیداری نسواں کے مشن کو ان بزرگوں کی مساعی جمیلہ سے بے حد فروغ حاصل ہوا۔ انہی جرائد و رسائل کی بدولت بہت سی خواتین علم و ادب سے آراستہ ہو کر طبقۂ نسواں کے اصلاحی مشن میں شامل ہو گئیں اور بہت ہی فعال کردار ادا کیا۔ خواتین قلم کاروں کا ایک بڑا گروہ بھی ذہنی آبیاری کے نتیجے میں زرخیز ذہن اور نئی فکر کے ساتھ میدان عمل میں اپنا کردار ادا کرنے کے لیے متحرک ہو گیا۔ اس طرح مردوں کی رہنمائی میں اٹھنے والی تحریک کی کمان بہت سی خواتین نے مختلف صوبوں میں اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس طرح تحریک کو ایک نئی سمت ملی نیا خون ملا اور قافلہ اپنی منزل کی جانب نئے رنگ و انداز کے ساتھ گامزن ہو گیا۔

انیسویں صدی کے نصف اول سے عورتوں کو خواندہ بنانے اور ان کے اندر بیداری پیدا کرنے کی جو مہم شروع کی گئی تھی وہ رفتہ رفتہ بار آور ہونے لگی اور تحریک بیداریٔ نسواں کا پودا ہندوستان کے مختلف حصوں میں جڑ پکڑنے لگا۔ حمایت اور مخالفت دونوں طرح کی لہریں کام کرتی رہیں۔ انھیں کے بیچ مختلف مذاہب اور سماج کے مختلف طبقوں کے درمیان عورت کے وجود اس کی

تعلیم اور ترقی پر بحث و مباحثہ کا آغاز بھی ہوا جس کے نتیجے میں سماج کے مختلف طبقوں کا ذہن اس طرف متوجہ ہوا۔ پھر انگریزوں کی آمد اور مسیحی تصورات کی تبلیغ نے بھی ہندوستانی سوچ میں تبدیلی پیدا کرنے میں مدد دی۔ نئے علوم و فنون اور شعور نے آگاہی بخشی۔ 1857 کے غدر کے حادثے نے ہندوستانی عوام کی فکر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ تبدیلی اور بیداری ان کی سرشت میں حلول کرنے لگی یہی وہ اہم موڑ ہے جہاں سے گزر کر ہندوستانی عوام نئے خیالات کے ساتھ نئی بنیادوں پر نئے ہندوستان کی تعمیر کرنے کے عزم سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ زندگی کے ہر شعبے میں تبدیلی اور ترقی کے بادل منڈلانے لگے۔ ایسی صورت میں یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ ہندوستانی خواتین کے روز و شب میں تبدیلی نہ آئے، بیداری کی لہر ان تک نہ پہنچے۔ تبدیلیاں آئیں اور خوب خوب آئیں یہاں تک کہ رفتہ رفتہ تحریک کی شکل اختیار کر گئیں۔

اس تحریک کو مزید حرکت و توانائی انگریزوں کی آمد سے ملی جب انگریز عورتیں ہندوستانی عورتوں کے درمیان جا کر تبلیغ کرنے لگیں تو انھیں ہندوستانی عورتوں کے زبردست پچھڑے پن کا احساس ہوا۔ انگریزوں نے ہندوستانی عورتوں کی حالت کو سدھارنے کے لیے 1854 میں حکومت کے ذریعہ اعلان کیا کہ ابتدائی تعلیم لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ اسکول میں حاصل کر سکتی ہیں۔ اس اعلان سے ہندوستانی قوم کچھ حرکت میں آئی۔ زندگی کے تمام شعبوں میں ہو رہی تبدیلیوں نے ان کی آنکھیں کھول دیں۔ وقت کے تقاضے کو دیکھتے ہوئے لوگ اپنی لڑکیوں کو اسکول میں داخل کرانے لگے۔ اس کے ساتھ ساتھ عیسائی مشنریوں نے بھی عورتوں کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ دی گرچہ ان کا مقصد عیسائیت کی تبلیغ تھا۔ لیکن اس سے فائدہ ہی پہنچا۔ ہندو سماج بیدار ہوا۔ آریہ سماج اور برہمو سماج نے باقاعدہ عورتوں کی تعلیم کا مشن چلایا۔ ان کوششوں سے ابتدائی ماحول تیار ہوا جس کے نتیجے میں چند عورتیں بھی مردوں کے شانہ بشانہ تحریک تعلیم نسواں کو عام کرنے کے لیے میدان میں نکل پڑیں۔ ان لوگوں کی کوششوں سے ہندوستان کے مختلف صوبوں میں تعلیم نسواں کی طرف رجحان بڑھنے لگا۔ پھر اس مشن میں مہارانی میسور، مہارانی بڑودہ اور سلطان جہاں بیگم فرمانروائے بھوپال نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان تمام کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ عورتیں تعلیم کی طرف بڑھنے لگیں اور 1883 میں پہلی بار ہندوستانی عورت گریجویٹ ہوئی اور 1893 میں پہلی بار

ہندوستانی عورت ڈاکٹری پڑھنے کے لیے آکسفورڈ گئی۔

ملک میں تیزی سے ہو رہی تبدیلی کا اثر مسلم سماج پر ہونا لازمی تھا۔ لہٰذا عورتوں کو خواندہ بنانے کی مہم کا آغاز بھی اسی بیچ ہو چکا تھا۔ سرسید اور ان کے رفقا اس میدان میں پورے طور پر سرگرم ہو گئے تھے۔ اصلاح نسواں اور تعلیم نسواں کا کارواں نا مساعد حالات کے باوجود موجوں کے تھپیڑے کھانے اور حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے میدان عمل میں عزم و استحکام کے ساتھ اپنے قدم ڈال چکا تھا۔ تحریک کی شمع کو آندھیوں میں بھی جلائے رکھنے والے متوالوں کا یہ قافلہ اپنی کوششوں میں ایسا جٹا کہ آندھیوں نے اپنا رخ موڑ لیا اور یہ لوگ کامیابیوں کی طرف بڑھتے گئے۔

انیسویں صدی کے آخر آخر تک یہ تحریک ایک پرزور تحریک میں تبدیل ہو گئی۔ اور اس آواز کو گھر گھر پہنچانے کے لیے ہندوستان کے طول و عرض سے زنانہ رسائل کے اجرا کی ضرورت شدت سے محسوس کی جانے لگی۔ انیسویں صدی کے نصف اول میں شروع ہوئی یہ تحریک انیسویں صدی کے ربع اول تک پرزور آواز بن کر ابھری اور سماج کے تمام طبقے اور مذاہب میں اس کا مختلف انداز میں خیر مقدم کیا جانے لگا۔ مسلمانوں نے بھی سرسید کی سربراہی میں اس مشن کی ابتدا کی یہ الگ بات ہے کہ حیات سرسید میں اس پر خاطر خواہ فضا تیار نہ ہو سکی۔ سرسید پہلے مسلمان لڑکوں کی تعلیم کے نظام کو استحکام بخشنا چاہتے تھے جو ابھی بھی مخالفین کے شدید نشانے پر تھا۔ لہٰذا سرسید نے اپنی حیات میں لڑکیوں کی تعلیم کے حق میں فضا تو سازگار بنا دی اور ایک پوری ٹیم بھی اپنے رفقا کی تیار کر دی تھی، جو اس مشن کو آگے بڑھانے کے لیے سرسید کی زندگی میں ہی متحرک ہو گئے تھے۔ بھلے ہی انھیں کامیابی ایک مدت کے بعد ہی ملی اور گہوارۂ سرسید میں شیخ عبداللہ اور ان کی بیگم کی کوششوں کے نتیجے میں لڑکیوں کی تعلیم کا یہ شجر لگایا گیا اور ثمر بار بھی ہوا۔

مسلمانوں میں تعلیمی مشن کو آگے بڑھانے اور خواتین کو خواندہ بنانے کے لیے خاص طور پر زنانہ رسائل کے اجرا کی ضرورت پیش آئی اور انیسویں صدی کے نصف آخر سے نسوانی رسائل کا سلسلہ شروع ہوا اور ربع آخر میں اس سمت میں مزید تیزی آئی۔ ابتدائی رسالوں کو ہم مکمل طور پر زنانہ رسائل کی فہرست میں تو شامل نہیں کر سکتے ہیں چونکہ یہ ابتدائی نقوش ہیں لہٰذا ان کی

اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ تعلیم نسواں کی اہمیت وافادیت کو اجاگر کرنے اور تشہیر واشاعت کے لے ان رسائل سے مدد لی گئی اس وقت کے لحاظ سے یہی خدمت بہت بڑی تھی اور اس سے نسوانی تعلیم کے مشن کو فروغ دینے اور ماحول کو سازگار بنانے میں کافی مدد ملی۔ لہٰذا ان کی خدمات اندھیرے میں دیا روشن کرنے جیسی ہے جس کو فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ یہ ابتدائی نقوش ہیں اور ان کا تذکرہ تاریخی تواتر کے لیے ضروری ہے۔ یہاں چند ایسے اخبار ورسائل کا تذکرہ اسی ضمن میں کیا جا رہا ہے۔ یہ نقش اول کی حیثیت رکھتے ہیں۔

### ''مفید عام'' آگرہ (1869):

'مفید عام' ایک پندرہ روزہ اخبار تھا جو آگرہ کے محلہ حکیماں سے 1869 میں جاری ہوا۔ اس کے مالک منشی احمد خاں صوفی [1] مہتمم وزیر خاں اور پرنٹر قادر علی خاں تھے۔ یہ اخبار مفید عام پریس آگرہ میں چھپتا تھا۔ اس اخبار میں خبروں کے ساتھ ساتھ علمی وادبی مضامین اور نامور شعرا کا کلام شائع ہوتا تھا۔ تعلیمی خبروں کے ساتھ ساتھ تعلیم نسواں سے متعلق معلومات بھی ہوتی تھیں اور مدارس نسواں کے لیے اچھے عمدہ عمدہ مضامین لکھے جاتے تھے [2] اختر شہنشاہی میں ہے۔

> ''اس اخبار میں اشاعت علوم واقوال حکمائے فلاسفر اور تواریخ اور سر رشتۂ تعلیم اور مدارس دختراں کے واسطے بہت عمدہ عمدہ مطالب ومضامین مفید عام لکھے جاتے ہیں۔ جس سے فی الواقع یہ اخبار اسم بامسمیٰ ہو رہا ہے۔ آگرہ محلہ حکیماں آٹھ ورق اوسط پندرہ روزہ۔ سالانہ 8 آنہ مالک احمد خاں صوفی، مہتمم وزیر خاں، پرنٹر قادر علی خاں از مطبع مفید عام اجرا 1869۔''[3]

گارسان دتاسی نے اپنے آخری خطبے میں اس اخبار کے بارے میں یوں اظہار خیال کیا ہے۔ اس کے مطابق:۔

> ''یہ جدید اُردو اخبار مہینے میں دو دفعہ نکلتا ہے۔ 20 صفحات پر مشتمل ہوتا ہے اور ہر صفحے پر دو کالم ہوتے ہیں۔ اس کی تقطیع چھوٹی فولیو ہے۔

مسٹر کیمپسن ناظم تعلیمات صوبہ ہائے شمال و مغربی نے جو نمبر نمونتاً میرے پاس بھیجا ہے اس اشاعت میں صوبہ ہائے شمالی و مغربی تعلیمی رپورٹ، تعلیم نسواں، کلکتہ یونیورسٹی، میسور اور جے پور کی تعلیمی حالت، مختلف اقسام کی زمینوں کے لحاظ سے ہندوستان کی زرعی پیداوار، قدیم فلاسفر اور مورخین کی تالیفیں، ناصرالدین سبکتگین اور ان کے بیٹے محمود غزنوی کے حالات، مہر، ذوق، گویا اور وزیر کے دیوانوں کے انتخاب اور اسی قسم کے دوسرے موضوعوں پر مضامین درج ہیں۔''[4]

اس سے زیادہ معلومات اس اخبار کے بارے میں کہیں درج نہیں ہے۔ اختر شہنشاہی اور دتاسی کے بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ''تعلیم نسواں'' پر اس کی خصوصی توجہ تھی۔

## ''معلم'' حیدرآباد دکن (1881):

'معلم' علمی و ادبی رسالہ تھا۔ یہ رسالہ 1881 میں حیدرآباد سے جاری ہوا۔ اس کے ایڈیٹر مولوی محب حسین تھے۔ میر احمد الدین خاں اپنی حالیہ تصنیف ''عہد عثمانی میں اُردو خدمات'' میں اس رسالے کے ظہور کی بابت رقم طراز ہیں:

''رسالہ معلم'' 1881 میں زیرادارت مولوی محب حسین شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ اس کے کچھ عرصے بعد اس رسالے کا نام ''معلم نسواں'' رکھا گیا۔'' ص:107

یہ کوئی نسوانی رسالہ نہیں تھا۔ بلکہ خالصتاً علمی و ادبی رسالہ تھا جس میں فلسفہ، اخلاق، سائنس، طب، تاریخ اور ادب پر مضامین شامل ہوتے تھے۔ لیکن اس رسالے کا کارنامہ صرف اتنا ہے کہ اس رسالے نے ایسے وقت میں جبکہ مسلمان قوم لڑکیوں کی تعلیم کی طرف متوجہ نہیں ہوئی تھی اپنے صفحات میں اس موضوع پر بطور خاص توجہ دی۔ طبقۂ نسواں کی اصلاح، ان کی تعلیم اور حقوق نسواں پر مضامین شائع کیے۔ اس لحاظ سے یہ پہلا رسالہ ہے جس نے طبقۂ نسواں کے لیے عملی قدم اٹھایا اور طبقۂ نسواں کی بہبود اور تعلیم نسواں کو اپنے مقاصد میں شامل کیا اور اس کے لیے فضا سازگار

بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

معلم میں تعلیم نسواں، حقوق نسواں اور پردے پر مضامین شامل ہوتے تھے۔ اخبار نسواں کے عنوان سے خواتین کی خبریں دی جاتی تھیں۔ اس میں زیادہ تر مضامین، نظمیں اور غزلیں وغیرہ خود مولوی محبّ حسین ہی کے ہوا کرتے تھے۔ انھیں شروع سے ہی طبقہ نسواں سے ہمدردی رہی ہے اور وہ ان کی حالت زار کو بہتر بنانے کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔ قلمی اور عملی اقدام اس بات کے گواہ ہیں۔ انھوں نے ایک 'مسدس نسواں' لکھی تھی جو معلم میں شائع ہوئی تھی مسدس نے اس زمانے میں بہت دھوم مچائی۔ اس مسدس میں انھوں نے عورتوں کی جملہ خصوصیات تاریخی حقائق کی روشنی میں بیان کی ہیں اور عورت کو موجودہ دور میں اپنی قدر و قیمت پہچاننے سماج میں اپنا وقار بحال کرنے اور معاشرے میں اپنی مساوی حیثیت بنانے، غلط رسم و رواج سے گریز کرنے کی ترغیب دلائی ہے۔ اس مسدس سے محبّ حسین کے اس پر خلوص جذبے کا اظہار ہوتا ہے جو خواتین کی تعلیم و ترقی کے تئیں ان کے دل میں موجزن تھا۔

## ''رفیق نسواں''، لکھنؤ (1884):

اس اخبار سے متعلق جو اطلاع اب تک منقول ہوتی آئی ہے وہ یہ ہے:

''یہ پرچہ قوی عیسائیاں مسمّی بہ 'رفیق نسواں' بہ زبان اردو ہندی لکھنؤ میں اور بہ زبان بنگالی کلکتہ میں اور بہ زبان تامل مدراس میں دو ہفتہ کے یوم دوشنبہ کو مخصوص عیسائی عورتوں کے لیے چھ ورق اوسط پر شائع ہوتا ہے۔ غربا کے لیے مفت۔ نذر شائقین کو ایک پیسہ فی پرچہ علاوہ محصول ڈاک کے دینا ہوگا۔

جملہ خط و کتابت متعلق اخبار ہذا بنام مسز بیڈلی اور قیمت و محصول اخبار ہذا بنام ایجنٹ امریکن مشن پریس لکھنؤ روانہ کرنا چاہیے۔

اس اخبار کو مطبع میتھوڈسٹ ایپسکوپل چرچ پریس 5/مارچ 1884 کو پادری کریون صاحب نے جاری کیا۔ پریس مین فتح محمد۔''[5]

اسی بیان کو کچھ ردو بدل کے ساتھ اپنی زبان میں امداد صابری نے بھی نقل کر دیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

''لکھنؤ سے پندرہ روزہ اردو ہندی میں کلکتہ سے بنگالی اور مدراس سے تامل زبانوں میں 5 / مارچ 1884 سے نکلنا شروع ہوا۔ یہ پرچہ عیسائی مشنریوں کی طرف سے عورتوں کے لیے جاری کیا گیا تھا۔ بارہ صفحات پر نکلتا تھا۔ بانی پادری کریون صاحب تھے۔ غربا کو مفت دیا جاتا تھا اور عام آدمیوں سے ایک پیسہ فی پرچہ لیا جاتا تھا۔''[6]

اس کے علاوہ اس اخبار سے متعلق کسی طرح کی اور کوئی معلومات کہیں نہیں ملتی۔ 'صرف اردو' کے لفظ پر غور کیا جائے تو سب نے 'پندرہ روزہ اردو ہندی میں لکھنؤ' کو ہی اوّلیت دی ہے۔ یعنی یہ معاملہ یہاں بھی بالکل واضح ہے کہ پہلے اردو میں ہی نکلا بعد میں دوسری زبانوں میں۔

یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ یہ اخبار عیسائی مشنری کی جانب سے جاری کیا گیا تھا اور عورتوں کے لیے مخصوص تھا۔ اب تک کا یہ پہلا اخبار ہے جو عورتوں کے لیے مخصوص تھا۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ عورتوں کی اصلاح و تربیت کے لیے جو تحریک پچھلے چند برسوں سے چلائی جا رہی تھی وہ محض پچیس تیس سالوں میں اس حد تک ثمر بار ہوتی ہوئی نظر آ رہی ہے کہ نوے کے دہے میں آتے آتے ادب و صحافت میں عورتوں کی شرکت کو یقینی بنانے کے لیے علاحدہ اخبار و رسائل کی ضرورت محسوس کی گئی۔ جس کا جیتا جاگتا ثبوت 'رفیق نسواں' ہے۔ اس رسالے کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کی ایڈیٹر مسز ہیڈلی اپنے اداریے میں یوں رقم طراز ہیں۔

'' آپ لوگوں کی خدمت میں جو پڑھ سکتی ہیں یہ گزارش ہے کہ آپ اس پرچے کا کوئی مضمون اپنے گھر میں ان کو جو پڑھ نہیں سکتیں ہر روز سنایا کیجیے۔ میں اس پرچے میں ان باتوں کا بیان کروں گی جو عجیب و غریب اور صحیح و درست ہیں۔ میری یہ تمنا ہے کہ آپ اس دنیا میں بہت خوشی سے بسر کریں اور میں اس طریقے کو جس سے آپ بآرام تمام رہنے کی اوروں

کو امداد دیں درج پرچہ ہذا کروں گی میں اپنی بہنوں سے وہ امر بھی جو
امورات خانگی کے لیے ضرور اور تعلیم اولاد سے متعلق ہے بیان کروں گی
مگر آپ اس کا اقرار کیجیے کہ ہر روز مضمون اخبار ہذا اوروں کے سامنے جو
پڑھ نہیں سکتیں سنایا کیجیے گا۔''

اس کے مقاصد کے پیش نظر یہ بات اور واضح ہوجاتی ہے کہ یہ صحیح معنوں میں پہلا اخبار تھا جو عورتوں کی اصلاح وتربیت کے لیے نکالا گیا حالانکہ اس کا مقصد اس کے پس پردہ عیسائی مذہب کی تبلیغ تھا۔ اس اخبار میں سبق آموز با تصویر کہانیاں، سائنسی و تاریخی مضامین، غزلیں امور خانہ داری سے متعلق معلومات، تربیت اطفال و مادراں سے متعلق ہدایات وخبریں شائع ہوتی تھیں۔ رفیق نسواں میں سارے مضامین اصلاحی ہوتے تھے۔ یہ اخبار خواتین کے لیے بہت مفید تھا۔ ان کی اصلاح وتربیت کے فریضے کو بخوبی انجام دے رہا تھا۔

### ''اخبار النساء'' دہلی (1884):

'اخبار النساء' یکم اگست 1884 کو ترکمان دروازہ دہلی، حویلی نواب ظفر خاں سے جاری ہوا۔ یہ دس روزہ اخبار آٹھ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس کے مالک اور ایڈیٹر مولوی سید احمد دہلوی[7] مؤلف فرہنگ آصفیہ، مدرس فارسی، ضلع اسکول تھے۔ مولوی سید احمد دہلوی کا شمار ان اولین مصلحین میں ہوتا ہے جنھوں نے عورتوں کی تعلیمی اور سماجی ترقی میں گہری دلچسپی لی اور اس مقصد کے حصول کے لیے باضابطہ عورتوں کا اخبار جاری کیا۔ سالانہ چندہ چھ روپے تھا اور مطبع ارمغان دہلی میں طبع ہوتا تھا۔ سید احمد دہلوی کا تبادلہ جب شملہ ہوگیا تو وہ وہیں سے اخبار مرتب کرنے لگے۔

یہ برصغیر میں صحافت نسواں کا اولین علم بردار اخبار تھا۔ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے خاص عورتوں کی اصلاح وتربیت کے لیے نکالا گیا تھا۔ اس پر یہ اعلان چھپتا تھا۔

''یہ پہلا اخبار ہندوستان میں عورتوں کو فائدہ پہنچانے والا ہے اور طالب علموں کو۔''[8]

اس اخبار کو خواتین کا پہلا با قاعدہ اخبار شمار کرنا چاہیے۔ اگر چہ اس سے قبل 'مفید عام' آگرہ اور 'رفیق نسواں' لکھنؤ سے نکل چکا تھا۔ 'مفید عام' میں اکا دکا مضامین اور تعلیم نسواں کی خبریں شائع ہوتی تھیں۔ 'رفیق نسواں' عیسائی عورتوں کے لیے مخصوص تھا اور اس کا مقصد عیسائی مذہب کی تبلیغ و اشاعت تھا۔ لیکن 'اخبار النساء' مکمل طور پر عورتوں کی اصلاح کے لیے مخصوص تھا۔ پھر پہلی مرتبہ خواتین کے مضامین اسی اخبار کے ذریعے منظر عام پر آئے۔ [9]

اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ پہلا اخبار ہے جو صحیح معنوں میں طبقۂ نسواں کا نمائندہ تھا۔ اس کے ذریعے اردو زبان میں خواتین اہل قلم کی نگارشات منظر عام پر آئیں۔ ایسے دور میں جبکہ مردوں کی جدید تعلیم کی ہر طرف مخالفت ہو رہی تھی۔ عورتوں کو تعلیمی میدان میں لانا پہاڑ کاٹنے کے مترادف تھا۔ سید احمد دہلوی کے اس جرأت مندانہ اقدام کی جتنی بھی ستائش کی جائے کم ہے۔

تعلیم نسواں کی اہمیت و افادیت کے ساتھ ساتھ امور خانہ داری پر مضامین ہوتے تھے، جس میں خاص زور عورتوں کی تعلیم پر ہوتا تھا اور مختلف زاویے سے اس پر مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس دور میں 'اخبار النساء' ایک نئی روشنی لے کر آیا۔ اس رسالے نے مشرقی تہذیب کی حفاظت کے ساتھ ساتھ قدامت پرستی، جہالت اور کم علمی کے اندھیروں کو دور کرنے میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ مولانا امداد صابری نے لکھا ہے کہ 'اس میں عورتوں کے مضامین بھی ہوتے تھے اور انھیں تلقین کی جاتی تھی کہ وہ حیا اور شرافت کا دامن نہ چھوڑیں اور خانگی جھگڑوں سے بچیں۔'' اس میں عورتوں کے مضامین کا ہونا حلقۂ نسواں میں بیداری کی لہر کے پیدا ہونے کی علامت تھا۔ معاشرے کی تہذیبی بنیادوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے، پردے کے قیود و بند میں رہ کر عورتوں کی اخلاقی تربیت خود اس صنف کے ذریعے ہونا بڑی بات تھی۔ اور اس سے بھی بڑی بات یہ تھی کہ چند عورتوں نے اس مشکل ترین دور میں عورتوں کی تربیت اور ان کی بہتر خانگی زندگی کے لیے آواز اٹھائی۔ گویا معاشرے میں تبدیلی کا صور پھونکا۔ اس رسالے میں دلّی کی زبان کو صحت اور صفائی کے ساتھ پیش کیا جاتا تھا اور یہ سید احمد دہلوی کے منفرد اسلوب کا آئینہ دار تھا۔ 'اخبار النساء' چونکہ عورتوں کا پہلا ادبی رسالہ تھا اس لیے اس پر پھبتیاں بھی کسی جاتی تھیں۔ مولانا رازق الخیری

نے لکھا ہے کہ 'اخبار النساء' کو اخباروں کی جورو' کہا جاتا تھا۔ لیکن مولوی سید احمد دہلوی اس کا برا نہیں مانتے تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ صحرا میں پھول کھلانا کتنا مشکل کام ہے۔ وہ اس وقت کے معاشرے کے نباض تھے۔ جب اس وقت کا معاشرہ عورتوں کی تعلیم کا مخالف تھا تو وہ ان کے اندر تعلیمی بیداری پیدا کرنے والی کسی تحریک کی حمایت کیسے کر سکتا تھا۔ لہٰذا یہ فطری ردعمل تھا جو اس رسالے پر ہو رہا تھا۔ سید احمد دہلوی خاموشی سے اپنا کام کرتے رہے یعنی خاتون خانہ میں علم کی روشنی کو پھیلانے اور اسے عام کرنے کا کام۔ انھیں معلوم تھا کہ یہی دھیمی لو آگے جوالا بنے گی اور ہر گھر میں علم کی روشنی کا دیا جل اٹھے گا۔ سلسلہ بنائے رکھنے کی ضرورت ہے۔

## ''شریف بیبیاں' لاہور (1893):

جس طرح 'اخبار النساء' کو خواتین کا پہلا اخبار ہونے کا شرف حاصل ہے اسی طرح 'شریف بیبیاں' کو اردو کی نسوانی صحافت میں پہلا رسالہ ہونے کا فخر حاصل ہے۔ یہ ایک ماہنامہ رسالہ تھا جو 1893 میں لاہور سے جاری ہوا۔ اس کے مدیر پیسہ اخبار کے ایڈیٹر منشی محبوب عالم (15B) تھے۔ منشی محبوب عالم کو شروع سے ہی تعلیم نسواں سے دلچسپی رہی ہے۔ طبقۂ اناث میں بیداری لانے کے لیے انھوں نے یہ رسالہ نکالا۔ منشی دین محمد فوق رقم طراز ہیں:

> ''تعلیم نسواں کا آپ (منشی محبوب عالم) کو ابتدا ہی سے خیال ہے۔ اپنے خیال کو آپ نے عملی صورت میں ظاہر کرنے کے لیے ایک ماہوار رسالہ بنام 'شریف بیبیاں' لاہور سے جاری کیا۔ جو ہندوستان میں مستورات کی بہتری اور ان میں تعلیم کی اشاعت کے لیے سب سے پہلا رسالہ تھا۔'' [10]

یہ رسالہ 16/20x30 کے سائز پر ہوتا تھا۔ ضخامت 42 صفحات تھی، سالانہ چندہ تین روپے تھا۔ خادم التعلیم پریس لاہور سے شائع ہوتا تھا۔ اس رسالے کے سرورق پر سورۃ النساء کی یہ آیت درج ہوتی تھی:

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ

اس کے بعد نام کی تختی کے نیچے یہ عبارت درج ہوتی تھی۔

''تعلیم نسواں کا ماہوار رسالہ جس میں سعادت مند لائق بیٹی، سلیقہ شعار، نیک بخت بی بی اور مہربان عقل مند ماں بننے کی ہدایات درج ہوتی ہیں۔''

پہلا شمارہ ستمبر 1893 کا ہے۔ اس شمارے میں مدیر نے رسالے کے مقاصد بھی بیان کیے ہیں لکھتے ہیں:

''رسالہ شریف بیبیاں جاری کرنے سے غرض یہ ہے کہ ہندوستان کی لاکھوں بے زبان مخلوقات (فرقۂ نسواں) کی خانہ داری کی تعلیم سے متعلق ایسے امور اس میں درج کیے جایا کریں جس میں نہ صرف ہر ایک گھرانہ بہشت کا نمونہ بن جاوے بلکہ آئندہ نسل کے اٹھان میں بھی اس سے مدد ملے۔ یہ ہے ہمارا ارادہ اب خداوند کریم سے دعا ہے کہ اسے استقلال و استحکام بخشے۔ آمین!''[11]

مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے مستورات کے لیے اصلاحی و تربیتی مضامین سہل اور آسان زبان میں پیش کیے جاتے تھے۔ تعلیم نسواں اور ترقی نسواں پر مضامین تو ہوتے ہی تھے اس کے علاوہ معاشرتی و اصلاحی ناول اور ادبی و تاریخی مضامین بھی شائع کیے جاتے تھے۔ اس رسالے کے مستقل عنوانات یہ تھے۔ ممتاز عورتیں، شریف بیبیاں، زنانہ بہادری کی مثالیں، روئے زمین کی عورتیں، انتظام خانہ داری، دسترخوان، تربیت اطفال۔ اس کے علاوہ معاشرتی و اصلاحی مضامین بھی ہوتے تھے۔

''ممتاز عورتیں'' کے مستقل عنوان کے ذریعہ مستورات کو دنیا کی مشہور و ممتاز خواتین کے حالات و واقعات سے روشناس کرایا جاتا تھا۔ اور کوشش یہ کی جاتی کہ متعارف کرائی جانے والی خاتون مسلمان ہوں تاکہ طبقۂ نسواں پر اس کا براہ راست اثر مرتب ہو سکے۔ تعارف کرانے کا انداز بے حد جذباتی ہوتا تھا جو خواتین کو بہت متاثر کرتا تھا۔ اس کے تحت ممتاز محل، ارجمند بانو،

فلورنس نائٹ اینگل اور رانی کرنا تھ وغیرہ پر مضامین ملتے ہیں۔ اسی طرح 'روئے زمین کی عورتیں' کے مستقل عنوان کے تحت دنیا کے مختلف ممالک کی عورتوں کے حالات، طرز زندگی اور طرز معاشرت سے متعلق مفید معلومات فراہم کی جاتی تھیں۔ جیسے افریقہ کی عورتیں، مصر کی عورتیں، ملک چین کی عورتیں، ملک ڈیہوی کی عورتیں وغیرہ۔

ایک مستقل عنوان 'زنانہ بہادری کی مثالیں' بھی تھا۔ اس عنوان کے تحت مختلف ممالک کی بہادر عورتوں کے کارنامے اجاگر کیے جاتے تھے تاکہ عورتیں ان سے سبق حاصل کرسکیں اور ان کی قوت اعتماد میں بھی اضافہ ہو سکے۔ اس عنوان کے تحت ''آسٹریلیا کی عورت کی سچی بہادری'' اور ''ایک غیرت مند افغان عورت'' ستمبر اکتوبر 1893 میں شائع ہوا۔

رسالے کے مدیر منشی محبوب عالم کے مضامین ایک مستقل کالم'' شریف بیبیاں'' کے تحت ہوتے تھے جو زیادہ تر تعلیم نسواں سے متعلق ہوا کرتے تھے۔ مثلاً ''تعلیم نسواں کیسی ہونی چاہیے؟'' ''مذہب اسلام میں عورتوں کا سوشل رتبہ'' وغیرہ شائع ہوا۔ یہ کالم صفحہ نمبر دو پر شائع ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ تربیت اولاد، بچوں کی صحت اور ان کے رکھ رکھاؤ سے متعلق عمدہ مضامین دیے جاتے تھے۔ انتظام خانہ داری اور دسترخوان میں گھر کی صفائی، آرائش و زیبائش سینا پرونا، کشیدہ کاری اور مختلف نوع کے کھانے پکانے کی ترکیبیں بیان کی جاتی تھیں۔ خواتین کا لباس اور عورتوں کے توہمات پر بھی مضامین ہوا کرتے تھے۔

آخر میں'' رائیں اور خبریں'' ایک مستقل عنوان ہوا کرتا تھا اس میں زیادہ تر تعلیمی خبریں درج کی جاتی تھیں۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ شریف بیبیاں کلیتاً خواتین سے متعلق جملہ معلومات پر مشتمل ایک مکمل زنانہ رسالہ تھا پہلی بار اس وقت نظر سے خواتین کے مسائل کا احاطہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ منشی محبوب عالم چونکہ ہندوستان کی مسلم خواتین کی زبوں حالی سے باخبر تھے۔ ان کی اس حالت پر انھیں بے حد افسوس تھا۔ لہٰذا وہ اس طبقے کو اس کی اس زبوں حالی سے نکال کر سماجی سطح پر اوپر اٹھانا چاہتے تھے۔ اس لیے ان کی اصلاح، دل جوئی اور ان کی تربیت کے مشکل مرحلے کو انھوں نے مقصد زندگی بنایا اور 'بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق' اور واقعی جذبۂ صادق سے

اصلاح اور ترقی کا وہ صور پھونکا کہ دبی کچلی نسوانی دنیا میں حرارت و توانائی کی لہر دوڑ گئی اور عورتوں میں بیداری اور جاگرتی پیدا ہونے لگی اور دھیرے دھیرے خواتین اصلاح کی راہ پر چل پڑیں۔ تہذیب و شائستگی کے ساتھ اسلامی روایات کا احترام کرتے ہوئے اور اعتدال پسند رویہ اپناتے ہوئے۔ لہٰذا اس میں کامیابی یقینی تھی اور محبوب عالم اپنے مقصد میں اپنے رسالے کے ذریعے کامیاب بھی ہوئے اور لکھنے والی خواتین کا ایک بڑا گروہ تیار ہو گیا جس نے خواتین کی اصلاح کی ذمہ داری قبول کی۔ اس رسالے میں بنت سید نذر الباقر، مسز عبدالقادر، اہلیہ بابو علی احمد، مس جے سی فلیچر، بیگم عبدالستار نے خواتین کے موضوعات پر مضامین لکھے۔ یہ اپنے وقت کی نامور خواتین تھیں۔ اس سے یہ اندازہ تو لگایا ہی جا سکتا ہے کہ اس میدان میں عورتوں کے قدم آگے بڑھنے لگے تھے جس نے آگے چل کر ایک تحریک کی صورت اختیار کی۔

### ’’معلم نسواں‘‘ حیدرآباد دکن (1894):

دہلی اور لاہور کے بعد اس سلسلے کی تیسری کوشش جنوبی ہند کے علمی و ادبی و تہذیبی مرکز حیدرآباد سے ہوئی۔ یوں تو حیدرآباد دکن میں اردو صحافت کی ابتدا ایک طبی سہ ماہی رسالہ ’طبابت‘ سے ہوتی ہے افضل الدین اقبال نے اپنی کتاب ’جنوبی ہند کی اردو صحافت‘ میں اس بات کی نشاندہی کی ہے اور ’طبابت‘ کو ہی اول رسالہ قرار دیا ہے۔ رسالہ ’طبابت‘ کے اجرا کے بعد ہی دینی، ادبی، معاشرتی رسائل و جرائد کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا اور خواتین کے لیے سب سے پہلے رسالہ ’معلم نسواں‘ شائع ہوا۔ جسے محب حسین نے جاری کیا تھا۔

محب حسین اس سے قبل مجلاتی صحافت کی دنیا میں ماہوار رسالہ ’معلم‘ کے ذریعے 1881 میں ہی قدم رکھ چکے تھے اور تقریباً تیرہ برس تک معلم پابندی سے نکالنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ قوم کے مردوں سے زیادہ خواتین میں علمی بیداری پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ معلم کے ذریعے اگر چہ وہ اس کام کو بھی کسی حد تک انجام دے رہے تھے لیکن وہ شاید کام کی ضرورت اور اہمیت کو دیکھتے ہوئے اس سے مکمل طور پر مطمئن نہیں تھے۔ لہٰذا وہ خواتین کی اصلاح اور تعمیر و ترقی کے لیے تعلیم کو بنیادی ستون مانتے ہوئے طبقۂ اناث میں تعلیمی بیداری کے مشن کو زور و شور کے

ساتھ آگے بڑھانا چاہتے تھے جس کے لیے ایک ایسے رسالے کی ضرورت تھی جو مکمل طور پر نسوانی رسالہ ہو اور عورتوں کی ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس میں ایسے مضامین شائع کیے جائیں جس سے ان کی مکمل اصلاح ہو سکے اور ان کا ذہن و شعور بیدار ہو سکے۔ اس خیال کے پیش نظر انھوں نے 'معلم' کو بند کرنے کا فیصلہ کیا یا یوں کہیے کہ 'معلم' کی حیثیت تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا اور 'معلم' ہی کو جلد 8 شمارہ 9 بابت ماہ جمادی الثانی 1312ھ مطابق نومبر، 1894ء سے ''معلم نسواں'' کا نام دے دیا۔ چنانچہ سرورق پر 'معلم' کے نیچے نسواں کا لفظ خفی قلم سے لکھ دیا گیا اور ساتھ ہی ساتھ یہ عبارت بھی درج کر دی گئی۔

> ''اس رسالے کی غایت ترقی نسواں ہے اور اس میں فقط عورتوں ہی کی حالت سے بحث کی جاتی ہے۔''

اس رسالے کے مقاصد میں سب سے بڑا مقصد ان کے نزدیک یہی تھا جس کے لیے انھوں نے یہ رسالہ جاری کیا۔

رسالے کی ضخامت 64 صفحات تھی اور سالانہ چندہ عام خریداروں سے چار روپے اور عورتوں سے دو روپے لیا جاتا تھا۔ اس رسالے کا موضوع عورت تھی۔ یعنی ہر پہلو و جوانب سے اس پر بحث کرنا۔ علاوہ ان مضامین کے جو عورتوں سے متعلق ہوں گے، وقتاً فوقتاً علوم جدیدہ، تاریخی اور علمی مضامین بھی شائع کیے جاتے تھے۔ گویا اس رسالے میں صرف خواتین کے مسائل پر مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس رسالے کو حیدرآباد میں تحریک نسواں کا اولین نقیب و ترجمان ہونے کا شرف حاصل ہے۔

اس رسالے کے تمام مضامین عورتوں کی فلاح و بہبود، تعلیم نسواں، پرورش اطفال اور مختلف ممالک کی خواتین کے حالات سے متعلق ہوتے تھے۔ پہلے شمارے کے زیادہ تر مضامین خود مولوی محب حسین ہی کے تحریر کردہ ہیں۔ لیکن آگے چل کر اور دوسرے لکھنے والے اور والیوں کے مضامین بھی کثرت سے شائع ہونے لگے۔ بلکہ خاتون لکھنے والیوں کی شرکت اجرا کے دو سال بعد ممکن ہو سکی اور پہلے پہل جن خواتین کی شرکت ہوئی ان میں بیگم صاحبہ نواب مختار یار جنگ افسر فوج اور احمدی بیگم کا نام شامل ہے۔ اس کے بعد دن بدن لکھنے والی خواتین کا اضافہ ہونے لگا۔ یہاں یہ

بات قابلِ غور ہے کہ پہلے پہل منشی محبوب عالم ایڈیٹر "پیسہ اخبار" نے 1895 میں اپنے اخبار کا ایک پرچہ خواتین کے تحریر کردہ مضامین سے مزین شائع کیا تھا۔ اس کے چند سال بعد ہی مولوی محبِ حسین دوسرے فرد ہیں جنھوں نے خواتین کی طرف توجہ مرکوز کی۔ ان کے مضامین کو اپنے رسالے میں جگہ دی۔ ان میں لکھنے پڑھنے کی تحریک پیدا کی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ صرف چند سال بعد یعنی 1899 (جلد 12، شمارہ 9) کے شمارے میں علاوہ چار مضامین کے تمام مضامین مستورات کے ہیں۔ فہرست یہ ہے۔

کنوار پن (احمدی جان) اولاد کو شائستہ بنانا (پرونتی) بچوں کو زیور پہنانا (سیدہ بیگم) لڑکیوں کو تعلیم کی ضرورت (معلمہ وکٹوریہ گرل اسکول لاہور) ہماری حالت موجودہ (محمدی بیگم مدیر رسالہ تہذیبِ نسواں) کنواری لڑکیوں کا پردہ عورتوں سے، لڑکیاں پیدا ہونے پر سوگ، لڑکیوں کے لیے تنہائی (محمدی بیگم) تعدد ازدواج سیرت الصحابیات (مولوی غوث محی الدین) اخبار نسواں، فصاحت و بلاغت (خادمِ نسواں محبِ حسین) مینوئل ارتھمیٹک یا عقدۂ انامل (مولوی محمد اختر)

اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ قوم کے بزرگوں کی جدو جہد اور لگن سے محض چند سالوں میں طبقۂ نسواں کے اندر علمی بیداری پیدا ہونا اور عمل کی صورت میں ظاہر ہونا کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ خود مستورات ذہنی طور پر آمادہ تھیں۔ ضرورت ایک ایسی سرپرستی کی تھی جو سماجی بندشوں کو نرم کر سکے تاکہ خواتین کو اظہارِ رائے کی آزادی مل سکے اور وہ اپنی جنس کی تعمیر و ترقی اور اصلاح کے فریضے کو انجام دے سکیں اور اس کے لیے عملی اقدام کر سکیں۔ نسوانی صحافت نے ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا کیا اور ان میں خود اعتمادی کی قوت کو بڑھاوا دیا۔ علم کی شمع سے گھر اور سماج منور ہونے لگا اور پھر سماج نے بھی اس کی افادیت کو رفتہ رفتہ محسوس کیا اور عورتوں سے متعلق عائد پابندیوں کی ڈور کو ڈھیلا کیا تو خواتین کے جوہر نکھرنے اور چمکنے لگے اور تعلیمِ نسواں کی تحریک نے زور پکڑا اور خواتین علم حاصل کرنے کی طرف راغب ہونے لگیں۔ یہی اس نسوانی صحافت کا مقصد بھی تھا جس میں زنانہ رسائل نے اہم کردار ادا کیا اور ان کے مدیران کی کاوشیں رنگ لائیں۔

یہ رسالہ مطبع اسلامیہ چھاؤنی ریزیڈنسی سے شائع ہوتا تھا اس کی قیمت بارہ آنہ فی پرچہ

زر سالانہ چھ روپے تھا۔ محبّ حسین پورے خلوص اور لگن کے ساتھ اس رسالے کی خدمت کر رہے تھے اور وہ یہ چاہتے تھے کہ یہ رسالہ گھر گھر پہنچے اور لوگ اس کے مقاصد کی آواز بنیں۔

اس رسالے کا ایک مستقل عنوان 'اخبار نسواں' تھا اس عنوان کے تحت مختلف ممالک اور ہندوستان کے شہروں میں تعلیم نسواں کی خبریں، عورتوں کے کارنامے اور ان پر مردوں کے مظالم کی خبریں شائع ہوتی تھیں۔ ہر خبر پر معلم کا تبصرہ بھی ہوتا تھا۔ نمونے کے لیے چند خبریں ملاحظہ ہوں۔

> خبر — ''قاہرہ میں تین پاشا بردہ فروشی کے جرم میں پکڑے گئے ہیں ان پر کورٹ مارشل بیٹھے گا ایک کا نام شادار بی پاشا ہے اس نے اقبال کیا ہے کہ حرم کے لیے لڑکیاں خریدی گئی تھیں۔
>
> معلم تبصرہ — واقعی سلاطین اسلام کا یہ دستور کہ حرم میں بہت سی عورتیں رکھی جائیں سخت قابلِ نفرت ہے۔ جب مذہب اسلام میں چار بیبیوں سے زیادہ کی اجازت نہیں تو پھر کیوں بکریوں کا مندہ پالا جاتا ہے جس سے دین اسلام دنیا میں مفت بدنام ہوتا ہے۔[12]
>
> خبر — اس سال بمبئی کی یونیورسٹی کے امتحان میٹریکولیشن میں 59 نوجوان عورتیں بھی شریک تھیں ان میں سے 34 عیسائی، 23 پادری اور 2 ہندو تھیں۔ گذشتہ سال 64 عورتیں یعنی 36 عیسائی، 23 پارسی، 4 ہندو اور ایک یہودی عورت اس امتحان میں شامل تھیں۔
>
> معلم تبصرہ۔ افسوس ہے کہ اس امتحان میں نام کو بھی کوئی مسلمان عورت شریک نہ تھی جس سے اہل اسلام کی علمی حالت بخوبی ثابت ہے اور پارسیوں کی ترقی میں کوئی شک وشبہ باقی نہیں ہے۔[13]

مولوی محبّ حسین تعلیم نسواں اور حقوق نسواں کے اس قدر حامی تھے کہ اس راہ میں آنے والی تمام رکاوٹوں کو یکلخت ختم کر دینا چاہتے تھے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے خواتین کے بے جا پردے پر سخت تنقید کی ہے اور ہر ایک کو بلا امتیاز مسلک ہدفِ ملامت بنایا ہے، جس پر ان کی کافی تنقید بھی ہوئی ہے۔ دراصل اس دور میں عورتوں کے لیے جو سخت ترین پردہ تھا وہ کسی نہ کسی حد تک

خواتین کی تعلیم میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ اور محبّ حسین پردے کی وجہ سے آرہی رکاوٹ کو کسی حد تک دور کرنا چاہیے تھے لیکن علما اس کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ چنانچہ ٹکراؤ کی صورت حال پیدا ہوگئی تھی علما ترقی برتنے کو ہرگز تیار نہیں تھے۔ اس اعتبار سے مولوی محبّ حسین کا نقطۂ نظر بہت حد تک حقیقت پر مبنی تھا وہ جہالت کو دور کرنے کے لیے تھوڑی سی قربانی کو جائز سمجھتے تھے۔ لیکن سماجی رویے نے اس مسئلے پر ان کے اندر شدت پیدا کردی جو یقیناً درست بات نہیں تھی۔

یہ رسالہ 1901 تک کامیابی کے ساتھ پابندی سے نکلتا رہا۔ مولوی محبّ حسین کی یہ کوشش قابل قدر ہے اور وہ تحریک نسواں اور آزادی نسواں کے اولین علمبرداروں میں ہیں۔ نسوانی صحافت اور تحریک نسواں کا جہاں کہیں بھی نام آئے گا مولوی محبّ حسین کا نام احترام و عقیدت سے لیا جاتا رہے گا اور 'معلم نسواں' کو نسوانی صحافت کے پیش رووں میں ہمیشہ نمایاں مقام حاصل رہے گا۔

### ''تہذیب نسواں'' لاہور، ہفتہ وار (1898):

نسوانی صحافت کی داغ بیل یوں تو 1859 میں ہی پڑ چکی تھی لیکن صحافت نسواں کی باضابطہ ابتدا ''رفیق نسواں'' سے ہوتی ہے۔ جو لکھنؤ سے 1884 میں نکلا تھا۔ رفیق نسواں کے بعد خواتین کے لیے، اخبار النساء، شریف بیبیاں، شریف بی بی اور معلم نسواں چار اخبار و رسالے نکلے جو خالصتاً طبقۂ اناث کے لیے تھے۔ 1884 سے 1894 تک مسلسل طبقہ نسواں کے لیے اخبار و رسالے کا اجرا اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کا پتہ دیتے ہیں۔ پھر 1898 میں لاہور سے تہذیب نسواں کا جاری ہونا اس بات کو مزید تقویت پہنچاتا ہے۔ قبل کے رسالوں نے فضا بنائی، راہ ہموار کی جس پر مستقبل کی نسوانی صحافت نے نت نئے انداز میں ترقی کی منزلیں طے کیں اور پھر صدی کے ختم ہوتے ہوتے ایک ایسے رسالے کا اجرا ہوا جس نے نسوانی صحافت کو اعتبار و استحکام بخشا اور دیرپا اثرات مرتب کیے۔ اس رسالے نے جس کا نام تہذیب نسواں ہے، نسوانی صحافت کی دنیا میں بہت دھوم مچائی اور نسوانی رسائل کی دنیا میں اعلیٰ مقام حاصل کیا۔ اس رسالے نے نصف صدی تک اذہان کی تعمیر و تشکیل کی، طبقۂ نسواں میں علمی بیداری پیدا کی، ادبی ذوق کی آبیاری کی،

انھیں ملک و سماج کے لیے کارآمد بنایا ان کے اندر سماجی بیداری پیدا کی۔ حصارِ ذات سے باہر نکل کر سماج کی تعمیر و تشکیل کا حوصلہ دیا۔ حصولِ علم کا ذوق و شوق بخشا، مختلف ہنر سکھائے اور زندگی کو نئے انداز سے جینے کے گن بتائے، اعتماد کی قوت دی، ہمت اور حوصلہ دیا۔ دل سے ڈر اور خوف کو مٹایا۔ طبقۂ نسواں کی ایسی تربیت کی کہ ان میں سے چند نے آگے چل کر اس طبقے کا نام روشن کیا۔ ایسی معروف ادیبائیں پیدا ہوئیں جو ادب و صحافت کے افق پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکیں اور نہ جانے کتنے ستاروں کو اپنی ضیاپاشیوں سے روشنی و حرارت بخشی۔ یہ سب کچھ یوں ہی نہیں ہو گیا۔ اس کے لیے مولوی ممتاز علی نے بڑی جد و جہد کی۔ خونِ جگر دے کر چمن کی آبیاری کی۔ اس میں ان کی اہلیہ بھی برابر کی شریک تھیں۔

اس اخبار کے اجرا کی بابت مولوی صاحب لکھتے ہیں:

> ''بچپن سے میری تربیت کچھ ایسے حالات میں ہوئی اور اپنے خاندان میں ایسے واقعات پے در پے پیش آئے کہ اس زمانے سے ہی مجھے مظلوم مستورات کے ساتھ ہمدردی ہوگئی اور عمر و تعلیم کے ساتھ ساتھ میرے دل کا یہ جذبہ بھی قوت پکڑتا گیا۔
>
> جب پہلی بیوی کے انتقال کے بعد 1897 کے آخر میں میرا عقدِ ثانی ہوا اور بیوی پڑھی لکھی اور ذہین ملی تو جس شوق کی آگ میرے دل میں مدت سے دبی ہوئی سلگ رہی تھی بھڑک اٹھی اور میں نے اپنے عقد کے چند گھنٹوں کے بعد ہی یہ قصد مصمم کر لیا کہ مستورات میں بیداری پیدا کرنے کے لیے ایک اخبار ضرور جاری کیا جائے اور اپنی اہلیہ کو اس کی ایڈیٹر بنایا جائے۔''[14]

جیسا کہ میں قبل بھی لکھ چکا ہوں کہ خواتین کو خواندہ بنانے اور ان میں بیداری پیدا کرنے کے لیے ایک مہم کی شروعات ہو چکی تھی۔ ممتاز علی کو بھی اس طبقے سے اتنا ہی لگاؤ تھا۔ لہٰذا انھوں نے بھی وقت اور حالات کو دیکھتے ہوئے اور دوسروں کے تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ٹھوس عملی اقدام کی صورت میں اس رسالے کا اجرا کیا جو وقت کی ایک بڑی ضرورت تھی۔ یہ تھا وہ

پس منظر جس کے تحت تہذیب نسواں نکالا گیا۔ اس اخبار کا نام تہذیب الاخلاق کے طرز پر تہذیب نسواں سرسید احمد خاں کا تجویز کردہ ہے۔ جیسا کہ مولوی صاحب کا بیان ہے۔

مولوی سید ممتاز علی نے ہفتہ وار 'تہذیب نسواں' یکم جولائی 1898 کو اپنے ادارہ دار الاشاعت سے جاری کیا۔ یہ ہندوستان کا تیسرا اخبار تھا جو خاص طور پر عورتوں کے لیے نکالا گیا تھا۔ پہلے دو اخبار 'اخبار النساء' اور 'شریف بیبیاں' تھے۔ مولوی ممتاز علی کی بیوی محمدی بیگم (والدہ سید امتیاز علی تاج) نے اخبار کی ادارت سنبھالی۔ یہ 8-20x26 کی تقطیع کے پہلے آٹھ پھر بارہ، پھر سولہ اور پھر چوبیس صفحات پر نکلنے لگا۔ سالانہ چندہ تین روپے چار آنے تھا۔ سرورق پر یہ عبارت درج ہوتی تھی 'تہذیب نسواں محترمہ محمدی بیگم نے لڑکیوں کے فائدے کے لیے 1898 میں جاری کیا۔ اس کے مقاصد مستورات کے لیے اخلاق و خانہ داری اور تربیت اولاد سے متعلق مضامین چھاپنا تھے۔ اس کے ہر صفحے پر دو کالم ہوتے تھے۔ مضامین مختصر ہوتے تھے۔ ایک کالم خبریں اور نوٹ کے عنوان سے ہوتا تھا جس میں دنیا بھر کی دلچسپ معلوماتی خبریں چھپتی تھیں۔ 'محفل تہذیب' ایک مستقل کالم تھا جس میں عورتوں کے مسائل اور شکایات کا قارئین کی جانب سے جواب دیا جاتا تھا۔ یہ مسائل بسا اوقات نہایت نجی قسم کے ہوتے تھے۔ نہایت مفید سلسلہ تھا۔

خواتین کے اجتماعی مسائل اور ان کے حل کے طریقوں پر آزادانہ بحث و مباحثہ ہوتا تھا۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کے علاوہ ایسے موضوعات پر بھی مضامین شائع ہوتے تھے جو عورتوں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ مثلاً 15/جون، 1926 کے شمارے میں نذر سجاد حیدر کا مضمون اس مسئلے پر شائع کیا گیا کہ لڑکیوں کی شادی کے وقت ان کی مرضی معلوم کی جانی چاہیے اور یہ تجویز بھی پیش کی گئی کہ لڑکی کو اپنے ہونے والے شوہر سے ملاقات اور تبادلۂ خیالات کا موقع دینا چاہیے۔ اس زمانے کے قدامت پسندانہ ماحول میں ایسے مضامین کا شائع ہونا جرأت مندانہ قدم تھا۔ عورتوں کی دلچسپی کے اشتہارات مثلاً کشیدہ کاری کی مشین، کمبل، زنانہ بستر، خانہ داری کی کتابیں، مستورات کی بیماریوں، بے اولاد، عورتوں کی دواؤں کے علاوہ ضرورت رشتہ کے اشتہارات بھی شائع کیے جاتے تھے۔ ہر ہفتے آئندہ شمارے کے مضامین کا بھی اعلان کر دیا جاتا تھا اور ناقابل اشاعت مضامین کی بھی فہرست دے دی جاتی تھی۔

سید ممتاز علی کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو عورتوں کی تعلیم و ترقی کے نہ صرف حامی تھے بلکہ صحیح معنوں میں اس کو فروغ دینا چاہتے تھے۔ اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے انھوں نے یہ رسالہ جاری کیا۔ اس رسالے میں عورتوں کے سماجی تہذیبی اور فکری مسائل کو زیر بحث لانے کا سلسلہ وسیع پیانے پر شروع کر دیا گیا۔ سید ممتاز علی کا مقصد خواتین کو صرف امور خانہ داری سے آشنا کرنا نہیں تھا۔ انھوں نے عورت کی ادبی صلاحیتوں کو بھی بیدار کیا اور اپنے مسائل کو خود اپنی نظر سے دیکھنے کا ادراک عطا کیا۔ اور بہت جلد اس کے اچھے نتائج برآمد ہوئے گھر گھر علم کی روشنی پھیلنے لگی۔ مولوی صاحب اپنے مقصد میں کامیابی سے ہم کنار ہونے لگے۔ جس سے ان کو بے حد اطمینان ہوا۔ اپنے انقلابی سفر کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں ۔:

> ''اور میں صریحاً دیکھ رہا ہوں کہ اس بیس سال کے عرصے میں مستورات کی علمی اور معاشرتی حالت میں بڑا بھاری انقلاب ہو گیا ہے۔ اعلیٰ، اوسط، ادنیٰ ہر درجے کے خاندانوں میں جہاں جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی تعلیم کی روشنی پھیل گئی ہے۔ شہروں اور قصبات میں مدرسے قائم ہو گئے ہیں۔ اور جا بجا قائم ہو رہے ہیں۔ استانیوں کی اتنی قدر ہو گئی ہے کہ جو استانیاں 5-4 روپے مہینے پر رکھی جاتی تھیں اب وہ چالیس چالیس روپے ماہوار تنخواہ پاتی ہیں۔'' 15

مولوی صاحب رقم طراز ہیں:

> ''یہ پرچہ جولائی 1898 میں اس وقت جاری ہوا تھا جب مستورات میں لکھنے پڑھنے کا عام طور پر چرچا نہیں تھا اور نہ فرقۂ نسواں کی بہبودی کے لیے کوئی اخبار یا رسالہ ہند میں جاری تھا۔ یہ پرچہ نرالے اغراض و مقاصد کے ساتھ امید و بیم کی حالت میں نکلا۔ کیونکہ اول اول ہم کو یہ شبہ گزرتا تھا کہ اس کے پڑھنے والے کہاں سے آئیں گے اور خصوصاً اس کی قلمی امداد کیا کر سکیں گی۔ جبکہ مستورات کا معمولی لکھنا پڑھنا بھی ایک طرح کا اخلاقی عیب خیال کیا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں کسی شریف بی بی کا اخبار

میں مضمون لکھنا اور پبلک میں اپنے خیالات وتحریر کا نمونہ پیش کرنا کیسا مشکل کام تھا اس کو ہم ہی خوب جانتے ہیں مگر ہمت و استقلال و ثابت قدمی سے تہذیب نسواں نے اپنے دیکھنے والے ملک میں آپ پیدا کر لیے مگر اس کے اجرا کے وقت مستورات میں علمی مذاق کی یہی کیفیت ہوتی جو آج نظر آ رہی ہے تو یقیناً اس اخبار کی اشاعت چند روز میں سینکڑوں سے ہو کر ہزاروں تک پہنچ جاتی۔'' 16

مٹھی بھر حامیانِ تعلیم نسواں اور مخالف سارا زمانہ۔ عورتوں کی تعلیم سماج کے حلق کے نیچے ابھی بھی نہیں اتر رہی تھی۔ جب تعلیم کا حصول ہی عورت کے لیے معیوب بات تھی تو پھر کسی رسالے میں مضمون کا لکھنا کہاں گوارا ہو سکتا تھا۔ لیکن داد دیجئے ان حامیانِ تعلیم نسواں کو جنھوں نے مخالفتوں کے سیلاب کا مقابلہ کرتے ہوئے عورتوں کو حوصلہ دیا اور ان کی ہمت بندھائی۔ قابل احترام ہیں وہ عورتیں بھی جو ہر طرح کی' مخالفت کے باوجود میدان میں آئیں اور ڈٹی رہیں نسائیت کی قدر و قیمت کا احساس سماج میں اجاگر کیا۔ دکھتی رگ پر نہایت احتیاط سے انگلی رکھی جس نے مردوں کی حسیت کو عفت و ناموس اور حیاداری کا وہ سبق پڑھایا کہ مخالفین بھی بھونچکا رہ گئے۔ پوری کہانی قرۃ العین حیدر سے سنیے۔ لکھتی ہیں:

''مخالفین کے اعتراضات کی وجہ سے نام کا پردہ ضروری تھا۔ چنانچہ تہذیب نسواں کے سرورق پر چھپتا تھا' تہذیب نسواں جو کہ ایک شریف بی بی کی ادارت میں ہر ہفتہ شائع ہوتا ہے۔ اکبری بیگم نے والدہ افضل علی اور نذر زہرا نے ''بنت نذر الباقر'' یا 'مس نذر الباقر' کے نام سے لکھا۔ مردانہ اخباروں میں یہ بحث بھی چھڑی کہ کیا شریف مسلمان لڑکیوں کا خود کو انگریزی لقب 'مس' سے یاد کرنا مناسب ہے یا سخت بیہودہ بات ہے۔''17

ان اعتراضات سے مردانہ ذہنیت کا اندازہ آپ بخوبی لگا سکتے ہیں جو اس وقت کے سماج میں تھا اور پھر آپ یہ سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ ان خواتین نے کس قدر بہادری کا کام کیا تھا۔

جس کے نتیجے میں عورتوں میں بیداری آئی اور مسلمان خواتین کی حالت میں دن بدن تبدیلی ہونے لگی۔

> باہر حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ لیکن مردانہ سماج میں عورتوں کی تعلیم کو لے کر ابھی بھی حالات اچھے نہیں تھے۔ انیسویں صدی کے اواخر تک تو حالت یہ تھی ''اس وقت قوم کے بزرگوں میں مولوی سید کرامت حسین، پروفیسر قانون علی گڑھ کالج، جسٹس سید امیر علی اور بدر الدین طیب جی اور نوجوانوں میں سید سجاد حیدر اور ان کے چند ساتھیوں کے علاوہ تعلیم نسواں کا کوئی حامی نہ تھا۔ [18]

بہر حال مخالفت اور موافقت کا سلسلہ چلتا رہا اور دھیرے دھیرے حالات سازگار ہونے لگے۔ 1903 میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ ممبئی میں منعقد ہوا اور پہلی بار عورتوں کو پردے کے پیچھے سے کانفرنس کی تقریریں سننے کا موقع دیا گیا۔ کانفرنس میں طیب جی خاندان کی عطیہ اور زہرا فیضی شریک ہوئیں۔

تہذیب نسواں نے تعلیم کے علاوہ اس وقت کے بدلتے ہوئے سماج میں عورتوں کے تمام موضوعات کو نہ صرف اپنے صفحات میں جگہ دی بلکہ اس پر بحث کرائی۔ جس سے عورتوں کے جوہر کھل کر سامنے آنے لگے۔ 1905 میں اصلاح لباس کی تحریک شروع ہوئی تو تہذیب نسواں میں یہ سوال اٹھایا گیا کہ ہم کیا پہنیں؟ کھنچواں پاجامہ جس کی رسم اٹھتی جارہی ہے یا شلوار۔ سب بہنیں اپنے اپنے لباس سے آگاہ کریں۔ عورتوں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور بدلتے فیشن کے لحاظ سے اپنی اپنی آراء سے تہذیب کو آگاہ کیا۔ زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ خواتین کی دلچسپیاں بھی بدل رہی تھیں ان کی دلچسپیوں کا خیال رکھتے ہوئے ایڈیٹر صاحبہ ایک نوٹ لکھتی ہیں:

> ''ورزش اور تفریح طبع کے لیے کھیلوں کو دریافت کرنے کی ضرورت رہتی ہے۔ ہماری بہنوں کے تجربے میں جو کھیل آچکے ہیں ان کی ترکیبیں لکھیں۔ غالباً ہماری بچی بہنیں اس بارے میں بہتر ہمیں لکھ سکیں گی ایک کھیل مجھے پسند آیا اُسے پن پان کہتے ہیں۔ انگریزی کھیل ہے۔'' [19]

1905 تک تہذیب نسواں نے عورتوں میں بیداری کی ایک لہر پیدا کردی اور خواتین لکھنے والیوں کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا۔ عورتیں چھوٹے چھوٹے مضامین تہذیب نسواں میں لکھنے لگیں۔ یلدرم کی چچازاد بہن نثار فاطمہ نے تہذیب کے مثبت پہلو کو اپنی ایک نظم میں اجاگر کیا۔ ملاحظہ فرمائیں۔

''شکر اللہ کا کہ ہم علم سے ہیں بہرہ مند
اس سے بڑھ کر نہیں دولت مری پیاری بہنو
اچھا کرتی ہو منگاتی ہو جو 'تہذیب' اخبار
اس سے بڑھتی ہے لیاقت مری پیاری بہنو''

پلول سے ایک بی بی نے لکھا:۔

''تہذیب'' سے ہمیں بہت فائدے ہو رہے ہیں پیش تر دنیا کے حالات کی خبریں نہیں تھیں۔ اب سب خبریں معلوم ہو رہی ہیں۔ یہ مضمون میں نے بہت کوشش کر کے لکھا ہے۔ اگر اس میں کچھ غلطی نظر آئے تو آپ اور دوسری بہنوں سے معافی مانگتی ہوں' یہ میرا پہلا مضمون ہے جو بعد اصلاح برادر معظم روانہ کرتی ہوں۔ میری بہنوں میں ایک شریف باشندہ بھوپال کی لڑکی ہوں۔''[20]

تہذیب نسواں نے علمی و ادبی ذوق و شوق کو بڑھاوا دینے کے ساتھ ساتھ خواتین کے سماجی اور سیاسی شعور کو بھی بیدار کرنے کا کام منظم اور منضبط طریقے سے کیا۔ اس لیے کہ جس وقت تہذیب جاری ہوا تھا عورتوں کی سماجی حالت بے حد ابتر تھی۔ وہ مکمل طور پر مردوں کے رحم و کرم پر تھیں۔ ان کی اپنی کوئی آواز نہیں تھی اور نہ ہی وہ کسی طرح کا سماجی و سیاسی شعور رکھتی تھیں۔ انھیں اپنی اہمیت کا کوئی اندازہ ہی نہیں تھا۔ وہ یہ نہیں جانتی تھیں کہ وہ سماج کا ایک جزو لاینفک ہیں اور اپنی صلاحیتوں سے ملک و قوم کو کس قدر فائدہ پہنچا سکتی ہیں۔ مولوی ممتاز علی کو عورتوں کے ان دگرگوں حالات کا بخوبی علم تھا۔ وہ تو عورت کو ملک اور سماج کے لیے کارآمد بنانا چاہتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے اپنے اخبار کے ذریعے اس سمت میں بھی کوشش کی۔ عورتوں کے باہم میل جول پر زور دیتے رہے

بالآخر محنت رنگ لائی اور 'لیڈیز کانفرنس' کا انعقاد عمل میں آیا۔ پھر پے در پے خواتین کی کئی انجمنیں وجود میں آئیں۔ 'زنانہ مجلس' خاتونان ہمدرد انجمن تہذیب نسواں، انجمن خواتین اسلام لاہور وغیرہ۔

گویا تہذیب نسواں کی تحریک نے خواتین کے اندر ایک نیا جوش وخروش پیدا کر دیا۔ اور خواتین سماجی و سیاسی بیداری کی مہم میں سرگرم ہوگئیں اور سیاست میں اپنی حصہ داری کو یقینی بنانے کے لیے 'عورت کا ووٹ' کے عنوان سے مضمون بھی لکھا تا کہ جمہوری عمل میں برابر کی شریک بن سکیں اور اپنی سیاسی اہمیت کو منوا سکیں۔ شروع سے اب تک کے تہذیب نسواں کے کارنامے پر اگر نظر ڈالیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ تہذیب نسواں نے ہر سطح پر مستورات میں شعور اور بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی اور طبقۂ نسواں کو اس کا وہ کھویا ہوا مقام دلایا جو اسے مذہب اور سماج نے عطا کیا تھا لیکن سماج کے ٹھیکے داروں نے اسے غصب کر لیا تھا۔ نسوانی تاریخ میں تہذیب کا یہ کارنامہ رہتی دنیا تک یاد رکھا جائے گا اور سنہرے حرفوں میں لکھا جائے گا۔

### ''پردۂ عصمت'' لکھنؤ۔(1900):

یوں تو عبدالحلیم شرر بنیادی طور پر تاریخی ناول نگار تھے۔ لیکن انھوں نے عورتوں کی اصلاح اور ان کے مسائل پر باقاعدہ معاشرتی ناول بھی لکھے جس میں انھوں نے پردہ، تعلیم، عقد ثانی وغیرہ پر بڑی اچھی بحثیں کیں۔ شرر باقاعدہ مولوی تھے اور مذہب کے زبردست پرستار لیکن اتنے ہی عورتوں کی تعلیم کے حامی اور پردے کے مخالف تھے۔ اس موضوع پر انھوں نے ایک ناول 'بدرالنساء کی مصیبت' لکھا جو پہلے حیدرآباد کے رسالے 'معلم نسواں' میں بعنوان 'پردے میں ایسا بھی ہوتا ہے' شائع ہوا۔ اس ناول میں پردے کی شدت کا بھرپور مذاق اڑایا گیا ہے اور ایک سچی کہانی کے ذریعے اس کے المناک انجام کو پیش کر کے عورتوں کی آنکھیں کھولنے کی کوشش کی گئی ہے۔ شرر عورت کو اس کی بے بسی اور مجبوری سے باہر لا کر اس کی سمجھداری اور ذہانت سے سماج اور گھر کو فائدہ پہنچانا چاہتے ہیں۔ اس لیے وہ عورت کی آزادی اور اس کی تعلیم کی بھرپور وکالت کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے مشن میں جان ڈالنے اور اپنی تحریک کو گھر گھر پہنچانے کے لیے 'پردۂ

عصمت' کے نام سے عورتوں کا ایک رسالہ لکھنؤ سے نومبر، 1900 میں جاری کیا۔ 'پردۂ عصمت' سے قبل وہ دو رسالے 'دلگداز' اور ہفت روزہ 'مہذب' نکال چکے تھے۔ رسالہ'' دلگداز'' انھوں نے 1887 میں نکالا تھا اور ہفت روزہ 'مہذب' 1890 میں جاری کیا تھا۔ رسالہ 'دلگداز' نے ادب و صحافت کی دنیا میں اپنی پہچان بنائی اور شرر ایک اچھے صحافی کی حیثیت سے بھی جانے گئے۔ دنیائے صحافت میں پختہ کار حیثیت بنا لینے کے بعد شرر نے اپنے مشن میں جان ڈالنے کے لیے 'پردۂ عصمت' کا اجرا کیا۔

شرر نے اپنے مشن کو تقویت دینے کے لیے اس رسالے کا اجرا کیا۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ تاریخ صحافت کی کسی کتاب میں اس رسالے کا تذکرہ نہیں ملتا۔ امداد صابری اور ڈاکٹر عبدالسلام خورشید میں سے کسی نے بھی اس کا ذکر نہیں کیا ہے، جبکہ ہفت روزہ 'مہذب' کا تذکرہ موجود ہے۔ البتہ لائبریری میں اس کے کچھ شمارے اب بھی خستہ حالت میں موجود ہیں۔

'پردۂ عصمت' کا پہلا شمارہ یکم شعبان مطابق نومبر 1900 میں قومی پریس لکھنؤ سے طبع ہو کر جاری ہوا۔ یہ رسالہ 16/22x30 کے سائز پر نکلتا تھا اور ضخامت 16 صفحات تھی۔ ہر اسلامی مہینے کی پہلی تاریخ کو لکھنؤ محلہ یحییٰ گنج سے شائع ہوتا تھا۔ قیمت ایک روپے سالانہ تھی مگر لڑکیوں اور شریف خاتون سے آٹھ آنے لیے جاتے تھے۔ ایڈیٹر کا نام درج نہیں ہوتا تھا۔ پیشانی پر پردۂ عصمت جلی قلم سے لکھا ہوتا تھا۔

اس رسالے میں پردے کے موضوع پر جو مضامین شائع ہوئے اسے بعد میں شرر نے باضابطہ کتابی شکل میں ''پردہ'' کے نام سے شائع کر دیا۔ اس طرح انھوں نے مشاہیر نسواں پر باقاعدہ ایک کتاب الگ سے تیار کی۔

چونکہ شرر مولوی تھے اور علوم دینیہ پر گہری نظر رکھتے تھے۔ مذہب کے زبردست حامی و پرستار تھے۔ پردے کی اہمیت اس کی شرعی حدود و قیود سے خوب واقف تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ خواتین کی تعلیم کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ پردہ ہے جو انھیں گھر سے نکلنے اور درسگاہوں تک جانے میں مزاحم ہے۔ پردے کی اس شدت پسندی کو جو سماج نے عورتوں کے تئیں عائد کر رکھی تھی اس کو انھوں نے غیر شرعی پردہ قرار دیا اور اس کی مخالفت میں یہ رسالہ نکالا۔

لہٰذا پردہ ترک کرنے کے لیے ان کی ساری بحث قرآن وحدیث اور اسلامی تاریخ کے تحت تھی۔ اس لیے مذہب دوست اور اعتدال پسند قارئین پر ان کے خیالات کا گہرا اثر پڑا۔ پھر یہ کہ شرر نے بڑی شد و مد اور شگفتہ بیانی کے ساتھ اس موضوع پر اظہار خیال کیا اس لیے بھی بات لوگوں کے دلوں کو چھو گئی۔

دنیا میں پردہ نہ ہوتا تو گناہ بھی نہ ہوتا، جب تک پردہ ہے صفائی کا انتظام بیکار ہے، ایک بے پردہ مسلم قوم، زن وشوہر کی مفارقت، علما کا بخل، عورت کے حقوق کم نہیں ہیں۔ خلع کا رواج ہونا چاہیے۔ پردہ نہ ہو تو مردوں کے اخلاق سنور جائیں۔ یہ شعر بھی عنوان ہے:

میں ان کے پردۂ بے جا سے مر گیا مضطر
انھوں نے مار ہی ڈالا حجاب کر کے مجھے

یعنی صرف اور صرف عورت کے حقوق کی آواز کو بلند کرنا ان کے حقوق کی یاد دلانا جو مذہب نے اسے دے رکھے تھے اور جسے سماج نے غصب کر رکھا تھا۔ اپنے حقوق کو حاصل کرنے کے لیے عورتوں کے اندر اعتماد کی قوت کو بڑھا دینے اور ان میں جرأت و ہمت پیدا کرنے کے لیے ماضی کے اوراق سے تاریخی مضامین دیئے جاتے تھے، جن میں مسلمان عورتوں کی شجاعت و بہادری کے واقعات ہوا کرتے تھے تاکہ عورتیں بھی ان مضامین کو پڑھ کر اپنے اندر ہمت اور حوصلہ پیدا کر سکیں اور اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کر سکیں۔

مولانا شرر سے پہلے مولوی محب حسین حیدر آباد نے بھی اپنے رسالوں 'معلم' اور معلم نسواں کے ذریعے پردے کی سخت مخالفت کی تھی۔ لیکن دونوں کی مخالفت میں بہت فرق تھا۔ محب حسین نے پردے کی مخالفت کرنے کے ساتھ ساتھ کسی حد تک انگریزی تہذیب وتمدن کو اپنانے پر زور دیا تھا لیکن مولانا شرر نے انگریزی تہذیب وتمدن کو اپنانے کی مخالفت کی ہے اور شرعی پردہ اپنانے پر زور دیا ہے مروجہ پردہ جو غیر شرعی ہے اس کی مخالفت کی ہے۔ اس کے باوجود دونوں مولویوں سے مسلم سماج نے ایک سا ہی برتاؤ کیا۔ دونوں رسالوں کی شدید مخالفت کی گئی۔ مخالفت کا طوفان جب بہت بڑھ گیا اور مدافعت کم ہو گئی تو بالآخر دونوں بزرگوں کو اپنے اپنے رسالے بند کرنے پڑے۔ اس طرح مفید کثیر المقاصد مبہم نابینا سماج کی آنکھوں میں بینائی ڈال کر،

ناواقف و ناانجان، مظلوم طبقۂ نسواں کو راستہ دکھا کر ان میں حوصلہ اور ہمت جگا کر ساحل سے موجوں کا نظارہ کرنے والے سماج کو دو چار تھپیڑے لگا کر خود طوفان کے شدید بھنور میں پھنس کر غرقاب ہو گئے۔ لیکن جاتے جاتے لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گئے۔

## ''سفیر قیصر'' میرٹھ (1900):

حیدر آباد، دلی اور لاہور کے بعد صدی کے آخری سال میں میرٹھ کی سرزمین سے 'سفیر قیصر' کے نام سے پہلا نسوانی رسالہ 25 ستمبر 1900 کو جاری ہوا۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ تاریخ صحافت کی کسی کتاب میں اس رسالے کا تذکرہ نہیں ملتا۔ میرٹھ سے دلی بے حد قریب ہے اس کے باوجود امداد صابری کو اس رسالے کی بھنک تک نہیں لگی یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب تاریخ صحافت اُردو میں اس کا ذکر نہیں کیا۔ پاکستان میں قومی عجائب گھر کتب خانہ لاہور میں اس کے دو شمارے موجود ہیں۔ جسے ڈاکٹر نسیم آرا نے تلاش کیا ہے ان کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق ایک 25 ستمبر، 1900 کا دوسرا نومبر دسمبر 1900 کا مشترکہ شمارہ تھا۔ 25 ستمبر کے شمارے پر جلد ایک شمارہ ایک درج ہے، اس لیے اس رسالے کے اجرا کی تاریخ 25 ستمبر، 1900 قرار پاتی ہے۔ سرورق پر درمیان میں رسالے کا نام اور دائیں بائیں جانب 'تعلیم' اور 'نسواں' کے الفاظ تحریر ہیں۔ جس سے اس کا مقصد واضح ہوتا ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ ''تعلیم نسواں'' ہی اس رسالے کا خاص مقصد تھا۔ یہ ماہانہ رسالہ تھا اور اس کو محمد نذیر احمد سعد نے جاری کیا تھا اور فیض عام پریس میرٹھ سے شائع ہوتا تھا۔ 16/22x30 کے 16 صفحات پر مشتمل تھا۔ سالانہ قیمت 3 روپیہ مقرر تھی۔ ایڈیٹر کوئی خاتون تھیں جن کا نام درج نہیں البتہ تہذیب نسواں کی تقلید میں ایڈیٹر ایک شریف اور پردہ نشین خاتون درج ہے۔

ستمبر، 1900 کے شمارے کے آخری صفحے پر ایک اشتہار دیا گیا ہے جس سے اس رسالے کے مقاصد سامنے آتے ہیں۔ دستور العمل رسالہ سفیر قیصر:

1- رسالہ ہذا ہر ماہ کی انگریزی 15 تاریخ تک طبع ہو کر ہدیۂ ناظرین ہوگا۔
2- جملہ مضامین ترقی تہذیب و تعلیم و مفید طبقۂ نسواں شائع ہوں گے۔

3- علاوہ مضامین کے دو ناول 'مطب بے نظیر' اور دوسرا 'ہدایت نسواں' ہر ماہ ہذا کے ساتھ شائع ہوں گے۔

4- رسالہ ہمیشہ تعلیم نسواں کا معاون اور تربیت و ہدایت کا خیر خواہ رہے گا۔

یہ رسالہ میں تعلیم نسواں، امور خانہ داری، تاریخی و معاشرتی مضامین سے پُر ہے جو اصلاح و تربیت نسواں کے لیے مفید ہیں۔ مثلاً 'چین کی عورتوں کی جہالت'، 'کند ذہن حریص لڑکیاں' اور 'تعلیم نسواں' قابل ذکر ہیں۔ تعلیم نسواں میں مستورات کی تعلیم کی اہمیت بیان کی گئی ہے اور اس پر خاص زور دیا گیا ہے۔ نومبر و دسمبر کے شمارے میں ایک مضمون اردو لٹریچر اور تعلیم یافتہ مسلمان مولانا حالی کا تحریر کردہ ہے اس میں ہندی کے مقابلے میں اردو کی حمایت کی گئی ہے اور اردو ہی کو مسلمانوں کی زبان قرار دیا گیا ہے۔ پھر اس کو وسیع تر بنانے کی خواہش کی گئی ہے۔ اس رسالے میں زبان و بیان کی سادگی و سلاست کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ تعلیم نسواں کو زیادہ سے زیادہ رواج دیا جائے تا کہ نسوانی لٹریچر میں اضافہ ہو۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ انیسویں صدی کے آخری دہے میں مسلم خواتین کو خواندہ بنانے کے جس مشن کا آغاز ہوا وہ صدی کے خاتمے پر خاصا زور پکڑ گیا اور اس میں ان رسالوں کا کردار بھی ناقابل فراموش ہے، جنھوں نے اس مشن میں جان ڈالی اور تعلیم نسواں کے مشن کو گھر گھر پہنچایا۔ سات پردوں میں بیٹھی خواتین کی آنکھیں کھول دیں۔ انھیں جہالت کی تاریکی سے باہر نکالا۔ ان کے دل و دماغ کو روشن کیا ان میں بیداری پیدا کی۔ گھر کی چہار دیواری سے مکتب اور اسکول کی دنیا تک ان کو پہنچایا اور پھر ایک ایسی فضا بنادی جس سے تحریک کی راہ ہموار ہوگئی اور یہ کارواں دوسری صدی میں نئے انداز سے اپنی راہ پر گامزن ہوا۔

# انیسویں صدی کے رسائل


1- منشی احمد خاں صوفی۔ خمخانۂ جاوید، جلد 5، ص:249
2- اختر شہنشاہی، ص:234
3- خطبات گارساں دتاسی حصہ سوم ص286
4- عہدِ عثمانی میں اُردو خدمات، ص۔107
5- اختر شہنشاہی، ص۔137
6- تاریخ صحافت اردو، سوم، امداد صابری، ص:334
7- اختر شہنشاہی، ص:10
8- اخبار نویسوں کے حالات زندگی۔ منشی محمد الدین فوق، ص:1 تا 6
9- شریف بیبیاں، لاہور ستمبر 1893ص:9
10- معلم نسواں، جلد 8 نمبر 5، جمادی الاوّل 1312ھ، ص4
11- ایضاً نمبر 6، جمادی الثانی 1312ھ، ص4
12- تہذیب نسواں لاہور، 6 جولائی 1918، ص:424
13- تہذیب نسواں لاہور، 6 جولائی 1918، ص:425
14- کارِ جہاں دراز ہے، حصہ اول، قرۃ العین حیدر، ص:163
15- تہذیب نسواں 23 ستمبر 1905، ص:402
16- کارِ جہاں دراز ہے، جلد اوّل۔ قرۃ العین حیدر، ص:163
17- کارِ جہاں دراز ہے، جلد اوّل۔ قرۃ العین حیدر، ص:132
18- کارِ جہاں دراز ہے، جلد اوّل۔ قرۃ العین حیدر، ص:163
19- کارِ جہاں دراز ہے، جلد اوّل۔ قرۃ العین حیدر، ص:163

20- کار جہاں دراز ہے، جلد اوّل-قرۃ العین حیدر، ص: 164

21- کار جہاں دراز ہے، جلد اوّل-قرۃ العین حیدر، ص: 164

22- صحیفہ تاج نمبر اکتوبر 1970، ص 47

23- تہذیب نسواں، 6 جولائی، 1918، ص: 432

24- پردۂ عصمت لکھنؤ، جلد 1، شمارہ 2، یکم رمضان 1318ھ، ص 2

# اردو صحافت میں خواتین کا حصہ

پروفیسر قمر جہاں

خواتین ہمارے سماج کا ناگزیر حصہ ہیں، جنھیں نصف بہتر کا درجہ حاصل ہے۔ آج وہ مردوں کے دوش بدوش تقریباً زندگی کے ہر شعبے میں گامزن ہیں۔ خواتین کی کارکردگی اور محنتِ شاقہ کے نقوش کہاں مرتسم نہیں ہیں؟ ایک زمانہ تھا جب صحافت، انجینئرنگ اور فوج میں خواتین نہیں ہوتی تھیں، مگر عہدِ حاضر میں ہر شعبہ جات میں بھی وہ موجود ہیں اور اپنے فرائض بحسن وخوبی انجام دے رہی ہیں۔

'صحافت' کو جمہوریت کا چوتھا ستون کہا جاتا ہے اور سچ پوچھیے تو عہدِ حاضر میں اس چوتھے ستون کی اہمیت اس قدر بڑھ گئی ہے کہ میڈیا ہی 'چوتھی ریاست' بن گئی ہے۔ دنیا جو واقعی اب ایک عالمی گاؤں میں مبدّل ہو چکی ہے، جہاں ان دنوں عوامی ذرائع ابلاغ یعنی ماس کمیونیکیشن کا ایک جال سا بچھ گیا ہے، انٹرنیٹ، کمپیوٹر، الیکٹرونک وسائل (E-mail)، فیکس، موبائل، فون، ریڈیو، ٹی وی، ویڈیو کانفرنسنگ، سیٹیلائٹ چینلوں نے پورے معاشرے کو اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا ہے اور بچہ بچہ کھیل کھیل میں وہاں تک پہنچ گیا ہے۔ اس بدلی ہوئی صورتِ حال میں ہماری

خواتین بھی یقیناً کافی ترقی یافتہ ہوگئی ہیں۔نئی تعلیم یافتہ لڑکیاں ہوں یا لڑکے، ان میں ذہنی و تعلیمی بیداری کے لحاظ سے کوئی حدِ امتیاز نہیں ہے۔

''صحافت'' بھی خواتین کی دلچسپی اور کارکردگی کا محبوب و پسندیدہ موضوع ہے۔غور کیا جائے تو عہدِ رواں میں صحافت کے بھی کئی شعبے ہیں، عام طور سے انھیں دو شاخوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔یعنی پرنٹ میڈیا اور برقی میڈیا۔مگر حقیقت تو یہ ہے کہ الیکٹرونک میڈیا اور پرنٹ میڈیا ترسیل وابلاغ کی دو علاحدہ شاخیں ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے قریب ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ پرنٹ میڈیا کو بھی الکٹرونک میڈیا کا ہی تعاون حاصل ہے۔زمانہ قدیم کی طرح اب چھاپہ خانہ یا کاتب وغیرہ کی ضرورت نہیں رہی۔اب کمپیوٹر کمپوزنگ کا دور ہے جو خالص ترقی یافتہ شکل ہے۔کتب و رسائل کی اشاعت کا مرحلہ ہو یا اخبارات کی طباعت کا، یہ تمام کام عہدِ حاضر میں جناتی کرشمے کی طرح تیز تر ہوگئے ہیں۔اس نئے ماحول میں ہماری خواتین جرنلسٹ بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔خواتین صحافی خواہ پریس میڈیا میں ہوں یا نیوز چینل (برقی میڈیا میں) تعداد ان کی بڑھتی ہی جارہی ہے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ معیار و مذاق میں بھی وہ اپنے دیگر ساتھیوں کے ہم پلّہ ہیں۔

آئندہ صفحات میں چند نام درج کیے جارہے ہیں جن کی خدمات کا اعتراف کیا جانا چاہیے، موضوع چونکہ اردو صحافت ہے۔لہٰذا ہماری نظر انتخاب ایسی خواتین پر ہے جو اردو صحافت میں اپنی پہچان بنا چکی ہیں۔اس سلسلے میں ایک اہم نام محترمہ شیریں دلوی کا ہے۔

وہ ممبئی میں اقامت پذیر تھیں اور ''اودھ نامہ'' بمبئی کی ایڈیٹر رہی ہیں۔محترمہ شیریں دلوی Associate Journalist کے علاوہ ٹیلی ویژن سے بھی وابستہ رہی ہیں۔ Forum against operation of Women کی صدر کے عہدے پر فائز تھیں۔

دوسری صحافی عالیہ ناز ہیں، جن کا آبائی وطن کشمیر ہے۔تعلیم دہلی میں JNU سے حاصل کی تھی۔ بی بی سی (BBC) کے اردو پروگرام 'شہر B' کو پیش کرتی تھیں۔ یونیسکو سے انھیں ایک خطاب Shaping the future of Journalism کے نام سے ملا تھا۔ وہ اپنے وقت کی ایک مقبول و معروف صحافی ہیں۔

مدھیہ پردیش میں خالدہ بلگرامی کا نام اولیت کے لحاظ سے خاص امتیاز رکھتا ہے۔ شاذیہ دہلوی India Today میں اپنی نمایاں کارکردگی کے لیے پہچان رکھتی ہیں۔اسی طرح محترمہ وسیم راشد اردو اخبار ''چوتھی دنیا'' دہلی کی معاون مدیرہ ہیں اور اپنی صحافتی خدمات کے لیے پہچانی جاتی ہیں۔ ریشماں اختر کا تعلق مشہور ''عالمی سہارا چینل'' سے ہے۔ نائب مدیر نازیہ نوشاد حالیہ دنوں میں پٹنہ سے شائع ہونے والے مقبول اخبار ''راشٹریہ سہارا'' میں اپنی نمایاں کارکردگی سے اپنی شناخت قائم کر چکی ہیں۔ محترمہ اس اخبار کی نائب مدیر ہیں۔ زرّیں فاطمہ مشہور اردو اخبار ''انقلاب'' پٹنہ سے وابستہ ہیں، موصوفہ اس اخبار میں نائب مدیر کے عہدے پر فائز ہیں اور اردو صحافت میں ان کی دلچسپی خصوصی ہے۔ عہد حاضر میں اردو صحافت کا نصب العین ملک کے اندر قومی یکجہتی کو فروغ دینا اور سیکولرزم کی خصوصیات کو اُجاگر کرنا ہے۔ ایک وقت تھا کہ بنگلہ زبان کے ساتھ سب سے پہلے اردو اخبارات نے ہی قوم کو آزادی کے خواب دکھائے تھے اور آزاد ہندوستان کے خواب کو اپنی مسلسل کوششوں سے شرمندۂ تعبیر کیا تھا۔ جنگ آزادی کی تاریخ میں اردو اخبارات کے نام سنہری حرفوں میں لکھے گئے ہیں۔ اس زمانے کے مشہور اخبارات میں قومی آواز، نوائے وقت، ہندوستان، ریاست، رہبر ہند وغیرہ بے شمار اردو اخبارات کے نام ہمارے ماضی کی شاندار وراثت ہیں۔

اردو اخبارات کے حوالے سے چند نام اور ذہن میں آرہے ہیں۔ ان تمام خواتین صحافیوں کی خدمات یقیناً قابلِ تعریف ہیں۔ اخبار ''نوائے وقت'' کی مدیرہ عارفہ صبیحہ، ''نوید وقت'' کی ایمان محمد جو پہلی خاتون صحافی ہیں جنھوں نے غزہ و اسرائیل جنگ کی تصویر کشی کر کے اپنا نام War Photo Journalist میں درج کرایا ہے۔ محترمہ ثوی خان کرائم جرنلسٹ کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ 1948 میں فاطمہ بیگم نے لاہور سے پہلا اردو اخبار ''خاتون'' کے نام سے نکالا تھا۔ ان کے علاوہ زاہدہ حنا، پروین شاکر، عاصمہ چودھری، زبیدہ مصطفیٰ، زیب النساء، فرحت صدیقی غرض بہت سے نام ہیں جو اخباراتِ اردو میں خواتین صحافی کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ ان میں ایک اہم نام محترمہ فوزیہ شاہین کا ہے جو اخبار ''جنگ'' سے وابستہ ہیں۔ BBC on line urdu service کی اپنی کارکردگی کے لیے محترمہ فوزیہ شاہین کو اوارڈ بھی مل چکا ہے۔ یونیسکو سے

Women Media of Pakistan کا خطاب حاصل کر چکی ہیں۔ مشہور افسانہ نگار زاہدہ حنا اور شاعرہ پروین شاکر بھی ''جنگ'' میں کالم نویس کی حیثیت سے مشہور رہی ہیں۔ یہ دونوں ممتاز و مقبول نام اپنے آبائی وطن کے لحاظ سے ہندوستانی ہیں۔ عاصمہ چودھری اخبار ''ڈان'' میں ہیں اور جنگ گروپ میں نائب مدیر ہیں۔ سمیرہ عزیز پہلی سعودی خاتون ہیں جو میڈیا میں کام کر رہی ہیں۔ ''آواز'' میں مینیجنگ ایڈیٹر ہیں ساتھ ہی اردو نیوز (سعودی سے) کی سپروائزنگ ایڈیٹر اور گوشۂ خواتین کی انچارج ہیں۔

صوبۂ بہار میں تسنیم کوثر ایک طویل مدت تک ٹی وی پر نیوز ریڈر رہی ہیں۔ محترمہ اچھی افسانہ نگار ہیں۔ ''بونسائی'' ان کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ خواتین میں بیشتر نام آج الکٹرونک میڈیا میں چمک رہے ہیں۔ اخبارات سے وابستہ خواتین صحافی ہیں تو ضرور مگر مردوں کے مقابلے میں ان کی تعداد بہت کم ہے۔ اپنی قلمی صلاحیت کے اعتبار سے بھی یہ خواتین ایم جے اکبر اور احمد سعید خاں وغیرہ کے مقابلے میں نہیں آتی ہیں۔ دراصل اردو سے آشنا خواتین نے صحافت کو بہت بعد میں لائق توجہ سمجھا ہے۔ اس لیے جس آزاد ماحول اور کھلے ذہن و دماغ کی ضرورت ہے اس سے ہماری خواتین اب قریب ہو رہی ہیں۔ اب تو باضابطہ صحافت کی تعلیم مختلف یونیورسٹیوں میں ہو رہی ہے۔ مردوں کے ساتھ خواتین بھی صحافت میں سند حاصل کر رہی ہیں۔ ویسے اس کورس کے لیے جن سہولتوں کی ضرورت ہے وہ فی الحال ہر یونیورسٹی میں دستیاب نہیں ہیں۔ خاص کر اردو مضمون میں بڑی تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ نہ تو اس فن کے ماہر اساتذہ ہیں نہ دیگر سہولتیں میسر ہیں۔ برقی میڈیا میں خواتین صحافیوں کی تعداد دنوں دن بڑھتی جا رہی ہے لیکن اردو زبان سے دوری اردو صحافت کے عمومی معیار کو مجروح کر رہی ہے۔ مثل مشہور ہے کہ 'بات کہنے کو بھی سلیقہ چاہیے'۔ ہمارے خیال میں اردو ادب سے ناواقفیت نے حُسنِ گفتار میں کمی پیدا کی ہے جبکہ صحافت کے پیشے میں زبان دانی ایک ضروری شرط ہے، خاص کر اردو شعر و ادب سے واقفیت زور خطابت کے لیے ضروری ہے۔

صحافت کی ایک اہم شاخ جرائد و رسائل کی اشاعت بھی ہے۔ خواتین کی ایک بڑی تعداد زمانہ دراز سے مدیرہ یا معاون مدیرہ کی حیثیت سے مختلف و متنوع اردو رسائل و جرائد میں

دیکھی جاسکتی ہے۔ یقینی طور سے ان میں سے بیشتر کے نام صرف نام تک ہی ہیں، کام کے معاملے میں ان کا صحافتی شعور ایک دم ناپختہ ہے۔

ادبی صحافت میں ہمارے پیش نگاہ 1910 میں مس زہرا نذر الباقر کا نام ہے جو اخبار ''پھول'' کی ایڈیٹر تھیں اور حقوقِ نسواں پر زوردار مضامین لکھا کرتی تھیں۔ ان کے کئی ناول بھی یادگار ہیں۔ دوسرا اہم نام محمدی بیگم کا ہے۔ موصوفہ خود اپنے عہد کی اچھی ادیبہ اور ناول نگار تھیں۔ اردو کے ممتاز ڈراما نگار امتیاز علی تاج کی والدہ اور مولوی سید ممتاز علی کی اہلیہ تھیں۔ ان کی ادارت میں خواتین کا مقبول عام جریدہ ''تہذیب نسواں'' پنجاب (لاہور) سے نکلتا تھا۔ اس میں بیشتر خواتین قلمکاروں کی تحریریں ہوتی تھیں۔

آزادی سے قبل اگست 1943 میں بنگلور سے ''نیا دور'' کا اجرا ہوا، جس کی ادارت ممتاز شیریں اپنے خاوند صمد شاہین کے ساتھ کرتی تھیں۔ ممتاز شیریں اردو ادب میں کئی حیثیتوں سے ممتاز ہیں۔ فکشن نگار ہونے کے ساتھ فکشن کی بہترین ناقد، اردو انگریزی دونوں زبانوں پر یکساں دسترس، منٹو شناسی میں ماہر اور ایک دانشور خاتون صحافی کی حیثیت سے وہ ہمیشہ یاد کی جائیں گی۔

مقبول عام رسالہ ماہنامہ ''آجکل'' دہلی میں محترمہ نرگس سلطانہ معاون مدیرہ کی حیثیت سے ایک عرصے سے کام کر رہی ہیں اور اپنی اعلیٰ کارکردگی سے متاثر کر رہی ہیں۔

خواتین کا رسالہ ''بزمِ ادب'' علی گڑھ جس کی مدیرہ مشہور شاعر خلیل الرحمٰن اعظمی کی اہلیہ راشدہ خلیل ہیں۔ یہ رسالہ سال میں ایک بار ماہ جنوری میں منظرِ عام پر آتا ہے۔ اب تک اس کے کل 17 یا 18 شمارے آچکے ہیں۔ ادبی لحاظ سے ''بزمِ ادب'' خواتین کے ادب میں انفرادیت قائم کر چکا ہے۔ اس میں صرف خواتین کی ہی نگارشات شائع ہوتی ہیں۔

جنوبی ہند کا کثیر الاشاعت و مقبول عام جریدہ ''زرّیں شعاعیں'' جو ماہنامہ کی صورت میں پابندی کے ساتھ بنگلور سے شائع ہو رہا ہے، اس میں پرنٹر، پبلشر اور ایڈیٹر کی حیثیت سے محترمہ فریدہ رحمت اللہ ہیں، تقریباً 26 سال سے شائع ہونے والا دلچسپ معلوماتی مجلّہ ہے جس میں مذہبی، ادبی، سیاسی، علمی و سائنسی غرض تمام موضوعات کا احاطہ کیا جا رہا ہے۔ مجلسِ مشاورت میں بھی تمام نام خواتین کے ہیں۔ ہمارے پیش نظر خواتین صحافیوں میں محترمہ فریدہ رحمت اللہ کا نی

مشہور و مقبول ہیں۔

شہر الہ آباد سے شائع ہونے والا سہ ماہی ''پہچان'' خالص ادبی و تنقیدی مزاج کا حامل ہے اور ادب میں اس کی واقعی ایک پہچان ہے۔ اس کی ادارت محترمہ زیب النساء اور اشفاق نعیم کرتی ہیں۔ حیدر آباد سے نکلنے والا مشہور و خالص ادبی رسالہ ''شعر و حکمت'' (کتاب دو، دور سوم) مرتبین میں شہریار اور مغنی تبسم کے ساتھ اختر جہاں بحیثیت ایڈیٹر اور شفیق فاطمہ شعریٰ معاون کی حیثیت سے جلوہ افروز تھیں۔ ایک زمانے میں ''سوغات'' بنگلور میں محمود ایاز کے ساتھ ان کی اہلیہ مریم ایاز کے علاوہ شائستہ یوسف بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ سہ ماہی ''جہانِ اردو'' دربھنگہ میں ڈاکٹر رابعہ مشتاق، پرنسپل مشتاق احمد اور امام اعظم کے ہمراہ زہرہ شمائل بحیثیت مدیرہ نظر آرہی ہیں۔ کتابی سلسلہ سہ ماہی ''آمد'' پٹنہ میں مدیر اعزازی خورشید اکبر ہیں اور مدیرہ ان کی بیگم عظیمہ فردوسی ہیں۔ عہد حاضر میں اردو کا یہ ایک معیاری رسالہ ہے، جس میں ادب کے زندہ لہو گردش آپ محسوس کر سکتے ہیں۔

''کوہسار جرنل'' (بھاگلپور) میں ڈاکٹر مناظر عاشق کے ساتھ نینا جوگن ''مباحثہ'' (پٹنہ) میں پروفیسر وہاب اشرفی کے پہلو بہ پہلو محترمہ نسیمہ اشرفی کو بحیثیت خاتون صحافی آپ دیکھ سکتے ہیں۔ حالیہ ''بیسویں صدی'' میں مدیرہ شمع افروز زیدی اور ''پاکیزہ آنچل'' میں رخسانہ صدیقی بحسن و خوبی مدیرہ کے فرائض انجام دے رہی ہیں اور عوامی ادبی حلقے میں یہ دونوں رسائل خاصے مشہور و مقبول ہیں۔ ''بانو'' (دہلی) اب بند ہے مگر خواتین میں کسی زمانے میں اپنی پہچان رکھتا تھا۔ اسی طرح عصمت، حریم، خاتونِ مشرق وغیرہ میں بھی خواتین کی صحافت کے نمونے موجود ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا جدیدیت کا ترجمان رسالہ ''شب خون'' کی مدیرہ ایک طویل عرصے تک فاروقی کی اہلیہ عقیلہ شاہین تھیں۔ کرناٹک اردو اکادمی کی سکریٹری اور اکادمی کے رسالے کی مدیرہ محترمہ فوزیہ چودھری ہیں۔ 1966 میں بمبئی سے ''قمر'' رسالہ نکلتا تھا جس کی مدیرہ شاعرہ مینا ناز تھیں اور معاون شاد کمرالوی تھے۔

اب ذرا عظیم آباد کی طرف آیئے اور ماضی میں جایئے۔ دسمبر 1967 میں پٹنہ شہر سے ''زیور'' خواتین کا مقبول ترین جریدہ محترمہ سلمیٰ جاوید کی ادارت میں شائع ہوا تھا اور 73-1972

تک باقاعدگی سے محترمہ ''زیور'' کو آراستہ کرتی رہیں۔ سلمیٰ اردو کی اچھی اسکالر اور افسانہ نگار تھیں، ماہ منیر خاں کی صاحبزادی تھیں، ان کے بڑے بھائی رضوان احمد خاں مدیر اعزازی کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ خود ایک مشہور و بیباک صحافی تھے۔ ''عظیم آباد ایکسپریس'' موصوف کی شعلہ بیانی کے لیے آج بھی مشہور ہے۔

شہر گیا سے نکلنے والا رسالہ ماہنامہ ''آہنگ'' جس کے چیف ایڈیٹر کلام حیدری تھے۔ مدیر کے کالم میں نوشابہ حق کا نام دیکھنے کو ملتا ہے۔ روزنامہ ''پندار'' پٹنہ جو آج بھی باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے، قائم شدہ ایڈیشن 1974 میں ایڈیٹر کی حیثیت سے جہاں آرا صاحبہ تھیں۔ پٹنہ سے نکلنے والا روزنامہ ''اِن دنوں'' کی مدیرہ نکہت سلطانہ ہیں۔ 91-1990 میں روزنامہ صرف ایک روپے کی قیمت میں اپنے قارئین کے ذوق کی تسکین کرتا تھا۔ ہفتہ وار ''وطن کے رنگ'' پٹنہ میں قاضی عبدالوارث کے ساتھ خورشید جہاں ہیں۔ پندرہ روزہ اخبار ''مگدھ پنچ'' پٹنہ 1978 میں معصوم اشرفی کے ساتھ محترمہ شمشاد جہاں کو دیکھ سکتے ہیں۔ رسالہ ''مفاہیم'' دور اول گیا 1979 میں افسری جبیں صاحبہ، تاج انور اور شاہین نظر کی معاون ہیں۔ ''زیب النساء'' نام سے ایک رسالہ 1937 میں چھپرہ سے شائع ہوا تھا۔ مدیرہ کا نام بھی زیب النساء ہی ہے۔

مجھے اس بات کا احساس ہے کہ ناموں کی اس کھتونی میں خواتین صحافیوں کی خدمات کا عکس نمایاں نہیں ہو سکا ہے۔ اس لیے کہ ہر نام کے ساتھ کوئی نہ کوئی اہم نام بھی سامنے آ گیا ہے۔ البتہ اردو صحافت کی عام صورتِ حال کے پیشِ نظر یہ تو کہا ہی جا سکتا ہے کہ اردو صحافت کا معیار ابھی بہت تسلی بخش نہیں ہے۔ یہاں ادبی و شعری حصہ ضرور بہت زرخیز ہے مگر سائنسی اور آئے دن ہونے والی نئی نئی تحقیقات سے اردو صحافت کو رنگین اور کارآمد بنانے کی ضرورت ہے۔ ہماری خواتین صحافی اس طرف آسانی سے توجہ دے سکتی ہیں۔

# ادبی رسائل اور خواتین کی خدمات

مہرین قادر حسین۔ ماریشس

اردو ادب کا بڑا سرمایہ اب بھی رسائل کے صفحات میں پوشیدہ ہے۔ بعض چیزیں کتابی شکل میں ہمارے سامنے ضرور آجاتی ہیں مگر بعض تخلیقات اور تنقیدات رسالوں میں گم ہو جاتی ہیں۔ ہمارے نئے اور پرانے محقق ان تحریروں کی نشاندہی کرتے ہیں جس کی ایک صورت اشاریہ سازی ہے اور دوسری صورت اس رسالے کی اہم تخلیقات اور تنقیدات کا انتخاب شائع کیا جاتا ہے جس سے مجموعی طور پر قارئین کو رسالے کے مزاج کے ساتھ اس میں شامل بیشتر چیزوں کا اشارہ مل جاتا ہے۔ رسالے کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے نوشاد منظر لکھتے ہیں:

> ''رسائل کی تاریخی ہی نہیں بلکہ عصری معنویت بھی ہوتی ہے، ہم جسے تاریخی دستاویز کہتے ہیں اس میں کسی نہ کسی طور پر حال کا چہرہ بھی پوشیدہ ہوتا ہے اس بات کا تعلق رسالے میں شائع شدہ مشمولات سے ہوتا ہے۔ کسی عہد کی ادبی، سماجی اور تہذیبی صورت حال کو سمجھنے کے لیے رسائل ایک اہم ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ رسائل ہی دراصل ادب اور

تہذیب کی مجموعی صورت حال سے ہمیں آشنا کرتے ہیں۔اس اعتبار سے
رسالے ہماری ادبی اور تہذیبی تاریخ کا استعارہ بن جاتے ہیں۔''

(رسالہ شاہراہ: تجزیاتی مطالعہ اور اشاریہ۔نوشاد منظر۔ص:11)

موضوع چونکہ ''ادبی رسائل اور خواتین کی خدمات'' ہے،لہٰذا میں نے اپنے مطالعے کا دائرہ ان رسائل تک محدود رکھا ہے جو خواتین کے لیے محدود رہے ہوں یا جن کی ادارت خاتون مدیرنے کی ہو۔خاتون کے ادبی رسالے کے موضوع کا دائرہ اتنا پھیلا ہوا ہے کہ اس پر کئی تحقیقی کام ہو سکتے ہیں۔چونکہ میں اس خطے سے تعلق رکھتی ہوں جہاں تمام ادبی رسائل کی دستیابی ممکن نہیں لہٰذا میں نے رسالہ 'خاتون دکن' رسالہ 'روشی' اور رسالہ 'روشنی' کے حوالے سے اپنا یہ مضمون تحریر کیا ہے۔

اردو میں صحافت کی عمر کوئی دوسو برس کے عرصے پر محیط ہے۔مگر جہاں تک خاتون صحافی یا خاتون کی صحافت کا تعلق ہے تو آزادئ ہند تک اس میدان میں چند ہی ایسے رسالے شائع ہوتے تھے جن میں خواتین قلم کاروں کی تحریریں شائع ہوا کرتی تھیں۔دراصل اس کی اصل وجہ اس زمانے کی سماجی اور مذہبی بندشیں تھیں۔اس زمانے کا ایک رسالہ 'معلم نسواں' تھا۔ جسے 1892 میں محبّ حسین نے جاری کیا۔اس رسالے کی خوبی یہ تھی کہ اس میں عورتوں اور لڑکیوں کی تربیت کی مناسبت سے مضامین شامل کیے جاتے تھے۔اس رسالے میں عورتوں کی تعلیم، پردہ، لباس اور اسلام میں عورتوں کے مقام کے حوالے سے مضامین شائع ہوتے تھے۔

آزادی سے قبل جو چند رسالے شائع ہوا کرتے تھے ان میں رسالہ ''عصمت'' کا نام سرفہرست ہے۔ اس رسالے کو علامہ راشد الخیری نے1908 میں جاری کیا۔مولانا نے اس رسالے کی ادارت بھی کی۔خواتین کو علم کی رغبت دلانے ان کی تربیت کرنے اور ان کے اندر علمی و ادبی صلاحیتیں پیدا کرنے کی غرض سے علامہ راشد الخیری نے خواتین کے فرضی نام سے اس رسالے میں مضامین تحریر کیے۔بعد میں مولانا کی بیگم اور معروف ادیبہ آمنہ نازلی نے بھی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی۔1980 تک یہ رسالہ پوری آب وتاب کے ساتھ شائع ہوتا رہا مگر اس کے بعد اس رسالے کا سراغ نہیں ملتا۔

رسالہ 'النساء' بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ رسالہ النساء کا پہلا شمارہ 1919 میں محترمہ صغریٰ ہمایوں مرزا کی ادارت میں شائع ہوا۔ یہ خواتین کا رسالہ تھا جس میں زیادہ تر خواتین کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس رسالے کی مدیرہ ایک اصلاحی اور انقلابی مزاج کی خاتون تھیں۔ مدیرہ نے ایسے مضامین شائع کیے جن میں عورتوں کی تعلیم و تربیت پر زور دیا گیا ہو۔

رسالہ 'خاتون دکن' کا پہلا شمارہ نومبر 1962 میں منظر عام پر آیا، اس اہم رسالے کی مدیر اعلیٰ محترمہ صالحہ الطاف تھیں، جو خود ایک اچھی افسانہ نگار تھیں۔ یہ رسالہ ترقی پسند مزاج کا حامل رسالہ تھا باوجود اس کے اس نے کلاسیکی سرمائے سے نظریں نہیں چرائیں بلکہ اس رسالے میں خواتین کے ساتھ ساتھ مرد قلمکاروں کی تحریریں بھی شائع ہوتی تھی۔ معین احسن جذبی، یوسف حسین خان، سید حرمت الاکرام، سیدہ جعفر، خدیجہ مستور اور فضا ابن فیضی جیسے اہم لکھنے والوں کی تحریں شائع ہوا کرتی تھیں۔

رسالہ خاتون دکن میں ''نقش اول'' کے عنوان سے اداریے شائع ہوا کرتے تھے جن میں اردو زبان وادب کے مسائل پر روشنی ڈالی جاتی تھی۔ ایک اداریہ ملاحظہ ہو:

> ''جو زبان ہندوستان کی تہذیب کی آئینہ دار ہے، جس زبان نے اپنے اور پرائے کے احساس کو مٹایا، جس زبان میں ہندوستان کے دل کی دھڑکنیں شامل ہیں، جس زبان نے اندھیروں میں روشنی کا پیغام دیا۔ آج اس زبان کو تسلیم کرنے میں تامل سے کام لیا جارہا ہے۔ اردو زبان کی بے بسی پر صرف اظہار ہمدردی کرنا اردو کے حق میں سخت ناانصافی ہے۔ جس زبان میں زندگی کے آثار نمایاں ہیں وہ زبان کبھی ختم نہیں ہوسکتی۔ اردو زبان حالات کی بے راہ روی کے باوجود اپنا احساس دلاتی رہے گی۔''

رسالہ 'خاتون دکن' میں خدیجہ مستور کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس کا عنوان ''بیٹی'' تھا۔ اس مضمون میں انھوں نے لڑکے اور لڑکی کے درمیان ہونے والے فرق کو سماج کے لیے نقصاندہ بتایا ہے، ان کا خیال ہے کہ بیٹا ہو یا بیٹی والدین کو چاہیے کہ دونوں کی تعلیم و تربیت کا

یکساں طور پر خیال رکھیں۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے سماج میں بیٹا اور بیٹی میں فرق کیا جاتا ہے والدین بیٹی کو تعلیم دلانے کے بجائے ان کو امور خانہ داری میں لگا دیتے ہیں۔والدین کے اس رویے سے لڑکیوں کے اندر احساس کمتری پیدا ہو جاتا ہے جس سے کئی طرح کے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

رسالہ خاتون میں سنجیدہ موضوعات پر تو مضامین ملتے ہی ہیں ساتھ ہی انشائیے اور طنز و مزاح بھی اس رسالے کی زینت بنتے رہے۔خود مدیرہ صالحہ الطاف طنز و مزاح کے گرتے معیار سے پریشان تھیں اور اس کو بہتر بنانے کی کوشش میں لگی رہتی تھیں،یہی وجہ ہے کہ اس رسالے میں طنز و مزاح پر کئی اچھے مضامین شائع ہوئے۔مجتبیٰ حسین،سرور جمال،احسن علی مرزا اور پروین سرور وغیرہ کی تحریروں نے بھی طنز و مزاح کو ایک نئی سمت دینے کی کوشش کی۔

رسالہ 'خاتون دکن' میں افسانے اور ڈرامے بھی کثرت سے شائع ہوا کرتے تھے۔جن افسانہ نگاروں کی کہانیاں اس رسالے میں شائع ہوئیں ان میں علی عباس حسینی، کیدار شرما، زین العابدین، سلمیٰ شاکر اور طاہرہ صدیقی کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔قرۃ العین حیدر کا ناولٹ ''کارمن'' بھی اسی رسالے میں شائع ہوا تھا۔

جہاں تک شاعری کا تعلق ہے تو رسالہ' خاتون دکن' میں نظمیں، غزلیں، قطعات، رباعیات شائع ہوا کرتی تھی۔شعری تخلیقات کے حوالے سے اس رسالے کو اس زمانے کے شعرا کا پورا تعاون حاصل تھا۔شاذ تمکنت،شہریار،مظفر حنفی،قیس رام پوری،غلام مرتضیٰ راہی،اور حسرت جے پوری کی شعری تخلیقات اس رسالے میں شامل ہوئیں۔

خاتون دکن کی ایک اہم خوبی یہ تھی کہ اس رسالے میں شائع ہونے والے مواد کو صنف کے اعتبار سے الگ الگ نام دیا جاتا تھا،مثلاً اداریے کے لیے جہاں ''نقش اول'' کا عنوان تھا وہیں تخلیقات کے لیے'' سوز و ساز''، تبصروں کے لیے'' سرگزشت دل'' مستقل کالم کے لیے ''عکس جمیل'' اور قارئین کے خطوط اور ان کی آرا کے لیے'' آواز جرس'' کا عنوان ملتا ہے۔

رسالہ 'قلم کار' احمری بیگم کی ادارت میں نکلنے والا ایک اہم رسالہ تھا۔یہ رسالہ مغل اکیڈمی حیدرآباد سے شائع ہوتا تھا بلکہ یہ رسالہ اکیڈمی کا ترجمان تھا۔اس رسالے کی مجلس مشاورت

میں ابوظفر، عبدالواحد، رفیعہ سلطانہ، جہاں بانو نقوی اور سید مہدی حسین وغیرہ شامل تھے۔ رسالہ 'قلم کار' کا اداریہ 'سوجھ بوجھ' کے عنوان سے شائع ہوتا تھا۔ یہ ایک کلاسیکی اقدار کے ساتھ ساتھ ترقی پسند فکر کا ترجمان رسالہ تھا۔ کسی بھی رسالے کا مزاج اس کے اداریے سے پتہ چلتا ہے۔ اس رسالے کے اداریے کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس رسالے کا مقصد ترقی پسند تحریک کی صحت مند ترویج و اشاعت کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب کی صورت حال کو مزید بہتر بنانے اور استحکام بخشنے کی کوشش کرنا تھا۔

خواتین کی نمائندگی کرنے والا ایک اہم رسالہ '' روشنی'' تھا۔ یہ رسالہ ہاجرہ بیگم کی ادارت میں دہلی سے شائع ہوتا تھا۔ اس رسالے کے سرورق پر ''انجمن خواتین ہند کا ماہنامہ رسالہ'' درج ہوتا تھا۔ اس جملے سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس رسالے کا اصل اور بنیادی مقصد عورتوں کے اندر حقوق کے تئیں بیداری پیدا کرنا اور ان کو بااختیار بنانے کا تھا، شاید یہی وجہ ہے کہ اس رسالے میں شامل بیشتر تحریروں کا تعلق خواتین کے مسائل سے ہوتا تھا۔ ہاجرہ بیگم نے اپنے ایک اداریے میں لکھا ہے کہ خواتین کو سیاست میں عملی حصہ لینا چاہیے کیونکہ یہی وقت کی ضرورت ہے۔ رسالہ روشنی نے عورتوں کے اندر سماجی اور معاشرتی بیداری کے ساتھ ساتھ سیاسی بیداری کو بھی وقت کی اہم ضرورت سمجھا اور اپنے مقاصد کی حصولیابی کے لیے ایسے مضامین شائع ہوئے جن میں مرد اور عورت کے درمیان پیدا ہوئے سماجی، سیاسی اور معاشرتی فرق کو مٹایا جاسکے اسے کم کیا جاسکے۔ اس رسالے نے عالمی پیمانے پر خواتین کے مسائل کو اپنے رسالے میں جگہ دی یہی وجہ ہے کہ انڈونیشیا میں ہوئی خواتین تحریک بلکہ بین الاقوامی سطح پر ہو رہی تحریکوں کے متعلق مضامین کو اپنے صفحات پر جگہ دی۔

بیسویں صدی میں شائع ہونے والا ایک اہم رسالہ ''روشی'' تھا۔ اس رسالے کی ادارت رونق جہاں زیدی کے ہاتھوں میں تھی۔ یہ ایک ادبی نوعیت کا رسالہ تھا، جس میں ادبی مضامین کے علاوہ تمام اصناف ادب اور شاعری کو جگہ دی جاتی تھی مگر رسالے کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مدیرہ کے پیش نظر افسانے کی ترویج و اشاعت اہم مسئلہ تھا، یہی وجہ ہے کہ تقریباً تمام ہی شماروں میں 7 سے 8 افسانے شائع ہوا کرتے تھے۔

رسالہ ''روشنی'' کی نوعیت گرچہ ایک ادبی رسالے کی تھی مگر اس رسالے نے سماجی، معاشی اور سیاسی مسائل کو بھی اپنے صفحات پر خصوصیت کے ساتھ شائع کیا۔ مارچ 1973 کا ایک اداریہ ملاحظہ کریں:

''اگر ہمیں ملک سے تعصب، تنگ نظری اور فرقہ پرستی کا قلع قمع کرنا ہے تو ہمیں عقلی سطح پر نیچے اتر کر دلوں اور جذبات کے ذریعے کام کرنا ہوگا اور ہندو مسلمانوں میں باہمی میل ملاپ کی فضا استوار کرنے کے لیے کلچر اور زبان کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوشش کرنی ہوگی کیونکہ یہ مسلمہ ہے کہ کلچر کا ہتھیار ایسا قوی ہتھیار ہے جس نے دنیا کی قوموں کی تقدیریں بدل دیں اور جس کا توڑ آج تک نہیں پیدا ہو سکا۔''

رسالہ روشنی کے ذمہ داران نے وقت کی ضرورت کے پیش نظر ادبی اور خواتین کے مسائل کے ساتھ ساتھ قومی یکجہتی پر بھی زور دیا ہے۔ رسالہ روشنی کا ڈاکٹر ذاکر حسین نمبر قابل ذکر ہے۔ یہ شمارہ مئی تا جون 1973 میں شائع ہوا۔ اس شمارے میں رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر مجیب، آل احمد سرور، ڈاکٹر سلامت اللہ اور عابد رضا بیدار جیسی علمی شخصیات کے مضامین شامل تھے۔ اس کے علاوہ غلام ربانی تاباں، عرش ملسیانی، جگن ناتھ آزاد شہریار اور نازش پرتاپ گڑھی جیسے شعرائے کرام کی نظمیں شائع ہوئیں جس میں شعرا نے ڈاکٹر ذاکر حسین کو خراج عقیدت پیش کیا تھا۔

مجموعی طور پر خواتین کے مسائل پر بیسویں صدی میں کئی اہم رسالے منظرِ عام پر آئے، ظاہر ہے تمام رسالوں پر تفصیلی گفتگو کرنے کا یہ موقع نہیں۔ میں نے چند رسالوں کے حوالے سے اردو صحافت میں خواتین کی شمولیت کے ساتھ ساتھ ان کی ترجیحات کو جاننے کی کوشش کی ہے۔ یہ رسالے دراصل حقوق نسواں میں کافی معاون ثابت ہوئے۔ تانیثیت کی ابتدائی شکل بھی کہیں نہ کہیں ان رسالوں میں نظر آتی ہے۔ معاصر عہد میں بھی کئی خواتین اپنی تحریروں سے صحافتی خدمات انجام دے رہی ہیں۔

# اردو صحافت: خواتین اور اطفال

خیال انصاری

بیسویں صدی کی ابتدا تحریکِ آزادی کا ہنگامہ خیز دور تھا جس میں کئی اخبارات نہ صرف جاری ہوئے بلکہ اردو صحافت کے کارواں کو آگے بڑھانے میں بھی نمایاں کردار ادا کیا، قومی یکجہتی اور تحریکِ آزادی میں اردو صحافت کے کارہائے نمایاں ملک کی تاریخ کا روشن باب ہیں۔ اسی طرح آزاد ہندوستان میں ملک وملت کی ذہنی تعمیر وتشکیل اور معاشرتی تانے بانے کو مستحکم کرنے میں بھی ملک کی اردو صحافت نے جو اہم رول نبھایا ہے وہ بھی پوشیدہ نہیں۔

بلاشبہ ذرائع ابلاغ وہ قوت متحرکہ ہے جس سے دنیا کے مختلف معاشروں، مختلف اداروں میں سیاسی، مذہبی، ثقافتی اور تمدنی انقلابات رونما ہوئے ہیں۔ اس لیے ابلاغ وصحافت کی اہمیت وضرورت ہر دور میں مسلّم رہی ہے۔ صحافت کی ایک تعریف یہ بھی ہے کہ سماج اور وقت کے تناظر میں لوگوں کو معلومات دے کر انھیں باخبر کرنا، انھیں فیصلہ کرنے اور سوچنے کے قابل بنانا، نیز علم، خیالات کو سچائی اور جزئیات کے ساتھ الفاظ وتصویر کے ذریعے دوسروں تک پہنچانا ہی صحافت ہے۔ یہ صرف خشک اطلاعات کا مجموعہ یا اندھیرے کو روشنی میں بدلنے والا پیشہ یا عمل نہیں بلکہ یہ تو

قوم کی خدمت کا ذریعہ اور اسے بیدار رکھنے سے عبارت ہے۔ صحافت ایک باوقار اور بے خوف، فنِ شریف ہے اور اس عمل میں علم کا باب ہمیشہ کھلا رہتا ہے اور اصلاح کا در بھی۔ یہی وجہ رہی ہے کہ گزرتے ماہ و سال کے ساتھ ساتھ حالات و ضروریات کے باعث اطلاعات و ترسیل کے علاوہ دیگر مقاصد بھی صحافت کے دامن میں پناہ لیتے چلے گئے۔

اردو صحافت اور ادب کو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ کیونکہ اردو صحافت نے ادب کو فروغ دیا ہے تو ادب نے صحافت کو جلا بخشی ہے۔ یہی سبب ہے کہ بیشتر صحافی اپنے دور کے نامور ادیب اور شاعر بھی رہے ہیں۔ جنھوں نے ادب اور صحافت کو نئی زندگی اور تازگی دی۔

تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ بیسویں صدی میں ادبی صحافت کا آغاز مکمل ہوا اور دورِ حاضر میں بھی تمام اہم اخبارات میں گوشۂ ادب کو اپنا جُز بنا رکھا ہے۔ نیز ادبی رسائل و جرائد کی موجودگی نے ادبی صحافت کو بھی استحکام بخشا ہے۔ جہاں تک اردو ادب اور ادبی صحافت کا تعلق ہے تاریخِ اردو سیکڑوں شاعرات اور خاتون قلم کاروں کے تذکرے سے مالا مال ہے۔ ادبی صحافت سے خواتین کی وابستگی سے جہاں خواتین کے لیے رسائل و جرائد شائع ہوتے رہے ہیں، جن میں غزل، نظم، کہانی اور ناول لکھ کر ایک طویل قامت سفر طے کیا۔ بعض قلم کار خواتین نے مدیر یا معاون مدیر کی خدمات بھی انجام دیں۔

ممتاز قلم کار صحافی برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال کی کوآرڈینیٹر ڈاکٹر مرضیہ عارف نے خاتون صحافیوں کے تعلق سے ''خواتین اور اردو صحافت'' موضوع کے تحت لکھا ہے کہ ''متحدہ ہندوستان میں اردو صحافت کی ایک پائدار بنیاد پڑ چکی تھی۔'' 1857 کی ملک گیر بدامنی انگریز حاکموں کی سخت گیری بھی جسے کمزور نہیں کر سکی۔ اردو اخبارات نے انگریزوں کی ملک دشمنی اور مظالم کے خلاف دبے اور چھپے لفظوں میں اپنا احتجاج درج کرانے کے لیے طنز و مزاح کے علاوہ خواتین کے قلمی نام سے عصری موضوعات پر لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اس کا مقصد خواتین میں سیاسی، سماجی اور معاشی شعور پیدا کرنا بھی تھا تاکہ انھیں اپنے مسائل اور ملک و قوم کی صورتِ حال خاص طور پر انگریز حاکموں کے ذریعے ہندوستانیوں کے استحصال کا اندازہ ہو سکے۔

ہندوستانی خواتین جو آزادی کی تحریک میں مردوں کے شانہ بشانہ انگریزوں کے خلاف لڑتی رہیں اور اردو صحافت (اخبارات) کی طرف اُن کی توجہ مبذول نہیں ہوئی۔ ایسی خواتین کی تعداد جنھیں آج کے معنوں میں ہم کُل وقتی (فُل ٹائم) صحافی کہہ سکیں مفقود ہی رہی ہے۔ اسی طرح روز نامہ اخبارات میں 20 ویں صدی کی ساتویں دہائی تک کوئی بھی خاتون نظر نہیں آتی، اس دہائی کے آخر میں اردو روز ناموں کی دنیا میں بھوپال کی خالدہ بلگرامی کا داخلہ ہوا۔ روز نامہ اخبارات میں خواتین کی نمائندگی کا یہ پہلا تجربہ 1978 میں آفتاب جدید بھوپال نے کر کے دوسری خواتین کو اردو روز ناموں میں داخلہ کی راہ دکھائی لیکن وہ بھی ہمہ وقت صحافی کی حیثیت سے ڈیسک پر کام کرتی رہیں۔ رپورٹنگ سے ان کا تعلق نہیں رہا۔ اردو کا دوسرا روز نامہ قومی آواز نئی دہلی ہے جس نے اپنے شعبۂ ادارت میں نور جہاں ثروت کو شامل کیا۔ بعد میں وہ انقلاب ممبئی کی نمائندہ برائے دہلی بھی رہیں اور اپنی رحلت تک اردو کالم نویسی کی خدمت انجام دیتی رہیں۔ اس سلسلے کا ایک اور نام حمیرہ قریشی کا ہے جنھوں نے حیدرآباد میں کالم نگاری اور رپورٹنگ کی خدمات انجام دیں۔

خواتین کے دو اہم رسائل خاتونِ مشرق اور بانو کا ذکر یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اپنی تاریخی خدمات ہیں اسی طرح حریم، آستانہ، بیسویں صدی، محفلِ صنم، حجاب جیسے رسائل کے لیے سعدیہ دہلوی، بیگم ریحانہ فاروقی، غزالہ صدیقی، ڈاکٹر شمع افروز زیدی، شہلا نواب، سیدہ نسرین نقاش، نینا جوگن، ثریا ظفر ہاشمی، جمیلہ فاروقی کی بھی ادبی رسائل کے لیے اپنی خدمات ہیں۔ دہلی سے پاکیزہ آنچل، مشرقی آنچل، خواتین کی دنیا کے علاوہ بنگلور سے ماہنامہ زرّین شعاعیں ایک مقبول جریدہ ہے، جس کو فریدہ رحمت اللہ بڑی محنت سے گذشتہ 27 برسوں سے مسلسل شائع کر رہی ہیں۔ پندرہ روزہ ''ہماری طاقت'' نامی اخبار جے پور، راجستھان سے پابندی سے شائع ہو رہا ہے، جس کی جوائنٹ ایڈیٹر ڈاکٹر زیبا زینت ہیں۔ ماہنامہ تمثیلِ نو دربھنگہ کی ادارت میں ڈاکٹر زہرہ شمائل شامل ہیں۔

ملکی صحافت میں خواتین کی نمائندگی پر مشتمل تفصیلات کے بعد ریاست مہاراشٹر میں ممبئی، اورنگ آباد، مالیگاؤں اور دیگر مقامات سے شائع ہونے والے اردو کے روز نامے، ہفت

روزہ، پندرہ روزہ اخبارات اور ادبی ماہناموں کے ایک سرسری جائزے میں جن خواتین کی جو خدمات اُجاگر ہوتی ہیں ان کے تحت مرحومہ اصغری بیگم سحر، مونسہ بشریٰ عابدی، ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی، رشیدہ قاضی، ریحانہ خطیب، فرزانہ انصاری، ریحانہ بستی والا، سعدیہ مرچنٹ، ریحانہ شیخ، غزالہ ناردی، رئیسہ منوّر، شیریں دلوی، رضیہ خان، ڈاکٹر شرمین انصاری، سید نوشاد بیگم محمود، شیخ شبانہ بانو، ڈاکٹر قمر سرور (احمد نگر)، ڈاکٹر عقیلہ غوث، ڈاکٹر نسیم بیگم، رعنا ایوب، صادقہ نواب سحر، فردوس جہاں (مالیگاؤں) شامل ہیں۔

اردو روز ناموں میں خواتین اور بچوں کے لیے، خصوصی صفحات یا کالمس میں جو مخصوص مواد شائع ہو رہا ہے یہاں اس کا ذکر بھی ضروری ہے۔ ملک کے سبھی اہم روز ناموں میں خواتین کے مضامین، کہانی، افسانے، ان کے اپنے مسائل، تعلیم و تربیت، رسوئی پکوان، فیشن اور خریداری کے تحت رہنمائی ہوتی ہے۔ اسی طرح بچوں کے لیے بھی ترتیب دیے گئے صفحات پر اسکولی سرگرمیوں، کامیابی اور سالگرہ کی مبارکباد کے ساتھ ہی نصابی کتب اور درسی معلومات، لطائف، کارٹون، کہانیاں جگہ پاتی ہیں۔

ممبئی کی اردو صحافت کی تاریخ کا اہم سنگِ میل کہا جانے والا روز نامہ ''ہندوستان'' گذشتہ آٹھ دہائیوں سے ممبئی کے علاوہ اب اورنگ آباد سے بھی شائع ہو رہا ہے۔ روز نامہ ہندوستان بلاشبہ ایک ''اسکول'' کا مقام رکھتا ہے جس سے اردو ادب اور صحافت کو بے شمار باصلاحیت افراد ملے ہیں جو آج اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ اس اخبار میں بھی درجن بھر عنوانات کے ساتھ بہتر مواد، خبروں کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔

روز نامہ ''انقلاب'' کی اپنی ایک تاریخ ہے جو کہ نہ صرف مہاراشٹر بلکہ اب قومی سطح پر بھی معیاری و معتبر مانا جاتا ہے۔ موضوعات اور حالاتِ حاضرہ پر، تحقیقی انفرادیت کے ساتھ واضح موقف لیے ہوئے جائزے اور تبصرے اس کی خصوصیات ہیں۔ خواتین اور بچوں کے صفحات کا بڑا اہتمام ہے۔ روز نامہ انقلاب ایک مکمل اخبار ہے جس کے صفحات گھر کے ہر فرد کے لیے، اسکولوں، مدارس اور انجمنوں کے لیے، بہتر مواد فراہم کرتے ہیں۔ بچوں کی تعلیمی رہنمائی اور مستقبل میں روزگار کے مواقع کی تفصیلات بھی اس کا اہم جزو ہیں۔

روز نامہ اردو ٹائمز بھی مہاراشٹرا کا ایک اہم اخبار ہے جس کے صفحات بھی اپنے قارئین کو بہتر سے بہتر مواد فراہم کرتے ہیں۔اس کی اپنی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ریاست کے چھوٹے سے چھوٹے مقامات کی خبریں اور عوامی و ادبی، تعلیمی سرگرمیوں کو اہمیت سے شائع کیا جاتا ہے۔

روز نامہ راشٹریہ سہارا ممبئی بھی قلیل مدت میں اپنا ایک مقام بنانے میں کامیاب ہوا ہے۔اس کے صفحات بھی رنگا رنگ مشمولات سے مزین ہوتے ہیں۔روز نامہ صحافت ممبئی کے علاوہ لکھنؤ اور دہرہ دون سے بھی شائع ہوتا ہے۔ان کے علاوہ ہفت روزہ سیرت،قومی تحریک، اخبار صداقت، صحافت کی شمع روشن کیے ہوئے ہیں۔ماضی میں اخبار عالم،اردو بلٹز،روز نامہ مہانگر جیسے اخبارات کی بھی دھوم رہی ہے۔

ممبئی کے بعد مراٹھواڑہ میں اورنگ آباد سے نصف صدی سے شائع ہونے والا اخبار اورنگ آباد ٹائمز بھی ایک اہم اخبار ہے۔اس کے علاوہ ایشیا ایکسپریس، شمع رہبر، اورنگ آباد ایکسپریس اور روز نامہ ہندوستان نیز سہ ماہی عکس ادب بھی شائع ہو رہا ہے۔اسی طرح لاتور سے ورق تازہ، ناگپور سے اخبار دعوت، المیزان،تحریکِ اصلاح جبکہ سولا پور سے اردو میلہ،کوکن سے کوکن کی آواز، ضلع دھولیہ سے معیارِ حق، سچا ہتھیار، ترجمانِ خاندیش،صدائے خاندیش اور احمد نگر سے ہفت روزہ مخدوم پابندی سے شائع ہو رہے ہیں۔

ریاست مہاراشٹر میں شہر مالیگاؤں اپنی گوناگوں خصوصیات کے باعث جانا جاتا ہے۔ جہاں شعر و ادب کی انجمنیں آباد ہیں وہیں صحافت کے ایوان بھی روشن ہیں۔شہر مالیگاؤں سے بیک وقت سات روز نامے جن میں شامنامہ، ترجمانِ اردو، ڈسپلن، نشاط نیوز، روز نامہ، دیوانِ عام اور بنکر ایکسپریس اور ہفت روزہ اخبارات میں عوامی آواز، بیباک، شہر یار، ندائے بنکر، ڈسپلن، نشانِ افق، شورش اور خیر اندیش ویکلی کے علاوہ ہفت روزہ البیان، ندائے شمس اور روشنی جیسے دینی اخبارات نیز ماہ نامہ بیباک شائع ہو رہے ہیں۔ واضح ہو کہ ممبئی کے اردو اخبارات اور مراٹھی و انگریزی اخبارات کی موجودگی میں بھی یہ تمام اخبارات بلا ناغہ شائع ہو کر عوام میں مقبول ہیں۔ان اخبارات میں بھی خواتین اور بچوں کے کالم اور صفحات شامل ہوتے ہیں۔ملک میں بچوں کے واحد

ہفت روزہ اخبار ''خیر اندیش'' اور ماہنامہ ''گلشنِ اطفال'' کی مسلسل اشاعت بھی اپنی انفرادی شناخت رکھتی ہے۔

اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اخبارات و رسائل چلتے پھرتے مدارس ہوتے ہیں۔ یہ عمارتوں کی حدود سے آزاد اور کسی علاقے کی قید سے بھی بالاتر ہوتے ہیں۔ ان کے ذریعے عوام تہذیب سے واقف ہوتے ہیں۔ تعلیم و تربیت، اصلاح و تبلیغ ان سے ہی بہتر طور پر ہوتی ہے۔ سماج و معاشرے کی تعمیر و تشکیل میں ان کا حصہ ہوتا ہے۔ اسی سماج کا ایک حصہ ''اطفال'' بھی ہیں جو کہ قوم و ملک کا مستقبل بھی ہوتے ہیں۔ نسلِ نو کی اپنی زبان سے واقفیت، بول چال، تعلیم و تدریس میں اردو زبان کے استعمال اور بچوں کے ادب کی تخلیق کو ایک بڑی ذمہ داری تصور کرتے ہوئے اردو کے اکابرین نے بچوں کے ادب اور بچوں کی صحافت پر خصوصی توجہ دی تھی۔ چنانچہ ہر دور میں خواتین کے رسائل کے ساتھ ہی ایسے رسائل بھی شائع ہوتے رہے ہیں جو یا تو بچوں سے متعلق رہے یا پھر بچوں کی دلچسپی کا بھرپور مواد ان میں شامل رہا۔

ماضی میں ماہنامہ ''کھلونا'' دہلی، ماہنامہ بچوں کی دنیا (گیا) ماہنامہ نرالی دنیا، غنچہ، نونہال، اسکول ٹائم، کلیاں، ثانی، ماہنامہ چندا نگری، ماہنامہ عینی، ماہنامہ مسرت اور مالیگاؤں کے اردو کومک، بچوں کا ساتھی، ہیرا اور جل پری، جیسے رسائل کی دھوم تھی۔ ان دنوں ماہنامہ بچوں کی دنیا، امنگ، پیامِ تعلیم، نور، ہلال، اچھا ساتھی، گل بوٹے، فنکار نو، گلدستۂ تعلیم اور گلشنِ اطفال مالیگاؤں جیسے ماہنامے پابندی سے شائع ہو رہے ہیں۔ واضح ہو کہ آج ملک میں ہفت روزہ خیر اندیش مالیگاؤں واحد بچوں کا مکمل اخبار ہے جو گذشتہ 29 برسوں سے بلا ناغہ شائع ہو رہا ہے۔ ملک کے مختلف علاقوں سے شائع ہونے والے بچوں کے ماہانہ رسائل میں بھی ہفت روزہ خیر اندیش مالیگاؤں (خیال انصاری) اپنی جدا اور ممتاز انفرادیت رکھتا ہے۔ ریاستِ مہاراشٹر میں بچوں کا ادب تخلیق کرنے والی خاتون قلم کاروں میں سب سے اہم نام ڈاکٹر بانو سرتاج کا ہے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر طاہرہ عبدالشکور، شیخ شبانہ بانو، نور جہاں نور، شمع اختر کاظمی، مہر رحمٰن، سلمٰی قادری، فرزانہ اسد، زہرہ جبیں اور ڈاکٹر زرینہ ثانی کے بھی کام اور نام اہم ہیں۔

اس سرسری جائزے کے بعد ایک سوال اُبھر کر آتا ہے کہ آج جب خواتین ہر شعبے میں

آگے بڑھ رہی ہیں انھیں ہم پائلٹ کی حیثیت سے بھی دیکھ رہے ہیں۔ فوج میں بھی ان کا داخلہ ہو گیا ہے لیکن پرنٹ میڈیا یعنی اردو اخبارات میں ان کی بہت کمی ہے، جس پر توجہ دیتے ہوئے اس کی وجہ اور حل تلاش کرنا چاہیے۔

# ساتواں باب

## اردو صحافت: سائنس، قانون اور دیگر موضوعات

# قانونی صحافت کی پیچیدگیاں
## ملکی و عالمی تناظر میں

خواجہ عبدالمنتقم

کوئی بھی شخص تب تک مکمل یا امتیازی طور پر قانونی صحافی نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کو قومی و بین الاقوامی قوانین، بین الاقوامی Treaties، عہد و پیماں اور اس طرح کی دستاویزات کی جانکاری کے ساتھ ساتھ متعلقہ زبان یا زبانوں پر مکمل عبور حاصل نہ ہو۔ علاوہ ازیں اسے نہ صرف قانون کی جانکاری ہو بلکہ وہ قانون کے علاوہ قانونی ضابطوں سے بھی بخوبی واقف ہو۔ اسی لیے انگریزی میں یہ کہا جاتا ہے کہ:

> A Legal Journalist must be familiar with the complexities of law and the procedure .

اسی کے ساتھ ساتھ علم قانون سازی کے ماہر Reed Dickerson کا قول ہے کہ legal drafting کسی طفل مکتب، نوآموز شائق فن یا نیم حکیم کا کام نہیں۔

میں اس سلسلے یہاں آپ کے سامنے ایک مثال پیش کرنا چاہوں گا۔ کئی دہائی قبل جب

دہلی ہائی کورٹ میں اس وقت کی وزیراعظم محترمہ اندرا گاندھی کے سلسلے میں ایک رٹ پٹیشن فائل کی گئی تھی تو عدالت نے پہلی پیشی میں سنوائی کے بعد صرف ایک لفظ پر مشتمل حکم جاری کیا۔ وہ لفظ تھا 'Rule'۔ یہ خبر دنیا کے ہر کونے میں جانی تھی مگر ہمارے وہ صحافی جو قانون اور قانونی ضابطوں کی پیچیدگیوں سے واقف نہیں تھے سخت پریشان تھے اور ان کی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ یہ پٹیشن قبول کی گئی ہے، منظور کرلی گئی ہے یا نامنظور کر دی گئی ہے۔ جو لوگ عدالت کے کام کاج سے واقف ہیں وہ بشمول دفتری وچپراسی جانتے ہیں کہ Rule کا مطلب یہ ہے کہ پٹیشن سماعت کے لیے قبول کرلی گئی ہے اور فریقین کو اس کی اطلاع دے دی جائے حالانکہ اگر آپ کوئی بھی قانونی لغت دیکھیں تو اس میں لفظ 'Rule' کا مطلب یہ نہیں ملے گا۔

اسی طرح ایک مرتبہ ہمارے اردو کی ایک نہایت معتبر خبررساں ایجنسی نے Foreigners Act کو غیرملکیوں کا قانون بتایا تھا جبکہ اس کا صحیح ترجمہ غیرملکیوں سے متعلق قانون ہے۔اس کی کچھ مثالیں اور بھی ہوسکتی ہیں جیسے Intelligence Organisations Act کو ہم خفیہ تنظیمیں ایکٹ نہیں کہہ سکتے۔ اسے خفیہ تنظیموں سے متعلق ایکٹ کہنا ہوگا۔اسی طرح ہم Lepers Act یا Children Act کو بالترتیب جزامی ایکٹ وبچوں کا ایکٹ تو نہیں کہہ سکتے مگر کبھی کبھی جلد بازی میں یا سہواً ایسی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔اس کی وجہ یہ نہیں کہ ہمارے اردو صحافی کسی بھی طرح دوسری زبانوں کے صحافیوں سے کم ہیں۔اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہمارا اردو صحافی شاید ہی کوئی ایسا میدان ہو جس پر بخوشی یا بحالت مجبوری نہ لکھتا ہو۔آج وہ سپریم کورٹ کے فیصلے پر تبصرہ کر رہا ہے تو کل وہی شخص ملک میں سیاسی اتھل پتھل کو اپنی تحریر کا موضوع بنا رہا ہے تو تیسرے دن کبھی کبھی آپ کو یہ دیکھ کر اور پڑھ کر حیرت ہوگی کہ وہ اسپورٹس اور فلمی کالم میں بھی طبع آزمائی کر رہا ہے جبکہ دیگر زبانوں میں خاص کر انگریزی یا فرنچ میں ایسے صحافی اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں جو قانونی امور پر ہی لکھتے ہیں۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ نہ صرف ہمارے ملک میں بلکہ برصغیر میں اردو میں قانونی صحافت سے متعلق سمینار یا جلسوں وغیرہ کا انعقاد شاذ و نادر ہی ہوتا ہے یا قانونی ادیبوں کو بھی انعام واکرام سے شاذ و نادر ہی نوازا جاتا ہے۔

ہمارے صحافیوں کو دوران صحافت سب سے بڑی دقت یہ آتی ہے کہ انھیں بہت سے

ایسے الفاظ کے مترادف تلاش کرنے میں دشواری ہوتی ہے جو بادی النظر میں بالکل ایک جیسے ہی نظر آتے ہیں لیکن قانون کے نقطۂ نظر سے ان میں فرق کرنا ضروری ہو جاتا ہے جیسے:

(1) Act(ایکٹ), act(کام), statute(قانون موضوعہ), statute (دستورالعمل)(of Aligarh Muslim university), law(قانون), bye law(ذیلی قانون), rule(اصول، قاعدہ), sub-rule(ذیلی قاعدہ) regulation(ضابطہ)

Rules refer to an established and authoritative standard of principls.

Regulations refer to sets of rules that have legal connotations.

جہاں تک قواعد کی بات ہے انھیں معیاری مستند و مسلمہ درجہ حاصل ہوتا ہے لیکن جہاں تک ضوابط کی بات ہے اس زمرے میں وہ قواعد آتے ہیں جن میں قانونی اشارات ملتے ہیں۔

(2) right (حق), prerogative (امتیازی اختیار، مراعاتی حق) privilege(مراعات، استحقاق)

(3) cancel (ردکرنا), repudiate (انکار کرنا، منحرف ہونا), abrogate(منسوخ کرنا، فسخ کرنا), dissolve(ختم کرنا، منسوخ کرنا) repeal(تنسیخ کرنا), rescind (منسوخ کرنا، فسخ کرنا), annul(کالعدم کرنا), quash(باطل کرنا، مسترد کرنا، منسوخ کرنا), set aside(پلٹ دینا) revert(الٹ دینا) null and void(باطل اور کالعدم)

(4) affray(ہنگامہ، جھگڑا), riot(بلوہ، فساد)

(5) contract(معاہدہ), agreement(قرار، اقرار نامہ), treaty(عہد و پیماں، میثاق), covenant(عہد و پیماں), convention(کنونشن), bargain(سودا), transaction(معاملہ)

(6) proposal(تجویز), resolution(قرارداد), motion(تحریک)

(7) intent(نیت), intention(ارادہ), motive(وجہ تحریک، محرک), purpose(مقصد), object(غرض), objective(منشا، غرض)

(8) adjourn( تاخیر کرنا، ملتوی رکھنا ), postpone( ملتوی کرنا ), defer( ملتوی کرنا ),
abeyance( التوا، تعطل )

(8a) state ( مملکت، ریاست )

آئین کی دفعہ 12 میں یہ اصطلاح دو معنوں میں استعمال کی گئی ہے۔ اس دفعہ کے ابتدائی حصے میں اس کا استعمال مملکت کے طور پر کیا گیا ہے جس میں مرکزی حکومت اور پارلیمنٹ شامل ہیں جبکہ اس کے دوسرے حصے میں اس کا استعمال ریاستوں کے حوالے کے طور پر کیا گیا ہے۔

(9) President ( صدر، صدر مملکت و سربراہ )

President of the union ( یونین کا صدر )

President of the state/country ( صدر مملکت )

President of a tribunal ( سربراہ )

(10) transfer( تبادلہ، انتقال ), conveyance( منتقلی، انتقال، سواری ),
assignment( تفویض، سونپا گیا کام )

(11) coercion( جبر، زبردستی ), pressure( دباؤ ), duress( اکراہ، جبر، دباؤ ),
compulsion( مجبوری، لازمیت ), influence( اثر، رسوخ، دباؤ )

(12) competent officer( افسر مجاز )

(13) judicial officer( عدلیاتی افسر )

(14) judicious officer( منصف مزاج افسر )

(15) distress( قرقی، بےچینی )

(16) quasi-personality( جائداد کی منقولہ و غیر منقولہ نوعیت )

(17) order( حکم، حکم دینا، درجہ، رتبہ، ترتیب، نظم، مسلک، عقیدہ، حالت وغیرہ )

(18) loss of society of wife( بیوی کی رفاقت سے محروم ہو جانا )

(19) instrument( آلہ، ہتھیار، تحریر، دستاویز )

(20) instrument of accession(دستاویز الحاق، شمولیت)

آئین کی دفعہ 77(2) میں اس لفظ کا استعمال دستاویز کے لیے جبکہ مجموعہ ضابطہ فوجداری کی دفعہ 211 میں گولی مارنے کے ہتھیار کے لیے ہوا ہے۔

(21) attendant(خدمت گار)attendant(متعلقہ صورت حال)

attendant(جسمانی نقصان ہوا ہو)

(22) admit(اپیل منظور کیا جانا)accept (اپیل سماعت کے لیے منظور کیا جانا)،

allow(اپیل منظور کیا جانا)disallow (اپیل نامنظور کیا جانا)،

dismiss an appeal(اپیل خارج کیا جانا)،

dismiss in limine(اپیل شروع میں ہی خارج کر دینا)

(23) accused(ملزم)، convict(مجرم)

(24) summons Case(سمن کیس میں وہ مقدمات آتے ہیں جن میں گرفتاری کا حکم نہ دیا جائے اور وارنٹ معاملوں میں وہ معاملات آتے ہیں جن کی سزا موت یا چھ ماہ سے زیادہ مقرر کی گئی ہو)

(25) parole(واپس آنے کے وعدے پر قیدی کی رہائی)

(26) pauper(نادار، مفلس)

اب اس کی جگہ لفظ indigent کا استعمال کیا جاتا ہے

ایسی صورت میں کسی بھی صحافی کو یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ کس اصطلاح کا استعمال کس پس منظر میں اور کس غرض کے لیے کیا جا رہا ہے۔ صرف یہی نہیں کبھی کبھی مختلف الفاظ کے الگ الگ مترادف الفاظ نہیں مل پاتے ہیں اور مجبوراً کئی اصطلاحات کے لیے ایک ہی مترادف رکھا جاتا ہے۔ البتہ اس ضمن میں بھی الگ الگ زبانوں میں صورت حال مختلف ہے، کبھی یہ مترادف اردو میں نہیں ملتا تو کبھی ہندی میں۔ صرف یہی نہیں بلکہ مختلف قانونی اصطلاحات کے لیے مختلف مترادف الفاظ کبھی سہواً تو کبھی ارادتاً استعمال کیے جاتے رہے ہیں مثلاً Legal provision کے لیے کبھی قانونی التزام کو مترادف اصطلاح کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے تو کبھی قانونی توضیع جبکہ

وزارت قانون میں لسانیاتی و قانونی ماہرین پر مشتمل ورکنگ گروپ نے لفظ provision کے لیے لفظ توضیع کو منظوری دی ہے۔ ہمارے صحافیوں کو ان ریاستوں میں اور بھی زیادہ احتیاط برتنے کی ضرورت ہے جہاں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ مثلاً اگر کشمیر میں قانون کی کسی دفعہ کی تعبیر کی بابت کوئی شبہ پیدا ہوتا ہے تو عدالت اس کے اردو متن کی جانب رجوع ہوگی اور اردو متن کو ہی حتمی مانا جائے گا نہ کہ اس کے انگریزی ترجمے کو چونکہ وہاں کی سرکاری زبان اردو ہے۔ اسی طرح اگر اتر پردیش میں قانون کی کسی دفعہ کی تعبیر کی بابت کوئی شبہ پیدا ہوتا ہے تو عدالت اس کے ہندی متن کی جانب رجوع ہوگی اور ہندی متن کو ہی حتمی مانا جائے گا نہ کہ اس کے انگریزی ترجمے کو چونکہ وہاں کی سرکاری زبان ہندی ہے۔ مرکز میں انگریزی غالب رہے گی چونکہ مرکز کی سرکاری زبان انگریزی ہے۔ البتہ مستند متن (مرکزی قوانین) ایکٹ، 1973 کے تحت اردو ترجمے کو بھی مستند متن کا درجہ حاصل ہے چونکہ اس کی توثیق بھی باقاعدگی کے ساتھ اسی قانون کے تحت صدر مملکت سے کرائی جاتی ہے۔

ان حالات کے مدنظر ہمارے اردو صحافیوں کے لیے معیاری قانونی لغات کا دستیاب ہونا اشد ضروری ہے مگر حیرت کی بات ہے کہ نہ صرف ہمارے ملک میں بلکہ برصغیر میں اس طرح کی معیاری قانونی لغات کا فقدان ہے۔ پاکستان میں ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن کی تیار کردہ قانونی لغت کو میری معلومات کے مطابق سب سے معیاری قانونی لغت کا درجہ حاصل ہے اور یہ درجہ ان کی علمی لیاقت تجربے اور رتبے کو دیکھتے ہوئے حاصل ہے مگر اس لغت میں اور Pakistan : National Language Authority, اور دیگر پبلشرز کی شائع کردہ لغات میں بھی بہت سے ایسے الفاظ نہیں ملتے جو جدید سیاسی و معاشی اور عمرانی تصورات کی روشنی میں گزشتہ چند دہائیوں میں برصغیر میں بنائے گئے قوانین میں استعمال کیے گئے ہیں۔ ویسے بھی ابھی کتنے ہی ممالک نے اقوام متحدہ کی مختلف تجاویز کے باوجود بہت سے امور سے متعلق قوانین ابھی تک نہیں بنائے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سی لغات میں عالمگیریت کے دور میں جو نئی قانونی اصطلاحات سامنے آئی ہیں ان کے بھی معقول مترادفات نہیں ملتے۔ کچھ عرصہ قبل environmental justice, cloning, stalking, surrogate mother, voyeurism, gender discrimination, جیسے الفاظ

عام نہیں تھے۔ قانونی لغات میں بھی ہوسکتا ہے کہ یہ الفاظ ایک لغت میں نہ ملیں۔ اسی طرح لفظ anticipatory bail ایک لغت میں ملے اور دوسری میں نہ ملے۔

صحافیوں کو انگریزی کے متروک الفاظ سے بھی واقف ہونا چاہیے۔ مثلاً اب mankind کی جگہ لفظ humankind کا استعمال کیا جارہا ہے۔ اقوام متحدہ میں وضع کی جانے والی دستاویزات میں بھی لفظ humankind کا استعمال کیا جارہا ہے۔ بظاہر اس کی وجہ یہ ہے کہ مردوں کے غلبے والے معاشرے میں لفظ mankind سے صنفی امتیاز کی بو آتی ہے۔ ہم نے سعودی عرب کی اُس ایجنسی کو بھی جس نے قرآن کریم کا انگریزی ترجمہ شائع کیا ہے یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ اس ترجمے میں آئندہ شائع ہونے والے ایڈیشنوں میں mankind کی جگہ، اگر وہ مناسب سمجھے، تو humankind لفظ کا استعمال کرے۔ اسی طرح اب لفظ discourse کو عام طور پر صرف مذہبی لٹریچر میں ہی استعمال کیا جارہا ہے۔ اسی طرح پہلے excise کے لیے اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں آبکاری لفظ کا استعمال کیا جاتا تھا کیونکہ اس وقت یہ ٹیکس عام طور پر صرف شراب یا دیگر مشروبات پر ہی لگتا تھا لیکن آج یہ تصور بالکل بدل چکا ہے اور بہت سی پروڈکٹس پر یہ محصول لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب اس کا نام اردو میں آبکاری کی جگہ پیداوار ٹیکس اور ہندی میں اُتپاد شُلک رکھا گیا ہے۔

جیسا کہ آپ سب واقف ہی ہوں گے اردو زبان میں قانونی کتابوں کی تصنیف، تالیف اور ترجمے کا کام 19 ویں صدی عیسوی میں شروع ہو چکا تھا اور ساتھ ہی قانونی لغات نویسی کا۔ قانون میں سب سے پہلی انگریزی اردو ڈکشنری جو ''کمرشل اینڈ لیگل انگلش ہندوستانی ڈکشنری'' کے نام سے موسوم ہے، ایک انگریز مصنف ڈاکٹر فالن نے 1858 میں لکھی تھی۔ اسے میکملن اینڈ کمپنی نے کلکتہ سے شائع کیا تھا۔ دوسری انگریزی اردو قانونی لغت درگا پرشاد نے لکھی، اس کا نام ''کنسائز انگلش اردو لا ڈکشنری'' ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن 1905 میں الٰہ آباد سے رام نرائن نے شائع کیا تھا۔ علاوہ ازیں اردو میں لکھی گئی دیگر قانونی لغات — 'اعظم اللغات' تالیف محمد احمد خاں برتر، 'قانونی ڈکشنری' تالیف جلیل الرحمٰن اور حیدرآباد و لاہور سے شائع ہونے والی مختلف قانونی لغات بھی تاریخی نقطۂ نظر سے قابلِ قدر ہیں۔

آزادی سے قبل ریاست حیدرآباد میں دارالترجمہ نے جو قانونی اصطلاحات تیار کی تھیں وہ اب دستیاب نہیں ہیں اور وہ ویسے بھی غیر مروج و غیر مستعمل ہو چکی ہیں۔ دارالترجمہ کے ذریعہ معیاری لغات کی بنیاد پر کیے گئے تراجم معلومات کا ذریعہ نہ ہو کر محض تاریخی دستاویزات کا حصہ بن چکے ہیں۔ اس ضمن میں اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ آزاد ہندوستان میں اس کام کا بیڑا سب سے پہلے جموں وکشمیر ریاست کی جوڈیشل اکیڈمی نے کافی عرصہ پہلے انگریزی، اردو قانونی فرہنگ شائع کر کے اٹھایا تھا۔ اس کے علاوہ یونیورسل لا پبلشنگ کمپنی نے سہ لسانی انگریزی، اردو، ہندی کی ایک مختصر لغت شائع کی مگر وہ پرشین اسکرپٹ میں نہ ہو کر دیوناگری رسم الخط میں ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے بھی 'فرہنگ اصطلاحات انگریزی-اردو' کا پہلا ایڈیشن 2013 میں شائع کیا ہے۔ ہم نہایت انکساری کے ساتھ یہاں یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ کونسل کے پینل برائے لیگل اسٹڈیز نے، جس کے ہم خود بھی رکن رہے ہیں، جس کے سربراہ ڈاکٹر طاہر محمود اور معزز اراکین میں گجرات ہائی کورٹ کے سابق جج جسٹس عبدالستار قریشی مرحوم اور اترپردیش کے سابق ایڈووکیٹ جنرل ایس ایم اے کاظمی مرحوم شامل رہے ہیں، اس لغت پر نظرثانی کا کام ہمیں سونپا تھا اور ہم نے اس فرہنگ پر نہ صرف نظرثانی کا کام کیا بلکہ بہت سے نئے الفاظ واصطلاحات کو بھی شامل کیا مگر فرہنگ کسی لغت، Lexicon یا Encyclopadia کا بدل نہیں ہوسکتی۔ اسی سال ہمارے علیگ برادر محمد ارشاد حنیف کی انگریزی، اردو لغت بھی منظر عام پر آئی تھی۔ علاوہ ازیں ہماری اول سہ لسانی قانونی لغت انگریزی، اردو، ہندی ایم آر پبلشرز نئی دہلی نے 2015 میں شائع کی ہے۔ این سی پی یو ایل اب ہماری قانونی، تجارتی و مالیاتی اصطلاحات پر مشتمل لغت شائع کر رہی ہے۔ اس لغت میں قانونی اصطلاحات کے ساتھ ساتھ بجٹ و پارلیمانی اصطلاحات، انسانی حقوق سے متعلق اصطلاحات، مسلم قانون کی اصطلاحات، وقف اصطلاحات اور لاطینی اصطلاحات بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ این سی پی یو ایل نے وزارت قانون کے ذریعہ ترجمہ کیے گئے کئی سو قوانین کے اردو ترجمے کو شائع کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے اور ان میں سے اچھی خاصی تعداد میں مرکزی قوانین کے اردو متن این سی پی یو ایل شائع کر بھی چکی ہے جو اس کی ویب سائٹ پر بھی موجود ہیں۔ این سی پی یو ایل نے وزارت قانون کے ذریعہ آئین کا جو اردو

ترجمہ تیار کیا تھا اس کے کئی ایڈیشن شائع کر چکی ہے۔ اس کے علاوہ آئین کا سہ لسانی انگریزی، اردو و ہندی ایڈیشن بھی موجود ہے۔ صرف یہی نہیں قانون میں اردو میں کتابیں لکھنے والوں کا فقدان ہے اور ان کے نام آپ انگلیوں پر گن سکتے ہیں اور اس فقدان کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ این سی پی یو ایل اور اس کے پیش رو ادارے اردو ترقی بیورو میں 1980 کے بعد سے لا پینل موجود ہونے کے باوجود اور متذکرہ بیورو اور این سی پی یو ایل کی مخلصانہ کوششوں کے باوجود صرف چند کتابیں ہی منظر عام پر آئی ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے نئے صحافی تیار کیے جائیں جو قانونی میدان کے مرد ہوں اور قانون کی پیچیدگیوں سے واقف ہوں۔ حالانکہ یہاں یہ کہنا بھی نامناسب نہ ہوگا کہ قانونی صحافی تو ہر میدان کا مرد ہوتا ہے چونکہ قانون کا تعلق ہر شعبۂ حیات سے ہوتا ہے۔ اس بات سے ہی آپ اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس میدان میں طبع آزمائی کس قدر مشکل کام ہے۔ میں جب وزارت قانون میں کچھ عرصے تک اس کام سے جڑا ہوا تھا تو میں نے اس زمانے میں 1984.85 میں اس وقت کے وزیر اعلیٰ فاروق عبداللہ، گورنر جگموہن، حکومت کشمیر کے صلاح کار جناب قریشی صاحب اور کئی لا سکریٹریز سے ملاقات کر کے اس بات کی انتہائی کوشش کی تھی کہ کشمیر کی ریاستی حکومت ان قوانین کے، جن کی تعداد اس وقت بھی تقریباً 200 سے زیادہ تھی، ترجمے شائع کرے مگر ریاست نے کسی بھی ایکٹ کا ترجمہ شائع نہیں کیا۔ البتہ جموں و کشمیر حکومت کا اردو کوآرڈینیشن سیل اس ضمن میں اپنی پوری مستعدی سے کام لیتا رہا اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ یہ سیل کئی سو قانون کے اردو تراجم تیار کر چکا ہے اور وزارت قانون ایک مخصوص ضابطے کے مطابق اسے حتمی شکل بھی دے چکی ہے۔ اب یہ ذمہ داری این سی پی یو ایل نے لے لی ہے اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو ہمارے ملک کے بیشتر قوانین اردو میں بھی دستیاب ہوں گے۔

ہمارے صحافیوں کو چاہیے کہ وہ پریس کونسل آف انڈیا کے ذریعہ تیار کیے گئے صحافیوں کے لیے ضابطۂ اخلاق Norms of Journalistic Conduct کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیں اور ساتھ ہی international code of conduct prepared by international press association کو بھی ملحوظ خاطر رکھیں۔

این سی پی یو ایل کو چاہیے کہ وہ پریس کی آزادی اور صحافیوں کے لیے ضابطۂ اخلاق سے متعلق کوئی معیاری کتاب شائع کرے۔ ہماری اس موضوع پر مختصری کتاب اس غرض کو پورا نہیں کرتی۔ ہمارے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کو چاہیے کہ وہ صحافیوں کو اس طرح کی معلومات فراہم کرانے اور قانونی اصطلاحات وقوانین کی تازہ ترین صورت حال سے باور کرانے کے لیے وقتاً فوقتاً ورکشاپ اور سیمناروں کا انعقاد کریں تاکہ ہمارے صحافیوں کی کارکردگی میں بہتری آئے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہمارے موجودہ صحافی باصلاحیت نہیں مگر ایسا کون شخص ہوگا جسے صحافت کے ہر میدان میں مہارت حاصل ہو۔ اس ضمن میں نہ صرف این سی پی یو ایل بلکہ ملک کی اردو اکادمیاں، یونیورسٹیاں ودیگر تعلیمی ادارے اہم رول ادا کرسکتے ہیں۔ علاوہ ازیں ان اداروں کو ایسے تربیتی کورسز بھی شروع کرنے چاہئیں جن میں مالگزاری، عدلیہ ونظم ونسق کے کام سے جڑے ہوئے افسران ووکلا کو قانون سے متعلق اردو اصطلاحات کی ہندی وانگریزی میڈیم میں جانکاری دی جاسکے، چونکہ یہ سمجھنا کہ اردو ہر شعبے سے ختم ہوتی جارہی ہے محض خیال خام ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی خاص شعبے کے بارے میں ہماری یہ رائے غلط ثابت ہومگر جہاں تک قانون کا سوال ہے ان اصطلاحات کا استعمال آنے والی صدیوں تک ہوتا رہے گا جس طرح گزشتہ کئی صدیوں سے ہوتا آرہا ہے۔ جائداد کے انتقال، ملکیت، وصیت، بیع وشرا، رہن وغیرہ میں مستعملہ الفاظ جیسے بیع نامہ، رہن نامہ، انتقال (mutation)، جمع بندی، اراضی، محصول سے متعلق الفاظ ہمیشہ استعمال میں لائے جاتے رہیں گے چونکہ کتنا بھی وقت گزر جائے ان امور سے متعلق دستاویزات ثبوت کے طور پر عدالت میں پیش کی جاتی رہیں گی۔ آج بھی مغلیہ دور میں صادر کیے گئے فرمان عدالتوں کے روبرو دستاویزی شہادت کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ آبکاری، فرد، مقبوضگی، جامہ تلاشی، فرد آلۂ جرم، نقشۂ مرگ (inquest report)، روزنامچہ جیسے الفاظ آج بھی تعزیری دستاویزات میں استعمال کیے جارہے ہیں خواہ رسم الخط کوئی بھی ہو۔

# اردو صحافت اور سائنس

ڈاکٹر رفیع الدین ناصر

دورِ حاضر میں سائنس ہماری زندگی کا لازمی جُز بن گئی ہے۔ ہمہ اقسام کی ایجادات، ذرائع ابلاغ اور رسل و ترسیل کے جدید ترین آلات، علاج و معالج کے جدید تر طریقۂ کار نے ہماری زندگی میں ایک انقلاب برپا کر دیا ہے۔ کیا ہمارے سماج کا اردو طبقہ ان ایجادات سے واقف ہے؟ کیا اردو صحافت اُتنی ہی چست ہے جتنی تیزی سے یہ دریافتیں ہوتی جا رہی ہیں؟ ہمیں ضرورت ہے کہ اردو صحافی ان ایجادات کی تفصیلات کو اردو میں منتقل کر کے فوری منظرِ عام پر لائیں۔ اس کے لیے اردو صحافی کا سائنسی علوم سے واقف ہونا ضروری ہے اور اس کے لیے ہمارے اخبارات و رسائل کو ایسے صحافیوں کو موقع فراہم کرنا چاہیے جو سائنس اور اردو صحافت دونوں پر دسترس رکھتے ہوں۔

سائنس کی دنیا ایک خواب کی دنیا ہے اور اس کا کبھی اختتام نہیں ہوتا۔ آج کے دور میں سائنسی فہم کا پیدا ہونا معاشرے کے لیے اشد ضروری ہے تا کہ ہم مثبت سمت میں قدم بڑھا سکیں۔

چنانچہ موجودہ مقالے میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ اردو صحافت کو سائنس سے مربوط کرنے کے طریقۂ کار کو پیش کیا جائے۔ ساتھ ہی جدید سائنسی تحقیقات جیسے بایوٹکنالوجی،

این سی پی یو ایل کو چاہیے کہ وہ پریس کی آزادی اور صحافیوں کے لیے ضابطۂ اخلاق سے متعلق کوئی معیاری کتاب شائع کرے۔ ہماری اس موضوع پر مختصر سی کتاب اس غرض کو پورا نہیں کرتی۔ ہمارے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کو چاہیے کہ وہ صحافیوں کو اس طرح کی معلومات فراہم کرانے اور قانونی اصطلاحات وقوانین کی تازہ ترین صورت حال سے باور کرانے کے لیے وقتاً فوقتاً ورکشاپ اور سیمناروں کا انعقاد کریں تاکہ ہمارے صحافیوں کی کارکردگی میں بہتری آئے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہمارے موجودہ صحافی باصلاحیت نہیں مگر ایسا کون شخص ہوگا جسے صحافت کے ہر میدان میں مہارت حاصل ہو۔ اس ضمن میں نہ صرف این سی پی یو ایل بلکہ ملک کی اردو اکادمیاں، یونیورسٹیاں و دیگر تعلیمی ادارے اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں ان اداروں کو ایسے تربیتی کورسز بھی شروع کرنے چاہئیں جن میں مالگزاری، عدلیہ ونظم ونسق کے کام سے جڑے ہوئے افسران و وکلا کو قانون سے متعلق اردو اصطلاحات کی ہندی و انگریزی میڈیم میں جانکاری دی جاسکے، چونکہ یہ سمجھنا کہ اردو ہر شعبے سے ختم ہوتی جارہی ہے محض خیال خام ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی خاص شعبے کے بارے میں ہماری یہ رائے غلط ثابت ہو مگر جہاں تک قانون کا سوال ہے ان اصطلاحات کا استعمال آنے والی صدیوں تک ہوتا رہے گا جس طرح گزشتہ کئی صدیوں سے ہوتا آرہا ہے۔ جائداد کے انتقال، ملکیت، وصیت، بیع وشرا، رہن وغیرہ میں مستعملہ الفاظ جیسے بیع نامہ، رہن نامہ، انتقال (mutation)، جمع بندی، اراضی، محصول سے متعلق الفاظ ہمیشہ استعمال میں لائے جاتے رہیں گے چونکہ کتنا بھی وقت گزر جائے ان امور سے متعلق دستاویزات ثبوت کے طور پر عدالت میں پیش کی جاتی رہیں گی۔ آج بھی مغلیہ دور میں صادر کیے گئے فرمان عدالتوں کے روبرو دستاویزی شہادت کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ آبکاری، فرد، مقبوضگی، جامہ تلاشی، فرد اکۂ جرم، نقشۂ مرگ (inquest report)، روزنامچہ جیسے الفاظ آج بھی تعزیری دستاویزات میں استعمال کیے جارہے ہیں خواہ رسم الخط کوئی بھی ہو۔

# اردو صحافت اور سائنس

ڈاکٹر رفیع الدین ناصر

دورِ حاضر میں سائنس ہماری زندگی کا لازمی جز بن گئی ہے۔ ہمہ اقسام کی ایجادات، ذرائع ابلاغ اور رسل و ترسیل کے جدید ترین آلات، علاج و معالج کے جدید تر طریقۂ کار نے ہماری زندگی میں ایک انقلاب برپا کر دیا ہے۔ کیا ہمارے سماج کا اردو طبقہ ان ایجادات سے واقف ہے؟ کیا اردو صحافت اُتنی ہی چست ہے جتنی تیزی سے یہ دریافتیں ہوتی جا رہی ہیں؟ ہمیں ضرورت ہے کہ اردو صحافی ان ایجادات کی تفصیلات کو اردو میں منتقل کر کے فوری منظرِ عام پر لائیں۔ اس کے لیے اردو صحافی کا سائنسی علوم سے واقف ہونا ضروری ہے اور اس کے لیے ہمارے اخبارات و رسائل کو ایسے صحافیوں کو موقع فراہم کرنا چاہیے جو سائنس اور اردو صحافت دونوں پر دسترس رکھتے ہوں۔

سائنس کی دنیا ایک خواب کی دنیا ہے اور اس کا کبھی اختتام نہیں ہوتا۔ آج کے دور میں سائنسی فہم کا پیدا ہونا معاشرے کے لیے اشد ضروری ہے تاکہ ہم مثبت سمت میں قدم بڑھا سکیں۔

چنانچہ موجودہ مقالے میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ اردو صحافت کو سائنس سے مربوط کرنے کے طریقۂ کار کو پیش کیا جائے۔ ساتھ ہی جدید سائنسی تحقیقات جیسے بایوٹکنالوجی،

سافٹ ویئر نالج، ہارڈ ویئر کی باریکیاں، آلودگی کے مسائل، غذائی سمیت کے مسائل، علاج کی آسانیاں، نباتات کے فوائد جیسے اہم نکات کو سمجھ کر ایک عام صحافی اردو قاری تک ان معلومات کو کیسے پہنچا سکتا ہے، اس پر گفتگو کی گئی ہے۔

**ابتدائیہ:**

سائنسی صحافت، صحافت کی ایک سنجیدہ قسم ہے۔ اس کا مقصد قارئین کو سائنس کی جدید معلومات بہم پہنچانے کے ساتھ عام سائنسی معلومات کو بھی عام فہم انداز میں پیش کرنا ہے۔ سائنسی صحافت کا مقصد عام لوگوں کو وہ ساری معلومات دینا ہے جو زندگی میں ان کے کام آسکتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی سائنسی موضوعات کو سمجھنے اور اس کا ذوق پیدا کرنے میں مدد دینا بھی اس کا اہم مقصد ہے۔

اردو کے بے شمار اخبارات و رسائل نکل رہے ہیں لیکن ان میں سائنسی علوم کا ذکر نہیں ہوتا۔ روزناموں میں کہیں کہیں شاذ و نادر ہی کسی کالم میں خبریں یا سائنسی مضامین پڑھنے کو مل جاتے ہیں لیکن یہ مضامین معتبر، مستند نہیں ہوتے۔

سائنسی صحافت کا اہم مقصد ہوتا ہے کہ کسی سائنسداں کی جانب سے انسان کی فلاح و بہبود و معلومات کے لیے کی گئی تحقیقات کو ایک عام قاری تک آسان اور مختصر زبان میں فراہم کرنا۔

اردو زبان کا المیہ یہ ہے کہ اس کے اخبارات و رسائل بہت زیادہ مسائل سے گھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ دیگر اہم امور کی طرح سائنسی معلومات کو بھی اپنے قاری تک پہنچانے میں کم دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس تلخ حقیقت کے باوجود بھی کئی رسائل و اخبارات صرف سائنسی موضوعات پر ہی ایک عرصے سے کامیابی سے شائع ہو رہے ہیں، لیکن جہاں تک عام فہم روزناموں کا تعلق ہے وہ اگر سائنسی معلومات کو اپنے قارئین تک پہنچانا چاہیں تو درج ذیل مسائل سے دوچار ہوتے ہیں:

- تربیت یافتہ عملے کی کمی
- صحافتی مہارت کا فقدان
- ترجمے کا مسئلہ

- سائنسی معلومات کی کمی
- صحیح رہبری کا فقدان

اردو صحافت کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ سائنسی صحافت کو مستقل جگہ دی جائے، اس پر گفتگو کی جائے، اس پر مزید معلومات حاصل کی جائے تا کہ ایک عام اردو قاری جدید سائنسی تحقیقات سے واقف ہوسکے اور اپنے معیار زندگی کو مزید بہتر بنا سکے۔ آج بھی کئی اشخاص ہمارے سماج میں ایسے مل جائیں گے جو نیانوٹکنالوجی، گلوبل وارمنگ (عالمی حدت)، سگریٹ نوشی کے نقصانات، حفظان صحت کے اصول، اوزون کی تہ کو نقصان، بائیونک فصلیں، کلوننگ، سافٹ ویئر، ہارڈ ویئر، ماحول کی تبدیلی، سمیت غذا وغیرہ جیسے علوم کی ابتدائی باتوں سے بھی واقف نہیں ہیں۔ ایسی حالت میں اردو قاری تک تمام بنیادی باتیں پہنچانا اخبار کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ بطور خاص اخبار ہی یہ معلومات پہنچانے کا فریضہ صحیح طریقے سے انجام دے سکتا ہے۔ کیونکہ اُس کا قاری سیاسی، سماجی، کھیل، ادب، ثقافت اور دیگر قسم کی خبروں کے ساتھ ساتھ سائنس کی خبروں کو بھی پڑھ کر اپنی معلومات میں اضافہ کرسکتا ہے۔ بعض اخبارات سائنسی خبروں کا دائرہ صرف طب وصحت تک ہی محدود رکھتے ہیں اور وہ اس کے متعلق معلومات کو یا تو مختصراً روزانہ نکات کی شکل میں شائع کرتے ہیں یا پھر ہفتے میں ایک دن ایک صفحہ 'صحت' کے لیے مختص کرتے ہیں۔ اس سے کچھ حد تک طب وصحت کے متعلق تشنگی دور ہوسکتی ہے لیکن دیگر سائنسی علوم سے واقفیت نہیں ہو پاتی۔ جبکہ بعض اردو سائنسی جرائد انتہائی معیاری انداز میں برسوں سے انتہائی کامیابی کے ساتھ تمام سائنسی علوم کا احاطہ کیے ہوئے ہیں اور اردو قاری کی تشنگی کو دور کرنے کی کوشش کررہے ہیں لیکن ایک عام اردو قاری جو آرٹ یا کامرس کا طالب علم رہ چکا ہے وہ ان رسائل میں کس حد تک دلچسپی کا مظاہرہ کرے گا؟ جبکہ اخبار میں شائع شدہ خبریں اس کی نظروں سے یقیناً گزرتی ہیں اس لیے شاعر نے کہا ۔

قلم کی آبرو رکھ لی لہو کی روشنائی سے
وہ قومیں مر نہیں سکتیں جہاں اخبار زندہ ہے

دورِ حاضر میں ایک عام انسان کو کامیابی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے

اندر سائنسی فہم پیدا کرے۔ ایک کامیاب صحافی معاشرے میں ایسی بیداری پیدا کرسکتا ہے جس سے ہم ترقی کی طرف مثبت قدم بڑھا سکیں۔

**سائنس کی خبریں کیسے تیار کریں:**

قدم چوے گی منزل ذوق میں کر بال و پر پیدا
سراپا شوق بن آگے نکل جا کاروانوں میں

سائنس کے کسی بھی علم کے متعلق خبر تیار کرنے سے پہلے صحافی کو چند بنیادی باتوں سے واقف ہونا ضروری ہے۔ سائنس یا کوئی بھی خبر تیار کرتے وقت خبر کے لوازم سے واقف ہونا ضروری ہے۔

**(1) وسیع سائنسی مطالعہ:**

سائنسی صحافی کو مختلف سائنسی علوم پر اپنا مطالعہ وسیع کرنے کی ضرورت ہے۔ بطور خاص جدید سائنسی تحقیقات کسی جدید جرنل یا رسالے میں شائع ہوتی ہیں اُس تک صحافی کی رسائی ہونا ضروری ہے۔

**(2) بہترین سائنسی مقالے کی تلاش:**

ہر ہفتے ہزاروں سائنسی مقالے دنیا بھر کے جرنلس میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ایسے مقالوں کا انتخاب کرنا چاہیے جو عام اردو قاری کے لیے دلچسپی کا باعث ہوں۔

**(3) مقالے کا گہرائی سے مطالعہ ہو:**

مقالے کی تلخیص یعنی Abstract کے مطالعے سے ایک عام نظریہ سمجھ میں آتا ہے اگر وہ پُرکشش ہو تو مقالے کا تفصیلی جائزہ لینا ضروری ہے۔ اس کا تجزیہ جاننا ضروری ہے اور پھر تنقیدی نظر سے اس کو سمجھنا چاہیے۔ یہ بھی دیکھا جائے کہ سائنسداں کا کسی کمپنی سے رابطہ تو نہیں ہے؟ تا کہ اُس کمپنی کے فائدے کے لیے اپنی تحقیقات کو منظر عام پر لائے۔

**(4) محقق سے انٹرویو:**

اگر ایک صحافی صرف مقالے کا مطالعہ کر کے خبر شائع کرتا ہے تو وہ خبر اتنی اہم نہیں ہوتی جتنی کہ سائنسداں کے انٹرویو کے ساتھ شائع کی گئی ہو۔ مقالہ نگار یا سائنسداں سے مل کر اُن کی

تحقیق کے نتائج کو ان کی زبان سے سمجھ کر مرتب کرنے میں زیادہ اثر پیدا ہوگا۔ یہاں یہ بات بھی سمجھنا چاہیے کہ ایک مقالے کو تحقیق سے لے کر شائع ہونے تک مہینوں لگ جاتے ہیں۔اس لیے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ کام کی رفتار کس طرح سے اپنی منزل تک پہنچی۔

**(5) دیگر ہم عصر سائنسدانوں کے تاثرات حاصل کرنا:**

شائع شدہ اصل مقالہ کو دیگر ہم عصر سائنسدانوں تک پہنچا کر اُن کے تاثرات حاصل کرنا چاہیے اس کی وجہ سے خبر پُر اثر ہوگی۔

**(6) بہترین سرخی کا انتخاب:**

ایک صحافی نے اپنے مطالعے سے ایک معیاری مقالے کو منتخب کر کے اس کی باریکیوں کو سمجھ کر اس کے فوائد کو جان کر محققین سے اور دیگر سائنسدانوں کے تاثرات کے بعد ایک بہترین خبر تیار کر لی، اب اس کی سرخی (Headline) کس طرح ہونی چاہیے؟ ایک طریقہ تو یہ ہوتا ہے کہ اس تحقیق کا فائدہ کیا ہے؟ یا اس پس منظر میں ایسی سرخی تحریر ہو جو عام قاری کے لیے تجسس کا باعث بنے۔

**(7) یاد رکھیں آپ کس کے لیے خبر تیار کر رہے ہیں:**

یاد رکھیں کہ ایک عام قاری اپنی دنیا اور اُس میں ہونے والی تبدیلیوں کو سمجھنے کے لیے پُر تجسس ہوتا ہے۔اس لیے اُن کے لیے ایسی خبر ہونا چاہیے جو اُن کو انٹرٹینمنٹ کرے اور ساتھ ہی معلومات میں اضافہ کرے۔

**(8) حقیقت پسند ہونا چاہیے:**

سائنسی خبر پوری طرح سے حقیقت پر مبنی ہونا چاہیے۔بعض مقالہ جات اغلاط سے پُر ہوتے ہیں اس کا بطورِ خاص خیال رکھنا چاہیے۔ریسرچ کے بعد جو بھی نتائج منظر عام پر آئیں ان کو جوں کا توں پیش کرنے میں ہی دیانتداری ہے۔

**(9) بہترین تحریر ہو:**

چونکہ سائنسی خبریں عام طور پر انگریزی سے حاصل کی جاتی ہیں۔اس لیے اس کے ترجمے کے دوران زبان سادہ، سلیس اور آسان ہونا چاہیے۔مشکل اصطلاحات کا استعمال ایک

عام قاری کی سمجھ سے بالاتر ہوتا ہے۔ایسی صورت میں خالصتاً انگلش اصطلاحات یا متوازی قوسین میں اردو اصطلاحات کا استعمال کرنا چاہیے۔خبر میں تسلسل اور تجسس ہونا چاہیے تاکہ قاری پوری خبر پڑھ سکے۔مختصر مگر جامع خبر قاری کے ذہن میں پیوست ہو جاتی ہے۔

عام طور پر عام اردو قاری سائنس کی وہ بنیادی باتیں جو روزانہ کے معمولات سے جڑی ہیں اُس کی طرف تیزی سے راغب ہوتا ہے۔اس لیے اردو صحافی اگر ان امور پر اپنی توجہ مرکوز کریں تو یقیناً سائنس بہترین زندگی گزارنے کے لیے فائدے مند ہو سکتی ہے۔سائنس کے بعض نکات کو سمجھانے کے لیے سائنسی فیچر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔لہٰذا جب سائنس کے کسی عنوان پہ فیچر مرتب کیا جاتا ہے اُس پر درج ذیل اہم امور کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

**سائنسی فیچر تحریر کرنے کے اہم نکات:**

1- عام اردو قاری کے لیے دلچسپی کا باعث بنے۔اس طرح کے فیچر کو منتخب کرنے کے بعد اُسے مخصوص عنوان دیا جائے اور ٹو دی پوائنٹ تحریر کرنا چاہیے۔

2- جن نکات کو پیش کرنا ہے وہ ترتیب وار اور پُرکشش ہوں تاکہ قاری راغب ہو سکے۔

3- تعارف مختصر مگر جامع اور تجسس سے بھرپور ہو۔

4- تمام اہم نکات کو ضبطِ تحریر میں لا کر اُن کا خاکہ تیار کیا جائے اور اُس کو پھر مناسب ترتیب کے لحاظ سے مرتب کیا جائے۔

5- قاری تک کون سی بات پہنچانا چاہیے تاکہ معاشرے کا فائدہ ہو سکے،اس کو اچھی طرح سے سمجھ کر انہی نکات کو پیش کرنا چاہیے۔اپنی پسند ناپسند،ذہنی دباؤ کو دور رکھ کر جب یہ فیچر عام قاری تک پہنچے گا تو یقیناً اردو قاری اس سے لطف اندوز ہوگا۔

سائنس کے بنا زندگی ادھوری ہے۔اس لیے سائنس پر مبنی صحافت آج کی ضرورت ہے۔نباتات کے فائدے،طب میں ان کی اہمیت،اسی طرح جدید طریقۂ علاج،قاتل بیماریوں پر قابو پانے کے گُر،آلودگی کے اثرات،آرام دہ زندگی کے اصول وغیرہ ایسے نکات ہیں جن کی طرف اردو کا عام قاری بہت آسانی سے راغب ہوتا ہے مگر ان امور پر خامہ فرسائی سے پہلے تمام بنیادی باتوں کو جاننا ضروری ہے،اس کے لیے چند ضروری مشورے پیش ہیں۔

**سائنسی صحافیوں کے لیے اہم مشورے:**

1- صحافیوں کو چاہیے کہ سب سے پہلے وہ خود سمجھ لیں کہ یہ سائنسی تحقیق کیوں اہم ہے؟
2- سمجھنے کے بعد اس مفروضے کو کسی دوست یا جانکار سے گفتگو کر کے اس کی اہمیت کو واضح کر لیں۔
3- بحیثیت سائنسی صحافی، سائنسی تحقیق کے تعلق سے تجسس پیدا کریں تا کہ پڑھنے والا راغب ہو سکے۔
4- غیر ضروری تجسس سے اجتناب کریں۔
5- مختلف سائنسی ماہرین سے گفتگو کرکے اس مفروضے یا تحقیق کی حقیقت کو سمجھیں اور اس کا معیار قائم کریں۔
6- یہ بھی تحقیق کریں کہ اس سے قبل اس مفروضے پر کوئی مقالہ شائع ہوا ہے کیا؟ اگر شائع ہوا تو اس کو کس حد تک پسند کیا گیا۔
7- کوئی تحقیقی مقالہ اگر آپ کے پسندیدہ عنوان پر شائع ہوا تو یہ جانچ لیں کہ اُس کو کتنے ماہرین نے پرکھا؟
8- اطراف واکناف کی تجربہ گاہوں اور اُس کے ماہرین سے ربط میں رہ کر بہترین معلومات حاصل کریں۔
9- اپنی انفرادیت برقرار رکھنے کے لیے عام مجموعہ سے ہٹ کر کسی اچھوتی ایجاد کو منتخب کریں۔
10- خود لطف اندوز ہوتے رہیں اور ساتھ ہی اردو قاری کو بھی لطف اندوز کریں جو کامیابی کا ضامن ہے۔

اردو زبان میں سائنسی علوم ایک عرصے تک بہت مقبول رہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان میں تبدیلیاں آتی گئیں لیکن آج بھی اردو قاری سائنسی تحقیقات کو جاننے کے لیے بیتاب ہے۔ اس لیے اخبارات کے مالکان، مدیران اور صحافیوں کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے نہ صرف انھیں جدید معلومات سے ہم آہنگی ہوگی بلکہ وہ ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل کا ذریعہ بھی بن سکتے ہیں اور یہی سب سے اہم ہے۔

# الیکٹرانک میڈیا اور اردو صحافت

انیس رفیع

آج کا عہد Information Explosion کا ہے۔ اس انفارمیشن سوسائٹی میں الیکٹرانک میڈیا جدید ترین صورتوں میں نمودار ہو رہا ہے۔ برق رو تغیرات ہمیں وہ لمحہ بھی نہیں دیتے کہ اک ذرا ٹھہر کر سوچیں کہ ان برقی آلاتِ ذرائع کے نقصانات اور فائدے کیا ہیں۔ کل ہمارے ایک دوست نے کہا کہ آج کل ڈاب (ناریل) میں پانی کی مقدار گھٹتی جا رہی ہے اور اس کی وجہ وہ Towers اور ٹرانسمیٹر ز ہیں جو ریڈیو، ٹیلی ویژن، موبائل اور انٹرنیٹ کی برقی لہروں کو پھیلانے اور پکڑنے کے لیے نصب کیے جاتے ہیں۔ چھتوں پر، کھیتوں میں، کھلیانوں میں، کھمبوں کے ذریعے، کہیں کہیں زمین دوز آپٹیکل فائبر تاروں سے۔ تمام حفاظتی اقدام کے باوجود خطرناک ریڈیائی لہریں (Radio-Active Waves) خارج کرتے ہیں اور ماحولیاتی آلودگی (Environmental Pollution) کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ ہر چند کہ فوری طور پر ہمیں اس کا احساس نہیں ہوتا۔ ہم ان کے مضر اثرات سے چشم پوشی کرتے رہتے ہیں۔ مگر کبھی کبھی اتفاق سے ہی سہی کوئی ریڈیائی لہر سانس کے ذریعہ ہمارے جسم میں داخل ہو جائے تو اس کے نتیجے میں سرطان (Cancer) جیسے

امراض ہو سکتے ہیں۔ جہاں جہاں نیوکلیائی بم گرائے گئے ہیں، جن جن ریگستانوں میں یا ریگستانوں میں نیوکلیائی تجربے کیے گئے ہیں یا تو اطراف کی آبادیاں وہاں سے دور محفوظ مقامات پر منتقل کر دی گئی ہیں یا جو رہ گئے ہیں وہاں حیوان و انسان کے بچے Deformity کے شکار ہو رہے ہیں۔ اب تو ہائڈروجن اور نائٹروجن بم کا زمانہ ہے۔ کوئی بھی نیوکلیائی جنگ چھڑی تو دنیا نیست و نابود ہو جائے گی۔ الیکٹرانک قوت کی ایجادات سے سیارچے خلا میں بھیجے جا رہے ہیں۔ راکٹ چاند تاروں پر کمند ڈال رہے ہیں۔ Remote Control سے جاسوسی کی جا رہی ہے۔ سرحدوں پر Drone سے حملے ہو رہے ہیں۔ یہ سب اس الیکٹرانک کے استعمال کے سانحات ہیں۔

ہم نے اس میدان میں سائنسی یا انسانی ترقیات کے منفی پہلو پر نظر ڈالی ہے۔ مگر دوسرے ایسے پہلو ہیں جو تابناک اور انسانوں اور دیگر مخلوقات کے لیے بے حد فائدہ مند ہیں۔ ان میں سب سے اہم ہے الیکٹرانک ذرائع ابلاغ (Electronic Media) جو آج ہماری زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کر رہے ہیں۔ زندگی کی رفتار تیز ہوتی جا رہی ہے۔

زندگی آج جس قدر تیز ہوئی ہے۔ صحافت کی رفتار اس سے کہیں تیز ہے۔ آدمی نے زمین پر (اب آسمان پر بھی) جتنی سرحدیں بنائی ہیں، چوحدوں پر آہنی پردے (Iron Curtains) لگائے ہیں، آج کی صحافت نے اپنی دھاردار نوکوں سے انھیں چاک کر دیا ہے۔ حکومت یا صاحبانِ ثروت و طاقت جتنے پہرے لگائیں، رازداری اور Confidential یا Embargo کے جتنے بڑے بڑے قلعے چسپاں کر لیں مگر وہ کسی نہ کسی دروازے سے باہر ضرور نکل آتے ہیں۔ آپ نے جولین اسانجے اور ایڈورڈ سنوڈین کے Wikileaks کا قصہ سنا ہوگا۔ Watergate (نکسن) اسکینڈل، اس سے پہلے Profume سیکس Scandal اور حال ہی میں Coalgate تنازعہ، شہزادی ڈائنا کی خفیہ زندگی کا مشتہر ہونا پھر پیچھا کرتی ہوئی پریس کی گاڑیوں سے بھاگتے ہوئے المناک حادثے کا شکار ہونا۔ 'تہلکہ'* مچانا یہ سب کچھ صحافت کے دائرۂ کار کا حصہ ہی تو ہیں۔ الیکٹرانک میڈیا کی حیرتناک چوکسی کی انتہا تو امریکہ کے Twin Tower پر ہوائی حملے کے وقت نظر آئی جب دنیا کے کونے کونے میں لوگوں نے اسے ٹی وی کے پردوں پر مسمار

---

* ترون تیج پال: ایڈیٹر تہلکہ

ہوتے دیکھا۔ Live Coverage کا یہ کمال الیکٹرانک میڈیا کے Omnipresence سے ہی ممکن ہو سکا۔ یہ سب 'Handi Cam' کے Lense کا ہی کمال ہے۔ Digital نشریہ نے تو اس میدان میں وہ انقلاب رونما کیا ہے جہاں تک ہم عام لوگوں کا تخیل بھی نہیں پہنچ سکتا۔

اب تک جو مذکور ہوا الیکٹرانک Gadget کی ترقی کی بابت ہو اگر جو اطلاعات ان کے ذریعہ پہنچائی جاتی ہیں وہ کسی نہ کسی زبان میں پہنچائی جاتی ہیں۔ پیغام رسانی کی زبان ہوتی ہے۔ مثلاً ہندوستان میں ہندی، اردو، انگریزی اور دیگر علاقائی زبانیں۔ ہندوستان کے National Channel (قومی چینل) یعنی D.D.National (قومی دوردرشن چینل) اس کی زبان ہندی ہے۔ اس چینل پر مقررہ وقتوں پر ہندی نیوز نشر ہوتی ہیں۔ ساتھ ہی چند مخصوص وقتوں پر اردو نیوز بھی نشر کی جاتی ہیں جو اردو آبادی والی ریاستوں کے علاقائی چینل سے بھی نشر ہوتی ہیں۔ سری نگر کشمیر ریڈیو پر اردو نشریات مستقل ہیں اور باضابطہ ہیں۔ تقسیم کے بعد اردو زبان جس زبوں حالی کا شکار ہوئی اس کا علم تمام اہل نظر کو ہے۔ حالانکہ سردار پٹیل جو پہلے وزیر اطلاعات اور نشریات تھے، انھوں نے پارلیمنٹ میں یہ کہا تھا کہ ہندی کے علاوہ اردو زبان کو بھی نشریے کا ذریعہ بنایا جائے گا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ یہ اور بات ہے کہ فیلڈن کے بعد آل انڈیا ریڈیو کے پہلے ہندوستانی ڈائریکٹر جنرل پطرس بخاری مقرر ہوئے۔ اس دور کے نامور شعرا و ادبا ریڈیو کے مختلف عہدوں پر مامور کیے گئے، جن میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، منٹو، اوپندر ناتھ اشک، بعد کو سہیل عظیم آبادی ہندوستانی نشریے کا حصہ بنے اور پروگراموں میں اردو کو فوقیت حاصل رہی۔ البتہ علاقائی ریڈیو پر علاقائی زبانوں کو فوقیت دی گئی۔ مگر حیدرآباد ریڈیو پر اردو کو اہمیت ضرور دی گئی اور شعبے کی کوشش رہی کہ وہاں اردو جاننے والے اسٹاف اور ڈائریکٹر کا تقرر ہو۔ سری نگر ریڈیو میں بھی اردو زبان کو فوقیت حاصل رہی۔ وہ اب بھی ہے۔

جہاں تک کلکتہ ریڈیو کا تعلق ہے تو یہاں کوئی باضابطہ اردو کا مقررہ چنک نہ تھا۔ ہندی پروگرام کے پروڈیوسر مثلاً دیپ مٹھولیا مہینے میں ایک بار اسٹوڈیو میں مشاعرہ یا شعری نشست ریکارڈ کرا کر نشر کروا دیتے۔ کبھی کبھی مشہور ادبی اور صحافتی شخصیتوں کو مدعو کر کے ان کی تقاریر نشر کروا دیا کرتے تھے۔ مگر کیندر کے Fix Point چارٹ میں اردو پروگرام کی کوئی نشاندہی نہیں ہوتی تھی۔

امراض ہو سکتے ہیں۔ جہاں جہاں نیوکلیائی بم گرائے گئے ہیں، جن جن بر فیلے میدانوں میں یا ریگستانوں میں نیوکلیائی تجربے کیے گئے ہیں یا تو اطراف کی آبادیاں وہاں سے دور محفوظ مقامات پر منتقل کر دی گئی ہیں یا جو رہ گئے ہیں وہاں حیوان وانسان کے بچے Deformity کے شکار ہو رہے ہیں۔ اب تو ہائڈروجن اور نائٹروجن بم کا زمانہ ہے۔ کوئی بھی نیوکلیائی جنگ چھڑی تو دنیا نیست و نابود ہو جائے گی۔ الیکٹرانک قوت کی ایجادات سے سیارچے خلا میں بھیجے جا رہے ہیں۔ راکٹ چاند تاروں پر کمند ڈال رہے ہیں۔ Remote Control سے جاسوسی کی جا رہی ہے۔ سرحدوں پر Drone سے حملے ہو رہے ہیں۔ یہ سب اس الیکٹرانک کے استعمال کے سانحات ہیں۔

ہم نے اس میدان میں سائنسی یا انسانی ترقیات کے منفی پہلو پر نظر ڈالی ہے۔ مگر دوسرے ایسے پہلو ہیں جو تابناک اور انسانوں اور دیگر مخلوقات کے لیے بے حد فائدہ مند ہیں۔ ان میں سب سے اہم ہے الیکٹرانک ذرائع ابلاغ (Electronic Media) جو آج ہماری زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کر رہے ہیں۔ زندگی کی رفتار تیز ہوتی جا رہی ہے۔

زندگی آج جس قدر تیز ہوئی ہے۔ صحافت کی رفتار اس سے کہیں تیز ہے۔ آدمی نے زمین پر (اب آسمان پر بھی) جتنی سرحدیں بنائی ہیں، چوحدوں پر آہنی پردے (Iron Curtains) لٹکائے ہیں، آج کی صحافت نے اپنی دھاردار نوکوں سے انھیں چاک کر دیا ہے۔ حکومت یا صاحبانِ ثروت و طاقت جتنے پہرے لگائیں، رازداری اور Confidential یا Embargo کے جتنے بڑے بڑے پلّے چسپاں کرلیں مگر وہ کسی نہ کسی دروازے سے باہر ضرور نکل آتے ہیں۔ آپ نے جولین اسانجے اور ایڈوارڈ سنوڈین کے Wikileaks کا قصہ سنا ہوگا۔ Watergate (نکسن) اسکینڈل، اس سے پہلے Profume سیکس Scandal اور حال ہی میں Coalgate تنازعہ، شہزادی ڈائنا کی خفیہ زندگی کا مشتہر ہونا پھر پیچھا کرتی ہوئی پریس کی گاڑیوں سے بھاگتے ہوئے المناک حادثے کا شکار ہونا۔ 'تہلکہ'* مچانا یہ سب کچھ صحافت کے دائرۂ کار کا حصہ ہی تو ہیں۔ الیکٹرانک میڈیا کی حیرتناک چوکسی کی انتہا تو امریکہ کے Twin Tower پر ہوائی حملے کے وقت نظر آئی جب دنیا کے کونے کونے میں لوگوں نے اسے ٹی وی کے پردوں پر مسمار

* ترون تیج پال: ایڈیٹر تہلکہ

ہوتے دیکھا۔ Live Coverage کا یہ کمال الیکٹرانک میڈیا کے Omnipresence سے ہی ممکن ہو سکا۔ یہ سب 'Handi Cam' کے Lense کا ہی کمال ہے۔ Digital نشریہ نے تو اس میدان میں وہ انقلاب رونما کیا ہے جہاں تک ہم عام لوگوں کا تخیل بھی نہیں پہنچ سکتا۔

اب تک جو مذکور ہوا الیکٹرانک Gadget کی ترقی کی بابت ہوا مگر جو اطلاعات ان کے ذریعہ پہنچائی جاتی ہیں وہ کسی نہ کسی زبان میں پہنچائی جاتی ہیں۔ پیغام رسانی کی زبان ہوتی ہے۔ مثلاً ہندوستان میں ہندی، اردو، انگریزی اور دیگر علاقائی زبانیں۔ ہندوستان کے National Channel (قومی چینل) یعنی D.D.National (قومی دوردرشن چینل) اس کی زبان ہندی ہے۔ اس چینل پر مقررہ وقتوں پر ہندی نیوز نشر ہوتی ہیں۔ ساتھ ہی چند مخصوص وقتوں پر اردو نیوز بھی نشر کی جاتی ہیں جو اردو آبادی والی ریاستوں کے علاقائی چینل سے بھی نشر ہوتی ہیں۔ سری نگر کشمیر ریڈیو پر اردو نشریات مستقل ہیں اور باضابطہ ہیں۔ تقسیم کے بعد اردو زبان جس زبوں حالی کا شکار ہوئی اس کا علم تمام اہل نظر کو ہے۔ حالانکہ سردار پٹیل جو پہلے وزیر اطلاعات اور نشریات تھے، انھوں نے پارلیمنٹ میں یہ کہا تھا کہ ہندی کے علاوہ اردو زبان کو بھی نشریے کا ذریعہ بنایا جائے گا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ یہ اور بات ہے کہ فیلڈن کے بعد آل انڈیا ریڈیو کے پہلے ہندوستانی ڈائریکٹر جنرل پطرس بخاری مقرر ہوئے۔ اس دور کے نامور شعرا و ادبا ریڈیو کے مختلف عہدوں پر مامور کیے گئے، جن میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، منٹو، اوپندر ناتھ اشک، بعد کو سہیل عظیم آبادی ہندوستانی نشریے کا حصہ بنے اور پروگراموں میں اردو کو فوقیت حاصل رہی۔ البتہ علاقائی ریڈیو پر علاقائی زبانوں کو فوقیت دی گئی۔ مگر حیدرآباد ریڈیو پر اردو کو اہمیت ضرور دی گئی اور شعبے کی کوشش رہی کہ وہاں اردو جاننے والے اسٹاف اور ڈائریکٹر کا تقرر ہو۔ سری نگر ریڈیو میں بھی اردو زبان کو فوقیت حاصل رہی۔ وہ اب بھی ہے۔

جہاں تک کلکتہ ریڈیو کا تعلق ہے تو یہاں کوئی باضابطہ اردو کا مقررہ چنک نہ تھا۔ ہندی پروگرام کے پروڈیوسر مثلاً دیپ متھولیا مہینے میں ایک بار اسٹوڈیو میں مشاعرہ یا شعری نشست ریکارڈ کرا کر نشر کروا دیتے۔ کبھی کبھی مشہور ادبی اور صحافتی شخصیتوں کو مدعو کر کے ان کی تقاریر نشر کروا دیا کرتے تھے۔ مگر کیندر کے Fix Point چارٹ میں اردو پروگرام کی کوئی نشاندہی نہیں ہوتی تھی۔

حالانکہ انجمن ترقی اردو شاخ کا برابر یہ مطالبہ رہا کہ کلکتہ ریڈیو اسٹیشن سے باضابطہ اردو پروگرام نشر ہو۔ مگر 1980 کی مئی تک ایسا نہ ہو سکا۔ حُسن اتفاق سے کلکتہ آکاش وانی پر ٹرانسفر ہو کر کشمیر کے مشہور اردو شاعر نے اسٹیشن ڈائریکٹر کا چارج لیا۔ آپ سب ہی جانتے ہوں گے وہ شاعر تھے مرحوم جناب قیصر قلندر۔ اردو سے ان کی گہری محبت فطری اور والہانہ تھی۔ اُنھوں نے کلکتہ کیندر کے A.R.O (Audience Research Officer) کو بلا کر پوچھا کیا آپ نے کبھی اردو سامعین (Urdu listeners) کا Data الگ سے تیار کیا۔ کبھی اردو Audience کا سروے کیا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ ہمارے Coverage Area میں (یعنی مغربی بنگال میں) اردو بولنے والوں کی بھاری تعداد ہے۔ آپ فوراً سروے کریں اور ہفتہ بھر میں رپورٹ پیش کریں۔ ان کی رپورٹ کا فی صد تناسب اتنا تھا کہ اردو نشریات کا جواز نکل آیا۔ انھوں نے اس رپورٹ کے حوالے سے وزارت اطلاعات* ونشریات کو یہ تجویز بھیجی کہ کم از کم ہفتہ میں ایک چنک آدھے گھنٹے کا مخصوص کیا جائے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ اردو کا ایک میگزین پروگرام سنیچر کی رات کے ساڑھے نو بجے (9.30 p.m) کلکتہ 'بی' پر نشر کیا جائے۔ جون 1980 سے آکاش وانی کلکتہ سے ہفتے وار نشریہ 'انجمن' کے نام سے شروع ہوا، جو ہنوز جاری ہے۔ اس پروگرام کی Frequency اور وقت بڑھانے کے لیے انجمن ترقی اردو کے رُکن قاسم علیگ نے بڑی کوششیں کیں۔ میں نے برابر اپنے نوٹ میں یہ لکھا کہ اردو آبادی کثیر ہوتی جارہی ہے اس کے Duration اور Frequency میں اضافے کا مطالبہ بڑھتا جارہا ہے مگر جواب دیا گیا کہ اتنی بڑی تعداد میں پوسٹ کارڈ جو آئے ہیں Sponsored ہیں۔ ہم نے اسٹیشن ڈائریکٹر سے کہا کہ یہ Association for promotion of Urdu کی آل انڈیا تنظیم ہے۔ بلکہ اردو کے معاملات میں اس کی حیثیت Advisory body کی ہے۔ ہر صوبے میں اس کی شاخیں ہیں۔ مرکزی حکومت اردو زبان کے مسائل پر اسی Association سے مشورے کرتی ہے۔ مگر نتیجہ اب بھی وہی ہے۔ دوردرشن کی آمد کے بعد ریڈیو نشریات کی اہمیت بہت کم ہوگئی ہے۔ اب ایف ایم ریڈیو کا دور ہے۔ اس کی زبان نہ خالص اردو یا ہندی ہے بلکہ Mixed چاٹ مسالہ ہے۔ ہندی زبان کے نشریاتی پروگرام میں اناؤنسر اردو اشعار اور اردو زبان بے طرح استعمال کرتے ہیں

* ان دنوں وزیر اطلاعات ونشریات جناب لال کرشن ایڈوانی تھے۔ حکومت جنتا پارٹی کی تھی۔

مگر ہندی کے نام پر۔ ہندی سیریل کی زبان بھی اردو ہی ہے۔

بہر حال میں نے اپنے زمانے میں آدھ گھنٹے کے پروگرام میں ہی اسے متنوع بنانے کی کوشش کی۔ پروگرام کو صرف شعر و شاعری اور ناٹک تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس میں ڈرامے، فیچر، ڈاکومینٹری، انٹرویو، مباحثے، سائنسی معلومات وغیرہ بھی شامل کیں۔ بنگلہ ڈراموں کو اردو میں ترجمہ کروا کر اردو پروگرام کے لیے پروڈیوس کیا۔ چونکہ کلکتہ ریڈیو سے اردو نیوز نشر نہیں ہوتی تھیں تو ہم نے اردو ادب و کلچرل پروگراموں کی Spot ریکارڈنگ کروا کر 'شہر نامہ' کے عنوان سے نشر کیا جو آج بھی جاری ہے۔ اسی نوعیت کا پروگرام میں، ''متاعِ شہر' کے نام ان شہروں کی سرگرمیوں کی ریکارڈنگ کرواتا جو کلکتہ سے باہر تھے۔ مثلاً آسنسول، برن پور، رانی گنج، ہوڑہ، ہگلی، اسلام پور وغیرہ۔ مدعو سامعین کے سامنے کلکتہ اور اس کے اطراف میں ریڈیو مشاعرے کا انعقاد ہوتا۔ اس طرح الیکٹرانک میڈیا کے سب سے پرانے شعبے یعنی آل انڈیا ریڈیو نے اردو شعر و ادب اور زبان کی چھوٹے پیمانے پر ہی سہی بڑی خدمت انجام دی اور یہ خدمت ہنوز جاری ہے۔

جیسے جیسے تقسیم وطن کی الم ناکیاں کم ہوتی گئیں ویسے ویسے برادرانِ وطن میں اردو زبان کی چاہت بڑھنے لگی۔ اس چاہت کو مہمیز لگائی فلموں نے۔ ہمیں یہ کہنے میں عار نہیں کہ ہندوستان کی لسانی عصبیت اور اردو مخالفت کے زمانے میں اگر اردو کو ہندی فلموں کا سہارا نہ ملتا تو غیر اردو داں طبقے میں اس کی مقبولیت نہ بڑھتی۔ صرف ایک غیر ملکی زبان بن کر رہ جاتی۔ ہندی فلموں میں اردو کے استعمال کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ فلموں کے بڑے بڑے ڈائریکٹر، پروڈیوسر، ایکٹرز بٹوارے کے بعد بمبئی چلے آئے۔ آزادی سے قبل لاہور بھی بڑا فلمی مرکز تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اردو اصنافِ ادب، بالخصوص گیت، غزلیں اور نظمیں ہندی فلموں کے لیے بے حد مناسب تھیں، نیز اردو زبان کی چاشنی اور حلاوت فلموں کی کامیابی کی ضمانت تھی۔ فلم جگنو، داغ، پکار (سہراب مودی) انارکلی، مغلِ اعظم، برسات کی رات، میرے محبوب، پاکیزہ وغیرہ وہ فلمیں تھیں جنھوں نے اردو زبان کو ہندوستان میں امر کر دیا۔ شاعروں میں خمار بارہ بنکوی، مجروح سلطان پوری، شکیل بدایونی، ساحر لدھیانوی کے نغموں نے الیکٹرانک کے اس قدیم میڈیم کو لافانی بنا دیا۔ ہندوستان میں فلموں کو اتنی ترقی ملی کہ تعداد کے اعتبار سے سب سے اونچے مقام پر ہے۔ ہماری فلم

انڈسٹری نے ہر نوعیت کی ہر (Genere) کی فلمیں بنائی ہیں، جن میں تاریخی، سماجی، جاسوسی، جنگ بازی، کامیڈی وغیرہ۔ فلموں کے اردو مکالموں نے بھی اردو کے فروغ میں بہت اہم کردار نبھایا ہے۔ یاد کیجیے فلم داغ، دیدار، انارکلی، مغل اعظم، میرے محبوب اور شعلے وغیرہ کے مکالمے۔ غرض کہ ہندوستان میں اس سمعی اور بصری (Audio-Visual) ذریعۂ ابلاغ نے ہندوستانی آرٹ اور کرافٹ کے میدان میں انقلاب بپا کیا ہے۔ بطورِ خاص فکشنل فیچر فلموں نے۔ ادھر کئی برسوں سے Short فلموں کے پروڈکشن بھی ہو رہے ہیں۔ عالمی اور مغربی فلمی میلوں میں ان کی بڑی پذیرائی ہو رہی ہے، انعامات بھی مل رہے ہیں۔ ہمارے ہی شہر کے مرحوم عین رشید کی فلم 'ساتواں آدمی' بے حد مقبول ہوئی اور اس Category میں کئی Awards جیتے، شاید ایک ایوارڈ برلن فلم فیسٹول میں بھی حاصل کیا تھا۔ ہندی فلموں نے تمام تعصبات اور تحدیدات کے باوجود اردو زبان کی بے بہا خدمت انجام دی ہے۔

فلموں کے بعد سمعی و بصری ذریعہ ابلاغ میں .T.V کا درجہ سب سے اونچا ہے۔ Satellite کی ایجاد نے ریڈیو اور .T.V کی Networking کو عالمی بنادیا ہے۔ اس طرح آپ دنیا کے کسی بھی کونے میں بیٹھ کر ہندوستانی یا پاکستانی اردو چینل کے پروگرام دیکھ سکتے ہیں۔ ان پروگراموں کے درمیان News Telecast کا خاصا اہتمام ہے۔ DD National اور DD Bangla پر بھی اردو خبریں نشر ہو رہی ہیں۔ کلکتہ دوردرشن سے بھی اردو خبروں کے نشریے کا آغاز 20 ستمبر 1992 سے ہوا، بنگلہ خبروں کے بعد دس منٹ کا اردو خبروں کا بلیٹن بھی نشر ہوتا ہے۔ اس طرح بنگلہ حلقوں میں اردو اور بھی زیادہ مقبول اور ہر دلعزیز ہو رہی ہے۔ اکثر ہمارے بنگالی دوست اور رفیق کار خبروں میں استعمال ہونے والے اردو الفاظ کے معنی دریافت کرتے۔ مثلاً وزیر اعظم، وزیر اعلیٰ، وزیر خارجہ، وزیر داخلہ، انسانی حقوق، دستورِ ہند، ہلاک شدگان، خبر رساں ایجنسی، اقوامِ متحدہ، یومِ جمہوریہ، دولتِ مشترکہ (Common Wealth) وغیرہ۔ حال ہی میں ہمارے گھر پر بنگلہ بھاشی کام والی آئی ہے۔ وہ ہندی یا اردو بڑے آرام سے بولتی ہے۔ ہم لوگوں نے دریافت کیا تم نے ہندی/اردو کہاں سے سیکھی ہے۔ اس نے کہا .T.V سیریل دیکھ کر۔ اسی کو کہتے ہیں ڈائریکٹ ٹو ہوم (DTH) ابلاغ۔

E T V اردو کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے دور درشن بھی اپنا اردو چینل شروع کر چکا ہے جسے ہم ڈی ڈی اردو کے نام سے جانتے ہیں پروگرامس اور اردو خبریں نشر کرتا ہے۔ ہندوستانی T.V. چینلوں نے اردو زبان کی ترسیل و تفہیم کا خاصا ماحول پیدا کر دیا ہے۔ ای ٹی وی، سہارا وغیرہ بھی اب اس دوڑ میں شامل ہیں۔ اردو چینلوں کی T.R.P بھی ہندی چینلوں سے کم نہیں۔ لہٰذا ان کے Commercial spots تجارتی فوائد پہنچا رہے ہیں۔ اردو ادب و آداب، اردو تہذیب و ثقافت اب ہمارے الیکٹرانک میڈیا کا اثاثہ ہیں جن کے بغیر ان کا نام نہیں چل سکتا۔ میگا سیریل 'مہابھارت' کی بے مثل کامیابی کا راز اسی میں پوشیدہ ہے کہ اس کی اسکرپٹ اردو اور ہندی کے شہرۂ آفاق ادیب راہی معصوم رضا نے لکھی تھی۔ ابھی بھی اسٹار چینل پر کئی ایسے میگا سیریل چل رہے ہیں جن کی زبان بنیادی طور پر اردو ہے۔ ہندی کے الفاظ شاذ و نادر استعمال ہوتے ہیں۔ اسٹار پلس (Star Plus) کا تازہ ترین سیریل 'بدتمیز دل' خالص اردو زبان میں لکھا سیریل معلوم ہوتا ہے۔ ہاں اگر کیریکٹر کی زبان (جیسے گرو، پنڈت وغیرہ) اس کی متقاضی ہو تو اس کی بات الگ ہے۔ T.V. اور فلموں کی زبان Spoken Language (بول چال کی زبان) ہوتی ہے، جو اردو سے زیادہ لگا کھاتی ہے۔ چینل کے نام بھی ہمارے یہاں اب اردو سے جوڑے جا رہے ہیں۔ جیسے Zee زندگی، Zee سلام، سہارا وغیرہ۔ فلمی گانے اور T.V. سیریل اردو کے بڑے خدمت گار ہیں۔

کمپیوٹر، انٹرنیٹ، Worldwide Web، سب کے سب اردو کی ترسیل، ترقی اور بقا میں نمایاں رول ادا کر رہے ہیں۔ بطور خاص اردو صحافت کو بڑی تقویت پہنچی ہے۔ اب اردو کے اخبارات National Dailies ہو رہے ہیں۔ سہارا اردو، اخبار مشرق، عالمی نیوز، انقلاب وغیرہ۔ یہ سارے اخبارات کمپیوٹر اور Internet کی بدولت ایک ساتھ کئی کئی شہروں سے شائع ہو رہے ہیں۔ اب یہ محسوس ہوتا ہے کہ اردو زبان کس مپرسی کی حالت سے باہر نکل چکی ہے۔ اردو اخباروں، جریدوں، رسائل و یکلی، پندرہ روزہ کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ اب یہ اخبارات ان کی ویب سائٹ پر بھی پڑھے جا سکتے ہیں۔ اردو سامعین و قارئین کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ غیر اردو داں اردو پڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

''سارے جہاں میں دھوم 'اردو زباں' کی ہے''

# اردو صحافت اور حکومتِ ہند

ڈاکٹر ابرار رحمانی

اردو میں رسائل وجرائد کی تعداد ایک دو یا دس بیس تک محدود نہیں بلکہ یہ سیکڑوں کی تعداد میں نکل رہے ہیں اور ان کی گنتی کر پانا بھی مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اردو میں آئے دن نئے نئے رسالے سورج کی مانند پوری آب وتاب کے ساتھ طلوع تو ہوتے ہیں لیکن شام ہوتے ہی ڈوب بھی جاتے ہیں۔ اردو کے یہ رسالے اِدھر ڈوبے، اُدھر نکلے۔ اُدھر نکلے اِدھر ڈوبے کے مصداق نکلتے اور بند ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں بیشتر رسائل ذاتی اور نجی ہوتے ہیں۔ مدیر اور صحافی کہلانے کے شوق میں یہ رسالے بڑی دھوم دھام سے نکالے تو جاتے ہیں لیکن انھیں بہت دور یا بہت دیر تک سنبھال پانا مشکل ہوتا ہے۔ ان رسائل وجرائد کی زندگی اور موت اس بات پر منحصر ہوتی ہے کہ ان کے مدیروں اور مالکوں کی جیب کی گہرائی کتنی ہے۔ لائق مبارکباد ہیں ''شاعر'' (ممبئی)، ''انشا'' (کولکاتا)، ''ذہن جدید'' (دہلی) اور ''شب خون خبرنامہ'' (الہ آباد) کے مدیران اور مالکان کہ یہ رسالے نہ صرف پوری آب وتاب کے ساتھ نکل رہے ہیں بلکہ اپنی موجودگی کا احساس بھی کراتے رہتے ہیں۔ گوکہ یہ رسائل 'شمع' اور 'بیسویں صدی' کے مدمقابل نہیں رکھے جاسکتے، جن کی سرکولیشن

ہزاروں میں نہیں بلکہ لاکھوں میں پہنچ چکی تھی۔ اس کے باوجود یہ بھی کڑ وا سچ ہے کہ شمع بجھ چکی اور بیسویں صدی بھی بیسویں صدی تک محدود ہو کر رہ گئی۔

حضرات! شاید میں اپنے موضوع سے بھٹک گیا ہوں۔ مجھے اپنی گفتگو کو موضوع کے مطابق بھارت سرکار کے رسائل و جرائد تک محدود رکھنا ہے۔ جیسا کہ میں نے شروع میں ہی عرض کیا ہے اردو میں رسائل و جرائد کی تعداد ایک دو یا دس بیس تک محدود نہیں بلکہ یہ سیکڑوں کی تعداد میں نکل رہے ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ سرکاری سطح پر نکلنے والے رسائل و جرائد کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ آیئے پہلے ان کے نام کی گنتی کر لیں:

(1) ماہنامہ 'اردو دنیا'

(2) ماہنامہ 'بچوں کی دنیا'

(3) سہ ماہی 'فکر و تحقیق'

(4) ماہنامہ 'آجکل'

(5) ماہنامہ 'یوجنا'

(6) ہفت روزہ 'روزگار سماچار'

(7) پندرہ روزہ 'سینک سماچار'

حکومتِ ہند کی وزارت فروغ انسانی وسائل کے ادارے قومی اردو کونسل سے ایک بہت ہی چمکتا دمکتا رسالہ 'اردو دنیا' کے نام سے پچھلے 18 سالوں سے جاری ہے۔ یہ رسالہ کبھی ترقی اردو بیورو کا خبرنامہ ہوا کرتا تھا، لیکن اب یہ ایک بھرپور قابل رشک رسالہ ہے، جو حسن صورت اور حسن سیرت دونوں سے مزین ہے۔ اس رسالے میں صحافت، ادبی مباحث، نفسیات، دوسری زبانوں سے، شخصیت، کتابوں کی دنیا، عالمی اردو نامہ، خبرنامہ، انٹرویو، زبان و تعلیم، خراج عقیدت، نقد و نظر، تہذیب و ثقافت، صنعت و حرفت، فلم، ادبی کوئز وغیرہ پر مضامین شامل ہوتے ہیں۔ اس طرح رسالہ 'اردو دنیا' اردو کے تمام دوسرے رسالوں میں ممتاز حیثیت کا مالک ہے۔ 100 صفحات پر مشتمل اس رسالے کی قیمت فی شمارہ 15 روپے اور سالانہ 150 روپے ہے۔

ماہنامہ 'اردو دنیا' ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' اور سہ ماہی 'فکر و تحقیق' ان تینوں رسائل کے

ایڈیٹر فی الوقت پروفیسر ارتضیٰ کریم ہیں۔ نومولود 'بچوں کی دنیا' ادب اطفال کی راہ میں اہم ترین سنگ میل ہے۔ بچوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوبصورت، خوب سیرت شاندار رسالہ قومی اردو کونسل کی فخریہ پیشکش ہے۔ بچوں کی دنیا میں پیاری پیاری نظمیں، قسط وار ناول، عجیب و غریب خبریں، دلچسپ کہانیاں، معلوماتی مضامین، ہنسنے ہنسانے کی باتیں، ان کے علاوہ دنیا کے مذاہب، کامکس کہانی، نانی کا صندوق، اردو ایس ایم ایس، اردو فیس بک، دماغی ورزش، ننھے فنکار اور ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم شامل ہیں۔ اس رسالے کی قیمت فی شمارہ 10 روپے اور سالانہ 100 روپے ہے۔

سہ ماہی 'فکر و تحقیق' اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ مانا جاتا ہے، جو اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز کی تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے کے لیے کوشاں ہے۔ اس جریدے کی قیمت فی شمارہ 25 روپے اور سالانہ 100 روپے ہے۔ مرکزی حکومت کا ایک اور رسالہ ہے جو وزارت دفاع کے تحت نکلتا ہے۔ اسی مناسبت سے اس رسالے کا نام 'سینک سماچار' ہے جو آج ہندوستان کی 13 زبانوں میں نکلتا ہے۔ لیکن جب یہ رسالہ 1909 میں فوجی اخبار کے نام سے جاری ہوا تو یہ صرف اردو میں تھا، جو 16 صفحات پر مشتمل اردو ہفت روزہ کی شکل میں تھا۔ اس رسالے میں دو صفحات رومن اردو میں بھی ہوتے تھے۔ اُس وقت ہندوستان میں اردو کا چلن اس قدر عام تھا کہ کیا مسلمان، کیا ہندو، کیا عیسائی اور کیا سکھ سبھی اردو پڑھتے تھے، لکھتے تھے اور بولتے تھے لیکن وقت نے کروٹ لی اور جہاں کل چمن تھا......۔ 13 زبانوں میں نکلنے والے اس رسالے کا کم وبیش ایک سال تک یہ ناچیز بھی ایڈیٹر رہ چکا ہے۔ لیکن چونکہ اس کا مزاج یہ ہے کہ This is a Magazine of the Army for the Army and by the Army. بہ الفاظ دیگر یہ پندرہ روزہ رسالہ پورے طور پر فوجیوں کے لیے ہے۔ اس میں فوجیوں کے کارنامے شائع ہوتے ہیں جو انھیں کے ذریعے لکھے جاتے ہیں اور وہی اسے پڑھتے بھی ہیں۔ عوام کو اس سے شاید ہی کوئی دلچسپی ہو۔ لیکن اس کے مدیران انڈین انفارمیشن سروس کے ہی ہوتے ہیں۔ ان دنوں اس رسالے کے چیف ایڈیٹر حبیب الرحمٰن صاحب اور ایڈیٹر احسان خسرو ہیں۔ ایک دلچسپ خبر یہ سننے میں آئی ہے کہ برسوں پہلے فوجی اخبار کے نام سے کرناٹک کے بنگلور شہر سے

ٹیپو سلطان کے زمانے میں ایک اخبار نکلتا تھا۔ اس خبر کی تصدیق معروف مورخ بپن چندرا نے بھی کی ہے۔ چونکہ اب تک اس اخبار کی کوئی کاپی نہ تو اصل اور نہ ہی اس کی کوئی عکسی کاپی ہی دیکھنے کو ملی ہے۔ لہٰذا ہنوز یہ امر مزید تحقیق کا متقاضی ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ قومی اردو کونسل نے اس پروگرام کو دو سو سالہ جشن اردو صحافت کے نام سے منسوب کیا ہے۔ یہ دعویٰ اس وقت ہی قابل قبول ہوگا جب اس اردو اخبار کو منظر عام پر لے آیا جائے گا۔

حکومت ہند کے رسائل میں سے ایک رسالہ تو وہی ماہنامہ 'آجکل' ہے جس کی ادارت ان دنوں راقم الحروف کے کاندھوں پر ہے، جو اب ڈائمنڈ جوبلی سال میں پہنچ چکا ہے۔ یعنی اس اگست میں یہ اپنی عمر کے 75 سال پورے کر لے گا۔ ناچیز کو یہ فخر حاصل ہے کہ گولڈن جوبلی سال میں بھی ماہنامہ 'آجکل' سے منسلک تھا اور اب ڈائمنڈ جوبلی سال میں بھی 'آجکل' کے ذریعہ اردو زبان و ادب کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ پبلی کیشنز ڈویژن سے نکلنے والا دوسرا اردو ماہنامہ 'یوجنا' کے نام سے پچھلے 35 سالوں سے تواتر سے نکل رہا ہے۔ یہ ایک ترقیاتی اور اقتصادی ماہنامہ ہے جو اردو سمیت ہندوستان کی 13 زبانوں میں نکلتا ہے۔ ماہنامہ 'یوجنا' کی ذمہ داری بھی اسی ناچیز کے کاندھوں پر ہے۔ ڈویژن سے نکلنے والا ایک اخبار ہفت روزہ 'روزگار سماچار' بھی ہے جو اپنے نام کے بموجب ایمپلائمنٹ کے اشتہارات پر مبنی ہے جو اردو کے علاوہ انگریزی اور ہندی میں بھی لاکھوں کی تعداد میں شائع ہو رہا ہے۔ یہ تینوں رسائل اور اخبار وزارت اطلاعات و نشریات حکومت ہند کے تحت ایک مضبوط اشاعتی ادارہ پبلی کیشنز ڈویژن سے پابندیٔ وقت سے شائع ہوتے ہیں۔

مذکورہ بالا رسائل میں سے 'آجکل' (1942) اور سینک سماچار (1909) میں جاری ہوئے۔ 'آجکل' جو 1941 میں جاری تو ہوا پشتو میں نن پرون کے نام سے، لیکن کچھ ہی دنوں میں پشتو کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی شائع ہونے لگا:

> ''نن پرون ایک عرصے سے پشتو زبان اور پشتو ادبیات کی بے نظیر خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس رسالے کی قدر و منزلت پختون قوم کے دل میں بس گئی ہے۔ بعض احباب پے در پے خواہش

کر رہے ہیں کہ نن پرون کا اردو ایڈیشن بھی نکالا جائے۔ چنانچہ ان کی خواہش اور دلائل سے متاثر ہو کر ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ نن پرون کا اردو ایڈیشن جاری کیا جائے جس کا پہلا شمارہ قارئین کرام کی خدمت پیش کیا جاتا ہے اور استدعا کی جاتی ہے کہ وہ اپنی قیمتی آرا اور مشوروں سے ہمیں مشکور فرمادیں۔"

(ادارہ نن پرون راجپور روڈ، 10، پرانی دہلی، اردو ایڈیشن 10 جون 1942)

پھر جلد ہی نن پرون کے بجائے 'آجکل' کے نام سے 25 نومبر 1942 سے اردو میں بھی شائع ہونے لگا۔ یکم جولائی 1943 کو یہ رسالہ پورے طور پر اردو کا پندرہ روزہ 'آجکل' کے طور پر سامنے آیا۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"اپنی دوسری سالگرہ کے موقع پر رسالہ 'آجکل' ایک نیا روپ بدل کر سامنے آرہا ہے۔ اب تک یہ رسالہ پشتو کے معروف رسالے نن پرون کا گویا ایک اردو چربہ ہوتا تھا اور اس حیثیت سے صوبہ سرحد میں پہلے ہی روشناس ہے۔ یہ اردو ایڈیشن جون 1942 میں شائع ہونا شروع ہوا اور جب سے اب تک غیر معمولی مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ اس کی بڑھتی ہوئی مانگ کو دیکھتے ہوئے بہت سے قدردانوں کی فرمائش پر بالآخر یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ آئندہ ہم صرف اپنے سرحدی احباب کو ہی مخاطب نہ کریں۔ بلکہ یہ رسالہ تمام ہندوستان کی اردو داں پبلک کے موافق مذاق اور پسند خاطر ہو سکے۔ چنانچہ اب رسالہ 'آجکل' ایک کل ہند حیثیت کا رسالہ ہو گیا ہے۔ امید ہے اہل ذوق اس کی حوصلہ افزائی کریں گے"۔

(پندرہ روزہ آجکل دہلی، یکم جون 1943، ص:4)

1947 کے ہنگامہ خیز دور میں تین ماہ کے لیے اس کی اشاعت معطل رہی۔ مارچ 1948 میں 'آجکل' کا گاندھی نمبر ماہنامہ کی شکل میں شائع ہوا۔ اس شمارہ میں عرش ملسیانی نے اطلاع دیتے ہوئے لکھا تھا:

''اردو کے ادبی حلقوں میں یہ خبر مسرت سے سنی جائے گی کہ شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی حکومت ہند کے پبلی کیشنز ڈویژن کے شعبۂ اردو میں مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے تشریف لے آئے ہیں۔ شعبۂ اردو اس پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ راقم، جگن ناتھ آزاد اور بلونت سنگھ آپ کے معاونین کی حیثیت سے کام کریں گے۔ شعبۂ اردو کے زیر اہتمام 'آجکل' کے علاوہ دو رسالے 'بساط عالم' اور 'نونہال' بھی نکلیں گے۔''

برٹش عہد سے نکلنے والے یہ رسالے بے شک برطانوی سامراج کے پروگرام اور پالیسی کے پروپیگنڈے کے لیے نکالے گئے تھے لیکن آزادی کے بعد بھی حکومت ہند نے انھیں جاری رکھا۔ مگر وہ 'آجکل' جو آزادی سے قبل پروپیگنڈے کے لیے جاری کیا گیا تھا وہ اب اردو زبان وادب اور ہندوستانی تہذیب وثقافت کے لیے وقف کر دیا گیا۔ اس کی بنیاد مضبوط کرنے کے لیے اس وقت کے وزیر اعظم اور وزیر تعلیم نے جوش ملیح آبادی کو بلا کر اس اہم رسالے کی ذمہ داری سونپی۔ جب سے اب تک یہ رسالہ اردو کے تقریباً تمام رسائل میں اپنی انفرادیت اور شناخت قائم کیے ہوئے ہے۔

ادارہ آجکل سے 15 جولائی 1948 سے جاری ہونے والا ماہنامہ 'بساط عالم' 1949 میں بند کر دیا گیا۔ 'بساط عالم' میں بین الاقوامی سیاست اور تہذیب وتمدن پر مضامین شائع ہوتے تھے۔ جبکہ 'نونہال' 15 اگست 1948 کو جاری ہوا۔ پھر جلد ہی یعنی 1949 میں یہ رسالے بند کر دیے گئے۔ 'بساط عالم' کو تو ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا جبکہ 'نونہال' مارچ 1950 میں بچوں کا آجکل کے نام سے شائع ہونے لگا جو ماہنامہ 'آجکل' کے آخری 8 صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ افسوس کہ اکتوبر 1965 کے بعد بچوں کا آجکل بھی بند کر دیا گیا۔ 15 سال تک شائع ہونے والا نونہال آجکل میں 'بچوں کا آجکل' کے نام سے تو محفوظ ہے۔ لیکن تقریباً ایک سال تک شائع ہونے والے 'بساط عالم' کے ساتھ کیا ہوا، کسی کو نہیں معلوم؟

دوسری طرف یہ بھی ہے کہ 'یوجنا' جیسے اقتصادی اور ترقیاتی رسالے کو اردو والے پڑھنا نہیں چاہتے جبکہ انگریزی اور ہندی میں اس کے قارئین کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ شاید اردو

والے شعر و ادب سے آگے کوئی چیز یا تو پسند نہیں کرتے یا انھیں ڈر ہے کہ دوسرے شعبوں کی چیزیں انھیں بدمزہ کر دیں گی۔ یہ حقیقت ہے کہ آج اردو زبان کو شعر و ادب تک خود اردو والوں نے محدود کر رکھا ہے۔ چنانچہ آج روز نامہ اردو اخبارات میں بھی سیاسی اور سماجی خبروں کے علاوہ اخبار کا ایک قابل لحاظ حصہ شعر و ادب پر مشتمل ہوتا ہے۔ تو کیا ہم اپنی زبان اردو کو شعر و ادب تک محدود کر کے دوسری زبانوں کی وسعت کا مقابلہ کر سکیں گے؟ میرا خیال ہے کہ اس پر ہمیں غور کرنا چاہیے۔

# اردو صحافت اور جدید ٹیکنالوجی

قطب الدین شاہد

گزشتہ صدی میں ٹیکنالوجی کی برکت سے زندگی کے تمام شعبہ جات نے بھرپور استفادہ کیا ہے، ان میں اردو اور اردو صحافت بھی شامل ہے۔ ابتدا میں اردو صحافیوں کو بڑی دشواریوں کا سامنا تھا۔ صحافیوں کو ناکوں چنے چبانے پڑتے تھے۔ طباعت و صحافت ایک مشکل اور دشوار گزار مرحلہ تھا۔ پرنٹنگ کے شعبے میں اردو کو وہ سہولتیں میسر نہیں تھیں جو دیگر زبانوں کو حاصل تھیں لیکن آج ٹیکنالوجی کے استعمال نے یہ فرق بہت کم کر دیا ہے جس کی وجہ سے اردو اخبارات بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ فی الحال آسانیاں اس قدر ہیں کہ کم سے کم افرادی قوت میں بڑا سے بڑا اخبار جاری کرنا اب بائیں ہاتھ کا کھیل ہو گیا ہے۔ صرف صلاحیت اور سرمایہ درکار ہوتا ہے۔ اگر آپ کے پاس صلاحیت اور سرمایہ ہے تو ایک چھوٹے سے دفتر میں بیٹھ کر کسی بھی مقام سے بین الاقوامی اہمیت کا حامل اخبار ور سالہ جاری کر سکتے ہیں۔

صحافت عربی لفظ ہے جو 'صحف' سے ماخوذ ہے جس کے معنی کتاب و رسالہ ہے تاہم جدید عربی لغت میں اسے جریدہ اور اخبارات کے معنوں میں بھی لیا جاتا ہے۔ صحافت کی تاریخ

بہت قدیم ہے بلکہ عہد طباعت سے بہت پہلے کی بتائی جاتی ہے۔ 1957 میں شائع ہونے والی محمد عتیق صدیقی کی مرتبہ تحقیقی کتاب ''ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں'' کے مطابق:

> ''حضرت عیسیٰ سے کوئی 751 برس پہلے رومن راج میں روزانہ ایک قلمی خبرنامہ جاری کیا تھا جس میں سرکاری اطلاعات نیز میدانِ جنگ کی خبریں ہوتی تھیں۔ اس قلمی خبرنامے کو 'ایکلا ڈایرنا' کہتے تھے۔ یہ لاطینی زبان کا لفظ ہے جو ACTA اور DIURNA کا مرکب ہے۔ اول الذکر کے معنی ہیں کارروائی اور موخر الذکر کے معنی روزانہ/یومیہ۔''

لیکن جدید اخبار نویسی کی تاریخ بہت قدیم نہیں ہے، بس چار پانچ سو برس کی بات ہے۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے زیر اہتمام صحافت کے طلبہ کے لیے شائع ہونے والی نصابی کتاب میں بتایا گیا ہے:

> ''1566 میں وینس شہر میں یہ طریقہ عام تھا کہ ایک شخص عام شاہراہ پر کھڑے ہو کر بلند آواز میں لوگوں کو دلچسپی کی خبریں ایک قلمی مسودے سے پڑھ کر سناتا تھا۔ یہ مسودہ حکومت کی نگرانی میں تیار کرایا جاتا تھا۔ جو لوگ ان خبروں کو سنتے تھے، ان سے ایک 'گزیٹا' وصول کیا جاتا تھا جو رائج الوقت سکہ تھا اور اسی کی مناسبت سے گزٹ کا لفظ ایجاد ہوا جو بعد میں اخبار یا سرکاری اعلان نامے کے معنی میں بولا اور لکھا جانے لگا۔''

ہندوستان میں اخبار نویسی کی تاریخ بھی اسی کے آس پاس قرار دی جاتی ہے۔ دستیاب شواہد کی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ اورنگ زیب کے زمانے میں شاہی محل میں ایک اخبار آیا کرتا تھا جو اُن کے عہد سے بہت پہلے جاری ہوا تھا۔ اس کی ایک ایک نقل دور دراز کے امرا وغیرہ کے لیے ارسال کی جاتی تھی۔ مغل عہد کے کئی سو قلمی اخبار لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔

چھاپے خانے کی ایجاد کے بعد پہلا مطبوعہ اخبار 1609 میں جرمنی سے جاری ہوا جس کا نام Oderzeitung Avisa Relation تھا۔ اس کے دو سال بعد اسی طرح کا ایک چھپا ہوا

خبر نامہ برطانیہ سے 'نیوز فرام اسپین' کے نام سے جاری کیا گیا۔ ہندوستان میں اخبار کی اشاعت کا سب سے پہلے خیال 1768 میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک ملازم کو آیا، جس کا نام ولیم لوئیس تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اسے خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی۔ بعد ازاں جیمس اگسٹس ہکی نامی ایک صحافی نے 'ہکیز ٹائمز' کے نام سے 29 رجنوری 1780 کو انگریزی میں ایک ہفت روزہ اخبار جاری کیا۔ اپنے زمانے میں یہ اخبار بہت مشہور ہوا۔ اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اسے 'کلکتہ جنرل ایڈورٹائزر' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ اس میں فارسی کا بھی ایک کالم ہوا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے بعض شماروں میں فارسی کی غزلوں کے ساتھ اُردو، عربی اور فارسی زبان میں اشتہارات بھی شائع ہونے کے ثبوت ملے ہیں۔ اس لحاظ سے اسے اگر اردو صحافت کا نقش اول بھی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ تقریباً انہی ایام میں ممبئی اور مدراس سے بھی انگریزی کے کئی اخبارات جاری ہوئے۔ ممبئی سے جاری ہونے والے اخبارات میں بامبے ہیرالڈ، بامبے کوریئر، بامبے گزٹ اور بامبے آبزرور قابل ذکر ہیں۔

یہ وہ دور تھا جب ہندوستان میں اردو کا فروغ بڑی تیزی سے ہو رہا تھا اور اس کا مرکز کلکتہ تھا۔ 1800 میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آنے کے بعد اس میں مزید تیزی آئی۔ ایسے میں مولوی اکرم نے سب سے پہلے اردو میں ایک مکمل اخبار کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے اسے عملی جامہ پہنایا۔ انھوں نے اپنے کچھ معاونین کے ساتھ کلکتہ سے 1810 میں ایک اخبار جاری کیا جس کا نام 'اردو اخبار' رکھا۔ اس اخبار کو زیادہ شہرت نہ مل سکی۔ اس کے 12 سال بعد یعنی 1822 میں لالہ سدا سکھ لعل نے کلکتہ سے ہی 'جام جہاں نما' جاری کیا۔ یہ اخبار عوام و خواص میں بہت مقبول ہوا۔ 1830 میں فارسی کی جگہ اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیے جانے کے بعد اردو کا فروغ بڑی تیزی سے ہوا۔

آج کا مہاراشٹر اور ممبئی بھی اس معاملے میں زیادہ پیچھے نہیں رہے۔ ممبئی میں اردو اخبارات کے موضوع پر تحقیق کرنے والے ڈاکٹر ماجد قاضی کے مطابق:

> ''مارچ 1822 میں کلکتہ سے 'جام جہاں نما' جاری ہوا۔ اسی سال 26 راپریل کو ممبئی سے فارسی اخبار'' آئینۂ سکندری' کا اجراعمل میں آیا۔12

صفحات پر چھپنے والا یہ فارسی ہفت روزہ فضل حق کی ادارت میں نکلتا تھا اور رامیس پریس میں اس کی طباعت ہوتی تھی۔ 1833 کے اواخر تک یہ صرف فارسی اخبار تھا۔ 1834 میں اس اخبار میں اردو ضمیمے کا اضافہ کیا گیا۔ اس طرح 'آئینۂ سکندری' ممبئی میں اردو صحافت کا نقطۂ آغاز بن گیا۔''

اتر پردیش اردو اکادمی کے زیر اہتمام شائع ہونے والی تحقیقی کتاب 'ہندوستانی پریس' میں مشہور محقق نادر علی خاں لکھتے ہیں:

''اخبار سکندری گویا نیم سرکاری اخبار تھا جو گورنر بمبئی کی ایما پر جاری کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ اس دور کے اخبارات پر اس کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی تھی کہ یہ لیتھو کے بجائے ٹائپ میں طبع ہو کر شائع ہوتا تھا۔''

یہ واقعہ ہے کہ اُس دور میں اخبار نکالنا بہت مشکل کام تھا۔ عام طور پر مدیران ہی اخبارات کے مالک بھی ہوتے تھے۔ انھیں نہ صرف طباعتی دشواریاں جھیلنی پڑتی تھیں بلکہ حق گوئی کی پاداش میں سرکاری عتاب بھی جھیلنا پڑتا۔ خبروں کی فراہمی آسان نہ تھی، جس کے لیے انھیں کلی طور پر انگریزی اخبارات پر انحصار کرنا پڑتا تھا، بالخصوص وہ اخبارات جو برطانیہ سے شائع ہوتے تھے۔ پانی کے جہاز سے ان اخبارات کو ہندوستان تک پہنچنے میں تقریباً 6 ماہ کا عرصہ درکار ہوتا۔ اس کے بعد اس میں سے کیمونٹی کی دلچسپی سے متعلق خبروں کا ترجمہ کیا جاتا تھا اور اسے شائع کیا جاتا تھا۔ اس دور میں پرنٹنگ مشینیں بھی بہت تھکی تھکی سی ہوتی تھیں، اس کی وجہ سے طباعتی مرحلہ بہت دشوار گزار ہوا کرتا تھا۔ چونکہ اُس وقت صحافت پروفیشن نہیں تھا بلکہ ایک مشن ہوا کرتا تھا اور اخبارات ایک مقصد کے تحت نکلتے تھے۔ اس لیے تمام تر صعوبتوں اور پریشانیوں کے بعد بھی جاری رہتے تھے۔ ایک اخبار بند ہوتا تو دوسرا جاری ہو جاتا۔ یشونت راؤ چوہان یونیورسٹی کے صحافتی کورس کے لیے ترتیب دی گئی نصابی کتاب کے مطابق 1853 تک ہندوستان سے 53 اخبارات شائع ہوتے تھے۔ جب تحریک آزادی زور پکڑنے لگی تو اُن تمام اخبارات پر جو جذبۂ حریت سے سرشار تھے، سختیاں برتی جانے لگیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیشتر پر پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ اس کے سبب 1854

میں صرف 12 /اخبارات ہی جاری رہ سکے لیکن جب حالات معمول پر آئے تو ایک بار پھر اخبارات کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا۔ 1885 میں تواتر کے ساتھ شائع ہونے والے اخبارات کی تعداد 117 تک پہنچ گئی۔ ابتدا میں اردو طباعت بلاک یا پھر لیتھو کے ذریعہ کی جاتی تھی۔ اسی دوران طباعت کے شعبے میں کتابت کی دشواریوں سے بچنے کے لیے ٹائپنگ کو متعارف کرایا گیا لیکن یہ تکنیک کامیاب نہ ہوسکی۔

آفسیٹ آجانے کے بعد صحافت کے شعبے میں زبردست انقلاب آیا۔ طباعت میں بڑی آسانیاں ہوگئیں۔ اردو صحافت کو اس ٹیکنالوجی کو استعمال کرنے میں تھوڑا وقت ضرور لگا مگر بیسویں صدی کی ساتویں آٹھویں دہائی تک اردو والے بھی اس تکنیک سے مستفیض ہونے لگے لیکن مخصوص ادارے ہی اس کے متحمل تھے۔ اردو صحافت کے لیے ٹیکنالوجی کا یہ پہلا بڑا استعمال تھا۔ اس تکنیک کی وجہ سے اخبارات ورسائل میں شائع ہونے والی تصاویر پہچان میں آنے لگیں۔ اردو کے اخبارات میں بھی رنگین صفحات نظر آنے لگے۔ آفسیٹ مشین کی وجہ سے بہت کم وقت میں بہت زیادہ کاپیاں چھپنے لگیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ گھٹنوں کے بل چلنے والی اردو صحافت اپنے پیروں پر کھڑی ہوگئی۔

آفسیٹ پرنٹنگ کا آغاز سب سے پہلے 1875 میں برطانیہ میں ہوا۔ اس کے موجد 'رابرٹ بارکلے' ہیں۔ 1904 میں امریکہ کے 'ایرا واشنگٹن روبیل' نے آفسیٹ پرنٹنگ کو مزید بہتر بنایا۔ یوں دیکھا جائے تو ہندوستان میں آفسیٹ پرنٹنگ کی تکنیک بہت بعد میں متعارف ہوئی، بالخصوص اس تک اردو اخبارات کی رسائی کافی بعد میں ہوئی۔

آفسیٹ پرنٹنگ آجانے کے بعد بھی ایک عرصے تک اردو اخبارات میں ہاتھ سے کتابت ہوا کرتی تھی۔ طباعت کے ہر مرحلے پر مشینوں کا استعمال ہوتا تھا لیکن کتابت ہاتھ ہی سے ہوا کرتی تھی جبکہ دیگر زبانوں کے اخبارات بالخصوص انگریزی صحافت کمپیوٹر ٹیکنالوجی کی مدد سے بہت تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کر رہی تھی۔ اردو کی قسمت کا ستارہ بیسویں صدی کی آخری دہائی میں چمکا جب کمپیوٹر کے ذریعہ کتابت ہونے لگی۔ ممبئی کی سرزمین پر سب سے پہلے 'دلکش' نام سے اردو کا ایک ڈاس بیسڈ (DOS based) ٹائپ سیٹنگ سافٹ ویئر جاری کیا گیا۔ اس کا

استعمال بھلے ہی بہت محدود رہا ہو لیکن اس نے راستہ ہموار کر دیا اور اس کی امید جاگ اُٹھی کہ اب بہت جلد اردو اخبارات بھی کمپیوٹر ٹیکنالوجی سے مستفید ہونے لگیں گے اور پھر وہ دن بھی آ گیا جب اردو دنیا میں 'ان پیج' نامی اردو پبلشنگ سافٹ ویئر کی آمد ہوئی۔ اس ٹیکنالوجی کے آ جانے سے وہ اردو صحافت جو گھٹنوں کے بل چلنے کے بعد ابھی ابھی کھڑے ہو کر چلنے کی کوشش کر رہی تھی، دوڑ نے لگی۔ طباعت بہت آسان ہو گئی۔ اس منزل تک آتے آتے خبروں کی فراہمی میں بھی انقلاب آ چکا تھا۔ وہ دن لد گئے تھے جب اردو کے اخبار انگریزی اخباروں کے محتاج ہوا کرتے تھے۔ اردو صحافت انفارمیشن ٹیکنالوجی کا بھرپور استعمال کرنے لگی تھی۔ ایک جانب جہاں بہت ساری خبر رساں ایجنسیاں میدان میں آ گئی تھیں، وہیں ٹیلی ویژن کی رسائی بھی ملک کے کونے کونے تک ہو چکی تھی۔ پی ٹی آئی، اے پی، اے ایف پی اور رائٹر جیسی خبر رساں ایجنسیاں جہاں کوئی واقعہ رونما ہونے کے محض چند ساعتوں بعد خبریں پہنچا دیا کرتی تھیں، وہیں واقعات کی تازہ ترین تصویریں بھی فراہم کی جانے لگی تھیں۔ اہم بات یہ ہوئی کہ اس ٹیکنالوجی کے استعمال میں اردو صحافت، دیگر زبانوں کی صحافت کے ہم قدم ہو گئی۔ ایک جانب جہاں یو این آئی کی صورت میں اردو میں خبریں فراہم کرنے والی ایک نیوز ایجنسی وجود میں آ گئی، وہیں چھوٹے بڑے تمام اخبارات ورسائل کورل ڈرا اور فوٹو شاپ جیسی تکنیک سے بھی فیضیاب ہونے لگے۔ اب نہ ہاتھ سے کتابت کی پریشانی رہی اور نہ ہی اس کی پیسٹنگ اور تصویروں کے پازیٹیو بنانے کا مسئلہ رہا۔ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ دور دراز کے علاقوں سے بھی اخبارات ورسائل شائع ہونے لگے۔ رفتہ رفتہ وہ شبیہ بھی بہتر ہونے لگی جس کے تحت کہا جاتا تھا کہ اردو اخبارات میں وہ خبریں ہوتی ہیں جو معاصر انگریزی اخبارات میں ایک دن قبل شائع ہو چکی ہوتی ہیں۔ اسی درمیان الیکٹرانک میڈیا میں بھی اردو صحافت نے داخلہ لیا اور اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔

خبروں کی فراہمی کے بہت سارے ذرائع میسر ہو جانے اور طباعت کے مرحلے میں بہت ساری آسانیاں پیدا ہو جانے کے بعد بھی ایک بڑا مسئلہ اخبارات کی ترسیل کا تھا۔ اخبارات ایک محدود خطے تک ہی پہنچ پا رہے تھے۔ یہ اخبارات دور دراز کے علاقوں میں دوسرے دن یا بذریعہ ڈاک ہفتوں میں پہنچتے تھے۔ اردو اخبارات نے ایک بار پھر ٹیکنالوجی سے فائدہ اُٹھایا اور

ویب سائٹس کے ذریعہ محض چند لمحوں میں دنیا کے دور دراز علاقوں میں آباد اردو کی ان بستیوں میں بھی دستک دینے لگے جہاں تک اخبارات کی 'ہارڈ کاپی' کی رسائی آسان نہیں تھی۔ 'ای پیپر' کی ٹیکنالوجی آجانے کے بعد اردو صحافت فراٹے بھرنے لگی تھی۔ یہ جدید ٹیکنالوجی ہی کی برکت ہے کہ علی الصباح بستر پر ہی اخبارات سے ملاقات ہو جایا کرتی ہے اور اسی طرح وہ لوگ بھی ای پیپر کی وجہ سے اپنے علاقوں اور خطوں کے واقعات سے باخبر ہو جاتے ہیں جو دنیا کے دوسرے گوشوں میں رہتے ہیں۔ بیسویں صدی کے اخیر اور اکیسویں صدی کے آغاز میں ایک اور انقلاب آیا جب نیوز پورٹل اور بلاگ کا آغاز ہوا۔ اس جدید تکنیک نے نہ صرف طباعت کی دشواریوں سے پوری طرح نجات دلا دی بلکہ ترسیل کا مسئلہ بھی حل کر دیا۔ آج اردو صحافت کی ترویج و اشاعت میں سوشل میڈیا بھی اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

مہاراشٹر اور ممبئی کی اردو صحافت نے بھی جدید ٹیکنالوجی سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ اِس وقت ممبئی سے اردو کے 5 قومی روزنامے نکلتے ہیں، جن میں سے بیشتر اخباروں کے کئی کئی ایڈیشن ہیں جو مختلف شہروں اور ریاستوں سے نکلتے ہیں۔ ان تمام اخبارات کے ویب ایڈیشن ہیں اور تقریباً سبھی کے ای پیپر بھی ہیں۔ یہ جدید ٹیکنالوجی کی ہی برکت ہے کہ محض ایک سال میں روزنامہ انقلاب نے ملک کے مختلف حصوں سے 11 ایڈیشن جاری کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ آج سے 25-20 سال قبل اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اردو صحافت کو اب وہ تمام لوازمات اور سہولتیں فراہم ہیں جو کبھی صرف انگریزی اور دیگر میڈیا کو میسر تھیں۔ ایک وقت تھا جب اردو کا ایک صحافی پہلے کاغذ پر کچھ لکھتا تھا، پھر کاتب سے اس کی کتابت کرائی جاتی تھی، پھر پروف ریڈنگ ہوتی تھی، بعد ازاں پتھر پر اس کے نقش اُبھارے جاتے تھے یا پلیٹ تیار کی جاتی تھی۔ اس طرح بہت سارے دشوار گزار مرحلوں کے بعد اس کی پرنٹنگ ہوتی تھی، اس کے باوجود کوالٹی اچھی نہیں ہوتی تھی، بالخصوص تصویریں بہت خراب چھپتی تھیں، بسا اوقات پہچان میں بھی نہیں آتی تھیں۔ ان تمام کاموں میں کافی وقت لگتا تھا۔ اس کے برعکس آج کا صحافی دفتر پہنچنے کے بعد اپنے ڈیسک پر بیٹھ کر کمپیوٹر کے ذریعہ تنہا ترجمہ کرتا ہے، کتابت اور اس کا لے آؤٹ ڈیزائن کرتا ہے اور پھر وہیں بیٹھے بیٹھے میلوں دور واقع پریس کو بھیج دیتا ہے، جہاں فوری طور پر اخبار کی پرنٹنگ کا کام شروع

ہو جاتا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی نے دنوں کا کام گھنٹوں میں اور گھنٹوں کا کام منٹوں میں کر دیا۔ ممبئی ہی کی طرح مہاراشٹر کے مختلف خطوں سے درجنوں روز نامے، ہفت روزہ اخبارات اور رسائل تواتر کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں۔ ان میں بھیونڈی، مالیگاؤں، اورنگ آباد، بیڑ، شولاپور، ناندیڑ اور ناگپور قابل ذکر ہیں۔

بلاشبہ جدید ٹیکنالوجی کے استعمال سے اردو صحافت کو بہت فائدہ پہنچا ہے لیکن اس کے کچھ نقصانات بھی ہیں۔ تکنیک کے آجانے سے تخلیق متاثر ہوئی ہے۔ اردو صحافت میں صحافیوں سے زیادہ کلرکوں کی تعداد پائی جارہی ہے۔ کسی زمانے میں عالم، ادیب اور شاعر صحافی ہوا کرتے تھے لیکن آج کمپیوٹر چلا لینا ہی شعبۂ صحافت میں داخلے کا معیار بنا ہوا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اردو زبان وادب سے متعلق معمولی شُد بُد کے حامل افراد بھی اپنے سینے پر صحافی کا تمغہ لگائے گھومتے پھرتے ہیں۔ موجودہ حالات میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولوی باقر، مولانا محمد حسین آزاد، سرسید احمد خاں اور حسرت موہانی کی طرح بے داغ صحافت کی امید بھی نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ اب صحافت پوری طرح سے مشن نہیں رہی بلکہ یہ پروفیشن میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اب نہ وہ مقصد رہا اور نہ ہی وہ جوش وجذبہ۔ بیشتر اخبارات کی ترجیح اب صرف زیادہ سے زیادہ آمدنی ہو کر رہ گئی ہے۔ مولانا محمد علی جوہر کہتے ہیں کہ صحافی رائے عامہ کا ترجمان ہی نہیں، راہ نما بھی ہوتا ہے۔ مولانا آزاد اخبارات کو ایک زندہ ہادی سمجھتے ہیں جو بری باتوں سے تنفر دلاتا ہے اور عمدہ باتوں کی جانب مائل کرتا ہے۔ 1902 میں اُس وقت کے مؤقر رسالے 'مخزن' میں وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''ہر قوم اور ہر فرد کو ایک رہبر اور ہادی کی سخت ضرورت ہے اور بغیر اس کے کوئی بھی صراط مستقیم پر نہیں چل سکتا یعنی حالت موجودہ کے اعتبار سے اخبار سے بڑھ کر کوئی ہادی اور رہبر نہیں ہے جو اسے سیدھی راہ پر چلائے۔''

اسی طرح یو این آئی کے سابق جنرل منیجر جی جی میر چندانی کہتے ہیں کہ ''صحافت ملک وقوم کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ صحافت تہذیب وتمدن، ثقافت وسماجی قدروں کی عکاسی کرتی ہے۔''

مولانا جوہر، مولانا آزاد اور میر چندانی کے ذریعہ بتائے گئے معیارات پر اگر آج کی صحافت بالخصوص اردو صحافت کو جانچا جائے تو علاوہ افسوس کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

جدید ٹیکنالوجی نے اردو صحافت میں کشش اور ظاہری حسن ضرور پیدا کیا ہے لیکن اس کے باطنی حسن کو نقصان بھی پہنچایا ہے۔ اس کے معیار و اقدار کے پیمانے بھی تبدیل کیے ہیں۔ ان حالات میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اردو صحافت کس رخ پر جا رہی ہے؟ سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا ٹیکنالوجی کا استعمال سوچ و فکر بھی تبدیل کر دیتا ہے؟ کیا مشن کے ساتھ پروفیشن نہیں چل سکتا؟ کیا آمدنی کے ساتھ قوم کی رہنمائی نہیں کی جا سکتی؟

بے شک جدید ٹیکنالوجی نے اردو صحافت کے قد و قامت کو بہت بلند کیا ہے مگر اس بات سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اس ترقی سے اردو صحافت کی روح بھی مجروح ہوئی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کے ظاہری حسن کے ساتھ ہی اس کے باطنی حسن کو دوبالا کرنے کے جتن کیے جائیں۔ یہ کام مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں۔

# اردو صحافت اور عصری چیلنجز
## (نئی تکنیک اور ٹیکنالوجی کے حوالے سے)

**ڈاکٹر ریحان انصاری**

علامہ اقبال نے لکھا ہے:

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

گذشتہ صدی میں ہوئی پے بہ پے اور نوع بہ نوع ایجادات نے سب کو حیرت زدہ کر رکھا ہے۔ میڈیا بھلا کیسے بچ پاتا۔ البتہ اردو میڈیا کو جدید ٹیکنالوجی کے ہم رکاب اور ہم آہنگ ہونے میں نسبتاً تاخیر ہوئی۔ اس تاخیر کے کچھ اسباب تھے۔ ایک بہت بڑا سبب یہ بھی ہے کہ اردو کو جدید ٹیکنالوجی سے جوڑنے کے لیے ہم اردو والے فعال (Active) کم اور منفعل (Passive) زیادہ ملا کرتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہم کوئی چیلنج پیش کرنے کے قابل کم نکلے ہیں اور دوسروں کے چیلنجز کا سامنا کرنے والے زیادہ ہوئے ہیں۔ جدید ٹیکنالوجی سے آج تو زندگی کا ہر شعبہ متاثر ہے، حتیٰ کہ اخلاقیات و معاملات بھی، لیکن میڈیا یعنی میدانِ صحافت اس سے ''سب سے تیز''

متاثر ہوا۔

دنیا کی زیادہ تر ایجادات نے انسان کی زندگی آسان سے آسان تر بنائی ہے اور ہم میں سے ہر فرد روزانہ اس کا مشاہدہ کرتا ہے۔

بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں ریڈیو کی آمد کے بعد صحافت کے معنی میں توسیع ہوئی تھی۔ تحریری صحافت سے صوتی صحافت کے سوتے پھوٹے تھے۔ پھر ربع صدی بیتنے کے بعد بولتی (ڈاکومینٹری) فلموں کا دور چلا اور ٹیلی ویژن ایجاد ہوا تو متحرک اور صوری صحافت یعنی الیکٹرانی صحافت رائج ہوگئی۔ ان تینوں ادوار میں یورپ اور امریکہ کے کاندھوں پر سوار ہوکر اردو (والوں) نے بھی اپنا قد اونچا دکھانے کی کوششیں کی مگر ان کی اکثر آڈینس برصغیر کی جغرافیائی حدود میں ہی کٹی تھی جبکہ ہم سب جانتے ہیں کہ میڈیا کی ترقی کا پیمانہ ٹی آر پی بمعنی تعداد آڈینس ہی ہے۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو دنیا بھر میں اردو دانوں کی پھیلتی آبادی کو جدید میڈیا سے فائدہ ملنے میں کئی عوامل مانع رہے۔ ان عوامل میں سب سے مقدم وہی بات رہتی ہے کہ ''اردو پر خرچ کر کے کیا ملے گا؟''...... اس زاویے سے دیکھا جائے تو ہم سب اپنی زبان کے لیے قربانیاں دینے کو تیار نہیں ہیں اور دوسروں کی ٹیکنالوجی پر منحصر ہونا ہماری فطرت ہے۔ اپنے جوہر ہمیں پر نہیں کھلتے۔ البتہ انٹرنیٹ کا استعمال عام ہو جانے کے بعد اردو دنیا بھی گلوبل ہو چکی ہے لیکن اس میں کہیں کہیں بڑا خلا موجود ہے۔

ایک مشہور اردو بلاگر 'ایم بلال ایم' نے ایک سوال قائم کیا اور خود ہی اس کا جواب بھی تحریر کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''قوموں نے ترقی کس زبان میں کی؟
>
> اس عنوان کا جواب صرف اتنا ہے کہ اپنی زبان، اپنی زبان اور بس اپنی ہی زبان میں ترقی کی۔
>
> خدا کے بندو زیادہ نہیں بس تھوڑے سے تاریخ کے صفحات کا مطالعہ کرو۔ دیکھو یورپ کے اس تاریک دور کو جب انگریزی میں جدید مواد تھا ہی نہیں۔ تب کچھ بندوں نے اپنی ضرورت کے مواد کو فارسی، عربی اور دیگر

زبانوں سے اپنی زبان میں منتقل کیا۔ عوام کو سکھایا اور شعور دیا۔ عوام خوشحال ہونا شروع ہو گئے۔ آج وہ وقت ہے کہ کسی بھی زبان میں کوئی تحقیق آتی ہے وہ اسے فوراً اپنی زبان میں منتقل کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ عوام کو نئی زبان سکھانے سے بہتر ہے کہ چند لوگ مترجم بن جائیں اور اپنے عوام کو انہی کی زبان میں مواد فراہم کریں تا کہ جتنی محنت نئی زبان سیکھنے پر کرنی ہے اتنی کسی اور کام میں کر کے مزید ترقی کی جائے۔
اگر اردو جدید ٹیکنالوجی میں اس مقام پر نہیں پہنچی جہاں دیگر زبانیں ہیں تو اس میں اردو کا کوئی قصور نہیں، یہ ہماری ہی نالائقی ہے۔ مزید یہ کہ گلوبل ویلیج کا راگ الاپنے والے جن کو انگریزی کا بخار چڑھا ہوا ہے۔ جنھوں نے کنویں سے باہر دیکھا ہی نہیں کہ ساری ترقی یافتہ دنیا اپنی اپنی زبانوں کو اپنائے ہوئے مزید ترقی کر رہی ہے۔ اگر انگریزی کے بغیر ترقی ممکن نہیں تھی تو پھر انھوں نے کیسے ترقی کر لی؟ دنیا گلوبل ویلیج بن چکی ہے تو پھر گوگل اور اس جیسی کئی ایک کمپنیاں انگریزی کے علاوہ دیگر زبانوں میں کیوں موجود ہیں۔ وہ ''صرف'' اس گلوبل ویلیج کی زبان کو ہی کیوں نہیں اپناتیں؟ وہ دیگر زبانوں میں اپنی ویب سائٹیں اور دیگر مواد کیوں فراہم کرتی ہیں؟ اس کا جواب صرف اتنا ہے کہ وہ کمپنیاں جانتی ہیں کہ ترقی یافتہ لوگ صرف اپنی زبان میں ترقی کر کے یہاں پہنچے ہیں اور وہ کبھی اپنی زبان نہیں چھوڑیں گے۔ ویسے بھی گلوبل ویلیج کی زبان انگریزی والی بات سرے سے ہی غلط ہے۔ بے شک دنیا گلوبل ویلیج بن چکی ہے لیکن اس گلوبل ویلیج کی کوئی ایک زبان نہیں بلکہ اتنی ہی زبانیں ہیں جتنی زبانوں والے لوگ اس میں شامل ہیں۔ کبھی آپ نے غور کیا ساری ترقی یافتہ دنیا اپنی کاغذی کارروائی اپنی زبان میں کرتی ہے۔ دیارِ غیر جانے والے لوگوں کو اس بات کا اندازہ ہوگا کہ ویزا کے جو کاغذات باہر سے

آتے ہیں وہ اس ملک کی اپنی زبان میں ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ باہر جانے والے کو اپنی اسناد اور دیگر کاغذات بھی اس ملک کی ہی زبان میں منتقل کروانے ہوتے ہیں۔ اگر انگریزی اتنی ہی اہم ہے تو وہ ملک پاگل ہیں جو آپ سے آپ کے کاغذات اپنی زبان میں مانگتے ہیں؟ وہی تو میں ترقی کرتی ہیں جو اپنے کام اپنی زبان میں کرتی ہیں اور صرف نہایت ہی مجبوری میں دوسری کسی زبان کا سہارا لیتی ہیں۔ کیونکہ سمجھدار قومیں دو کشتیوں کی سوار نہیں بنتیں بلکہ ایک کشتی میں بیٹھتی ہیں اور منزل کی جانب رواں دواں رہتی ہیں۔''

ٹیکنالوجیکل انقلابات سے پہلے کی اردو صحافت کے عنوانات بہت محدود تھے۔ ملکی، غیر ملکی، علاقائی خبریں، جرائم نامے، مذہبی (مسلکی)، سیاسی، فلمی، تفریحی، سماجی تجزیاتی مضامین، انٹرویوز، معمولی سی معلومات، گھریلو صحت سے متعلق چٹکلے، معمے اور ٹائم پاس مشغلے جیسی باتیں اور چیزیں۔

اس دور کے لدنے کے بعد جب ٹیکنالوجی نے صحافت یا جرنلزم کو ''میڈیا'' کا لباس دے دیا تو اس کا تکاثری proliferative دور شروع ہو گیا۔ اس میں ہر جگہ اسپیشلائزیشن کے شعبے قائم ہونے لگے۔ سیاسی (عالمی، ملکی، مقامی وغیرہ)، سماجی اور ثقافتی، کاروبار و معیشت، اسپورٹس، ریئل اسٹیٹ (اراضی و املاک)، علم، فلم، جرائم و قانون، سائنس و صحت اور ٹیکنالوجی، خواتین و اطفال، کیٹرنگ اور ریسپیز (طباخی)، ملبوسات و زیبائش وغیرہ۔ پہلے یہ شعبے موجود ہونے کے باوجود اپنا ایسا الگ وجود نہیں رکھتے تھے جیسا کہ اب ہو چلا ہے بلکہ ایک دوسرے میں تقریباً ضم ہو کر چلا کرتے تھے۔ مگر ٹیکنالوجیز کی آمد کے بعد ان کا تخصص منفرد و نمایاں اور بہت پہلودار بن کر سامنے آیا ہے۔ اس باب میں دیکھیے تو ہمارے یہاں مذکورہ میدانوں کے ماہرین تو بہت مل جائیں گے لیکن ان میں سے معدودے چند ہی ملتے ہیں جو اردو زبان میں اپنے علم و فن کی (قدیم و جدید) معلومات منتقل کرنے اور عوام کے لیے مفید بنانے کی جانب توجہ دیتے ہیں۔ اس باب میں میڈیکل افراد کی شراکت اور حصہ قابل قدر و قابل ذکر ہے۔ اس کے بعد تعلیمی میدانوں کے

ماہرین کا حصہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ اگر اس جانب لوگوں کو آمادہ کیا جائے، اُکسایا جائے تو ایک بہتر اور جدید و ہمعصر اردو معاشرہ اُبھر کر سامنے آ سکتا ہے جس پر کسی بھی قسم کی ''کوتاہ بینی'' کا الزام نہیں لگ پائے گا۔

صرف تیس برس قبل تک اردو صحافت اپنے چہرے کے لیے کاتبوں کی محتاج تھی۔ نستعلیق کے بغیر اس کی پہچان مشکل ہے۔ مگر نستعلیق خط کو کمپیوٹر کے ذریعہ قابل استعمال بنانے کی تکنیک تیار ہوتے ہی چہار صدیوں پر محیط کتابت و کاتب کی داستان ربع صدی میں داستان پارینہ بن گئی۔ اس تکنیک کی آمد سے یہ بڑا فائدہ ضرور ہوا کہ اخبارات و رسائل اور کتابوں کی طباعت ایسی آسان ہو گئی کہ اصحاب علم و فن کا دردِ سر کم ہو گیا۔ انھیں کاتب، پروف ریڈر، پیسٹر، پازیٹیو اور نگیٹیو فلم میکر وغیرہ سے چھٹکارا مل گیا۔ لیکن دو بڑے نقصانات بھی ہوئے۔ ایک نقصان یہ کہ فن کتابت کے طلبہ اور پاسداران کا کال پڑ گیا اور کوئی بھی نیا شخص کتابت سیکھنے کی جانب مائل ہی نہیں ہوتا، جبکہ کسی بھی نئے نستعلیق فونٹ کی تیاری بغیر اس شخص کے تعاون کے ممکن ہی نہیں جو فن کتابت کے رموز و تطبیق سے واقف ہو اور اگر اس جانب توجہ نہیں دی گئی تو اردو تحریر میں جمود و اِکہراپن رہ جائے گا۔ دوسرا نقصان یہ ہوا کہ اب کوئی ایرا غیرا بھی شعبۂ صحافت میں ''ٹیگ'' لگا کر چلنے لگا ہے۔ اُس کا املا، جملہ اور منجملہ اغلاط نویسی کا مرقع ہو تب بھی اسے اوراق کا کفن مل جاتا ہے۔

نستعلیق فونٹ کی بابت یہ تذکرہ بے محل نہیں ہوگا کہ یہ کام راتوں رات انجام نہیں پا گیا۔ یہ کئی تکنیکی مدارج سے گزرا۔ جدید تکنیکی مراحل سہولت پسند ہیں، کمپیوٹر یوزر بھی ان کے عادی اور متوالے ہیں۔ اردو زبان و تحریر ان کے لیے پیچیدہ ثابت ہوئی ہے۔ اردو محض حروف تہجی سے نہیں مزین ہوتی بلکہ اس میں حروف کی مرکب شکلیں جدا جدا انداز میں بار بار آتی رہتی ہیں۔ اسی لیے نستعلیق فونٹ ابتداءً ''ڈاس'' DOS بیسڈ تھا اور کلیدی تختے کی مدد سے ٹائپ ضرور ہو سکتا تھا مگر محض پرنٹ آؤٹ لیا جا سکتا تھا۔ اس کی ایک مثال ممبئی میں سرفراز آرزو (روزنامہ ہندوستان) کے ذریعہ تیار کردہ سافٹ ویئر ''دلکش'' کی صورت میں ملتی ہے۔ اس سے قبل ''کاتب'' نامی سافٹ ویئر کا استعمال بھی کیا جاتا تھا جو پاکستان میں تیار کیا گیا تھا مگر وہ کامیاب نہیں ہو پایا۔ حیدرآباد میں جناب انعام علوی کے ذریعہ ''صفحہ ساز'' نامی پلیٹ فارم بھی بنایا گیا لیکن اس کی بھی

محدودیت اسے مقبولِ عام نہیں بنا سکی۔ صفحہ سازی کے دیگر امور اس تکنیک میں ممکن نہیں تھے۔ اس کے بعد تصویری فائل bitmap میں نستعلیق فونٹ بنایا گیا۔ اس کا سب سے کامیاب استعمال ''اردو نیوز'' (سعودی عرب) میں دیکھا گیا، لیکن اپلیکیشن کی محدودیت کے سبب اسے بھی فروغ نہیں ملا۔ اس کے بعد جب ٹروٹائپ True Type فونٹ ٹیکنالوجی پر مبنی ''نوری نستعلیق'' برطانیہ میں Monotype نے تیار کیا تو اسے ''شاہکار'' نامی پاکستانی سافٹ ویئر کے پلیٹ فارم پر چلایا گیا۔ اسے ''احمد مرزا جمیل'' صاحب نے ایک کاتب کی ابتدائی مدد کے ساتھ تحریر کیا تھا۔ شروع شروع میں یہ بھی زیادہ کارآمد نہیں تھا کیونکہ اردو میں درکار مفرد و مرکب شکلوں کی تعداد ہزاروں میں ہے اور نوری نستعلیق میں اس وقت صرف سولہ (16) ہزار شکلیں ہی بن سکتی تھیں، دیگر شکلوں کی غیرموجودگی میں سطروں میں ''نسخ فونٹ'' کے کیرکٹر گھس بیٹھ کرتے تھے جو بدنمائی پیدا کرتے تھے لیکن یہ تجربہ کامیابی کا ضامن تھا۔ اس لیے اس پر مزید تحقیق و کام جاری رہا۔ حتیٰ کہ ونڈوز پر نوری نستعلیق فونٹ پوری روانی کے ساتھ کام کرنے لگا۔ لیکن اب بھی پبلشنگ کی دنیا کو اطمینان کے لیے ایک ایسے پلیٹ فارم کی ضرورت تھی جس پر صفحہ سازی اور پکچر امبیڈنگ وغیرہ بالکل اسی انداز میں انجام پائے جیسا کہ دیگر زبان والوں کے لیے آسان ہے۔ اس بابت دہلی کی سافٹ ویئر کمپنی ''کانسیپٹ سافٹ ویئر'' کے پارٹنرز وی کے گپتا اور آر پی سنگھ صاحبان نے جاپانی کمپنی کے لیے اپنے تیار کردہ سافٹ ویئر میں خاطر خواہ تبدیلیاں کر کے ''ان پیج'' نامی اردو پبلشنگ سافٹ ویئر دیا اور اس پر 'نوری نستعلیق' فونٹ پوری کامیابی کے ساتھ چل پڑا۔ پاکستان میں ''مقتدرہ'' کی امداد سے 'نفیس نستعلیق' بھی تیار کیا گیا لیکن اسے کامیابی سے استعمال نہیں کیا جاسکا۔ خطِ نستعلیق کے لاہوری اسکول کی کمی کو دور کرنے کے لیے ممبئی میں ڈاکٹر ریحان انصاری (بھیونڈی) کے تحریر کردہ فونٹ ''فیض نستعلیق'' کو خطاط جناب اسلم کرتپوری کی نگرانی حاصل تھی، فیض نستعلیق کو ''ایکسس سافٹ میڈیا'' (مجگاؤں) کے مالک، کمپیوٹر تکنیک کے ماہر اور ریسرچر سید منظر حسن زیدی نے فونٹ کی شکل دی۔ یہ فونٹ بھی 'ان پیج' کے پلیٹ فارم پر بہت سہولت، سرعت و روانی سے چلتا ہے۔ اس منزل تک آتے آتے کمپیوٹر ٹیکنالوجی نے دنیا کی تمام زبانوں کو مشترک کوڈ یعنی ''یونی کوڈ'' استعمال کرنے کے بعد ہی قابل قبول قرار دیا۔ اس لیے ان ٹیموں کو دوبارہ اپنے کام پر

لگنا پڑا اور نوری و فیض نستعلیق فونٹس کو یونی کوڈ میں منتقل کیا گیا۔ یہ پبلشنگ یا طباعتی دنیا کا تقاضا تھا۔ علاوہ ازیں اردو کی طباعتی دنیا میں نوری اور فیض نستعلیق فونٹس ہی ''اوریجنل'' یا اصلی و اساسی فونٹس ہیں۔ اسی دوران انٹرنیٹ کا استعمال بھی عام ہوا تو الیکٹرانک میڈیا میں بھی نستعلیق کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ اس پلیٹ فارم پر بہت سے احباب نے نوری نستعلیق اور فیض نستعلیق کے حرفی اجزا کو توڑ مروڑ کر کئی نستعلیق نام کے فونٹ بنانے کی سعی کی جنھیں علوی، جمیل وغیرہ ناموں سے متعارف کرایا گیا۔ بعد ازیں پاکستان میں لاہوری اسکول کے تاج نستعلیق اور مہر نستعلیق نے بھی اپنا جلوہ دکھایا لیکن ہنوز یہ دونوں کامیاب استعمال کے تجربے سے نہیں گزرے ہیں۔

اب ہم اپنے مقالے کے عنوان سے متعلق غور کریں تو اس میں اردو صحافت کے سامنے عصری (صحافتی) چیلنجز سے کئی ذیلی عنوانات بھی پھوٹتے ہیں جو میڈیا کی دو راہوں یعنی پرنٹ اور الیکٹرانک دونوں میں اپنی الگ الگ حیثیت رکھتے ہیں۔ عصری لسانی صحافت کو بغور دیکھیں تو اس کے اجزا میں صرف مواد کو تحریر کرنے کا کام نہیں رہ گیا ہے بلکہ اس کی پیشکش کا انداز بھی منفرد و دیدہ زیب نوعیت رکھتا ہے۔ ماضی کے مقابلے میں اب صفحات (ہارڈ کاپی یا ویب) کی تہذیب و آرائش میں کئی فنون ایک ساتھ کام میں لائے جاتے ہیں۔ البتہ اردو اس محاذ پر دیگر زبانوں کے مقابلے میں کمزور نظر آتی ہے۔ اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ ہمارے یہاں پروفیشنل فوٹو گرافروں یا باصلاحیت پیج لے آؤٹ ڈیزائنر فنکاروں کی قلت ہے بلکہ ان کی خدمات کو حاصل کرنے اور انھیں بھرپور مواقع دینے میں بخالت سے کام لیا جاتا ہے، ان کی کبھی پذیرائی نہیں کی جاتی، موقع بے موقع ان کے خلوص و تعاون کا عیارانہ استحصال کیا جاتا ہے اور کبھی کبھی اخبار کے ذمہ داروں سے یہ بھی سننے کو ملتا ہے کہ ان سب کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے کہ اردو پڑھنے والوں کی اکثریت اس میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتی! حالانکہ خصوصی اشاعت میں سبھی اخبار و مجلوں کی صوری دلکشی بڑھانے کے لیے طرح طرح کے جتن کرنے لگتے ہیں۔

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ اردو پبلشنگ کی دنیا میں صرف 'ان پیج' ہی اکلوتا قابل اعتماد سافٹ ویئر ہے۔ لیکن اس کے ساتھ چند ایسے مسائل اور دشواریاں بھی ہیں جن پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔ مثلاً اس پر کلاسیفائیڈ ایڈورٹیزمینٹ کا ٹیمپلیٹ آسانی کے ساتھ نہیں بنایا جا سکتا۔ اس میں

نئی کلر ڈیفی نیشن ناکام ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کی کلر لائبریری 1992 کی ہے اور نئے ورژن لانچ کرنے کے باوجود اس پرانے بیس کو تبدیل نہیں کیا جاتا۔ اس کا بڑا سبب ہم اردو والوں کی اکثریت کی خو ہے جو لائسنسڈ ورژن یا یوٹیلیٹی کو لیگلی خریدنے کا رجحان ہی نہیں رکھتے اور قزاقی کے مال یعنی پائریٹڈ ورژن کو استعمال کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔

**بلاگنگ (Blogging) اور ویب سائٹس:**

جدید ٹیکنالوجی کی ترقی نے انسانی روابط و تعلقات کی نت نئی شکلیں پیدا کر کے ان کو وسیع تر کر دیا ہے۔ سوشل نیٹ ورکنگ نے ہم زبان افراد کا اپنا اپنا گلوبل معاشرہ تعمیر کر دیا ہے۔ سوشل میڈیا انفرادی اور گروہی سطح پر باہمی رابطوں کا ذریعہ، معلومات و اطلاعات اور خبروں کی آزادانہ ترسیل کا موثر ترین وسیلہ بن کر سامنے آیا ہے۔ ٹیکنالوجیز کے روز بروز افزوں ہونے کے سبب عقل کے استعمال میں اضافہ ہوا اور سائنسی طرز فکر پیدا ہوئی ہے۔

انہی سوشل میڈیا کی ایک اہم شکل بلاگنگ بھی ہے۔ بلاگ اصل معنوں میں کسی فرد کی نجی الیکٹرانی میگزین یا ڈائری ہے، جس پر وہ اپنے خیالات، معلومات، نظریات، میلانات و اختلافات وغیرہ سب حسب منشا رقم کر سکتا ہے اور اسے ایڈیٹوریل سنسر شپ سے آزادی ہوتی ہے۔ بلاگز دُوریاں ختم کرنے میں روایتی میڈیا سے زیادہ موثر ہیں بلاگز محض معلومات فراہم کرنے کا وسیلہ بننے کے بجائے ایک ایسا پلیٹ فارم بن گئے جہاں ہر طرح کا نقطۂ نظر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اب وہ دن گئے جب روزانہ اخبارات کو اسٹال تک پہنچنے سے پہلے ہی ضبط کر لیا جاتا تھا اور کتابوں پر چھاپہ خانوں کے اندر ہی پابندی عائد ہو جاتی تھی۔ اب ای میل اور بلاگز کے ذریعے الفاظ کو دنیا بھر میں قارئین تک پہنچانا بہت سستا اور اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ کہ بہت آسان اور تیز رفتار ہو گیا ہے۔ ایک بات یہ بھی اہمیت کی حامل ہے کہ بلاگ کی آڈیئنس کسی اخبار یا میگزین کے عام قاری کی مانند نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کا درجہ ان معنوں میں زیادہ ہوتا ہے کہ یہ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کا استعمال جانتے ہیں۔ مختلف اغراض کے لیے معیاری انٹرنیٹ سرفنگ جن کا معمول بن چکا ہے۔ اس نسبت سے وہ خاطر خواہ پڑھے لکھے اور تجزیہ و نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت سے مملو

ہوتے ہیں۔ گویا ہم کسی ایسے قاری و ناظر کے سامنے ہوتے ہیں جو اوسطاً دس عام قارئین کا قائم مقام ہوتا ہے۔

**الیکٹرانک چینلس اور اردو:**

گو کہ بلاگنگ اور ویب سائٹس خود بھی الیکٹرانک میڈیا ہیں لیکن ان کی بیشتر اقسام ''سوشل میڈیا'' کی رُکن بن جاتی ہیں۔ جبکہ ٹیلی ویژن کا معاملہ تھوڑا الگ اور فی الفور پیشکش سے جڑا ہوا ہے۔ اس میڈیا میں وقت کے ایک ایک دقیقے کو اہمیت دی جاتی ہے۔ آیئے اب اس میڈیا پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لیں جسے ''سب سے تیز'' سمجھا اور مانا جاتا ہے۔ ہندوستان میں کل ملا کر دس تا بارہ اردو ٹی وی چینلس ہیں۔ پاکستان میں سب سے زیادہ اردو چینلز ہیں اور کچھ برطانیہ سے چلائے جاتے ہیں۔ یہاں اس کی تفصیلات پیش کرنا طوالت کا باعث ہوگا لہٰذا اس سے گریز کیا جاتا ہے۔ ہمارے ملک کے اردو ٹی وی چینلز بھی اکثر تفریحی ہیں یا سماجی و مذہبی۔ ان کا پروفیشنل تجزیہ کیا جائے تو وہ دیگر معاصر میڈیا کے مقابلے میں تکنیکی طور سے ہر شعبے میں کمزور پائے جاتے ہیں۔ اس کا سبب بہت واضح ہے کہ اعلیٰ تکنیکی اور پروفیشنل صلاحیتوں کی خدمات حاصل کرنے سے یہ قاصر رہتے ہیں۔ چنانچہ وہ کثیر ٹی آر پی بھی جمع نہیں کر پاتے اور مارکیٹنگ میں بالکل پچھڑ جاتے ہیں۔ ٹیلی ویژن چینل کے مالکان اردو پروگراموں کو بہتر ٹائم سلاٹ، اچھے پروموٹرس اور اشتہارات بھی نہیں دیتے۔ نتیجتاً کثیر آبادی کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ اردو میں اچھے اور مفید پروگرام بنائے اور دکھائے جاتے ہیں۔ پھر یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ اردو ٹیلی ویونگ کی ٹارگیٹ آڈینس بھی ایک مخصوص کمیونٹی کو بنا دیا گیا ہے۔ اسی کی مذہبی و جذباتی مناسبت سے بھلے اور برے پروگرام بنائے جاتے ہیں۔ دنیا کی دیگر زبانوں کے ساتھ میڈیا کا ایسا رویہ نہیں ہے۔ ان میں مذہبی مواد اور سماجی شعائر اگر دکھائے جاتے ہیں تو اسی کے ساتھ جدید تر دنیا کے مختلف موضوعات پر بھی معلومات اور پروگرام پیش کیے جاتے ہیں۔ اس جانب زیادہ توجہ دینے اور دیگر سمتوں میں آڈینس تلاش کرنے کی ضرورت ہے جو اردو کے حق میں زیادہ مفید ہوگی۔ اس موضوع پر کافی تحقیق کی جاسکتی ہے۔

اخیر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اردو اور جدید میڈیا کا ربط یقیناً ہر دوسری زبان کی طرح نئی تکنیک اور ٹیکنالوجی سے ہی قائم کیا جاسکتا ہے اور اس طرح اردو کا فروغ ممکن ہے جو کافی حد تک جاری وساری ہے۔ مگر مسابقت کی دوڑ میں دنیا کے میڈیا سے اردو میڈیا ہنوز کافی پیچھے چل رہا ہے۔ دنیا کو تو زیادہ ضرورت نہیں ہے لیکن اردو کی ترقی چاہنے والوں کو اس جانب کاروباری منافع اور استحصالی وشکایتی رویوں سے کچھ اوپر اُٹھ کر اپنی زبان کے لیے قربانیاں دینے کا جذبہ پروان چڑھانا ہوگا۔ ان میدانوں میں کام کرنے والے باصلاحیت افراد کے حوصلوں کو سنبھالنا اور افزوں کرنا ہوگا، اس جذبے کے بغیر ہم خواہ کتنی ہی خواہش کرلیں، عمل پیرا نہیں ہوں گے تو اردو کو جدید دنیا کے شانہ بشانہ کھڑا ہونے اور ترقی کرنے کے لیے کوئی فضا نہیں بنے گی۔

# اردو صحافت اور انفوٹین مینٹ

شیخ الماس حسین

**Infotainment** ایک ایسا موضوع ہے جو گزشتہ تین دہائیوں سے زیر بحث ہے، بڑے بڑے دانشور اور صحافی جیسے David Demers, Bonne Anderson, C.Stayner, J.Schhr, R.Cambell, Mathew Baim, Nalain Rajan نے اپنے اپنے نظریات کے مطابق اس موضوع پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی مگر اب تک اس کا کوئی مثبت پہلو اُبھر کر سامنے نہیں آیا۔

نئی نئی ٹیکنالوجی کی ایجاد کے ساتھ اس کائنات میں نئے طلسمات اُبھر کر سامنے آئے۔ مگر ہر طلسم قابل تعریف نہیں ہوتا اس کے باوجود اس پر اس طرح غور کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ خواہ مخواہ اور خود بخود قابل تعریف بن جاتا ہے۔ یہ نیک کام ایک ایسی طاقت کرتی ہے جو خود مخفی ہے مگر اس کی حرکات اور سکنات ظاہر ہیں۔ جو مخفی ہیں وہ نظر میں نہ سہی مگر نظر میں چبھتی ضرور ہیں اور جو ظاہر ہیں اسے ہم میڈیا کہتے ہیں۔

گزشتہ دو دہائیوں میں بالخصوص برقی میڈیا کے وجود میں آنے کے بعد صحافت کے معنی، مفہوم اور اصول مکمل طور پر بدل چکے ہیں۔ اس تبدیلی کے پس پردہ دو بڑے اسباب ہیں پہلی

سیاست دوسرا صارفیت۔ صارفیت کے اس دور میں ہر شے کی اہمیت خرید و فروخت پر قائم ہے۔ اس لیے اشتہار بازی پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ اس صارفیت نے صحافت کو بھی ایک ایسا کاروبار بنا دیا جہاں خبریں بولتی نہیں بکتی ہیں۔ پہلے صحافت کا تعلق سچائی، سنجیدگی اور ایمانداری سے تھا۔ اب اس کا براہ راست تعلق منافع سے ہے۔ اسی منافع خوری یا صحافتی زبان میں کہیں تو Rating کی وجہ سے چینلوں، صحافیوں اور مدیروں کے درمیان ایک جنگ شروع ہو گئی۔ اس جنگ میں فتح حاصل کرنے کی نیت سے ہی سنجیدہ صحافت کو Infotainment کے سانچے میں ڈھالا گیا۔

Infotainment سے مراد Information + Entertainment ہے۔ مگر انفوٹین مینٹ کی تعریف مختلف دانشوروں نے مختلف انداز میں کرنے کی کوشش کی ہے، Devid Demers لکھتے ہیں:

> " Infotainment is a neologistic portmanteau of information and entertaimment, referring to a type of media which provides a combination of information and entertainment (Dictionary of mass communication and research page-143) "

Anddrew O'Cornner انفوٹین مینٹ کی تعریف کچھ اس طرح کرتے ہیں:

> " Infotainment, then is portmanteau of information and entertainment.Itsfocus human-interest issue, violent, crime and other topics where a public policy components is not wholly central to the story (Infotainment's appeals and Consequences. vol.4-summer 2009)."

Infotainment کے حامیوں نے یوں تو اس کے لیے باضابطہ طور پر اصول اور مقاصد قائم نہیں کیے، مگر ان کے مباحث سے جو نتائج اُبھر کر سامنے آئے ہیں وہ کچھ اس طرح ہیں:

1- خبروں کی تشہیر بذریعہ تفریح کی جائے۔
2- گپ شپ کو اہمیت دی جائے۔
3- نیتاؤں، فلم اسٹارز اور اسپورٹس اسٹارز کی معمولی معمولی باتوں کو بھی بریکنگ نیوز بنا کر پیش کیا جائے۔
4- پنچ لائن کا خاص خیال رکھا جائے۔
5- خبروں کی ترسیل کے لیے ایسا انداز بیان اختیار کیا جائے کہ سننے والوں کے کان کھڑے ہو جائیں۔
6- خبروں کے ذریعہ ایک سنسنی پھیلا دی جائے۔

Infotainment کی یہ اصطلاح صحافت کی دنیا میں ایک نئی چیز ہے، وکی پیڈیا کے مطابق یہ اصطلاح کا پہلی مرتبہ 1980 میں United Kingdom کے Sheffield شہر میں Institute of Information Scientist and library Association کی کانفرنس میں استعمال کیا گیا۔

> " The term Infotainment and infotainer were first used in september 1980 at the joint conference of Aslib The Institute of Information scientist and The Library Association, in Sheffield UK. The Infotainers were a group of British information Scientist who put on comedy shows of the professional Conference between 1980 to 1990. " (Wikipedia-page-4)

مگر Rational Wiki والے وکی پیڈیا کے اس دعوے کو نہیں مانتے ان کا دعویٰ ہے کہ 80 کی دہائی میں امریکن صحافیوں نے انفوٹین میٹ کی اصطلاح کو پہلی مرتبہ اپنی صحافت میں استعمال کیا اور اس اصطلاح کو عام کرنے میں امریکن اخبار USA TODAY نے ایک نمایاں رول انجام دیا۔

> In the 1980s, a new breed of journalism started creeping into The United States Media, with the trend quickly exporting to other countries and their own journalist, USA TODAY perhaps one of the first newspaper for creating Happy News. The intent was rating. (Rational Wiki. p.2)

اب امریکہ کو اولیت حاصل ہے یا برطانیہ کو اس بحث کو میں کسی اور وقت کے لیے اُٹھا رکھتا ہوں۔ فی الحال ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ یورپ کے مختلف ملکوں میں Infotainment کی روایت مختلف ناموں کے ساتھ شروع ہوئی۔ مثلاً Happy News, Punchline, Cheque Book Journalism اور Soft News وغیرہ۔ تاریخ شاہد ہے کہ صحافت کے فارمولے وقت اور زمانے کے مزاج کے مطابق بدلتے رہتے ہیں زرد صحافت کا قصہ تو اب پُرانا ہو گیا ہے، پیڈ نیوز کی بات تو رہنے دیجیے۔ کیونکہ اب معاملہ چیک بک جرنلزم تک جا پہنچا ہے۔ پہلے پیسے لے کر خبر بنائی جاتی تھی آج پیسے دے کر اسٹوری تیار کی جاتی ہے۔ چاند سے اُترنے کے بعد ایک سائنسداں کس میڈیا ہاؤس کو سب سے پہلے انٹرویو دے گا، کون سا نیتا منسٹر بننے کے بعد سب سے پہلے کس چینل سے روبرو ہوگا، کون سی ایکٹریس اپنی دوسری شادی کی پہلی تصویر کون سے چینل کے حوالے کرے گی۔ یہ سب چیک بک جرنلزم کے ذریعہ ہی طے پاتا ہے۔

یہ چیک بک جرنلزم Infotainment کا ایک اہم حصہ ہے۔ چند مہینے قبل Sydney Siege کا واقعہ سامنے آیا تھا اس واقعہ کی وجہ سے صحافت کی دنیا میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ اخبار (The Guardian 20/1/15) میں Petter Manning نے اپنے ایک کالم کے ذریعہ یہ خلاصہ کیا کہ Sydney Siege میں رہا ہونے والوں کو سب سے پہلے خصوصی انٹرویو دینے کے لیے ایک بڑی رقم ادا کی گئی۔ صحافت کی یہ حیران کر دینے والی تصویر انفوٹین منٹ کی دین ہے۔

انفوٹین منٹ کی دوسری قابل ذکر خصوصیت پنچ لائن نیوز ہے، اس کے ذریعہ لوگوں کو خبروں کی طرف کھینچنے کی کوشش کی جاتی ہے، اس کھینچ تان میں ہم اصل خبر سے بے خبر ہو جاتے ہیں

اور جو چیز دکھائی جاتی ہے اس سے صرف سنسنی پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً سوتا ہے تو جاگتے رہو، India wants to know ، ماں نے بیٹی کا قتل کیا، کب، کیوں اور کیسے؟ فلاں کرکٹر کا معاشقہ فلاں ایکٹریس کے ساتھ۔ اسکینڈل کے پیچھے کا اسکینڈل، سرحد پر گولی، وزیر کی بولی وغیرہ وغیرہ۔

انفوٹین مینٹ کی ایک شکل Soft News بھی ہے۔ جس طرح بچوں کو کھیلنے کے لیے Soft toys دیا جاتا ہے۔ تاکہ بچوں کو چوٹ نہ لگے اسی طرح عوام تک Soft News پہنچائی جاتی ہے تاکہ لوگ Hard News یعنی سنجیدہ خبروں سے دور رہیں اور سرکار کو چوٹ نہ پہنچے۔ Soft News میں بڑی خبر کو چھوٹی اور چھوٹی کو بڑی بنا کر دکھایا جاتا ہے۔ مثلاً آروشی قتل کیس اور شینا بورا خون کا معاملہ۔ سارے میڈیا والے اس طرح اس واقعے کے پیچھے پڑ گئے کہ جیسے اس ملک میں اور کوئی دوسرا اہم مسئلہ نہیں ہے۔ اس Soft News کلچر پر طنز کرتے ہوئے امریکن صحافی Jon Stewart نے لکھا تھا:

> " The press can hold its magnifying glass up to our problems... illuminating issue heretofore unseen, or they can use that magnifying glass to light ants on fire and then perhaps host a week of show on the sudden, unexpected, dangerous flaming ant epidamic. (Wiki-page.2)"

دنیا میں ادیبوں اور دانشوروں کا ایک طبقہ انفوٹین مینٹ کی اس بڑھتی ہوئی لہر سے خائف ہے، اس لیے Kees Brants جیسے ادیبوں کو "Who's afraid of Infotainment" کے عنوان سے طویل مضمون لکھنا پڑتا ہے۔

جہاں تک ہندوستانی صحافت کی بات ہے تو ہم یہ بلا جھجک کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستانی صحافیوں نے ہمیشہ مغربی صحافیوں کے نقش قدم پر چلنا پسند کیا ہے، بیشتر اخبارات، رسائل اور Channels انفوٹین مینٹ کے ذریعہ اپنی دُکان چمکا رہے ہیں، ہر کسی کی اپنی اپنی ڈفلی ہے اپنا اپنا راگ۔ جتنے Channels اتنی بات۔ کس خبر کو کس حد تک بڑھاتا ہے، کس حد تک دباتا ہے، کس حد

تک توڑتا ہے، کس حد تک مروڑتا ہے تا کہ سننے سنانے میں مزا آئے، ایک سنسنی پھیلے اور Rating میں اضافہ ہو۔ ہندوستان میں انفوٹین مینٹ کے گہرے اثرات کا اندازہ آپ اس بات سے بھی لگا سکتے ہیں کہ اس کے ذریعہ قاتل کو مسیحا بنا دیا جاتا ہے اور مسیحا کو قاتل۔

اب رہی بات اردو صحافت کی تو ہندوستان کی دوسری زبان کی صحافت کے مقابلے میں اردو صحافت کوسوں پیچھے ہے، آج دو سو سال گزر جانے کے بعد بھی اردو صحافت اپنا وجود تلاش کر رہی ہے۔ یوں تو اردو اخبارات کی کمی نہیں، ہر شہر سے کئی ایک اردو اخبارات شائع ہوتے ہیں مگر ہر وقت مدیر اخبار کے ذہن میں یہ بات چبھتی رہتی ہے کہ کل کا اخبار سورج کی روشنی دیکھ پائے گا؟ رسالوں کا معاملہ تو کچھ ایسا ہے کہ اگر ایک شمارہ نکل جائے تو دوسرا شمارہ مردم شماری کی طرح دس سال بعد نکلتا ہے بشرطیکہ رسالہ سرکاری نہ ہو، ریڈیو اور ٹیلی میڈیا کی بات تو رہنے دیجیے دو چار چینل ہی اردو کے نام پر چراغ جلائے بیٹھے ہیں اور جسے اردو والے ہی کم دیکھتے ہیں۔ اب ایسے حالات میں اردو صحافت انفوٹین مینٹ سے کس قدر قریب ہے اور کتنی دور؟ میرے خیال سے اردو صحافت پر انفوٹین مینٹ کے اثرات دوسری زبان کے مقابلے میں کم نظر آتے ہیں۔

دراصل انفوٹین مینٹ کے لیے جس طرح کے Infrastructure کی ضرورت پیش آتی ہے وہ اردو صحافت میں اب تک ندارد ہے۔ جس طرح دوسری زبان کے چینل، اخبارات، رسائل کسی غیر اہم خبر کو بریکنگ نیوز کے ذریعہ ایک بڑی خبر بنا کر ساری توجہ اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتے ہیں وہ اردو صحافت کے بس میں نہیں ہے۔ بلکہ اردو اخبارات میں جب تک کوئی خبر چھپتی ہے، وہ خبر اس تیز میڈیا کے دور میں پُرانی ہو چکی ہوتی ہے۔ ہندوستان میں اردو صحافی نہ تو کسی قاتل کے ساتھ ہوائی جہاز میں سفر کر سکتے ہیں اور نہ اس انٹرویو کو Live دکھا سکتے ہیں، نہ کسی Under World Don کی کہانی کو فوق الفطری عناصر کے ساتھ مزہ دار بنا کر پیش کر سکتے ہیں، بس دہرائی ہوئی خبروں کی طرح اسی طرح دہرا دی جاتی ہے، سوشل میڈیا کے دور میں ایک خبر دو چار گھنٹے میں ہی اپنی لذت کھو دیتی ہے، چاہے وہ خبر کتنی ہی مزہ دار کیوں نہ ہو۔

انفوٹین مینٹ کے نام پر بیشتر انگریزی اخبارات، رسائل اور چینلز تیج تھری خبروں کے طور پر ایسی عریانیت کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ نا قابل دید ہوتی ہے، شرفا ان تصویروں کو دیکھنے کے

بعد اس پیج کو کہیں چھپا دیتے ہیں تا کہ بچوں کی نظر نہ پڑ جائے۔ اردو صحافت میں ایسی حماقت نظر نہیں آتی کیونکہ اردو اخبار پڑھنے والوں میں ابھی ایسی ذہنی گراوٹ ظاہری طور پر پیدا نہیں ہوئی ہے۔ حالانکہ اردو صحافت میں فلمی خبروں کی روایت کافی پرانی ہے۔ فلمی رسالہ شمع ایک زمانے میں کافی مقبول تھا۔ لوگ بڑے چاؤ سے اسے پڑھا کرتے تھے۔ انفوٹین مینٹ کی صحیح تصویر شمع میں ہی نظر آتی تھی، علاوہ ازیں تبسم کے مشہور ٹیلی پروگرام پھول کھلے ہیں گلشن گلشن کی یادیں آج بھی دیکھنے والوں کے ذہن میں تازہ ہیں، تبسم کا مسکراتا ہوا چہرہ اور ان کا انداز بیان اس طرح لوگوں کے دل میں اثر کرتا کہ لوگ ہفتوں اس پروگرام کا انتظار بےقراری کے ساتھ کرتے، ایک اور مثال امین سہانی کی پیش کر سکتا ہوں، ریڈیو پران کی آواز سن کر لوگ دیوانے ہو جاتے تھے۔ وہ اپنی آواز کے ذریعہ فلموں کا اشتہار ایسی خوبصورتی سے پیش کرتے کہ خراب سے خراب فلم بھی لوگ دیکھنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ آج بھی اگر آواز کی بات نکلتی ہے تو امین سہانی کا نام زبان پر ضرور آ جاتا ہے، فلمی صفحہ آج بھی سنیچر یا اتوار کو اخبار کے ساتھ رہتا ہے۔ مگر جدید دور میں انفوٹین مینٹ کے معنی اور مفہوم اس طرح بدل گئے ہیں کہ پوری صحافت ہی انفوٹین مینٹ ہوگئی ہے۔ Shonali muthalay اپنے آرٹیکل The relevence of Metro Section میں لکھتی ہیں:

> " Lipstick is not the only thing in our mind...... unfortunately over past few years the metro section of News paper usually comprising cherry local stories with bright zesti writer. (21st, Century Journalism in India)

انفوٹین مینٹ کی ایک بڑی خصوصیت چیک بک جرنلزم ہے۔ اردو صحافت اور چیک بک جرنلزم ایک بہت مشکل عمل ہے۔ کیونکہ اردو صحافت نے معاشی طور پر اتنی ترقی نہیں کی ہے کہ کسی خبر کو سب سے پہلے حاصل کرنے کے لیے یا کسی اسٹار کی بڑی خبر کو Exclusive News کے طور پر تشہیر کرنے کے لیے پیشگی رقم ادا کر سکے، اس لیے یہاں وہاں سے دیکھی دکھائی پرانی خبروں سے ہی کام چلا لیتی ہے۔ البتہ پیڈ نیوز کے طور پر کسی سیاسی پارٹی کی حمایت میں لگی رہتی ہے یا

تک توڑتا ہے، کس حد تک مروڑتا ہے تاکہ سننے سنانے میں مزا آئے، ایک سنسنی پھیلے اور Rating میں اضافہ ہو۔ ہندوستان میں انفوٹین مینٹ کے گہرے اثرات کا اندازہ آپ اس بات سے بھی لگا سکتے ہیں کہ اس کے ذریعہ قاتل کو مسیحا بنادیا جاتا ہے اور مسیحا کو قاتل۔

اب رہی بات اردو صحافت کی تو ہندوستان کی دوسری زبان کی صحافت کے مقابلے میں اردو صحافت کوسوں پیچھے ہے، آج دو سو سال گزر جانے کے بعد بھی اردو صحافت اپنا وجود تلاش کر رہی ہے۔ یوں تو اردو اخبارات کی کمی نہیں، ہر شہر سے کئی ایک اردو اخبارات شائع ہوتے ہیں مگر ہر وقت مدیر اخبار کے ذہن میں یہ بات چبھتی رہتی ہے کہ کل کا اخبار سورج کی روشنی دیکھ پائے گا؟ رسالوں کا معاملہ تو کچھ ایسا ہے کہ اگر ایک شمارہ نکل جائے تو دوسرا شمارہ مردم شماری کی طرح دس سال بعد نکلتا ہے بشرطیکہ رسالہ سرکاری نہ ہو، ریڈیو اور ٹیلی میڈیا کی بات تو رہنے دیجیے دو چار چینل ہی اردو کے نام پر چراغ جلائے بیٹھے ہیں اور جسے اردو والے ہی کم دیکھتے ہیں۔ اب ایسے حالات میں اردو صحافت انفوٹین مینٹ سے کس قدر قریب ہے اور کتنی دور؟ میرے خیال سے اردو صحافت پر انفوٹین مینٹ کے اثرات دوسری زبان کے مقابلے میں کم نظر آتے ہیں۔

دراصل انفوٹین مینٹ کے لیے جس طرح کے Infrastructure کی ضرورت پیش آتی ہے وہ اردو صحافت میں اب تک ندارد ہے۔ جس طرح دوسری زبان کے چینل، اخبارات، رسائل کسی غیر اہم خبر کو بریکنگ نیوز کے ذریعہ ایک بڑی خبر بنا کر ساری توجہ اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتے ہیں وہ اردو صحافت کے بس میں نہیں ہے۔ بلکہ اردو اخبارات میں جب تک کوئی خبر چھپتی ہے، وہ خبر اس تیز میڈیا کے دور میں پُرانی ہو چکی ہوتی ہے۔ ہندوستان میں اردو صحافی نہ تو کسی قاتل کے ساتھ ہوائی جہاز میں سفر کر سکتے ہیں اور نہ اس انٹرویو کو Live دکھا سکتے ہیں، نہ کسی Under World Don کی کہانی کو فوق الفطری عناصر کے ساتھ مزہ دار بنا کر پیش کر سکتے ہیں، بس دہرائی ہوئی خبروں کی طرح اسی طرح دہرادی جاتی ہے، سوشل میڈیا کے دور میں ایک خبر دو چار گھنٹے میں ہی اپنی لذت کھودیتی ہے، چاہے وہ خبر کتنی ہی مزہ دار کیوں نہ ہو۔

انفوٹین مینٹ کے نام پر بیشتر انگریزی اخبارات، رسائل اور چینل تیج تھری خبروں کے طور پر ایسی عریانیت کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ نا قابل دید ہوتی ہے، شرفا ان تصویروں کو دیکھنے کے

بعد اس پیج کو کہیں چھپا دیتے ہیں تا کہ بچوں کی نظر نہ پڑ جائے۔ اردو صحافت میں ایسی حماقت نظر نہیں آتی کیونکہ اردو اخبار پڑھنے والوں میں ابھی ایسی ذہنی گراوٹ ظاہری طور پر پیدا نہیں ہوئی ہے۔ حالانکہ اردو صحافت میں فلمی خبروں کی روایت کافی پرانی ہے۔ فلمی رسالہ شمع ایک زمانے میں کافی مقبول تھا۔ لوگ بڑے چاؤ سے اسے پڑھا کرتے تھے۔ انفوٹین مینٹ کی صحیح تصویر شمع میں ہی نظر آتی تھی، علاوہ ازیں تبسم کے مشہور ٹیلی پروگرام پھول کھلے ہیں گلشن گلشن کی یادیں آج بھی دیکھنے والوں کے ذہن میں تازہ ہیں، تبسم کا مسکراتا ہوا چہرہ اور ان کا انداز بیان اس طرح لوگوں کے دل میں اثر کرتا کہ لوگ ہفتوں اس پروگرام کا انتظار بے قراری کے ساتھ کرتے، ایک اور مثال امین سہانی کی پیش کرسکتا ہوں، ریڈیو پران کی آواز سن کر لوگ دیوانے ہو جاتے تھے۔ وہ اپنی آواز کے ذریعہ فلموں کا اشتہار ایسی خوبصورتی سے پیش کرتے کہ خراب سے خراب فلم بھی لوگ دیکھنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ آج بھی اگر آواز کی بات نکلتی ہے تو امین سہانی کا نام زبان پر ضرور آ جاتا ہے، فلمی صفحہ آج بھی سنیچر یا اتوار کو اخبار کے ساتھ رہتا ہے۔ مگر جدید دور میں انفوٹین مینٹ کے معنی اور مفہوم اس طرح بدل گئے ہیں کہ پوری صحافت ہی انفوٹین مینٹ ہوگئی ہے۔ Shonali Imuthalay اپنے آرٹیکل The relevence of Metro Section میں لکھتی ہیں:

> " Lipstick is not the only thing in our mind...... unfortunately over past few years the metro section of News paper usually comprising cherry local stories with bright zesti writer. (21st, Century Journalism in India)

انفوٹین مینٹ کی ایک بڑی خصوصیت چیک بک جرنلزم ہے۔ اردو صحافت اور چیک بک جرنلزم ایک بہت مشکل عمل ہے۔ کیونکہ اردو صحافت نے معاشی طور پر اتنی ترقی نہیں کی ہے کہ کسی خبر کو سب سے پہلے حاصل کرنے کے لیے یا کسی اسٹار کی بڑی خبر کو Exclusive News کے طور پر تشہیر کرنے کے لیے پیشگی رقم ادا کر سکے، اس لیے یہاں وہاں سے دیکھی دکھائی پرانی خبروں سے ہی کام چلا لیتی ہے۔ البتہ پیڈ نیوز کے طور پر کسی سیاسی پارٹی کی حمایت میں لگی رہتی ہے یا

سرکار کے حق میں خبروں کی ترسیل کے ذریعہ لاکھوں روپے کا اشتہار حاصل کر لیتی ہے یا کسی ادبی اور غیر ادبی انجمن کے لیے امیج مینجمنٹ کا کام انجام دیتی ہے۔

دراصل حقیقت یہی ہے کہ نہ اردو صحافت میں انفوٹینمنٹ کے لیے کوئی انفراسٹرکچر ہے اور نہ ہی BillO'Reilly جیسے کوئی Infotainer ہیں۔ دوسری طرف اردو صحافت میں ارنب گوسوامی، راج دیپ سردیسائی، برکھادت اور دیپک چورسیا جیسے صحافی بھی نہیں ہیں جو خبروں میں اپنی آواز کے ذریعہ ایسی آواز پیدا کر دیتے ہیں کہ لگتا ہے کہ یہ آواز خلق ہے اور لوگ مزے لے کر خبریں سنتے ہیں۔ آج انفوٹینمنٹ کے اس عہد میں اردو صحافت پر انفوٹینمنٹ کے اثرات برائے نام نظر آتے ہیں۔ اب یہ اچھی بات ہے یا بری بات مجھے نہیں معلوم، پر اتنا کہہ سکتا ہوں کہ آج دو سو سال گزر جانے کے بعد بھی اردو اخبار کی Circulation اردو آبادی کے مقابلے میں تکلیف دہ حد تک کم ہے۔

# آٹھواں باب

## علمائے کرام اور اردو صحافت

# اردو صحافت اور مذہبی اتحاد

**پروفیسر قدوس جاوید**

خبر: عالم انسانیت کے عروج وزوال اور تغیر وتبدل کا استعارہ ہے۔ خواہش اور اطمینان سے قطع نظر، انسانی زندگی اور زمانے میں مسرت اور بصیرت، خیر اور شر اور حسرت اور طمانیت کی جتنی اور جیسی بھی لکیریں اور دائرے نمایاں ہوتے ہیں، ان کا سلسلہ کسی نہ کسی پہلو سے ''خبر'' سے بھی لازماً ملتا ہے اور یہ ''خبر'' ہی ہے جو انسان کو اپنے وجود کے خارج اور باطن کی آگہی کے لیے ''نظر'' بخشتی ہے۔ لہٰذا، اگر کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ آج کے معاشرے میں ''خبر ہی زندگی ہے'' تو ٹھیک ہی کہتے ہیں اور اس حوالے سے یہ بھی کہنا غلط نہیں ہوگا کہ آج کی تاریخ میں ''صحافت'' کی حیثیت ایک پُل کی سی ہے جس کے ایک طرف ملک وقوم کا خواب ہوتا ہے اور دوسری طرف تعبیر، خواب کیسا ہے اور تعبیر کیسی ہو اس کا خاکہ صحافی، ماحول اور معاشرہ، ملک اور قوم کے مفاد میں، مقامی ضروریات اور عالمی حالات کی روشنی میں پیش کرتا ہے۔ صحافی کا یہ خاکہ خبر، اسٹوری، اداریہ، مضمون، کالم یا تبصرہ کسی بھی شکل میں کیوں نہ سامنے آئے، اتنی بات تو طے ہے کہ اس خاکے میں رنگ بھرنے کا انحصار اور اختیار صحافی یا عوام کے پاس نہیں، ان کی منتخب کردہ سرکار یعنی ارباب اقتدار کے ہاتھوں

میں ہوتا ہے۔

1857 میں ہم نے اپنی آزادی کھوئی تھی۔ 1947 میں آزادی دوبارہ حاصل کی، حالات بدلے لیکن ہمارا نو آبادیاتی مزاج پورے طور پر بدل نہیں پایا ''داغ داغ اُجالا اور شب گزیدہ سحر'' کے باوجود ہمارے صحافیوں نے ملک وقوم کی سمت ورفتار بدلنے اور تعمیر وترقی کی صحیح سمت دینے کے لیے صحافتی سطح پر جو کوششیں کیں ان پر سابقہ حکومتوں نے خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ یہ اسی گمراہ کن وعدے وعید اور کھوکھلے تصورات کے سبب زبان، فرقہ، علاقہ، غربت و افلاس اور بے روزگاری کے ایسے ہمالیائی مسائل کھڑے ہوتے چلے گئے جن کے اندر سے خوش حالی، امن و سکون اور تعمیر وترقی کے چشمے تو نہیں پھوٹے البتہ خود غرضی، بدعنوانی، مفاد پرستی اور تنگ نظری کی ''بجلیاں'' ضرور گریں جو مشترکہ تہذیب، آپسی بھائی چارہ اور فرقہ وارانہ اتحاد کی صدیوں پرانی بسی بسائی بستیوں کو تہہ وبالا کر گئیں اور آج بھی کر رہی ہیں۔ (کبھی بابری مسجد، اکشر دھام مندر کے عنوان سے تو کبھی لو جہاد، گھر واپسی اور گاؤکشی کے نام پر) آزادی کے بعد کے صحافیوں، عثمان فارقلیط، حیات اللہ انصاری، عشرت علی صدیقی، خواجہ ثناءاللہ بٹ اور غلام احمد صوفی اور شمیم احمد شمیم کی طرح آج اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں بھی ایسے اردو صحافیوں کی کمی نہیں جو ماحول اور معاشرے میں مذہبی اتحاد پیدا کرنے اور سیاست اور حکومت کو تعمیر وترقی کی راہ پر گامزن رکھنے کے باب میں اپنا کردار بخوبی نبھا رہے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان صحافیوں کے مشوروں کو نظرانداز کیے جانے کے سبب نہ صرف ہمارے ملک کا جمہوری ڈھانچہ کمزور ہو رہا ہے بلکہ خود جمہوریت کا مرکزی ستون صحافت بھی کھوکھلا ہو رہا ہے۔

جرمن مفکر وولف گانگ آئزر نے کہا ہے: ہر برسراقتدار جماعت ملک وقوم کے ہر شعبۂ زندگی کو اپنے مزاج اور منصوبے کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتی ہے لیکن جب ضرورت پڑتی ہے تو ملک وقوم کے مفاد میں، اقتدار کی کلائی موڑنے کی طاقت کا مظاہرہ صحافت ہی کرتی ہے، یہی صحافت کا منصب بھی ہے۔ مقصد بھی اور منزل بھی۔ اس کی زندہ مثال ایمرجنسی کے زمانے کی یادیں آپ کے ذہنوں میں محفوظ ہوں گی۔ جون کا مہینہ تھا، گرمی تو قہر ڈھا ہی رہی تھی لیکن، 26، 25 جون 1975 کی رات ایک اور ہی قہر ٹوٹا۔ ایمرجنسی کا اعلان کردیا گیا اور 26 جون کی

صبح، ابھی لوگ نیند سے بیدار بھی نہیں ہوئے تھے کہ ''سنسر شپ'' کا شکنجہ کس چکا تھا۔ پولیس نے بہادر شاہ ظفر مارگ دلی کے اخبارات کی بجلی کاٹ دی۔ نکتہ چیں اخباروں پر سرکاری اشتہارات کے دروازے تقریباً بند کر دیے گئے۔ آزادیٔ اظہار کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ سنسر شپ کے سبب، اخباروں میں چھپی خبریں بے رس ہو گئیں۔ لیکن اس ماحول میں بھی، دوسری زبانوں کی طرح اردو صحافت نے بھی جس جرأت مندی کا مظاہرہ کیا وہ تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے۔ جب 1977 میں (شریمتی گاندھی کی شکست کے ساتھ) ایمرجنسی ختم ہوئی تو لوگ جاننے کے لیے بے چین ہو گئے کہ ایمرجنسی کے دوران کیسی کیسی قیامتیں ٹوٹیں اور یہ بھی کہ دشت صحافت کے کس کس دیوانے پر کیا کیا گزری۔ ''ایڈورٹائزنگ اینڈ مارکیٹنگ میگزین'' کے مطابق ایمرجنسی کے دوران اخبارات و رسائل کی کھپت 40 فی صدی بڑھ گئی تھی اور ایک دلچسپ حقیقت یہ بھی ہے کہ پہلی بار کئی ہندی، اردو اور بنگلہ اخباروں کی تعداد اشاعت بعض انگریزی اخبارات سے بھی آگے نکل گئی تھی۔ اگر دیکھا جائے تو یہی وہ اہم موڑ ہے جہاں سے اردو سمیت دیسی صحافت ایک بار پھر عوام کے سماجی اور سیاسی شعور کو بیدار کر کے تعمیری رائے عامہ کو مضبوط و مستحکم کرنے کی ویسی ہی جد وجہد میں جٹ جاتی ہے جیسی جد و جہد 1857 کے آس پاس ہم شہید صحافت سید محمد باقر کے دہلی اردو اخبار میں اور تقسیم ملک سے قبل عبد المجید سالک کے انقلاب، منشی نول کشور کے اودھ اخبار اور مولانا مسعودی کے ہمدرد وغیرہ میں دیکھتے ہیں۔ اس صورتِ حال سے دو نتائج سامنے آئے، اول یہ کہ ملک میں اخبارات اور اخبار بینوں کی تعداد میں قابلِ لحاظ اضافے کے سبب ملک میں جدید ترین پرنٹنگ مشینیں آنے لگیں، دوئم یہ کہ پرنٹ میڈیا ایک منفعت بخش صنعت کے سانچے میں ڈھلنے لگا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ملک کے سرمایہ دار طبقے نے اخبار کو ایک فائدہ مند Product اور صحافت کو منافع بخش انڈسٹری کی طرح برتنا شروع کر دیا۔ چنانچہ گوینکا، رام کرشن ڈالمیا، شانتی لال شاہ اور چمن بھائی پٹیل جیسے سرمایہ دار اس میدان میں کود پڑے، ان کے لیے صحافت مشن یا مقصد سے زیادہ کاروبار بن گیا۔ (سرمایہ داروں کے اخبارات عمدہ چکنے کاغذ پر رنگ برنگی تصویروں کے ساتھ آفسیٹ پر شائع تو ہوتے ہیں) لیکن چند ایک کو چھوڑ کر زیادہ تر اخبارات محض پیسہ اور سیاسی فائدہ حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ اکثر اخبارات قارئین کی تعداد بڑھانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔

اس لیے نہیں کہ قارئین کو ملک و قوم کے مسائل پر غور وفکر، تبادلۂ خیالات اور تعمیری معلومات پر مبنی رائے عامہ قائم کرنے کا اہل بنایا جائے بلکہ ان کا مقصد قارئین کی زیادہ تعداد دکھا کر زیادہ سے زیادہ اشتہار اور اثر ورسوخ حاصل کرنا ہوتا ہے۔ان کے لیے اخبار کے قارئین صرف گاہک ہیں۔ اسی لیے ہر قماش کے خریداروں کو خوش کرنے کے لیے یہ اخبار سنسنی خیزی، عریانیت اور مذہبی جذباتیت کے باتصویر ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔ جہاں تک اردو اخبارات کا تعلق ہے آج کی تاریخ میں ''ہندو، ٹائمز آف انڈیا، ہندوستان ٹائمز، دینک جاگرن، بھاسکر اور امر اُجالا جیسے انگریزی اور ہندی کے اخبارات کے پائے کا کوئی ایک اردو اخبار ہندوستان میں شائع نہیں ہوتا۔ سیاست، انقلاب، راشٹریہ سہارا، صحافت جیسے چند ایک اردو اخبارات ہماری عصری اردو صحافت کی آبرو ہیں لیکن وسیع تناظر میں انھیں بھی بڑے نہیں منجھولے اخبار ہی کہا جا سکتا ہے، پھر بھی دل کے خوش رکھنے کو ہم انھیں ہی بڑا اخبار مانتے ہیں۔ گرچہ ان میں سے کوئی بھی اخبار (خبر اور نظر کی وسعت، ترتیب اور پیش کش کی جدت اور ادارتی آرٹیکل، تبصرہ، اسٹوری کے حوالے سے ہندو، ٹائمز آف انڈیا، ہندوستان ٹائمز یا ہندی جاگرن اور امر اُجالا کی طرح) مکمل اخبار کے تصور پر پورا نہیں اُترتا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک ہی ادارے سے شائع ہونے والے انگریزی، ہندی اور اُردو اخباروں کے معیار اور مزاج میں بھی فرق ہے۔ یقین نہ آئے تو ہندی جاگرن اور اردو انقلاب یا پھر دور کیوں جائیے انگریزی ''گریٹر کشمیر'' اور اس کے اردو ایڈیشن ''کشمیر عظمیٰ'' کو ہی دیکھ لیجیے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کشمیر عظمیٰ اپنی موجودہ صورت میں بھی اردو صحافت کے معیار میں اضافہ کر رہا ہے اور اس کا کریڈٹ اس سے وابستہ ادارتی عملے کو دیا جانا چاہیے جو کم معاوضے کے باوجود اپنے لہو سے صحافت کا چراغ روشن رکھے ہوئے ہے۔ بہر حال اردو کے ان بڑے یا منجھولے اردو اخبارات کے ساتھ ساتھ پورے ملک کے گلی کوچوں سے اخبار کے نام پر ہزاروں کی تعداد میں خبرنامے بھی کسی طور چھپ رہے ہیں (اور آپ جانیے کہ دلی، حیدرآباد، لکھنؤ یا عظیم آباد کے کوچے اب اوراقِ مصور تو رہے نہیں، وقت نے اردو والوں کی امارت وثروت کی میراث تو بہت پہلے چھین لی تھی سو اب یادِ رفتگاں کے دیے جلا کر عصرِ حاضر میں ستم ہائے روزگار کا شمار کرنے کے سوا ہم اردو والوں کے پاس رکھا بھی کیا ہے۔اب تو ہر روز روزِ عید کی جگہ ہر دن محرم ثابت ہو رہا

ہے۔قوم ویسی ہی شکست خوردگی کی شکار ہے جیسی کہ اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں شکست خوردہ تھی اور یہ غالبًا ہمارے ذہنی بحران اور سیاسی و سماجی بے سمتی کا ہی نتیجہ ہے کہ ہمارے سماج کا ہر سوواں آدمی یا تو شاعر ہے یا لیڈر یا ایڈیٹر)۔ چھوٹے، ٹٹ پونجیے اخبار، پہلے تو صرف ریاستوں کی راجدھانیوں سے نکلتے تھے لیکن اب کم وبیش شمالی اور مشرقی ہندوستان کے اکثر وبیشتر ضلعوں سے بھی اردو اخبارات شائع ہورہے ہیں لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مقامی مسائل کو منظر عام پر لانے اور حکام تک پہنچانے کے سلسلے میں ان چھوٹے اخبارات کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ گاؤں اور قصبوں کے نچلے پسماندہ اور کم تعلیم یافتہ لوگوں کو اپنے مسائل کے تیئں بیدار کرنے کی ذمہ داری یہ چھوٹے ''روپیہ اخبارات'' ہی نبھاتے ہیں۔ لیکن اردو صحافت میں منجھولے اور چھوٹے اخبارات کے مسائل اور بڑے تعمیری کردار پر اب تک سنجیدہ توجہ مرکوز نہیں کی گئی ہے۔ حکومت اور تجارتی، کاروباری ادارے چھوٹے اخبارات کو پہلے بھی منہ نہیں لگاتے تھے لیکن 1990 کی دہائی میں سرکاری اشتہارات سے متعلق ''پریس کاؤنسل آف انڈیا'' کے فیصلے کے بعد تو چھوٹے اردو اخبارات کا جینا دوبھر ہوگیا تھا اور اب بھی اشتہارات اور سرکاری معاونت کے معاملے میں صورت حال بد سے بدتر ہی ہے۔ لاتعداد اردو اخبارات بند ہوگئے لیکن جو باقی بچ گئے وہ محض اپنی وابستگی، اپنے جوش جنوں کی وجہ سے۔ یہ بھی ایک کھلی حقیقت ہے کہ چھوٹے منجھولے اردو اخبارات کے مالکان کا ہی نام بطور ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر شائع ہوتا ہے جبکہ اکثر مالکان اُردو ہندی سے نابلد بھی ہیں۔ اخبار کی ادارت، نظامت کی ذمہ داری وہ باصلاحیت صحافی نبھاتے ہیں جو خود اخبار نکالنے کی استطاعت نہیں رکھتے لیکن جن کے اندر اپنی زبان، معاشرہ اور ملک وقوم کی اصلاح اور فلاح کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے لیکن ان بے نام ''گھوسٹ ایڈیٹرس کو نہ تو تشفی بخش معاوضہ ملتا ہے اور نہ مقام و مرتبہ۔ اس کے براہ راست اثرات، اردو صحافت کے معیار پر مرتب ہورہے ہیں۔ تیس برسوں سے زیادہ عرصے تک ہندی کے مشہور اخبار دینک جاگرن کے مدیر شری نریندر موہن نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ ''سیاسی آقاؤں اور نوکر شاہوں کی نظروں میں دیسی اخباروں کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ انگریزی اخبار کا کوئی صحافی اگر گرفتار ہوتا ہے تو اسے جیل میں اے کلاس میں رکھا جاتا ہے جبکہ اردو اور دیگر دیسی زبانوں کے

صحافیوں کو بی کلاس کے قابل بھی نہیں سمجھا جاتا۔ نریندر موہن جی نے یہ بھی لکھا ہے کہ پڑوسی ملک میں اردو کے کالم نگار کو جتنا معاوضہ ملتا ہے اس کا نصف بھی ہمارے یہاں اردو کے مدیر اور معاون مدیر کو نہیں ملتا، حالانکہ 1955 میں ہی قومی سطح پر صحافیوں اور اخبارات کے دیگر ملازمین کی تنخواہیں طے کرنے کے لیے ایک ریٹائرڈ جج کی سربراہی میں تنخواہ کمیشن بھی قائم کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ 1990 کی دہائی تک پانچ بورڈ بھی بنائے گئے تھے اور تنخواہ کے تعین کو اخبار کی مجموعی آمدنی (ٹوٹل ریوینیو) سے جوڑ دیا گیا تھا یعنی جس اخبار کی جتنی آمدنی ہوگی، ملازمین کو تنخواہیں اسی حساب سے دی جائیں گی لیکن اس پر عمل نہ ہو سکا۔ اخبار مالکوں نے مختلف ہتھکنڈوں سے کم آمدنی یا نقصان دکھا کر معاوضے کی سفارشوں پر پانی پھیر دیا اور دیسی، خصوصاً اردو اخباروں کے مدیران اور ملازمین قلاش کے قلاش ہی رہے۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلی دہائیوں تک نئے تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ نوجوان اردو صحافت میں کوئی کشش محسوس نہیں کرتے تھے۔ اگر (جذبۂ حریت یا جوش وطن پرستی سے سرشار) کوئی نوجوان صحافت کی دہلیز پر قدم رکھنے کا ارادہ کرتا تو اسے بے وقوف اور سنکی سمجھا جاتا تھا۔ اسی لیے بیسویں صدی کے اختتام تک اردو میں اخبارات کی تعداد میں تو اضافہ ہوتا رہا لیکن صحافت کا معیار، انگریزی، ہندی، بنگلہ حتیٰ کہ پنجابی اور مراٹھی صحافت کے معیار سے بھی نیچے گرتا چلا گیا۔

صحافت کا وہ معیار جو سید محمد باقر کے دہلی اردو اخبار، منشی نول کشور کے اودھ اخبار، ابوالکلام آزاد کے الہلال، عبدالماجد دریابادی کے الصدق، عبدالمجید سالک کے انقلاب، ملک راج صراف کے رنبیر، منشی معراج الدین کے پاسبان اور مولانا مسعودی کے ہمدرد کے علاوہ خالد، وکیل اور خدمت کے ساتھ ساتھ، آزادی کے بعد قومی آواز، الجمعیۃ اور دعوت وغیرہ نے قائم کیا تھا وہ کہیں گم ہو کر رہ گیا۔ اردو صحافت کے زوال یا جمود کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔

1- اردو کو محض مسلمانوں کی زبان ثابت کرنے کی سازش۔
2- خود مسلمانوں کی بتدریج بڑھتی ہوئی تعلیمی اور معاشی پسماندگی۔
3- تعلیم یافتہ طبقے میں اردو کے برعکس انگریزی اخبار کو ترجیح دینے کا رجحان۔
4- اشتہار کے معاملے میں اردو اخبارات کے تئیں ارباب اقتدار کا سوتیلا سلوک۔

5- خود اردو اخبارات میں تازہ ترین خبروں اور معاصر سیاسی، سماجی، ثقافتی اور معاشی گفتگو سے متعلق روشن خیال مواد کی کمی۔

6- ان محاورات، اصطلاحات اور ضرب الامثال سے محرومی جن سے اردو صحافت، آزادی سے قبل تک فکر و شعور میں انقلاب برپا کرنے کا کام لیا کرتی تھی۔

اخبار ''اظہار رائے کی آزادی'' کی اہم ترین علامت ہے۔ جمہوریت کا مطلب ہی یہ ہے کہ جس میں اظہار رائے کی مکمل آزادی ہو، لیکن نہیں بھولنا چاہیے کہ آزادانہ اظہار رائے ایک سفلی عمل بھی ہے کہ اگر تمیز اور توازن اور صبر و ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے تو یہ عمل اُلٹا بھی پڑ سکتا ہے اور ملک و قوم کے لیے مفید ہونے کے بجائے مہلک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ آج کل آزادیِ اظہار کی آڑ میں نت نئے عنوان سے جو بدزبانیاں ہو رہی ہیں اس سے ملک کے مذہبی اتحاد کو کتنا نقصان پہنچ رہا ہے یہ دہرانے کی ضرورت نہیں۔ دوسری بات یہ کہ گذشتہ چند دہائیوں میں میڈیا اور اکیڈمک دنیا میں قابل لحاظ انقلاب آیا ہے۔ ظاہر ہے اس کی ایک اہم وجہ تعلیم یافتہ افراد کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہے۔ 1991 میں یہ تعداد 35 کروڑ سے کچھ ہی زیادہ تھی لیکن 2001 کی مردم شماری کے مطابق ملک میں تعلیم یافتہ افراد کی تعداد بڑھ کر 55 کروڑ سے زیادہ ہو گئی۔ دوئم اس عرصے میں کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور آفسیٹ پرنٹنگ کے تیز رفتار پھیلاؤ اور بحیثیت پیشہ فن صحافت کی تربیت اور تحقیق کا رواج بھی عام ہوا ہے لیکن اس کے باوجود اکثر اردو اخبارات میں ایک چیز کی کمی کھٹکتی ہے وہ ہے اس ''مشن'' یا اعلیٰ ترین مقصد کا فقدان، جس کے تحت اردو میں صحافت کا آغاز ہوا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ 1810 میں ''اردو اخبار'' اور مارچ 1822 میں ''جام جہاں نما'' کے اجرا کا مقصد ہی ملک و قوم کے ہر فرقہ، ہر طبقہ کے اندر روشن خیالی اور باہمی اتحاد و یگانگت کو فروغ دینا تھا۔ مذہبی اتحاد اور یکتا کل بھی سب سے بڑی طاقت اور ضرورت تھی اور آج بھی ہے۔ حکومت برطانیہ کو سب سے زیادہ پریشانی ہندوستانی عوام کے اتحاد سے ہی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو ''جام جہاں نما'' میں اپنے اقتدار کا سورج غروب ہوتا نظر آنے لگا تھا اور اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ کمپنی کے سکریٹری ولیم بٹر وتھ بیلی نے اصلاً ''جام جہاں نما'' کی زباں بندی کی خاطر ہی 1823 میں اولین پریس آرڈیننس نافذ کیا تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ابھی ہندوستان میں چھاپہ خانوں کا

رواج عام نہیں ہوا تھا۔ چھاپہ خانے کا وجود تو انیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں ''جام جہاں نما'' کے اجرا سے کچھ ہی پہلے ہوا۔ اردو صحافت کا باضابطہ آغاز بھی لوگ ''جام جہاں نما'' سے ہی مانتے ہیں لیکن اب تک کسی نے اس پر توجہ نہیں دی ہے کہ ہندوستان میں مطبوعہ اخبار کا سلسلہ شروع ہونے سے ایک ڈیڑھ صدی پہلے ہی اردو میں ''قلمی صحافت'' کی روایت قائم ہو چکی تھی۔ ملکی حالات سے عوام الناس کو باخبر رکھنے کے لیے معلوماتی تبصرے، تجزیے، مضامین وغیرہ رقعہ، کتابچہ اور رسالہ کی شکل میں قلم بند کرنے اور ان کی نقلوں کی تقسیم اور ترسیل کی روایت اٹھارھویں صدی کے وسط تک عام ہو چکی تھی۔ راوی لکھتا ہے کہ 6 مئی 1799 کو حضرت ٹیپو سلطان نے جام شہادت نوش کیا۔ اسی روز انگریزی فوج نے دولت نہ خاص اور محلات شاہی کے علاوہ ٹیپو سلطان کے کتب خانے پر بھی قبضہ کر لیا۔ ٹیپو سلطان کے کتب خانے میں، جو ان دنوں لندن کی ایک لائبریری میں ہے، کئی قلمی نسخے ایسے بھی ہیں جنھیں خبروں کا مجموعہ یا اخبار بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس کا اندازہ ان کے ناموں سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ مثلاً ''خلاصۃ الاخبار''، ''منتخب الاخبار''، ''لطائف الاخبار''، ''اخبار الاخبار'' وغیرہ۔ عاشق حسین بٹالوی نے اپنے ایک مضمون ''ٹیپو سلطان کا کتب خانہ'' (مطبوعہ، ادبی دنیا لاہور، جلد پنجم شمارہ سوم 1950) میں مذکورہ قلمی نسخوں کا ذکر کیا ہے لیکن مشمولات کی نوعیت اور احوال بیان نہیں کیے ہیں (اردو صحافت کے دیگر محققین اور مورخین کی رسائی بھی ان رسالوں تک نہیں ہو سکی ہے، گربچن چندن کی تصنیف ''اردو صحافت کا سفر'' میں بھی ٹیپو سلطان کے ان قلمی نسخوں کا کوئی ذکر نہیں ملتا) لیکن قیاس ہے کہ اگر ان رسالوں تک رسائی حاصل کی جائے تو عین ممکن ہے کہ اردو صحافت کی تاریخ میں ''جام جہاں نما'' 1822 اور ''اردو اخبار'' 1810 سے قبل کی بھی کچھ اور کڑیاں جڑ جائیں خواہ وہ قلمی صحافت کی شکل میں ہی کیوں نہ ہوں۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اٹھارھویں، انیسویں صدی میں غلامی کے خلاف، آزادی کی حمایت میں قلمی صحافت نثر کے علاوہ اکثر شعری پیرائے میں بھی رقعوں اور پرزوں کی صورت بھی عوام تک پہنچتی تھی۔ ایسی شاعری میں حسرت، شکوہ شکایت اور مشورے کے علاوہ بغاوت اور انقلاب کی ترغیب بھی ملتی ہے۔ مثلاً صوفی شاعر مظہر جان جاناں بڑی حسرت سے کہتے ہیں:

یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا، گل اپنا، باغباں اپنا

مصحفی نے 1825 میں انتقال سے پہلے واضح لفظوں میں کہا تھا:

ہندوستاں کی دولت وحشمت جو کچھ کہ تھی کافر فرنگیوں نے، بہ تدبیر چھین لی

مومن خاں مومن ہجر پردہ نشیں پہ مرنے کے لیے مشہور ہیں لیکن مومن ایک ذمہ دار شہری کی طرح عوام کو انقلاب کے لیے اُکساتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں یہ شعر دیکھیے:

اے حشر جلد کر تہ و بالا جہان کو یوں کچھ نہ ہو، امید تو ہے انقلاب میں

اسی طرح سودا نے کسی بیدار مغز صحافی کی طرح کچھ طنزیہ کچھ ناصحانہ انداز میں بادشاہ شاہ عالم کو جو مشورے دیے تھے، وہ آج بھی معنی خیز ہیں۔ یہ شعر دیکھیے:

امور ملک میں اوّل ہے شہ کو یہ لازم گدا نوازی و درویش پروری جانے
مقام عدل پہ جس دم سریر آرا ہو ہر ایک خورد و کلاں میں برابری جانے
جو شخص نائب داور کہائے عالم میں یہ کیا ستم ہے نہ آئین داوری جانے

(سودا)

اردو صحافت ابتدا سے ہی تعمیری کردار نبھاتی رہی ہے ''جام جہاں نما'' کا ذکر بہت ہو چکا ہے لیکن خاص طور پر شہید صحافت سید محمد باقر کے دہلی ''اردو اخبار'' کا اجرا ہی مذہبی اتحاد، انقلاب اور آزادی کی حمایت کے لیے ہوا تھا۔ ''دہلی اردو اخبار'' کی اشاعت کے فوراً بعد مدراس پریزیڈنسی کے گورنر تھامس منرو نے حکم نامہ جاری کرتے ہوئے کہا تھا: ''ہم نے اپنی سلطنت کی بنیادیں جن اصولوں پر استوار کی ہیں ان کی رو سے رعایا کو اخباروں کی آزادی نہ تو کبھی دی گئی اور نہ کبھی دی جائے گی''۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے 2010 میں دہلی اردو اخبار کے 1841، 1851 تا 1857 کے نایاب شماروں کو حاصل کر کے تین جلدوں میں شائع کر دیا ہے۔ یہ شمارے اگر منظر عام پر نہ آتے تو شاید دنیا کو اندازہ نہ ہو پاتا کہ ''دہلی اردو اخبار'' نے ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کے آس پاس ملک کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد اور انگریزوں کے خلاف صف آرا کرنے میں کس طرح کلیدی کردار ادا کیا۔

چند سطریں دیکھیے، سید محمد باقر اپنی زبان میں بھارت کے باسیوں کو سمجھا رہے ہیں:

''اب ہمارے ملک والے یک جان و یک تن، بے غل وغش ہو کر ان کے مقابلے میں بجان و دل کمر بستہ ہو جائیں اور عیاشی اور آرام کو اب طاق نسیاں پر رکھیں...... اس زمانے میں اس ملک کے مختلف مذہب والوں کو اپنی مخالفت مذہبی کا بھی (خرخشہ) اظہار نہیں کرنا چاہیے اور ایسا ذکر آپس میں نہیں لانا چاہیے۔ کیونکہ ان کے آپس میں ایک دوسرے کے دھرم ایمان کا کوئی معترض نہیں ہے۔ ہمارے سلطان ذی شان کی سلطنت میں ہندو مسلمان یا کسی مختلف المذہب کی اذیت رسانی اور مجبور کرنا کسی کا، کسی نے نہ سنا ہوگا...... کچھ اندیشہ کسی طرح کا اہل دھرم و ایمان کو نہیں۔''

''دہلی اردو اخبار'' میں انگریزوں کے ساتھ ہندوستانیوں کے جنگ کے عینی مشاہد سے بھی شائع ہوتے تھے۔ اسی طرح ''گلشن نو بہار کلکتہ، حبیب الاخبار بدایوں، عمدۃ الاخبار بریلی اور سراج الاخبار دہلی'' وغیرہ بھی بغاوت کی آگ بھڑکانے میں پیش پیش تھے۔ اردو اخباروں میں باغیانہ نظمیں بھی شائع ہوتی تھیں۔ مولانا امداد صابری نے اپنی تحقیقی کتاب ''1857 کے مجاہد شعرا'' میں لکھا ہے کہ باغیانہ کلام شائع کرنے کے جرم میں 45 شعرا کو انگریزوں نے موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔ دراصل مذہبی اتحاد اور تحریک آزادی کی حمایت کی غرض سے ہی 1857 سے پہلے کئی اردو اخبارات جاری کیے گئے، جے نٹراجن نے اپنی کتاب History of Journalism میں لکھا ہے کہ 1853 میں اردو اخبارات کی تعداد 35 تھی لیکن بغاوت کی ناکامی کے بعد 1858 میں یہ تعداد گھٹ کر صرف چھ (6) رہ گئی، لیکن اردو صحافت کا سفر رُکا نہیں 1859 میں مکند لال نے آگرہ سے ''تاریخ بغاوت ہند''، 1860 میں اجودھیا پرشاد نے اجمیر سے ''خیر خواہ خلق'' جاری کیا، 1877 میں منشی سجاد حسین نے ہفت روزہ ''اودھ پنچ'' جاری کر کے طنز و مزاح کے حربوں سے غیر ملکی حکومت پر حملے کیے۔ اردو صحافت میں کارٹون نگاری کی ابتدا، ''اودھ پنچ'' سے ہی ہوتی ہے۔ 1903 میں فضل الحسن حسرت موہانی نے ''اردوئے معلیٰ'' میں واضح لفظوں میں اعلان کیا کہ ''قومی

سیاست کا مسلک، کامل آزادی ہے اور اس کے لیے جد و جہد کرنا ہر ہندوستانی کا فرض ہے''۔
بیسویں صدی کے اوائل میں لاہور انقلاب پسندوں کا اہم مرکز بن گیا تھا۔ 1900 سے 1978 کے بیچ سب سے زیادہ اردو اخبارات لاہور سے ہی جاری ہوئے مثلاً پیسہ اخبار، ہندوستان اور جھنگ سیال وغیرہ۔ ایم حسن نے اپنی کتاب Communal & Pan Islamic Trends in Colonial India (Delhi. 1981, p.88) میں لکھا ہے کہ 1878 میں مولانا ابوالکلام آزاد بھی لاہور کی ایک انتہا پسند پارٹی ''بھارت ماتا سبھا'' کے سرگرم معاون تھے۔ اس پارٹی میں ہندو، مسلم، سکھ سبھی دھرموں کے لوگ شامل تھے اور وطن کو ماں تصور کرتے تھے۔ اسی زمانے میں ڈاکٹر اقبال نے ترانۂ ہندی ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' لکھا۔ ناٹک ساگر والے نور الٰہی کے دوست محمد عمر کے مطابق علامہ اقبال سے یہ ترانہ لالہ ہردیال نے لکھوایا تھا جو ان دنوں گورنمنٹ کالج لاہور کے طالب علم تھے۔ یہ وہی لالہ ہردیال ہیں جنھوں نے بعد میں امریکہ جاکر مشہور انقلابی جماعت ''غدر پارٹی'' قائم کی تھی۔ اقبال کا ترانہ 1907 میں ہی کانپور کے رسالہ زمانہ، لکھنؤ کے اتحاد اور لاہور کے مخزن میں شائع ہوا۔ 1907 میں ہی بابو شانتی نرائن بھٹناگر نے الٰہ آباد سے ایک بے حد اہم اخبار ''سوراجیہ'' جاری کیا جو چار زبانوں اردو، ہندی، مراٹھی اور تیلگو میں شائع ہوتا تھا۔ ''سوراجیہ'' کے نو ایڈیٹر تھے اور سب کی تنخواہ جو کی ایک روٹی اور پانی کا ایک پیالہ مقرر تھی۔ ایک ایڈیٹر لدھا رام کو کالا پانی کی سزا بھی دی گئی۔ بیسویں صدی کے اوائل تک آکر اردو صحافت ہندوستان کی سرحدوں سے باہر نکل کر بین الاقوامی حیثیت حاصل کر لیتی ہے۔ جنوری 1908 میں لالہ رام ناتھ پوری نے امریکہ سے اردو کا پہلا اخبار ''سرکلر آزادی'' جاری کیا جبکہ اپریل 1910 میں مولوی برکت اللہ بھوپالی نے جاپان سے ماہنامہ ''اسلامک فریٹرنٹی'' شائع کیا جس کا نعرہ یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمان اپنے ہم وطن ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ مل کر انقلاب کی تنظیم کریں۔ 1910 میں ہی بنگال کے انقلابی لیڈر بپن چندر پال نے لندن سے سوراج نکالا جو اردو ہندی اور بنگلہ تین زبانوں میں چھپتا تھا لیکن ہندوستان کی آزادی کے حوالے سے اس دور کا سب سے اہم اخبار ہفت روزہ ''غدر'' تھا جسے لالہ ہردیال نے کیلیفورنیا امریکہ سے 1913 میں جاری کیا تھا۔ 1947 سے قبل اور بعد میں ہندوستان میں جو اخبارات جاری ہوئے ان کی تفصیل ہر جگہ

دستیاب ہے لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ آج کی تاریخ میں انگریزی، ہندی، بنگلہ اور مراٹھی اخبارات اور صحافت کو بڑے پیمانے پر انڈسٹری کی طرح برتا جارہا ہے لیکن اردو میں انقلاب، سیاست، راشٹریہ سہارا، ہندسماچار جیسے گنتی کے چند اخبارات کے سوا اور کوئی اردو اخبار نہیں ہے جسے انڈسٹری کی طرح برتا جارہا ہو۔ حالانکہ دہلی، اتر پردیش، بہار، بنگال، مہاراشٹر اور جموں وکشمیر سے بھی ایسے کئی اخبارات نکل رہے ہیں جو خوشحال تو ہیں لیکن ابھی بھی انڈسٹری کی حیثیت اختیار نہیں کر سکے ہیں۔ پھر بھی میں جموں وکشمیر کے اخباروں کے حوالے سے کہہ سکتا ہوں کہ آفتاب ہو کہ کشمیر عظمیٰ، تسکین ہو یا اُڑان، سری نگر ٹائمز ہو یا بلند کشمیر ان میں خود اعتمادی کی کمی نہیں اور اگر حکومت کا ذرا سا تعاون حاصل ہو جائے تو یہ اخبارات سیاسی اور سماجی، ثقافتی اور مذہبی اتحاد کو مضبوط و مستحکم کرنے میں قومی صحافت کی رہنمائی بھی کر سکتے ہیں۔ کیونکہ صدیوں سے ہندو مسلم سکھ اتحاد کے سورج کی کرنیں کشمیر کی پہاڑیوں سے نمودار ہو کر پورے ملک میں پھیلتی رہی ہیں۔

مزید وضاحت اس سیمینار کے دوسرے مقالوں میں بھی کی گئی ہے۔ لہٰذا اب میں آخر میں اردو اخبارات کی روشنی میں اردو صحافت کے چند بنیادی امتیازات کی نشاندہی کر کے اپنی گفتگو ختم کردوں گا۔

1۔ اردو صحافت کی بنیاد حب الوطنی، انقلاب اور مذہبی اتحاد پر رکھی گئی ہے۔

2- ابتدائی دور میں مسلمانوں سے زیادہ غیر مسلم صحافیوں نے اردو صحافت کو پروان چڑھایا۔

3- 1810 میں ''اردو اخبار دہلی'' کے اجرا سے لے کر 1910 میں ''اسلامک فریٹرنٹی'' جاپان تک صرف سو سال کے عرصے میں اردو صحافت کا قومی سے نکل کر بین الاقوامی منظرنامے میں مقام پیدا کر لینا معجزہ نہیں ہمارے بزرگوں کی محنت اور لگن کا ثبوت ہے۔

4- اردو صحافت کا مزاج کسی بھی دوسری زبان کی صحافت سے زیادہ سیکولر ہے۔

5- اردو اخبارات کی تعداد میں جس تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اتنی تیزی سے اردو صحافت کا معیار بلند نہیں ہو رہا ہے۔

6- اردو صحافت میں خواتین کی نمائندگی برائے نام ہے۔ قرۃ العین حیدر کے بعد کوئی ایسی خاتون سامنے نہیں آئی جو انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو صحافت سے بھی دلچسپی لے۔ البتہ

کبھی کبھی بعض خواتین کے مضامین یا کالم اردو اخبارات میں شائع ہوتے ہیں۔

7- انگریزی اور ہندی کی طرح اردو اخبارات میں بھی جنسی اور جرائم کی خبریں تو شائع ہوتی ہیں لیکن تعلیم، ملازمت، ازدواجی زندگی جیسے مسائل پر روشن خیال مضامین کم ہی شائع ہوتے ہیں۔

8- اردو اخبارات کے ساتھ اشتہارات کے معاملے میں مرکزی اور ریاستی حکومتیں انصاف نہیں کر رہی ہیں۔ لہٰذا اگر حکومت اخبار مالکان اور اردو صحافی ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے اقدامات کریں تو اردو صحافت انگریزی اور ہندی صحافت سے پیچھے نہیں رہے گی۔

# ماضی کی اردو صحافت میں علما کا حصہ

سہیل انجم

اردو صحافت اور علما کا آپس میں چولی دامن کا رشتہ ہے۔ صحافت کے فروغ میں علما کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ اپنے اپنے دور میں ایک سے ایک ''عالم صحافی'' اس میدان میں ابھرے اور صحافت کے صفحات پر اپنے اپنے نقوشِ پا ثبت کرتے گئے۔ ایسے عالم صحافیوں کی تعداد خاصی ہے جن کی تحریریں اردو ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ ماضی کے صحافیوں نے جہاں اپنے قلم کو جنگ آزادی میں تلواروں کی مانند استعمال کیا وہیں ان کی تحریروں اور اداریوں نے تعلیم یافتہ طبقے میں علمی و ادبی ذوق کو پروان چڑھایا اور اس کے ساتھ ساتھ وقت اور ماحول کے تقاضے کے مطابق عوامی مزاج بھی پیدا کیا۔ جہاں اخبارات ورسائل کے صفحات پر اعلیٰ معیار کی خبر نگاری کے نمونے ملتے ہیں وہیں انھی صفحات کے دامن پر ادبی شہ پارے بھی اپنا جلوہ بکھیرتے نظر آتے ہیں۔

اگر ہم ان صحافیوں کی زمرہ بندی کریں تو انھیں چار قسم کی کیٹگری میں رکھ سکتے ہیں۔ پہلے وہ عالم صحافی جنھوں نے مین اسٹریم کی صحافت کی۔ دوسرے وہ جنھوں نے ادبی صحافت کی۔ تیسرے وہ جنھوں نے مذہبی صحافت کی اور چوتھے وہ جنھوں نے ہمہ قسم کی صحافتی خدمات انجام

دیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد آخر الذکر قسم کے صحافیوں میں سرفہرست ہیں۔ نیرنگ عالم، المصباح، لسان الصدق، الندوہ، وکیل، الہلال، البلاغ، اقدام، پیام، الجامعہ، تحفۂ احمدیہ اور احسن الاخبار۔ یہ وہ اخبارات و رسائل ہیں جو اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ مولانا آزاد کی صحافت کو کسی ایک خانے میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے الہلال کے بارے میں تو بڑی وقیع اور قابل احترام آرا کا اظہار کیا گیا ہے۔ سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان کہا کرتے تھے کہ میں الہلال کے مطالعے کے سبب خارزار سیاست میں داخل ہوا۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کہتے تھے کہ سیاست کا چسکہ مجھے الہلال نے ڈالا۔ علامہ انور شاہ کشمیری کے مطابق ابوالکلام نے الہلال کا صور پھونک کر ہم سب کو جگایا۔ اپنے دور کے عظیم خطیب سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا اعتراف ہے کہ الہلال نے مجھے خطابت سکھائی، سیاست پڑھائی اور زبان و بیان کی ندرت بخشی۔

علما کی صحافتی وادبی خدمات کی تاریخ اسی وقت سے ملتی ہے جب ہندوستان کے افق پر اردو صحافت کا سورج طلوع ہوا۔ اردو اخباروں کی پہلی غیر سرکاری ڈائرکٹری اختر شہنشاہی کے مطابق اردو کا پہلا اخبار 1810 میں کلکتہ سے نکلا تھا جسے ایک عالم دین مولوی اکرام علی نے نکالا تھا۔ اس کا نام ''اردو اخبار'' تھا۔ اگرچہ کچھ لوگ اسے درست نہیں مانتے۔

اسی طرح دہلی سے پہلا اردو اخبار بھی ایک عالم دین ہی نے نکالا جن کا نام مولانا محمد باقر ہے اور جن کے اخبار کا نام ''دہلی اردو اخبار'' ہے۔ یہ اخبار 1837 میں جاری ہوا۔ مولانا باقر کے کئی امتیازات ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے انھوں نے ہی پہلا مذہبی اخبار بھی 1843 میں نکالا تھا۔ یہ اخبار اہل تشیع کے عقائد کو فروغ دینے کے لیے نکالا گیا اور اس کا نام ''مظہر الحق'' تھا۔ گویا مولانا باقر نے مین اسٹریم کی صحافت کے ساتھ ساتھ مذہبی صحافت بھی کی۔ وہ ہندوستان کے پہلے شہید صحافی بھی ہیں۔

جنگ آزادی کے دوران بیشتر اخبارات حریت پسندوں کی حمایت کرتے تھے۔ ان کی تحریریں اور اداریے انگریزوں کے خلاف جوش و ولولہ پیدا کرتے رہے۔ اسی کے شانہ بشانہ ادبی اور مذہبی صحافت بھی پروان چڑھتی رہی۔ مین اسٹریم عالم صحافیوں میں مولانا ظفر علی خاں، مولانا محمد علی جوہر، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی، منشی محبوب عالم، مولوی محبوب حسن، مولانا حامد الانصاری

غازی، مولانا نصر اللہ خاں عزیز، مولانا عبدالوحید صدیقی اور مولانا عبدالباقی کا نام لیا جاسکتا ہے۔

مولانا ظفر علی خاں نے تو اپنے اخبار ''زمیندار'' کے صفحات کو میدان جنگ میں تبدیل کر دیا تھا۔ انھوں نے جب اپنے والد سے اس اخبار کی ادارت اپنے ہاتھوں میں لی تو پر جوش مضامین اور ولولہ انگیز اداریوں کی بدولت اس کی اشاعت پانچ سو سے بیس ہزار تک پہنچا دی۔ صبح ان پڑھ لوگوں کا شوق دیکھنے کے قابل ہوتا تھا کہ دو پیسے کا اخبار خریدتے تھے اور کسی سے پڑھوانے کے لیے اسے چار پیسے دیتے تھے اور اخبار سنتے تھے۔ زمیندار کی دس ہزار کی ضمانت ضبط ہوتی تھی تو لوگ چندہ کر کے دوسری ضمانت جمع کرا دیتے تھے۔

''زمیندار'' نے جہاں عوامی صحافت کو متعارف کرایا وہیں ''ہمدرد'' نے معیاری صحافت کو رواج دیا۔ مولانا محمد علی جوہر نے ہمدرد کے ذریعے ایوانِ حکومتِ فرنگ میں لرزہ طاری کر دیا تھا۔ ان کی صحافتی خدمات اردو صحافت کا لازوال سرمایہ ہے۔ نظر بندی کے دوران جب مولانا عبدالماجد دریابادی نے انھیں تاریخ پر کوئی کتاب لکھنے کا مشورہ دیا تو انھوں نے کہا تھا ''یہ وقت تاریخ نگاری کا نہیں تاریخ سازی کا ہے۔ اغیار تاریخ بنا رہے ہیں اور آپ مجھے تاریخ لکھنے کا مشورہ دے رہے ہیں''۔

لیکن تاریخ لکھی مولانا حسرت موہانی نے۔ اور کہاں لکھی ''اردوئے معلی'' کے صفحات پر۔ انھوں نے 1903 میں علی گڑھ سے اپنا رسالہ ''اردوئے معلّٰی'' جاری کیا اور پہلے ہی شمارے میں ہندوستان کے لیے مکمل آزادی کا مجاہدانہ نعرہ بلند کر دیا۔ انھیں دبستان علی گڑھ کا پہلا باغی کہا جاتا ہے۔ انھوں نے 1908 میں اردوئے معلّٰی میں انگریز حکومت کے خلاف انتہائی سخت مضمون لکھا جس کے نتیجے میں انھیں جیل میں ڈال دیا گیا۔ وہ بار بار جیل جاتے رہے اور ہر بار ان کے عزائم مزید بلندیوں پر پہنچ جاتے۔ چکی کی مشقت بھی ان کے ارادوں کو متزلزل نہیں کر سکی۔

مین اسٹریم اردو صحافت میں منشی محبوب عالم کا مقام بہت بلند ہے۔ وہ سات زبانوں اردو، فارسی، عربی، انگریزی، فرانسیسی، ترکی اور روسی پر عبور رکھتے تھے۔ انھوں نے فیروز والا ضلع گوجراں والا پنجاب سے ''پیسہ'' اخبار جاری کیا تھا۔ یہ اخبار 1887 میں ہفتہ وار کی شکل میں شروع ہوا۔ بعد میں اسے لاہور منتقل کیا گیا اور جنوری 1896 میں روزنامہ ہو گیا۔ اس کی اشاعت

1896 میں دس ہزار تھی۔ یہ شاید اردو کا پہلا اخبار تھا جس نے مقبولیت وشہرت کے ساتھ ساتھ تعداد اشاعت کا ریکارڈ بھی قائم کیا۔ اس کے نام سے پیسہ پوسٹ آفس اور پیسہ اسٹریٹ قائم ہوئی۔ محبوب عالم نے یورپ کا سفر کیا۔ واپسی پر سفر نامہ قسط وار شائع کرنا شروع کیا تو اخبار کی اشاعت بہت زیادہ بڑھ گئی۔ اس سفر نامے کا ذکر ابن انشا نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے۔ پنجاب سرکار نے اس کی اشاعت پر چار سو روپے کا نقد انعام عطا کیا۔ نظام دکن نے ڈھائی ہزار روپے سالانہ کا وظیفہ مقرر کیا جو بیس برسوں تک جاری رہا۔ پیسہ اخبار کی چھپائی کے لیے ولایت سے 17 جدید مشینیں منگائی اور لگائی گئی تھیں۔ منشی محبوب عالم کا شمار پاکستانی صحافت کے بانیوں میں ہوتا ہے۔

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی الہلال، البلاغ اور اس سے قبل پیغام کے ادارتی عملے میں بھی شامل رہے۔ انھوں نے 1929 میں کلکتہ سے ''ہند'' نام سے اپنا روزنامہ اخبار جاری کیا جس کی مدد سے اردو صحافت کی تاریخ میں سنجیدہ صحافت نے آنکھ کھولی۔ مولانا ملیح آبادی نے 1947 میں ہفتہ وار ''اجالا'' اور 1948 میں روزنامہ ''آزاد ہند'' جاری کیا۔ بعد میں ''ثقافۃ الہند'' کے بھی وہ مدیر ہوئے۔ عبدالرزاق ملیح آبادی کے تاریخی مضامین ''شہید اعظم'' اور ''انسانیت موت کے دروازے پر'' کو کون فراموش کرسکتا ہے۔

مولوی مجید حسن نے انتہائی پرآشوب دور میں قلیل پونجی سے یکم مئی 1913 کو ہفتہ وار ''مدینہ'' شروع کیا تھا جو جنگ آزادی کے ہراول دستے میں شامل رہا۔ مدینہ یکم جنوری 1917 سے سہ روزہ ہوگیا۔ بعد میں روزنامہ بھی نکلا مگر وہ زیادہ دن نہیں چل سکا۔ ''مدینہ'' کی بڑی خصوصیت یہ رہی کہ اس کے ادارۂ تحریر کو جن حضرات کی خدمات حاصل ہوئیں وہ نہ صرف اس کے قوم پرور اور حریت پسندانہ موقف کے حامی تھے بلکہ اپنے زمانے کے مشہور انشا پرداز اور صاحب طرز نثر نگار بھی تھے۔

مدینہ اخبار کا نام آئے اور مولانا حامد الانصاری غازی اور مولانا نصر اللہ خاں عزیز کا نام نہ آئے یہ کیسے ممکن ہے۔ مولانا غازی کو جرأت وبیباکی اور ذہانت وفطانت ورثے میں ملی تھیں۔ وہ ایک محب وطن اور قوم پرور صحافی تھے۔ ان کے مضامین اور شذرات قاری کو سوچنے اور غور کرنے پر مجبور کرتے تھے۔ وہ ان مقتدر ادیبوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنے مضامین میں سیاسی تدبرو

تفکر کا ثبوت دیا اور نہایت مربوط اور شائستہ زبان میں عصری واقعات وحالات پر شذرات لکھے۔ انھوں نے دوسرے کئی اخباروں میں بھی کام کیا تھا۔

مولانا نصر اللہ خاں عزیز نہ صرف ایک بلند پایہ صحافی تھے بلکہ شگفتہ قلم ادیب، خوش گو شاعر، شیریں بیان مقرر اور اعلیٰ پائے کے طنز ومزاح نگار بھی تھے۔ انھیں زبان وبیان پر بے پناہ قدرت حاصل تھی۔ انھوں نے سہ روزہ اور روز نامہ دونوں مدینہ میں کام کیا تھا۔ دونوں کی ادارتی ذمہ داری انھی کے دوش پر تھی۔ ان کا مستقل کالم ''سرراہے'' کافی مقبول تھا۔ انھیں کئی بار جیل میں بھی ڈالا گیا تھا۔

مولانا محمد عثمان فارقلیط کی صحافتی خدمات بھی کم نہیں۔ وہ 1947 میں الجمعیۃ کے چیف ایڈیٹر ہوئے اور مسلسل پچیس برسوں تک بحیثیت مدیر خدمات انجام دیتے رہے۔ وہ روزانہ اداریہ اور شذرہ لکھتے۔ ان کے اداریوں کی تعداد بقول پروفیسر نثار احمد فاروقی، کم از کم پچیس ہزار ہے۔

زمیندار، انقلاب اور دیگر اخبارات سے وابستہ مولانا غلام رسول مہر اور مولانا عبدالمجید سالک کا نام آتا ہے تو ان کے ادبی کارنامے بھی یاد آجاتے ہیں۔ مولانا مہر کا مقام ایک نقاد اور مصنف کی حیثیت سے بھی بہت بلند ہے۔ انھوں نے بچوں کے لیے درسی کتابیں لکھیں۔ نصاب سے متعلق تقریباً پچاس کتابیں تصنیف کیں۔ ہزار صفحات کی سیرت سید احمد شہید لکھ کر انھوں نے اسلامی تاریخ پر احسان عظیم کیا ہے۔ حضرت شہید کے رفقا کے حالات بھی سرگذشت مجاہدین کے نام سے انھوں نے لکھے۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے غالب کی سوانح حیات لکھ کر غالبیات میں ایک اہم اضافہ کیا۔ کلام غالب کا تفصیلی جائزہ لینے والے مختار الدین آرزو کے مطابق ''زمانہ حال میں سب سے زیادہ مفصل اور جامع کتاب غلام رسول مہر کی ہے''۔ انھوں نے خطوط غالب کو بھی دو ضخیم جلدوں میں ترتیب دیا۔

عبدالمجید سالک ایک صحافی کے ساتھ ساتھ مصنف اور ترجمہ نگار بھی تھے۔ ان کی تحریریں ادبیت سے لبریز ہوتی تھیں۔ طنز ومزاح میں ان کا رنگ منفرد تھا۔ مولانا سالک کی خودنوشت کا نام ''سرگذشت سالک'' ہے جس کا انتساب پطرس بخاری کے نام ہے۔ کتاب کے آغاز میں دو دیباچے ہیں۔ ایک علامہ چراغ حسن حسرت جیسے مایہ ناز صحافی کا اور دوسرا مولانا

غلام رسول مہر کا۔

چراغ حسن حسرت کا شمار ان ہمہ جہت اہل قلم میں ہوتا ہے جنھوں نے بیک وقت صحافت، ادب اور تاریخ کے قرطاس پر نوع بنوع رنگ آمیزیاں کیں۔ حسرت کے فرزند ظہیر الحسن جاوید نے اپنے والد کے بارے میں لکھا ہے کہ حسرت جب شملہ آئے تو ان کی عمر 16 برس تھی۔ پیغام کے شعبۂ ادارت میں شامل ہوئے تو وہ 17 برس کے تھے، نئی دنیا میں تھے تو 19 سال کے تھے۔ 20 سال کی عمر میں وہ عصر جدید کے مدیر اور نامور صحافی تسلیم کیے گئے۔ پھر 21 سال کی عمر میں انھوں نے اپنا اخبار آفتاب نکالا۔ اس اخبار نے علم وادب کی دنیا میں بڑا نام کمایا۔ وہ پائے کے طنز و مزاح نگار تھے۔ سعادت حسن منٹو نے ان کی مزاح نگاری کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''حسرت صاحب مر جائیں تو مزاح نگاری ساری عمر عدت میں گزار دے گی''۔ حسرت نے اخبار ''امروز'' سے اپنا کالم ''حرف و حکایت'' شروع کیا تھا۔ یہی کالم بعد میں نوائے وقت میں لکھنے لگے۔ ان کے انتقال کے بعد جب یہ کالم بند ہو گیا تو منٹو نے لکھا کہ اب جبکہ یہ کالم بند ہو گیا ہے تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے مجھے ناشتہ نہیں ملتا۔

اخباری صحافت کے ذریعے ادب کو پروان چڑھانے والوں میں حیات اللہ انصاری کا بھی نام ہے۔ انھوں نے لکھنؤ کے علمائے فرنگی محل کے مشہور علمی خانوادے میں آنکھ کھولی۔ بچپن میں مذہبی تعلیم پائی اور دارالعلوم فرنگی محل سے سند فراغت سے سرافراز ہوئے۔ انھوں نے اخبار ہندوستان، قومی آواز، سچ رنگ اور سب ساتھ کے ذریعے اردو زبان وادب اور صحافت کے میدان میں جو نمایاں نقوش مرتب کیے ہیں وہ آج تک روشن ہیں۔ انھوں نے روز نامہ قومی آواز کے توسط سے اردو صحافت کو ایک نئی زبان سے آشنا کیا تھا۔ ان کا ناول ''لہو کے پھول'' ادب میں ایک اضافہ ہے۔ علامہ نیاز فتح پوری اور علامہ تاجور نجیب آبادی کو کون بھول سکتا ہے جنھوں نے اردو میں ادبی صحافت کو پروان چڑھایا۔

مولانا عبدالحلیم شرر اور علامہ راشد الخیری کی ادبی و صحافتی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ مولانا شرر برصغیر کے ایک معروف ادیب تھے۔ اسلامی ناول نگاری میں انھوں نے خصوصی شہرت حاصل کی تھی۔ انھوں نے 1887 میں لکھنؤ سے ماہنامہ ''دلگداز'' کا اجرا کیا تھا۔ ان کی کتاب

''گذشتہ لکھنؤ'' ادبی، تہذیبی، ثقافتی، سیاسی اور سماجی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ جبکہ علامہ راشد الخیری خواتین کی علمی ترقی کے بہت بڑے علمبردار تھے۔ انھوں نے 1908 میں دہلی سے رسالہ عصمت کے اجرا سے خواتین میں علمی ذوق پیدا کیا۔

مذہبی صحافت کا ذکر کریں تو علامہ شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، سید ابوالاعلیٰ مودودی، ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری، عبدالماجد دریابادی، سعید احمد اکبرآبادی، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، محمد منظور نعمانی، ماہر القادری، عامر عثمانی اور ایسے بے شمار نام ہیں جنھوں نے اپنے قلم سے مذہبی صحافت میں انتہائی روشن نقوش مرتب کیے۔ ہندوستان میں مذہبی صحافت کو علمی رنگ دینے اور بلند پایہ صحافی اور قلمکار پیدا کرنے میں ندوۃ العلما لکھنؤ کے مجلّہ ''الندوہ'' اور اس کے ایڈیٹر علامہ شبلی نعمانی کا نمایاں کردار رہا ہے۔ اس سے قبل علما کی جماعت مناظرانہ مضامین کی اشاعت اور افکار و خیالات کی تکرار میں سرگرم تھی۔ شبلی نعمانی نے الندوہ کے پلیٹ فارم سے علمی اور فکری صحافت کا جو آغاز کیا تو مضمون نگاری کے فن میں نمایاں تبدیلی آگئی۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی صحافت کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے اعظم گڑھ سے ماہنامہ ''معارف'' کے اجرا سے ایک علمی پرچے کی داغ بیل ڈالی۔

مولانا عبداللہ عمادی بھی شبلی کے اصحاب صفہ میں سے ایک ہیں۔ وہ الندوہ میں بھی نظر آتے ہیں، الہلال میں بھی اور البلاغ میں بھی۔ وہ دہلی میں طب کی القانون حکیم عبدالمجید سے پڑھتے نظر آتے ہیں اور رام پور میں الریاض نام کے رسالے کے مدیر کی حیثیت سے بھی سامنے آتے ہیں اور عربی کے ''البیان'' کے مدیر کی حیثیت سے بھی۔ اور اسے کیا نام دیا جائے کہ وہ دارالترجمہ حیدرآباد جاتے ہیں تو 22 برس اس کی نذر کر دیتے ہیں۔ مولانا عمادی نے قلم اٹھایا تو تصانیف کے انبار لگا دیے۔ تحکمات، علم الحدیث، فلسفہ ابن عربی، صناعۃ العرب، تاریخ عرب قدیم اور ترجمہ کی طرف راغب ہوئے تو متعدد اہم کتابوں کا ترجمہ کر ڈالا۔

مولانا ثناء اللہ امرتسری نے نومبر 1903 میں امرتسر سے ''اخبار اہلحدیث'' کے نام سے ایک ہفت روزہ جاری کیا جو مسلسل 44 برسوں تک نکلتا رہا۔ اس کے مجموعی صفحات کی تعداد 35 ہزار سے زائد ہے۔ اپنے زمانے کے صاحب طرز ادیب، انشاپرداز، تخلیق کار اور مصنف مولانا سید

ابوالاعلیٰ مودودی نے ایک رسالہ ''ترجمان القرآن'' کی مدد سے ایک بہت بڑی مذہبی جماعت کھڑی کردی۔

ان صحافیوں نے جہاں اخبارات ورسائل کے ذریعے صحافتی خدمات انجام دیں وہیں مولانا امداد صابری نے پانچ جلدوں میں اردو صحافت کی تاریخ لکھ کر تاریخِ صحافت میں اپنا نام سنہرے حروف میں درج کرالیا۔

یہاں یہ بات بھی بتاتے چلیں کہ اردو کا پہلا روزنامہ ''اردو گائڈ'' کلکتہ سے 1857 میں جاری ہوا تھا جسے مولوی کبیرالدین احمد نے جاری کیا تھا۔ ان کے علاوہ مولانا عبدالواحد عظیم آبادی نے تحفۂ حنفیہ نامی اخبار نکالا جو کسی مدرسے سے نکلنے والا پہلا مذہبی اخبار تھا۔ یہ اخبار 1897 میں پٹنہ سے جاری ہوا تھا۔

موجودہ دور میں بھی بے شمار علمائے کرام صحافت سے وابستہ ہیں۔ آج بھی اردو صحافیوں کی اکثریت مدارس کے فارغین پر مشتمل ہے۔ توقع ہے کہ آئندہ بھی ''عالم صحافی'' میدانِ صحافت میں آتے رہیں گے اور اپنی قابلیت کے جوہر دکھاتے رہیں گے، اپنی صحافتی خدمات کی روشنی بکھیرتے رہیں گے۔ میں نے وقت کی قلت کے پیش نظر اپنے مقالے میں نمونے کے طور پر چند شخصیات کا ذکر کیا ہے۔ میں نے ان کی صحافتی وادبی کاوشوں کا جائزہ بھی عمداً چھوڑ دیا ہے۔ دراصل عالم صحافیوں کی تعداد سیکڑوں میں ہے اور صحافت کے فروغ میں ان کی قربانیاں چاندی کے ورق پر سونے کے پانی سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ یہ داستان اتنی دلچسپ، اتنی پرجوش، اتنی سبق آموز اور اتنی طویل ہے کہ اس کے لیے متعدد کتابیں بھی تصنیف کی جائیں پھر بھی یہ موضوع تشنۂ تحریر ہی رہے گا۔

# اردو صحافت اور علمائے کرام

**ڈاکٹر رشید احمد**

اردو زبان سرزمینِ برصغیر میں ایک اسلامی زبان کی حیثیت سے رونما ہوئی۔ اس کی پیدائش اسلامی ماحول میں ہوئی ہے۔ البتہ اس کے خدام مسلم و غیر مسلم سبھی ہیں۔ مسلمان فاتحین جب برصغیر (موجودہ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کا علاقہ) میں آئے تو اپنے ساتھ عربی، فارسی اور ترکی زبانیں بھی لائے۔ مسلمان فاتحین کی ان زبانوں اور ہندوستان کی مقامی مروجہ بولیوں سے مل کر ایک نئی زبان کی تشکیل ہوتی چلی۔ بعد میں جس نے بادشاہ شاہجہاں کے زیرِ سایہ نشو و نما پائی اور جس زبان میں سب سے پہلے دین و مذہب کے پابند ایک بادشاہ یعنی شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے شعر کہے، جس زبان میں سب سے پہلے زمانے کے دو بڑے مولوی و عالمِ دین یعنی مولانا شاہ عبدالقادر صاحبؒ اور مولانا شاہ رفیع صاحبؒ نے قرآن کریم کے ترجمے لکھے۔ چنانچہ اوّل الذکر کا ترجمۂ قرآنِ کریم اردو لغات کے لیے ایک بہت بڑی سند ہے۔ اور مؤخر الذکر کا ترجمہ اردو تراکیبِ نحو کے لیے ایک بہت ہی عمدہ دستاویز ثابت ہوا ہے۔[1] یہی وہ زبان ہے جو ایک اور دینی و ادبی شخصیت یعنی ولی دکنیؒ کی خدمت سے گراں بار ہے۔ چنانچہ آج یہ زبان اس

کے پیدائشی علاقہ برّصغیر اور ایشیا کی حدود سے گزر کر ساری دنیا میں پھیل چکی ہے، حتیٰ کہ آج یہ زبان جاپان، چین، روس، یورپ، امریکہ، افریقہ جیسے برّ اعظموں کے مختلف اداروں اور یونیورسٹیوں میں بڑے اہتمام کے ساتھ پڑھی پڑھائی جاتی ہے اور اس نومولود زبان کا آج یہ حال ہے کہ انگریزی کے بعد یہی زبان دنیا میں عالمگیر حیثیت حاصل کرنے جارہی ہے اور جو زبان جس حیثیت کی مالک ہوتی ہے اس کی صحافت بھی عام طور پر اسی پائے کی ہوا کرتی ہے۔ اس مختصر ابتدائی بیان سے عالمی زبانوں اور ادبوں میں اردو زبان و ادب کا مقام اور ساتھ ساتھ اردو صحافت کی اہمیت پر بھی بطور اشارہ و کنایہ کچھ نہ کچھ روشنی پڑی ہے۔ چنانچہ اس انٹرنیشنل کانفرنس میں ہمارا آج کا موضوع اسی سے متعلق ہے، یعنی "اردو صحافت کے دو سو سال: ماضی، حال اور امکانات"، جیسا کہ آپ حضرات کو معلوم ہے۔

ساتھ ساتھ آپ حضرات کو یہ بھی معلوم ہوا ہوگا کہ کانفرنس کے اس آخری دن میں میرا موضوع ہے "اردو صحافت اور علمائے کرام"۔ چنانچہ آج کے اس دور میں یہ موضوع نہایت ہی اہمیت کا حامل ہے، جبکہ علمائے کرام کو "پسماندہ"، "قدامت پرست"، "بیکار اور سماج کا بوجھ" وغیرہ طعنوں سے نوازا جاتا ہے۔ حالانکہ اگر اندھادھند طعنہ زنی اور جہالت کا راستہ چھوڑ کر اعتدال و انصاف کی نظر سے علمائے کرام کے موقف کو دیکھا جائے اور سوچا جائے تو یہی نتیجہ برآمد ہوگا کہ ان لوگوں کو یعنی حقانی ربانی علمائے کرام کو ''پسماندہ''، ''قدامت پرست''، ''بیکار اور سماج کا بوجھ'' وغیرہ طعنہ آمیز خطابوں کا ہدف بنانا ان پر سراسر ظلم اور زیادتی ہے اور اس ظلم و ستم اور زیادتی کن حرکات سے باز رہنا ہر ایک ذی شعور انسان کا فرضِ منصبی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر دور میں سماج اور انسانیت کے لیے ضروری و اہم اور فائدہ مند ممتاز خدمات ہر میدانِ عمل میں حقانی ربانی علمائے کرام نے انجام دیں، فی الحال بھی دے رہے ہیں اور آئندہ بھی دیتے رہیں گے اور چونکہ اردو صحافت کے ساتھ بھی سماج اور انسانیت کے بہت سارے مفاد اور ضروریات منسلک ہیں، چنانچہ اس میدان میں بھی ہر دور کے حقانی ربانی علمائے کرام نے نمایاں کردار ادا کیا اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔ ذیل میں اردو صحافت کے ابتدائی دور سے اب تک علمائے کرام کے کردار پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی جارہی ہے۔

## اردو صحافت کا آغاز اور اس میں علمائے کرام کا کردار:

برِ صغیر میں اردو صحافت کا آغاز انیسویں صدی عیسوی کے نصفِ اوّل سے ہوا ہے۔ مشہور محققین کے قول کے مطابق 27 مارچ 1822 میں اردو کا پہلا اخبار ہفت روزہ "جام جہاں نما" منشی سدا سکھ کے ہاتھ مغربی بنگال یعنی کلکتے سے شائع ہونا شروع ہوا۔[2] لیکن ایک دوسری تحقیق کے مطابق مولوی محمد اکرام (صاحبِ ترجمہ 'اخوان الصفا') [3] نے "اردو اخبار" کے نام سے اردو کا 'پہلا نیوز پیپر' 1810 کو شائع کیا، جس کی زبان اور اسکرپٹ کے کاغذات 'کلکتہ نیشنل لائبریری' میں محفوظ ہیں۔ اس کے بعد مولانا محمد باقر نے، جو شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد کے والدِ بزرگوار تھے، دہلی کا پہلا اردو اخبار "دہلی اردو اخبار" 1836 میں شائع کیا۔[4] یہ اخبار ہفت روزہ تھا۔ پہلے اس کا نام صرف 'اردو اخبار' تھا۔ پھر کچھ دن بعد اس کا نام "دہلی اردو اخبار" کر دیا گیا۔ یہ 1837 / 1836 سے جاری ہو کر 1857 کی جنگِ آزادی تک جاری رہا، موصوف نے "مظہر الحق" کے نام سے ایک دوسرا اردو اخبار اکتوبر 1843 کو نکالا تھا، جس میں شیعیت کی ترجمانی ہوتی تھی، اس میں مدیر کے طور پر شیخ محمد امداد حسین کا نام دیا جاتا تھا۔ یہ اخبار 1848 میں بند ہو گیا۔[5] یہاں یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ اردو صحافت کے آغاز میں علمائے کرام کی خدمات بھی شامل ہیں اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے، جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا نیز یہ میدانِ صحافت میں ان کے مقام کو بھی اجاگر کرتا ہے۔

## اردو صحافت سے رشتہ رکھنے والے برصغیر کے مختلف علاقوں کے مشہور علمائے کرام:

میدانِ صحافت سے رشتہ رکھنے والے علمائے کرام کے نام کی فہرست تو بڑی طویل ہے لیکن یہاں میں بطورِ نمونہ چندے از خروارے ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے بعض مشہور عالمِ دین صحافی اور صحافت سے منسلک بعض اہم شخصیات کے نام اور ان کے اخبار کے نام، کہیں کہیں مختصر تعارف کے ساتھ اور کہیں اس کے بغیر، بہ ترتیب ادوار ذکر کر رہے ہیں۔ سب سے پہلے ہندوستان کے علمائے کرام، کیونکہ اس ہندوستان کا صدر مقام دہلی اور اس کے آس پاس کے علاقے اردو کی پیدائش گاہ ہیں، اس کے بعد پاکستان، کہ اردو صحافت اس کے باشندوں کی

خدمات سے گراں بار ہے اور سب سے اخیر میں بنگلہ دیش، کہ اس کی اردو صحافتی خدمات سب سے کم ہیں۔ چنانچہ ہندوستان کے چند مشہور صحافی علمائے کرام کے نام اور ان کے نکالے ہوئے یا ان سے منسلک رسائل واخبار مذکورہ تفصیل کے مطابق یعنی علاقہ وار بترتیب ادوار درج ذیل ہیں۔

خطۂ ہندوستان کے مشہور اردو صحافی علمائے کرام:

(انیسویں صدی کے آغاز سے اٹھارہ سو ستاون تک)

(1) مولوی محمد اکرام نے 1810 میں اردو کا پہلا نیوز پیپر ''اردو اخبار'' نکالا، جس کی اسکرپٹ وغیرہ کلکتہ نیشنل لائبریری میں محفوظ ہیں۔

(2) مولوی محمد باقر نے 1836 میں شمالی ہندوستان کا پہلا اردو اخبار ''دہلی اردو اخبار'' دہلی سے نکالا۔ یہی شمالی ہندوستان کا پہلا اردو اخبار ہے۔ ایک زمانہ تک اسی کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ یہی اردو کا پہلا اخبار ہے۔

(3) مولوی عبدالغفور 1837 میں دہلی سے جاری شدہ ''سیدالاخبار'' کے ایڈیٹر تھے۔[6]

(4) مولوی محمد باقر موصوف نے 1843 میں ایک اور رسالہ ''مظہر الحق'' دہلی سے نکالا، جیسا کہ اوپر مذکور ہوا ہے۔

(5) مولوی کریم الدین نے 1845 میں دہلی سے ہفت روزہ" کریم الاخبار" جاری کیا۔[7]

(6) مولوی عبداللہ نے 1847 یا 1850 میں شملہ سے ہفت روزہ اردو رسالہ " شملہ اخبار" نکالا۔ یہ پنجاب کا پہلا اردو اخبار تھا، یہ رسالہ دیوناگری رسم الخط میں چھپتا تھا۔[8]

(7) مولوی محمد یعقوب نے 1856 میں لکھنو سے ہفت روزہ" طلسم" نکالا۔[9]

(اٹھارہ سو ستاون کے بعد سے انیسویں صدی کے اخیر تک)

(8) مولانا الطاف حسین حالی 1866 سے سہ روزہ ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' کے مدیر بنے، جبکہ یہ باہتمام منشی محمد یار خاں اردو اور انگریزی میں مشترکہ طور پر نکلنا شروع ہوا۔ اس

سے پہلے یہ رسالہ ہفت روزہ تھا اور صرف انگریزی زبان میں نکلتا تھا۔ [10]

(9) مولوی محمد بشیر نے 1899 میں اٹاوہ سے ہفت روزہ "البشیر" نکالا۔ [11]

(10) مولانا ابوالکلام آزاد نے 1900 میں کلکتہ سے ہفت روزہ "الصباح" نکالا۔ [12]

یہاں یہ بات قابل دید ہے کہ 1857 سے 1900 تک نکلنے والے اردو اخبارات کے مدیران میں صرف دو چار گنے چنے حضرات جیسے مولانا الطاف حسین حالی، مولوی محمد بشیر وغیرہ کے علاوہ سارے کے سارے مدیران یا تو ہندو تھے اور یا انگریز تھے اور خوش قسمتی سے بو لیے یا اتفاقاً بو لیے، ان گِنے چُنے مسلم مدیرانِ اردو اخبار میں تقریباً سبھی مولوی نکلے۔ گویا اس پوری نصف صدی میں یہی چند حضرات میدانِ اردو صحافت میں مسلمانوں کی جانب سے نمائندے اور لڑاکو تھے اور میدانِ صحافت خالی نہ رہا۔

## (بیسویں صدی کے آغاز (1901) سے اخیر تک)

دراصل بیسویں صدی کے آغاز سے اردو صحافت کی نوجوانی شروع ہوئی اور اس کا سلسلہ آج تک جاری ہے اور ان شاء اللہ قیامت تک رہے گا۔ ذیل میں بیسویں صدی میں ہندوستانی علمائے کرام کی صحافتی خدمات کا ایک مختصر جائزہ پیش خدمت ہے۔

(1) مولانا ثناءاللہ 1902 کو شائع شدہ ہفت روزہ "مسلمان"، امرتسر کے مدیر تھے۔ [13]

(2) مولانا حسرت موہانی 1903 کو شائع شدہ ماہنامہ "اردوئے معلیٰ"، علی گڑھ کے مدیر تھے۔

(3) مولانا اصغر علی روحی 1903 کو شائع شدہ ماہنامہ "الہدیٰ"، کٹھالہ (گجرات) کے مدیر تھے۔

(4) اوپر مذکور مولانا ثناءاللہ امرتسری 1903 کو شائع شدہ ہفت روزہ "اہلِ حدیث"، امرتسر کے مدیر تھے۔

(5) مولانا رشید احمد گنگوہی 1905 کو شائع شدہ ماہنامہ "مجلّہ القاسم"، دیوبند کے مدیر تھے۔

(4) سید ارتضیٰ حسین المعروف بہ ملا واحدی 1909 کو شائع شدہ ماہنامہ "نظام المشائخ"، دہلی کے مدیر تھے۔

(7) مولانا ابوالکلام آزاد 1912 کو شائع شدہ ہفت روزہ "الہلال"، کلکتہ کے مدیر تھے۔

(8) مولانا محمد علی جوہر 1913 کو شائع شدہ روزنامہ "ہمدرد" کلکتہ کے مدیر تھے۔[14]

(9) مولانا عبدالحلیم شرر متوفی 1926 نے ہفت روزہ "مہذب" لکھنؤ سے جاری کیا۔ اس کے علاوہ موصوف نے رسالہ "دلگداز" جاری کیا، موصوف "اودھ اخبار" میں نامہ نگاری کرتے تھے اور "اودھ پنچ" میں بھی لکھتے تھے۔[15]

(10) حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانویؒ (متوفی 1362ھ مطابق 1943) کی سرپرستی میں مندرجہ ذیل ماہنامے یوپی کے مختلف علاقوں سے نکلتے تھے:

1۔ الامداد 2۔ المبلغ 3۔ الابقاء 4۔ الہادی 5۔ النور 6۔ اشرف العلوم اور 7۔ الاشرف۔

یہ سات رسالے علی الترتیب مندرجہ ذیل علمائے کرام اور مولوی صاحبان کے زیر ادارت نکلتے تھے۔

(☆) خود حضرت مولانا تھانویؒ کے زیر نگرانی "الامداد" نام کا ایک اور رسالہ تھانہ بھون سے رجب 1332ھ (مطابق 1914) سے جاری ہوا۔ اس کی ضخامت 40 صفحات کی تھی۔ اس میں حضرت تھانویؒ کی ہر قسم کے مضامین چھپتے تھے۔

(11) مولانا شبیر علی صاحب تھانوی کے زیر ادارت ماہوار رسالہ "النور" ہر قمری مہینہ کے آخری ہفتہ میں شائع ہوتا تھا، اس کے مع ٹائٹل 36 صفحے تھے، جو 1339ھ مطابق 1920 جاری ہوا۔ اس کا سال ماہ جمادی الاولیٰ سے شروع ہوتا تھا۔ اس میں حضرت تھانویؒ کے مضامین شائع ہوتے تھے۔

یہ مولانا شبیر علی حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانوی کے چھوٹے بھائی منشی اکبر علی صاحب کے بیٹے یعنی ان کے بھتیجے تھے۔ حضرت تھانویؒ نے ان کو اپنے چھوٹے بھائی سے یہ فرما کر لے لیا تھا کہ:

" میری کوئی اولاد نہیں ہے۔ لہٰذا شبیر کو مجھے دے دو۔ میں اس کو اپنی اولاد

کی طرح رکھوں گا۔"

(منشی عبدالرحمن خان، سیرتِ اشرف، ادارۂ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، پاکستان، حصۂ دوم، بلا تاریخ، ص:337)۔

(12) مولوی محمد عثمان خانؒ تاجر کتب کے زیر ادارت دریبہ کلاں دہلی ہی سے رسالہ "الہادی" ہر قمری مہینے میں شائع ہوتا تھا۔ 48 صفحات کا یہ رسالہ 1343ھ (مطابق 1924) میں جاری ہوا۔ اس کا سال جمادی الاولیٰ سے شروع ہوتا تھا۔ اس میں حضرت کے ہر قسم کے علوم عقلیہ ونقلیہ سے پُر بیانات شائع ہوتے تھے۔

(13) یہی خان صاحب موصوف ہر قمری مہینہ کی پندرھویں تاریخ کو دریبہ کلاں دہلی سے رسالہ "الابقاء" شائع کرتے تھے۔ اس میں مع ٹائٹل 36 صفحے ہوتے تھے۔ یہ رسالہ 1348ھ (مطابق 1930) میں جاری ہوا۔ اس کا سال ماہِ رمضان سے شروع ہوتا تھا۔ اس رسالے میں حضرت تھانویؒ کے کیاب مواعظ چھپتے تھے۔ یہ رسالہ اب تک کراچی سے شائع ہوتا رہتا ہے۔

(14) انہی مولانا شبیر علیؒ کے زیر ادارت ماہوار رسالہ "المبلغ" ہر قمری مہینے کو شائع ہوتا تھا، یہ رسالہ 40 صفحات کا ہوا کرتا تھا جو 1349ھ (مطابق 1931) سے جاری ہوا۔ اس کا سال شوال المکرّم سے شروع ہوتا تھا۔ اس میں حضرت تھانویؒ کے نئے مواعظ شائع ہوتے تھے۔

(15) اوپر مذکورہ مولوی محمد عثمان خانؒ تاجر کتب موصوف ہر قمری مہینے کی پندرھویں تاریخ کو دریبہ کلاں دہلی سے ایک اور رسالہ "الابقاء" شائع کرتے تھے۔ اس میں مع ٹائٹل 36 صفحے ہوتے تھے۔ یہ رسالہ 1348ھ (مطابق 1930) میں جاری ہوا۔ اس کا سال ماہِ رمضان سے شروع ہوتا تھا۔

(16) مولانا ظہور الحسن صاحب کسولوی کی ادارت میں دفترِ اشرف العلوم سہارنپور سے محرم الحرام 1354ھ (مطابق اپریل 1935) سے رسالہ "اشرف العلوم" جاری ہونا شروع ہوا۔ یہ ہر قمری مہینے میں شائع ہوتا تھا۔ پہلے پہل یہ رسالہ 235 صفحات پر چھپتا رہا، بعد میں اس کی

ضخامت 40 صفحات رہ گئی۔ حضرت تھانویؒ کے نام نامی ہی کی طرف نسبت کرتے ہوئے اس رسالے کا نام "اشرف العلوم" رکھا گیا تھا۔

(17) مولوی محمد حسن صاحبؒ کی ادارت میں انوار بک ڈپو لکھنؤ سے ایک ماہوار رسالہ "الاشرف" نکلا کرتا تھا۔ یہ رسالہ ربیع الثانی 1354ھ (مطابق 1935) سے جاری ہوا۔ اس کے آدھے حصے میں حضرت تھانویؒ کے جدید ملفوظات اور دوسرے آدھے حصے میں ان ہی کی کتاب "بوادر النوادر" شائع ہوتی تھی۔ [16]

(18) مولانا ابوالکلام آزاد 1914 میں شائع شدہ ہفت روزہ "البلاغ"، کلکتہ کے مدیر تھے۔ [17]

(19) حافظ عبداللہ روپڑی 1915 کو شائع شدہ ہفت روزہ "تنظیم اہل حدیث"، روپڑ کے مدیر تھے۔

(20) مولانا سید سلیمان ندوی 1916 کو شائع شدہ ماہنامہ "معارف"، اعظم گڑھ کے مدیر تھے۔

(21) مولوی یوسف شمس 1918 کو شائع شدہ ماہنامہ "اہل الذکر"، فیض آباد کے مدیر تھے۔

(22) مفتی محمد عمر نعیمی 1918 کو شائع شدہ ماہنامہ "سواد الاعظم"، مرادآباد کے مدیر تھے۔

(23) مولوی اعجاز احمد 1919 کو شائع شدہ ماہنامہ "اعجاز القرآن"، امرتسر کے مدیر تھے۔

(24) مولوی تاج الدین 1919 کو شائع شدہ ہفت روزہ "تاج"، جبل پور کے مدیر تھے۔

(25) مولانا عبد اللہ عمادی 1919 کو شائع شدہ ماہنامہ "تہذیب الاخلاق"، امرتسر کے مدیر تھے۔

(26) مولوی عبد الحمید خادم 1920 کو شائع شدہ ماہنامہ "مسلمان"، سوہدرہ کے مدیر تھے۔

(27) مولانا ابوالکلام آزاد 1921 کو شائع شدہ ہفت روزہ "پیغام"، کلکتہ کے مدیر تھے۔

(28) مفتی کفایت اللہ 1921 کو شائع شدہ ہفت روزہ "مسلم"، کلکتہ کے مدیر تھے۔

(29) مولوی احمد اللہ 1922 کو شائع شدہ ماہنامہ "تبلیغ السنہ"، دہلی کے مدیر تھے۔

(30) مولوی محمد جوناگڑھی 1922 کو شائع شدہ پندرہ روزہ "محمدی"، دہلی کے مدیر تھے۔

(31) مولوی محمد بشیر 1923 کو شائع شدہ ماہنامہ "المجاہد"، چمرکنڈ کے مدیر تھے۔

(32) مولانا عبدالماجد دریابادی 1924 کو شائع شدہ ہفت روزہ "سچ"، دریاباد کے مدیر تھے۔

(33) مولانا محمد عرفان 1924 کو شائع شدہ ہفت روزہ "الجمعیۃ، دہلی کے مدیر تھے۔

(34) مولانا ابوالقاسم 1925 کو شائع شدہ ہفت روزہ "رسالت"، کلکتہ کے مدیر تھے۔

(35) مولانا داؤد غزنوی 1927 کو شائع شدہ ہفت روزہ "توحید"، امرتسر کے مدیر تھے۔

(36) مولانا سید سلیمان ندوی 1932 کو شائع شدہ ہفت روزہ "دعوت"، دہلی کے مدیر تھے۔

(37) مولانا منظور احمد نعمانی 1932 کو شائع شدہ ماہنامہ "الفرقان" لکھنؤ کے مدیر تھے۔

(38) اہتمام دارالعلوم دیوبند کے زیر ادارت 1935 سے شائع ہونے والا ماہنامہ "دارالعلوم"، دیوبند کے سارے مدیرین علمائے کرام ہیں۔

(39) مولانا ابواللیث 1941 کو شائع شدہ سہ ماہی رسالہ "اصلاح"، سرائے میر (اعظم گڑھ) کے مدیر تھے۔

(40) مولانا شمس الہدیٰ 1944 کو شائع شدہ رسالہ ہفت روزہ "الجہاد"، مانسہرہ کے مدیر تھے۔[18]

## خطۂ پاکستان کے مشہور اردو صحافی علمائے کرام:

### (بیسویں صدی کے آغاز سے دور حاضر تک)

(1) مولوی ان شاء اللہ 1901 کو اور ایک قول کے مطابق 1902 کو شائع شدہ ہفت روزہ "وطن" لاہور کے مدیر تھے۔[19]

(2) حافظ نور احمد 1902 کو شائع شدہ ہفت روزہ "شمشیر قلم" لاہور کے مدیر تھے۔

(3) مولوی ممتاز علی 1902 کو شائع شدہ پندرہ روزہ "تالیف واشاعت"، لاہور کے مدیر تھے۔

(4) مولوی ممتاز علی موصوف "تہذیب نسواں"، لاہور نامی ایک ہفت روزہ زنانہ رسالے کی ادارت بھی کرتے تھے۔[20]

(5) اوپر نام ذکر کردہ مولوی ان شاء اللہ 1903 کو شائع شدہ ماہنامہ "تفسیر القرآن" لاہور

کے مدیر تھے۔

(6) مولوی سراج الدین احمد نے 1903 کے جون میں لاہور سے "زمیندار" نکالنا شروع کیا۔[21]

(7) اوپر ذکر کردہ مولانا اصغر علی روحی 1905 کو شائع شدہ ماہنامہ "الہدیٰ"، لاہور، کے مدیر تھے۔

(8) مولوی تاج الدین نقشبندی 1908 کو شائع شدہ ماہنامہ "المجدد"، لاہور کے مدیر تھے۔

(9) مولانا ظفر علی خان 1910 کو شائع شدہ ہفت روزہ "زمیندار" کرم آباد کے مدیر تھے۔

(10) مولوی شجاع اللہ 1910 کو شائع شدہ ماہنامہ "ملت"، لاہور کے مدیر تھے۔

(11) مولوی محمد سعید سبطین 1910 کو شائع شدہ ماہنامہ "برہان"، لاہور کے مدیر تھے۔

(12) مولانا ظفر علی خان 1910 کو شائع شدہ ہفت روزہ "زمیندار"، لاہور کے مدیر تھے۔

(13) حافظ محمد عالم 1918 کو شائع شدہ ماہنامہ "عالمگیر"، لاہور کے مدیر تھے۔

(14) مولوی نور احمد قادری 1925 کو شائع شدہ ہفت روزہ "بشریٰ"، ایمن آباد کے مدیر تھے۔

(15) مولانا محمد دوست 1926 کو شائع شدہ ماہنامہ "اسوۂ حسنہ"، لاہور کے مدیر تھے۔

(16) مولوی محمد فاضل 1926 کو شائع شدہ ماہنامہ "بلاغ القرآن"، لاہور کے مدیر تھے۔

(17) مولوی احمد بابا مخدومی 1926 کو شائع شدہ ہفت روزہ "حمایتِ اسلام"، لاہور کے مدیر تھے۔

(18) حافظ سید احمد 1927 کو شائع شدہ ماہنامہ "صبحِ شہادت"، لاہور کے مدیر تھے۔

(19) مولانا غلام رسول مہر اور مولانا عبدالمجید سالک 1927 کو شائع شدہ روزنامہ "انقلاب"، لاہور کے مدیر تھے۔[22]

(20) مولانا عبدالودود 1932 کو شائع شدہ ہفت روزہ "شوریٰ"، پشاور کے مدیر تھے۔

(21) مولوی عبدالرحمن 1934 کو شائع شدہ ماہنامہ "آستانہ"، لاہور کے مدیر تھے۔

(22) اوپر ذکر کردہ مولوی عبدالرحمن 1934 کو شائع شدہ ماہنامہ "تبلیغ اسلام"، لاہور کے مدیر تھے۔

(23) حافظ محمد عالم 1934 کو شائع شدہ ہفت روزہ "الاسلام"، لاہور کے مدیر تھے۔
(24) مولانا عبداللہ خاں 1934 کو شائع شدہ ہفت روزہ "کلمۃ الحق"، کوئٹہ کے مدیر تھے۔
(25) مولوی عبدالحنّان 1936 کو شائع شدہ ماہنامہ "ریاض توحید"، لاہور کے مدیر تھے۔
(26) مولانا عبدالکریم 1939 کو شائع شدہ ہفت روزہ "الاسلام"، کوئٹہ کے مدیر تھے۔
(27) حافظ سراج الدین 1940 کو شائع شدہ ماہنامہ "العزیز"، بہاولپور کے مدیر تھے۔
(28) مولانا محمد عبداللہ 1941 کو شائع شدہ ماہنامہ "الفاروق"، کوئٹہ کے مدیر تھے۔[23]

## خطۂ بنگلہ دیش کے مشہور اردو صحافی علمائے کرام:

### (بیسویں صدی کے آغاز سے دور حاضر تک)

بیسویں صدی سے پہلے حصۂ بنگلہ دیش کے صحافتی میدان میں علمائے کرام کا کردار اُتنا نمایاں نہیں۔ البتہ بیسویں صدی کے آغاز سے جبکہ تقسیم بنگال کے بعد ڈھاکہ کو نئے طور سے مشرقی بنگال کے پایۂ تخت کا درجہ دیا جانے لگا، میدانِ اردو صحافت میں علمائے کرام متحرک ہو اٹھے۔ ذیل میں اس علاقے کے مشہور علمائے کرام کے صحافتی کردار پر روشنی ڈالی جارہی ہے:

(1) شفاء الملک حکیم مولوی حبیب الرحمٰن صاحب نے حصۂ بنگلہ دیش کے صحافتی میدان میں سب سے اہم اور بڑا کارنامہ ادا کیا ہے۔ انھوں نے اپنی اولوالعزمی اور پختہ ارادے کو عملی جامہ پہنا کر انتھک سعی وکوشش سے اکتوبر 1906 میں ڈھاکہ کی سرزمین سے اس علاقہ کی تاریخ اردو صحافت کا سنگ میل "المشرق" کے نام سے نکالنا شروع کیا۔ اس کے ذریعہ حکیم مولوی حبیب الرحمٰن صاحب یہاں کے مسلمانوں میں مذہبی اور سیاسی بیداری کی لہر پیدا کرنا چاہتے تھے۔ حصۂ بنگلہ دیش سے اردو زبان میں شائع ہونے والا پہلا ماہنامہ رسالے یہی تھا۔ بعد میں یہ رسالہ ہفتہ وار شائع ہونے لگا۔ اس رسالہ کی تقطیع 8×7 ہے۔ اس رسالے کی تین چار کاپیاں ڈھاکہ یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری میں محفوظ ہیں۔

(2) مولوی نجم الدین نامی ایک عالم "المشرق" کے قلمی ادبا میں تھے۔

(3) سرزمینِ بنگلہ دیش کے صحافتی میدان میں حکیم صاحب موصوف دوسرا اہم کارنامہ ان کا ماہنامہ "جادو" ہے۔ یہ رسالہ صحیح قول کے مطابق 1923 کو جاری ہوا اور 1930 تک چلتا رہا۔ اس رسالے کی نوعیت ادبی، تعلیمی، علمی اور ثقافتی تھی۔

(4) "جادو" کے قلمی ادبا میں زیادہ تر مولوی ہی تھے یا مولوی گھرانے سے ہونے کی وجہ سے 'نیم مولوی' تھے، جن کے نام یہاں قابلِ ذکر ہیں اور وہ یہ ہیں:

(الف) مولوی مظفرالدین ندوی

(ب) مولوی عبدالوہاب

(ج) خالد بنگالی

(د) حافظ نذیر احمد اور

(ہ) خود حکیم مولوی حبیب الرحمٰن صاحب کا نام نامی (اس فہرست میں شامل ہے)۔

(5) سرزمینِ بنگلہ دیش کے صحافتی میدان کی ایک اور اہم شخصیت مولوی محمود الرب صدیقی المعروف بہ خالد بنگالی کی شخصیت ہے۔ خطۂ بنگلہ دیش کے ضلع میمن سنگھ کے قصبہ "بولائی" ہے، اسی قصبے سے تقسیم ہند سے پہلے خالد بنگالی نے یہاں کا تیسرا معیاری رسالہ "اختر" 1924 میں شائع کیا۔ اپنے والد ماجد مولانا عبدالحی اختر کی یاد میں انھوں نے یہ رسالہ نکالا۔ اس رسالے کا صرف ایک ہی شمارہ نکل سکا، بقول بعض تنقید نگار- "اس زمانے میں مشرقی بنگال کے کسی دور افتادہ مقام سے اردو کا رسالہ نکالنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔" یہ رسالہ چونسٹھ صفحات پر مشتمل ہے اور کتابی سائز کا ہے۔ اسی رسالے کے صفحہ نمبر 5 پر ان کے خیال کے مطابق "مسلمانوں کی مشترکہ زبان" اردو کے بارے میں وہ رقمطراز ہیں:

> ''اور یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ایشیا کی کوئی قوم مسلمانوں کے اس پندار کی حریف نہیں ہوسکتی کہ اردو اسلامی زبان ہے اور اس کے موجد مسلمان ہیں۔'' (مدیر خالد بنگالی، رسالہ اختر، مطبوعہ بولائی، میمن سنگھ، ص:5)۔

(6) مولوی قمر احمد عثمانی، یہ جمعیۃ علماء پاکستان کے صدر مولانا ظفر احمد عثمانی کے صاحبزادے تھے۔ اس زمانے میں یعنی 1947ء (بقولِ بعض 1948 کو) مشرقی پاکستان کے صدر مقام

ڈھاکہ سے نکلنے والا پہلا سہ روزہ "مشرقی پاکستان" اخبار کے یہ چیف ایڈیٹر تھے۔[24]

(7) جامعہ اہلیہ معین الاسلام ہاٹھزاری چاٹگام سے "سالانہ رپورٹ" کے نام سے ادارے کے مہتمم صاحب کی سرپرستی میں ایک سالانہ رسالہ پاکستانی دور تک تقریباً ہر سال نکلتا تھا، جو بنگلہ دیشی دور میں آکر بند ہوگیا ہے۔

(8) مولانا مفتی دین محمد خان صاحب نے 1384ھ مطابق 1964 کو اپنی نگرانی میں "روداد جامعہ قرآنیہ عربیہ" (لال باغ-ڈھاکہ) کے نام سے ایک وقتی رسالہ نکالا، جس کے سرورق پر یہ لکھا ہوا تھا- "چودہ سالہ روئے داد (پہلی سطر میں، پھر) جامعہ قرآنیہ عربیہ (دوسری سطر میں، پھر) لال باغ، ڈھاکہ- (تیسری سطر میں، اور آخری سطر میں لکھا ہوا تھا-) بابت 84-1370ھ مطابق" 64-1950۔ اس رسالے کا سائز 10"×71/2" تھا، صفحے 72 تھے۔

(9) مولوی ڈاکٹر محمد عبد اللہ مرحوم، یہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو و فارسی کے مایۂ ناز پروفیسر تھے اور ادب اردو کے بڑے ماہر تھے۔ "ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف پرشین اینڈ اردو- سالِ اول شمارہ: اول جنوری- دسمبر 2004" ایڈیٹوریل بورڈ کے رکن تھے۔[25]

## دورِ حاضر کی اردو صحافت اور علمائے کرام:

## (ہندوستان)

(1) ماہنامہ ''دار العلوم''، یہ رسالہ دار العلوم دیوبند کا ترجمان ہے۔ 1935 سے آج تک شائع ہوتا چلا آرہا ہے۔ قوم وملت کے برادران کو ضروری امور سے باخبر کرنا اس کی اہم خدمات میں سے ہے۔

(2) پندرہ روزہ ''تعمیر حیات''، لکھنؤ، یہ رسالہ دفتر نظامت، دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ سے گذشتہ نصف صدی کی طویل مدت سے لگاتار شائع ہوتا چلا آرہا ہے۔ اس کا 10/ 25 نومبر 2003 نمبر اس وقت میرے سامنے ہے۔ اس میں سرپرست کے طور پر حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ناظمِ ندوۃ العلما لکھنؤ کا نام درج ہے، نگرانِ خصوصی مولانا عبد اللہ

عباس ندوی اور مدیر عام مولانا شمس الحق ندوی ہیں۔ تینوں ہی عالم دین ہیں۔

(3) رسالہ ''الجمعیۃ'' دہلی، یہ رسالہ جمعیۃ علماء ہند کا ترجمان ہے اور آج تک مسلسل جاری ہے، اس کی قیادت میں علمائے کرام ہی ہیں۔

(4) ماہنامہ رسالہ ''معارف'' اعظم گڑھ، یہ مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ ہے، جولائی 1916 سے آج تک یہ رسالہ برابر جاری ہے، سید سلیمان ندوی سے لے کر آج تک تقریباً سارے کے سارے مدیرانِ معارف علمائے کرام ہیں۔[26]

## (پاکستان)

(1) ماہنامہ "الحسن"، لاہور۔ یہ جامعہ اشرفیہ لاہور کا ترجمان ہے۔ اس کے مدیران علمائے کرام ہیں۔

(2) ماہنامہ "البلاغ"، کراچی۔ یہ جامعہ دار العلوم کراچی کا ترجمان ہے، اس کے بانی مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ ہیں۔ فی الحال اس کے ناظم اعلیٰ اور پبلشر مفتی محمد تقی عثانی ہیں۔ یہ رسالہ تقسیم کے بعد جاری ہوا اور آج تک تقریباً ستر (70) سال سے چل رہا ہے۔

(3) ماہنامہ "الفاروق"، کراچی۔ ایک عام فہم، دلچسپ اور معیاری اسلامی صحافت کا نمونہ ہے۔ اس کے سرپرست مولانا سلیم اللہ خاں صاحب ہیں، مدیر مولانا عبید اللہ خالد ہیں، یہ جامعہ فاروقیہ کراچی سے شائع ہوتا ہے۔ میرے سامنے اس کے شمارہ نمبر 10 اکتوبر 2008 کی ایک کاپی ہے۔ اوپر کی معلومات اسی سے فراہم ہوئی ہے۔

(4) ماہنامہ "الابرار"، کراچی۔ اس کی اپریل 2012 والی کاپی ابھی میرے سامنے ہے۔ اس میں سرپرست کے طور پر حضرتِ اقدس مولانا شاہ حکیم محمد اخترؒ کا نام نامی درج ہے اور مدیر اعلیٰ مولانا حکیم محمد مظہر ہیں۔ دونوں ہی عالم ہیں۔

(5) ہفت روزہ ''خدام الدین'' لاہور، اس کے بانیین اور چلانے والوں میں حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ اور مولانا عبید اللہ انورؒ تھے، جو زمانے کے بہترین علمائے کرام کے

سرفہرست تھے۔ فی الحال ''خدام الدین'' کی جو کاپی میرے پاس موجود ہے، یہ اکتوبر 2008 کی کاپی ہے۔ اس کا شمارہ نمبر 49 ہے۔ اس میں رئیس الادارہ کے طور پر مولانا محمد اجمل قادری ہیں۔ رئیس التحریر مولانا ڈاکٹر محمد اکمل راشدی ہیں اور مدیر مولانا مجاہد الحسینی ہیں۔

## (بنگلہ دیش)

آج کل خطۂ بنگلہ دیش سے اردو رسالے اکا دُکا ہی نکلتے ہیں۔ جس کے مختلف وجوہ ہیں، جن کے بیان کا میرے خیال میں یہاں موقع نہیں ہے۔ البتہ اتنی بات عرض کی جاسکتی ہے کہ بنگلہ دیش کی اردو صحافت کو اگر آپ حضرات کی جانب سے مختلف جہتی بھرپور تعاون تعاون حاصل ہو تو بہت ترقی کرسکتی ہے، یعنی وہاں ماشاء اللہ اشخاص تو ہیں مگر دوسرے اسباب ومواد کی فراہمی کی کمی ہے۔ میں نے یہاں '' آپ حضرات کی جانب سے'' اس لیے عرض کیا کیونکہ ہم آپ لوگوں کے قرب وجوار سے ہیں اور نظامِ اخلاق میں قرب وجوار کا بھی ایک حق ہوتا ہے۔ بہر حال بنگلہ دیش میں اردو صحافت کے اس بحرانی دور میں علمائے کرام اپنی بساط کے مطابق کچھ نہ کچھ کام انجام دے رہے ہیں، ان میں ڈاکٹر مفتی محمد غلام ربانی صاحب کا نام یہاں خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ انہی کی کوشش بلیغ سے "ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو" کے شمارہ: چہارم 2011 نے اشاعت کا منھ دیکھا اور موصوف اس کے اگلے شمارے کے ایڈیٹوریل بورڈ کے رکن بھی ہیں۔

## اردو صحافت کی آئندہ ترقی وکامیابی کے لیے چند تجویزیں:

اردو صحافت کی آئندہ ترقی وکامیابی کے لیے جن باتوں کی طرف اسے اقدام کرنا ہے وہ وہی باتیں ہیں جن کی طرف تاریخ صحافت کی ابتدا سے لے کر آج تک کے سارے کامیاب صحافی اور اخبار نویسوں نے (خواہ وہ حضرات اردو صحافت سے ہوں یا دوسری کسی زبان کی صحافت کے ہوں) اقدام کیا ہے۔ چنانچہ ان کامیاب صحافیوں کی اپنائی ہوئی چند اہم باتیں درج ذیل ہیں:

(1) ہر ایک صحافی کو سب سے پہلے یہ خیال رکھنا چاہیے کہ انسانی زندگی نام ہے 'ہمہ گیر ایک ذمہ داری' کا جس کا ایک سرا جڑا ہوا ہے خالق سے اور دوسرا سرا مخلوق سے۔ ایک

صحافی ہی نہیں بلکہ ہر ایک انسان کو ایک طرف اپنے خالق کے ساتھ ان کی عبادت اور فرمانبرداری کے ذریعہ رابطہ استوار رکھنا اور دوسری طرف مخلوق کے ساتھ مقدور بھر ان کی ہمہ جہت خدمات کی انجام دہی اور فائدہ رسانی کا خیال رکھنا اس کی ذمہ داری ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسی اصولی بات ہے جو پوری زندگی کو محیط ہے اور جس سے صرف ایک انسان ہی نہیں بلکہ عالم حیوانات کا ایک ادنیٰ فرد چیونٹی کو بھی لازمی طور پر اس سے چین و امن حاصل ہوتا ہے۔ میں یہاں ایک مثال سے یہ بات واضح کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ وہ مثال یہ ہے- ہمارے ہندوستان ہی (ہردوئی، یوپی) کے ایک بہت بڑے بزرگ ابھی چند سال پہلے گزرے ہیں۔ ان کا واقعہ ہے کہ ایک روز وضو کرنے کے لیے ایک جگہ بیٹھے اور اٹھ گئے، پھر دوسری جگہ بیٹھے پھر اٹھ گئے، پھر تیسری جگہ بیٹھے پھر بھی وضو کیے بغیر اٹھ گئے۔ اس وقت کسی دیکھنے والے نے حضرت سے پوچھا کہ حضرت! وضو کرنے بیٹھ کر وضو کیے بغیر اس طرح بار بار تبدیلیٔ مکان کی کیا وجہ ہے؟ اس وقت انھوں نے جو جواب دیا وہی یہاں سوچنے کے قابل ہے۔ چنانچہ جواب میں انھوں نے کہا کہ میں پہلی جگہ بیٹھا تو دیکھا کہ چیونٹیاں ہیں تو دوسری جگہ بیٹھا تو وہاں بھی وہی چیونٹیاں تھیں پھر تیسری جگہ بیٹھا تو وہاں بھی چیونٹیوں کی قطار پہنچی تھی، اس لیے پھر مجھے جگہ تبدیل کرنا پڑا، دین اور اخلاق کی تعلیم ہے کہ ''کسی بھی مخلوق کو بلا وجہ کسی بھی قسم کی تکلیف دینا حرام ہے'' خواہ وہ چیونٹی ہی کیوں نہ ہو، چہ جائیکہ کسی بھی انسان کو کسی بھی قسم کی تکلیف پہنچانا۔ حاصل یہ کہ ایک صحافی کو ہر وقت بنی نوع انسان کے ہر فرد کے احترام کا خیال رکھنا چاہیے۔

(2) جرأت اور ہمت مردانہ، یعنی ہر ایک صحافی کو با جرأت اور با ہمت ہونا چاہیے۔ جیسا کہ اس میدان کے تین شہیدوں نے عملی طور پر کر کے دکھایا، زندگی گئی مگر جرأت و ہمت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ صحافت کے وہ تین بالترتیب زمانۂ شہادت یہ ہیں: (1) دہلی اردو اخبار" اور "مظہر الحق" دہلی کے مدیر مولوی محمد باقر علی نے 1857 کو جام شہادت نوش کیا۔ (2) ''الامان'' کے مدیر مولانا مظہر الدین کو شہادت کا رتبہ حاصل ہوا اور پھر (3) ہفت روزہ " تکبیر " کراچی کے مدیر جناب صلاح الدین کو اسلام اور مسلمانوں کے سچے وفادار

ہونے کی خاطر جامِ شہادت پینا پڑا۔ چنانچہ اسی طرح سے برصغیر کے مسلم صحافیوں نے اور پھر خصوصاً ان میں سے علمائے کرام نے اپنے تازہ خون کی بدولت یہاں کی مسلم صحافت کو تابندہ رکھا۔ آئندہ مسلم نسل کو بھی اپنے اسلاف کا طریق کار اختیار کرنا چاہیے اور اسی میں ان کی کامیابی مضمر ہے۔ جیسا کہ زمانہ اس پر شاہد ہے۔

(3) حق تلاشی اور حق گوئی۔

(4) قوم وملت کی خیر خواہی۔

(5) احترام انسانیت کا خیال رکھنا، اور اس کے لیے عریانیت اور فحاشی سے پرہیز کرنا لازمی ہے۔

میرے خیال میں اردو صحافت نگار حضرات اگر مذکورہ باتوں کا خیال رکھیں تو اردو صحافت اپنے صحافتی میدان میں ایک امتیازی مقام حاصل کرسکتی ہے۔

## ماخذ و منابع:

1۔ منشی عبدالرحمن خان، سیرتِ اشرف، ادارۂ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، پاکستان، حصۂ دوم، 1417ھ مطابق 1996، ص: 479۔

2۔ محمد افتخار کھوکھر، تاریخ صحافت، عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی، 2009، ص 11۔

3۔ روح ادب، مغربی بنگال اردو اکادمی کا سہ ماہی رسالہ، جنوری تا جون 1995 ص: 19 و 28۔

4۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، صحافت پاکستان و ہند میں، مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع اول، 1963، ص: 103 و 109۔

5۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، صحافت پاکستان و ہند میں، سابق ص 109۔

6۔ تاریخ صحافت، سابق ص: 35۔

7۔ صحافت پاکستان و ہند میں، سابق ص: 111۔

8۔ تاریخ صحافت، سابق ص: 36، 35۔

9۔ تاریخ صحافت، سابق ص: 41۔

10۔ تاریخ صحافت، سابق ص: 56۔

11۔ تاریخ صحافت، سابق ص: 46۔

12۔ تاریخ صحافت، سابق ص: 47۔

13۔ تاریخ صحافت، سابق ص: 228-221۔

14۔ تاریخ صحافت، سابق ص: 228-222۔

15۔ ڈاکٹر انور سدید، اردو ادب کی مختصر تاریخ، عزیز بکڈپو، لاہور، طبع پنجم 2006، ص: 298-300: تاریخ صحافت، سابق ص: 161

16۔ منشی عبدالرحمن خان، سیرتِ اشرف، ادارۂ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، پاکستان، حصۂ دوم، بلا تاریخ، ص: 337-339۔

17۔ محمد افتخار کھوکھر، تاریخ صحافت، سابق ص: 221-228

18۔ محمد افتخار کھوکھر، تاریخ صحافت، سابق ص: 147، 221-228

19۔ تاریخِ صحافت، سابق، ص:147، 221-228

20۔ تاریخِ صحافت، سابق، ص:70-72

21۔ سابق، ص: 147، 222-228

22۔ تاریخِ صحافت، سابق، ص:149

23۔ تاریخِ صحافت، سابق، ص:228-221

24۔ سید اقبال عظیم، مشرقی بنگال میں اردو، ڈھاکہ، ص:99؛ پروفیسر ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر، بنگلہ دیش میں اردو ادب، بنگلہ-اردو ساہتیہ فاؤنڈیشن، ڈھاکہ، اشاعت اول:2015 ص:68-60۔

25۔ ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف پرشین اینڈ اردو (مجلہ فارسی و اردو دانشگاہ داکا)، ناشر: ڈھاکہ یونیورسٹی، سالِ اول، شمارہ: اوّل، جنوری-دسمبر 2004، ص:1۔

26۔ ڈاکٹر انور سدید، اردو ادب کی مختصر تاریخ، عزیز بکڈپو، لاہور، طبع پنجم 2006، ص:407؛ محمد سہیل شفیق، اشاریہ معارف اعظم گڑھ (جولائی 1916 تا جون 2005)، قرطاس، کراچی یونیورسٹی کراچی، ص:5۔

# نواں باب

## ادبی صحافت

# ادبی صحافت کے مسائل

ابوالکلام قاسمی

اردو میں صحافت کی تاریخ جتنی قدیم ہے، ادبی صحافت اتنی قدیم تو نہیں لیکن وہ عام صحافت جس کی شناخت خبروں، سیاسی تبصروں اور فیچرز وغیرہ سے ہوا کرتی تھی، کچھ عرصے کے بعد اس میں ادبی اور تخلیقی تحریریں بھی شامل ہونے لگیں۔ ''جام جہاں نما'' سے لے کر ''دہلی اردو اخبار'' اور ''اودھ اخبار'' تک میں کبھی نظموں، غزلوں، نیم افسانوی تحریروں اور غیر افسانوی ادب کے بہت سے نمونوں کی اشاعت کا سلسلہ ابتدائی زمانے ہی سے شروع کیا تھا۔ مگر جب ہم آج ادبی صحافت کا ذکر تے ہیں تو اس سے ہماری مراد ان ادبی جرائد و رسائل سے ہوتی ہے جن میں سب سے پہلے ایک خاص قسم کے معیار کو برقرار رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اسی معیار کا لحاظ رکھتے ہوئے شعری اور افسانوی ادب کی اشاعت بھی عمل میں آتی ہے اور ایسی صحت مند تنقید بھی شائع ہوتی ہے جو ماضی کے ساتھ اپنے زمانے کے ادب کے تعین قدر میں معاون ثابت ہو سکے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تبصرہ اور تنقید کے گوشے میں وقتاً فوقتاً ایسی تحریریں بھی شائع ہوتی رہی ہیں جن کو کسی بھی طرح معروضی یا غیر جانبدارانہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ تاہم اس طرح کی تحریروں سے ادبی رسائل و

جرائد کا اعتبار مشتبہ ہوتا ہے اور صرف تحسین یا صرف تنقیص کو بھی سنجیدہ حلقوں میں پذیرائی نہیں ملتی۔

یوں تو تقسیم ہند سے قبل ادبی جرائد دہلی، لکھنؤ، عظیم آباد وغیرہ مقامات سے بھی شائع ہوا کرتے تھے مگر ادبی سرگرمیوں کا سب سے بڑا محور لاہور کی مرکزیت کی وجہ سے پنجاب بن گیا تھا۔ نقوش، نیرنگ خیال، سات رنگ، ادب لطیف اور سویرا جیسے متعدد معیاری جرائد لاہور سے نہ صرف یہ کہ شائع ہوتے رہے بلکہ بہت سی ادبی بحثوں کا سلسلہ بھی عرصے تک قائم رکھا کرتے تھے۔ لاہور کی یہ مرکزیت پنجاب کے محکمۂ تعلیمات کی سرگرمیوں، انجمن پنجاب اور اس کے بہت بعد حلقۂ ارباب ذوق کی سرگرمیوں کی رہینِ منت تو تھی ہی، اس کے ساتھ ہی ان کا تعلق پنجابیوں کے اس مزاج سے بھی تھا جو نئے ادبی رجحانات و میلانات کو خوش آمدید کہنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ لاہور کے علاوہ دہلی سے شائع ہونے والے ادبی جرائد کو بھی ادبی سرگرمیوں کا اظہار بننے کے وسیلے کا شرف اسی لیے بھی حاصل تھا کہ اَن گنت اہلِ قلم دہلی کی مرکزیت، مواقع روزگار کے امکانات اور ریڈیو یا نشر و اشاعت کے دوسرے مواقع کے سبب روایتی طور پر بھی اپنا ملجا و ماوا تصور کرتے تھے۔

تقسیم ہند کے بعد یہ منظرنامہ بڑی حد تک تبدیل ہوگیا۔ ادبی اعتبار سے دہلی کی مرکزیت ہندوستان کا دارالحکومت ہونے کے باوجود ختم سی ہوگئی۔ تقسیم کا سماجی اور تہذیبی اثر کم و بیش برصغیر کے ہر شہر پر پڑا ہوگا مگر جو ابتری ادبی اور تہذیبی اعتبار سے دہلی پر مسلط ہوئی، ہندوستان کی پوری تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ تقسیم کے بعد دہلی کی تہذیب و ثقافت جس انتشار سے گزری اس کا سلسلہ روز بروز دراز ہوتا رہا ہے۔ جہاں تک سوال علمی اور ادبی نقطۂ نظر کا ہے تو چونکہ علم و ادب کا بہت گہرا رشتہ زبان و بیان سے ہوتا ہے اور تقسیم ہند نے اردو بولنے، اردو میں ادب تخلیق کرنے اور ادب و تہذیب کے نام پر مالی خدمات پیش کرنے والے بیشتر حضرات کو اپنی جڑوں سے اُکھاڑ پھینکا اور پھر انھیں دیارِ غیر میں جا کر بھی بے بنیاد ہونے کے احساس سے دوچار کرتا رہا۔ اس طبقے کی غیر موجودگی نے نہ صرف دہلی بلکہ اردو کے سب سے بڑے علاقے اتر پردیش کو کم از کم اردو کے معاملے میں بے یار و مددگار بنا کر رکھ دیا۔

جہاں تک سوال ہندوستان میں ادبی صحافت کی صورتِ حال کا ہے تو 1970 تک ادبی جرائد کی سرگرمیاں یہاں خاصی ماندی رہیں۔ اگر ادبی میلانات کو فروغ دینے والے جرائد کی بات کی جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ ترقی پسندی کو فروغ دینے میں جن ادبی رسالوں نے اہم کردار ادا کیا ان میں سے زیادہ تر لاہور سے نکلتے تھے، البتہ یہ ضرور ہوا کہ 1970 کے قدرے ماقبل اور پھر بعد کے زمانے میں جدیدیت کے میلان کو زیادہ فروغ ہندوستان میں ملا۔ رسالہ شب خون، سوغات، شاعر، کتاب، شعر و حکمت اور بعض دوسرے جرائد نے نئے ادبی مباحث میں تقسیم سے پہلے والی کیفیت پیدا کردی۔ کم و بیش اسی زمانے میں ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں کا اچھا خاصا مجمع بمبئی میں رہا۔ وہاں سے بعض جرائد بھی نکلے مگر ان کی زیادہ وابستگی فلموں سے رہی، کہ شاید اس وقت تک ادبی جوش و خروش مدھم پڑ چکا تھا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ادبی جرائد کے توسط سے سامنے آنے والے رجحانات کی صحیح نمائندگی کتابوں کے بجائے ادبی صحافت کے ذریعہ ہوتی تو ضرور ہے مگر جرائد کی اشاعت کو کیوں کر یقینی بنایا جاسکتا ہے؟ شاید اس معاملے میں دو رائے نہ ہو کہ ادبی صحافت ہی اصل ادبی مباحث کو زندہ رکھ پاتی ہے ورنہ کتابوں کی اشاعت اس سلسلے میں کوئی موثر کردار ادا نہیں کر پاتی۔ اس کے اسباب گوناگوں ہیں۔ سب سے بڑا سبب تو یہ ہے کہ زندہ اور متحرک ادب یا ادبی رجحانات، ادبی جرائد کے وسیلے سے ہی زیر بحث بھی رہتے ہیں اور ان کا سلسلہ دراز بھی ہوتا رہتا ہے۔ کتابوں میں زیادہ تر وہ تحریریں شائع ہوتی ہیں جن کو یا تو تسلیم شدہ ادبی مسائل کی حیثیت حاصل ہوتی ہے یا جس ادب میں روایت بننے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ ادبی رسائل میں ایک تو اداریے کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوتی ہے اور دوسرے یہ کہ نئی شائع ہونے والی کتابوں یا دوسری تحریروں پر تبصرے شائع ہوتے رہتے ہیں جو ایک طرح سے ادبی رجحان سازی کا فریضہ انجام دیتے ہیں، مگر اس کے لیے یہ بات بھی ضروری ہے کہ ادبی جرائد کی بنیادیں مستحکم ہوں اور کم از کم دو چار دس برسوں تک ان کے جاری رہنے کا امکان موجود ہو۔ ماضی قریب میں متعدد ایسے ادبی جرائد شائع ہوئے جن کو جرائد سے زیادہ کتابی سلسلے کا نام دیا گیا۔ ایسے جرائد میں نمائندہ ادب بھی شائع کیا جاسکتا ہے، رجحان ساز مضامین کی اشاعت بھی ہوتی ہے اور کبھی کبھی ادب سے متعلق بحث و تمحیص سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ تاہم اگر تواتر بلکہ بہت کم وقفوں

کے تواتر کے ساتھ ادبی جرائد شائع ہوتے رہیں تو ان میں چھیڑی جانے والی بحثوں پر رد عمل بلکہ خطوط تک کے کالم میں ادبی رد و قبول کی صورتِ حال بھی سامنے آتی رہتی ہے۔ نمونے کے طور پر اس ضمن میں ہندو پاک کے بعض ادبی جرائد کی کارکردگی اور ادبی تحریک کو مہمیز کرنے یا نہ کر پانے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ پاکستان سے نقوش، نیرنگ خیال، اوراق اور ہندوستان میں شعور، سطور، اظہار، استعارہ، مفاہیم، عصری ادب، شناخت یا اقدار کے بعض شماروں میں حد درجہ نمائندہ نثری اور شعری تخلیقات شائع ہوئیں مگر ان میں سے بہت کم تحریروں کو ادبی بحث کے آگے بڑھانے کا موقع مل سکا۔ جہاں تک تنقیدی تحریروں کا سوال ہے تو ان پر اگر رد و قبول کا تاثر سامنے نہیں آتا تو بسا اوقات بہت سی اہم بحثیں نہ تو اپنے منطقی انجام تک پہنچ پاتی ہیں اور نہ ان کی معنویت کی صحیح نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ متذکرہ ضخیم جرائد اور لمبے لمبے وقفوں سے ان کی اشاعت کی اگر فہرست سازی کی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان کے صفحات میں ہزاروں تشنۂ جواب سوالات اور تحریکات گویا کہ دفن ہو کر رہ گئیں۔ ان جرائد کے برخلاف شب خون، عصری آگہی، کتاب، ساقی، شاعر، نقد و نظر، الفاظ، مورچہ وغیرہ نے نہ صرف یہ کہ نئے ادب کی بھرپور رجحان سازی ہی کی بلکہ ادبی صحافت کی مثبت اقدار کو آگے بڑھانے میں اہم کردار بھی ادا کیا۔

متذکرہ معروضات کا تعلق ان ادبی رسائل و جرائد سے تھا جو ماضی قریب میں برصغیر کی ادبی صحافت کو رنگ روپ دینے میں اہم رول ادا کرتے رہے، مگر یہ دیکھے اور پرکھے بغیر، بات پوری نہیں ہو سکتی کہ آج ادبی صحافت کی صورتِ حال کیا ہے؟ پاکستان سے شائع ہونے والے رسائل ہندوستان میں اب کس قدر کمیاب ہیں کہ ان کا ذکر ہمیں کسی نتیجے تک نہیں پہنچا پائے گا۔ مگر ہندوستان میں جس ادبی صحافت سے ہمارا واسطہ ہے اس کی نمائندگی کرنے والے رسائل و جرائد کی اگر فہرست سازی سے احتراز کرتے ہوئے بھی بات کی جائے تو بلا تکلف یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ادبی رسائل میں جو متحرک بلکہ محرک کارنامہ اداریوں کے ذریعہ انجام دیا جا سکتا ہے، آج کے رسالوں میں تقریباً اس کا فقدان ہے۔ مدیر حضرات عموماً کچی پکی ادبی تحریروں کا انتخاب کرتے ہیں اور اس کی اچھی یا بری پیش کش کو ہی ادبی صحافت کا متبادل بنا کر پیش کر دیتے ہیں۔ بہت کم مدیر ایسے ہیں جو شاعری، افسانے یا تنقید پر اپنی کوئی واضح رائے رکھتے ہوں اور جہاں تک

شعری اور نثری تحریروں کے اندر سے جنم لینے والے ادبی رجحانات اور میلانات کی بات ہے تو ان کی شناخت دیکھنے تک کو نہیں ملتی۔ پھر یہ بھی ہے کہ عام طور پر اب ادبی صحافت کو زندہ رکھنے کی ذمہ داری ادبی اداروں سے مربوط ہوگئی ہے۔ جس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہے کہ آج کی ادبی صحافت پوری طرح بے چہرہ ہو کر رہ گئی ہے، جس کے اندر سے جھانکتے ہوئے ادبی رجحان یا تحریک کی پہچان ممکن ہی نہیں رہ گئی۔ حالانکہ مختلف شہروں سے کم وقفے سے شائع ہونے والے ادبی رسائل بھی شائع ہورہے ہیں مگر ان کے اندر اداریے اور تبصرے محض رسمی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اداریے میں کسی ادبی نقطۂ نظر کو شامل کیے بغیر بھی ادبی رجحان سازی کی مثالیں اردو میں کم نہیں ملتیں۔ ''شب خون'' میں اداریہ کبھی شائع نہیں ہوا مگر نثر و نظم کے انتخاب اور مضامین میں موجود موقف نے دیکھتے ہی دیکھتے گذشتہ برسوں میں جدیدیت کو ایک طاقتور اور موثر رجحان بنا کر ہی دم لیا۔

اس پورے پس منظر میں اردو کی ادبی صحافت کی عام صورت حال کو سائنٹفک اور منطقی بنیادوں پر نئے سرے سے تشکیل دینے، زبان و ادب کے بڑے اداروں کو ادبی صحافت کے خد و خال درست کرنے، ادبی جرائد کو موثر بنانے اور زندہ متحرک ادبی اظہار کا رسائل کو پوری طرح وسیلہ بنانے پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ بصورت دیگر ہم جس تنظیمی اور فکری انتشار سے ماضی قریب میں دو چار رہے ہیں اس کا سلسلہ آگے بھی مزید دراز ہوتا رہے گا اور ہم محض رسمی طور پر اس موضوع پر لا حاصل گفتگو کرنے میں مصروف رہیں گے۔

# اردو کی ادبی صحافت کا تدریجی ارتقا

عزیز نبیل

اردو صحافت کی مجموعی تاریخ تقریباً دو صدیوں پر محیط ہے۔ ان دو صدیوں میں ہندوستان میں کئی ایک علاقائی زبانوں کی صحافت نے بھی اپنے پیر پھیلائے اور اپنے اپنے طور پر اپنی زبان اور اپنے علاقے کی ثقافت کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا، تاہم اردو صحافت نے اپنے مطلوب و مقصود کی سمت ارتقا کی جو منازل طے کیں، وہ اسے اوروں میں انفرادیت عطا کرنے کے لیے کافی ہیں۔

اردو زبان، صحافت کی کسی بھی عملی شکل سے قبل جس صورت میں ہندوستان میں رائج تھی اور جن دیگر لسانی اصناف کے ذریعے اپنی نشر و اشاعت میں کوشاں تھی اس نے اردو کو عوام الناس سے اس درجہ ہم آہنگ نہیں کیا تھا جس سطح پر اردو صحافت کے عمل دخل کے بعد یہ عوام الناس میں مقبول ہوئی۔ صحافت سے قبل اردو میں تذکرہ نگاری واحد ایک ایسی نثری صنف تھی جس سے واقعات اور خیالات کے ارسال و ترسیل کا کام لیا جا رہا تھا، جو اپنے حقیقی معنی میں کسی بھی طرح معاشرے اور افراد کے مجموعی حالات و واقعات کی ترسیل میں کارآمد ثابت ہوتی نظر نہیں آتی۔ تذکرہ نگاری سے زبان و ادب کا ارتقا تو ہوتا نظر آتا ہے لیکن اس صنف کی یک رُخی کے

باعث اس کا موازنہ کسی بھی طرح صحافت سے نہیں کیا جاسکتا۔

اردو میں صحافت، بطورِ خاص ادبی صحافت کے عمل دخل نے نہ صرف یہ کہ اس زبان کو شش جہتی ارتقا بخشی بلکہ ہند اسلامی یا ہند آریائی ثقافت کو ایک نئے اسلوب میں ظاہر کرنے کی بنا ڈالی۔ ادبی صحافت کو اگر وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو یہ ادبی تاریخ نویسی کا ایک بہت اہم اور جامع عمل ہے۔ رسائل و جرائد صرف کسی متعین دورانیہ میں تخلیق کار کی جانب سے قاری کے لیے ادب کی ترسیل کا ذریعہ نہیں ہوتے بلکہ یہ اپنے عہد کے ادبی رجحانات و میلانات اور ادبی مزاج کے عکاس ہوتے ہیں اور مختلف نظریات و خیالات تک رسائی اور تبادلے کا اہم سلسلہ بنتے ہیں۔ مختلف عہد کی ادبی صحافت سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح اردو کے ادبی مزاج میں بتدریج تبدیلی کا عمل واقع ہوا، رسائل و جرائد نے اپنے پیراہن کس طرح آہستہ آہستہ تبدیل کیے اور کس طور اردو ادب کے مختلف ادوار میں متنوع ادبی مزاج اور نظریات تشکیل پائے۔ ادبی صحافت دراصل اپنے عہد کے قلم کاروں کا شناخت نامہ اور مستقبل کے محقق کے لیے ایک مستند ذریعۂ تحقیق ہوتی ہے، جس کی ہمہ گیر قوت کا اندازہ ہم ماضی کے ادبی رسائل و جرائد کے مطالعے سے بخوبی کر سکتے ہیں۔

29 جنوری 1780 کو ''ہیکیز بنگال گزٹ'' نامی ہفت روزہ اخبار کی اشاعت کے ساتھ ہی سرزمین ہند میں صحافت کی ابتدا ہوتی ہے۔ تیس سال تک مختلف انگریزی اخباروں کا خوب دبدبہ رہا اور پھر کلکتہ سے ہی 1810 میں مولوی اکرم علی نے اردو زبان میں پہلا اخبار ''اردو اخبار'' کے نام سے جاری کیا۔ حالانکہ اگر بیشتر محققین کی رائے کو مدِ نظر رکھا جائے تو پہلا اردو اخبار ''جام جہاں نما'' ہے، جس کا اجرا ہری دت اور سدا سکھ لعل نے 1822 میں کلکتہ سے کیا۔ ایک اور روایت ہے کہ اردو کا پہلا اخبار ٹیپو سلطان نے میسور سے 1794 کو جاری کرایا جس کا نام فوجی اخبار تھا، جس کی تمام فائلوں کو انگریزوں نے سری رنگاپٹنم فتح کرنے کے بعد نذرِ آتش کر دیا تھا۔ الغرض اردو کے پہلے اخبار کے تعلق سے محققین مزید کئی اخباروں کے نام بھی لیتے ہیں، یہ ایک علاحدہ بحث طلب موضوع ہے۔ پھر یوں ہوا کہ اردو اخبارات کی کامیابی کے بعد بہت جلد ہندوستان کے طول و عرض سے مختلف زبانوں میں دھڑا دھڑ اخبارات نکلنے شروع ہو گئے۔

اردو اخبارات کی اشاعت کے بعد 1850 آتے آتے محبِ ہند، خیر خواہِ ہند، فوائد الناظرین اور قران السعدین جیسے بہت سے رسائل و جرائد شائع ہونے لگے جن میں تاریخی، ادبی، سائنسی، سماجی اور مختلف علمی موضوعات پر خصوصی توجہ دی جاتی۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی نے ''محبِ ہند'' دہلی کو اپنے ایک مضمون ''اردو کا اولین رسالہ'' میں اردو زبان کا اولین ادبی جریدہ قرار دیا ہے۔ ماسٹر رام چندر کی ادارت میں ''محبِ ہند'' کا پہلا شمارہ جون 1847 میں منظرِ عام پر آیا۔ اس رسالے میں باقاعدہ بہادر شاہ ظفر، مومن، مجنوں اور شاہ نصیر وغیرہ کا کلام اہتمام سے شائع کیا جاتا، یوسف خاں کمبل پوش کا سفر نامہ کئی اقساط میں چھپتا رہا۔

انیسویں صدی نے اپنے اختتام سے پہلے بے شمار اردو رسائل و جرائد کا چلن دیکھا جن میں اسبابِ بغاوتِ ہند، تہذیب الاخلاق، دبدبۂ آصفی، معارف علی گڑھ، افسر، مخزن، الفوائد، جلوۂ سخن، حسن اور معلّم نسواں جیسے بہت اہم تھے۔ سرسید کے ''تہذیب الاخلاق'' نے تو خیر اردو رسائل و جرائد کی تاریخ میں اپنے معیار اور مقبولیت کے اعتبار سے ایک انقلاب برپا کر دیا تھا اور پھر بیسویں صدی کا سورج اپنے ہمراہ اردو کی ادبی صحافت کا ایک ایسا روشن اور تابناک دور طلوع ہوا کہ جس کی روشنی سے آج تک اردو شعر و ادب کا مطلع منور ہے۔

اردو کے ادبی رسائل کے سر کا تاج اور قافلہ سالار اگر کوئی رسالہ کہلانے کا حقدار ہے تو وہ شیخ عبدالقادر کا رسالہ ''مخزن'' ہے جس کا اجرا اپریل 1901 میں لاہور سے کیا گیا۔ مخزن کی زندگی کئی ادوار پر مشتمل ہے۔ شیخ عبدالقادر 1904 میں لندن گئے تو مخزن کی ادارت اپنے معاون شیخ محمد اکرام کے سپرد کر گئے۔ 1907 میں شیخ عبدالقادر وطن واپس ہوئے اور اپنے ساتھ مخزن کو دہلی منتقل کر لیا۔ 1909 میں شیخ عبدالقادر لاہور واپس آ گئے لیکن مخزن شیخ محمد اکرام کی ادارت میں دہلی سے ہی نکلتا رہا۔ لیکن اسی سال شیخ محمد اکرام کی لندن روانگی کے بعد مخزن پھر لاہور آ گیا جسے 1910 میں مولانا غلام رسول نے خرید لیا مگر سرورق پر اعزازی مدیر کی حیثیت سے شیخ عبدالقادر کا نام ہمیشہ چھپتا رہا۔

1917 میں مولوی غلام رسول کی وفات کے بعد تاجور نجیب آبادی رسالہ مخزن نکالتے رہے۔ مخزن کے آخری دور میں جو 1927 سے شروع ہوتا ہے حفیظ جالندھری اور ہری چند اختر نے

مخزن کی ادارت کی ذمہ داریاں بحسن وخوبی انجام دیں۔ تقسیم ہند کے بعد ایک بار پھر مخزن کی اشاعت مولانا حامد علی خاں کی ادارت میں شروع ہوئی جس کے مدیر اعزازی شیخ عبدالقادر تھے، لیکن بہت مختصر عرصے کے بعد مخزن کا یہ نیا دور بھی اختتام کو پہنچا۔ مخزن وہ تاریخ ساز رسالہ ہے جس کے ذکر کے بغیر ادبی صحافت کی تاریخ نامکمل سمجھی جاتی ہے۔

مخزن کے کچھ خصوصی شمارے یہ تھے:

| | |
|---|---|
| دربار نمبر — | دسمبر 1902 |
| دوسرا دربار نمبر — | جنوری 1903 |
| سالگرہ نمبر — | مارچ 1928 |
| سالگرہ نمبر — | مارچ 1929 |
| سالگرہ نمبر — | مارچ 1930 |

مشہور زمانہ رسالہ ''زمانہ'' کا اجرا فروری 1903 میں بریلی سے کیا گیا جس کے پہلے ایڈیٹر منشی شیو برت لال تھے، نومبر 1903 سے زمانہ کی باگ ڈور اور ادارت کی ذمہ داریاں دیا نرائن نگم ولد منشی شیو نرائن نگم نے سنبھالی۔ جنوری 1904 سے زمانہ کانپور منتقل ہوا اور مستقل طور پر یہیں سے نکلتا رہا۔

دیا نرائن نگم نے زمانہ کے ذریعے بہت سے نئے لکھنے والے شعرا و ادبا کو متعارف کرایا۔ مخزن کی طرح زمانہ کو بھی یہ امتیاز حاصل ہے کہ بیسویں صدی کی پہلی تین دہائیوں میں عظیم تخلیق کاروں کی تخلیقات کو ملک کے طول وعرض میں ترسیل کا کام انجام دیا۔ اقبال، چکبست، درگا سہائے سرور، اکبر، تلوک چند محروم، جوش، فراق، غلام بھیک نیرنگ وغیرہ رسالہ زمانہ کے مستقل قلم کاروں میں شامل تھے۔

1908 میں مصوّرِ غم علامہ راشد الخیری نے خواتین کا علمی وادبی رسالہ ''عصمت'' دہلی سے جاری کیا۔ علامہ راشد الخیری اس جریدے میں خواتین کے قلمی ناموں سے مضامین لکھتے رہے تاکہ عورتوں میں تعلیم کا شوق پروان چڑھ سکے۔ عصمت کے ابتدائی دور میں شیخ محمد اکرام بھی اس کی ادارت سے وابستہ رہے۔ 1924 میں ادارت کی ذمہ داری مولانا رازق الخیری کے سپرد کی

گئی۔ مولانا رازق الخیری نے بہت محنت اور دلجمعی کے ساتھ ادارت کی ذمہ داریاں سنبھالیں اور عصمت کے معیار اور وقار میں اضافہ کیا۔

تقسیم ہند کے بعد یہ رسالہ مولانا رازق الخیری کے ہمراہ کراچی منتقل ہو گیا اور اپنی اشاعتِ مسلسل کے سبب نسائی رسائل میں اہم مقام حاصل کیا۔ مولانا کی اہلیہ معروف ادیبہ آمنہ نازلی بھی ایک عرصے تک عصمت کی ادارت سے وابستہ رہیں۔ 1979 میں مولانا کی وفات کے بعد صائمہ خیری نے ادارت کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ اسّی سال کی قابلِ فخر اشاعت کے بعد یعنی 1988 کے بعد اس کی اشاعت کا سراغ نہیں ملتا۔

رسالہ ''عصمت'' کے چند خصوصی شمارے:

| | |
|---|---|
| رسول نمبر— | جنوری رفروری 1917 |
| جوبلی نمبر— | جون 1928 |
| سالگرہ نمبر— | جولائی راگست 1933 |
| 50 سالہ جوبلی نمبر— | جولائی راگست 1958 |
| الماسی جوبلی نمبر— | جولائی راگست 1968 |
| رازق الخیری نمبر— | ستمبر 1981 |
| بیگم شائستہ اکرام اللہ نمبر— | اگست 1986 |
| سالگرہ نمبر— | اکتوبر 1992 |

ماہنامہ ''الناظر'' کا شمار اردو کے قدیم اور اہم رسائل میں ہوتا ہے۔ 1909 میں الناظر کا اجرا لکھنؤ میں عمل میں آیا۔ ابتدا میں اس کے مدیران ظفر الملک علوی اور وصی الحسن علوی تھے۔ بعد میں ظفر الملک علوی ہی الناظر کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ رسالہ الناظر کے مالک منشی سخاوت علی صاحب علوی تھے۔

''الناظر'' میں شائع ہونے والے مضامین کثیر الجہت تھے۔ چنانچہ ادبی، تاریخی، تمدنی، اخلاقی اور معاشرتی ہر طرح کے مضامین اس میں شائع ہوتے لیکن ادبی مضامین کو فوقیت حاصل تھی۔ ابتدا سے ہی الناظر کو اپنے عہد کے مایہ ناز قلم کاروں کا تعاون حاصل رہا جن میں مولوی

عبدالحق، نظام الدین شاہ دلگیر، رضا علی وحشت، سلطان حیدر جوش، افسر میرٹھی، حسرت موہانی، آرزو لکھنوی اور سید علی حیدر طباطبائی کے نام شامل ہیں۔

''الناظر'' نے اپنے ابتدائی شماروں سے ہی انگریزی اور دوسری ملکی اور غیر ملکی زبانوں کے افسانوں کے تراجم کی اشاعت کا خصوصی اہتمام جاری رکھا۔ رسالہ الناظر کے آخری رسالے کا سراغ نومبر 1937 کے بعد نہیں ملتا ہے۔

1920 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ادبی و علمی ترجمان ماہنامہ ''علیگڈھ میگزین'' کا اجرا ہوا، جس کے پہلے مدیر کی حیثیت سے رشید احمد صدیقی نے ادارت کی ذمہ داری سنبھالی۔ علیگڈھ میگزین دراصل علیگڈھ منتھلی کا بدلا ہوا نام تھا جس کا اجرا جنوری 1903 میں ہوا تھا اور مدیر تھے خوشی محمد ناظر صاحب۔ رشید احمد صدیقی کے بعد علیگڈھ میگزین کے ایڈیٹر یونیورسٹی کے طلبا ہوتے رہے اور اساتذہ میں سے کوئی ایک اس کے نگراں مقرر ہوتے رہے اور یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔

بنیادی طور پر طلبا کا رسالہ ہونے کے باوجود علیگڈھ میگزین معیار میں ہمعصر رسالوں سے کسی طرح کم نہیں رہا۔ اسے ہمیشہ مقتدر اہلِ قلم کا تعاون حاصل رہا اور اردو ادب کے مختلف اصناف کے بہترین لکھنے والے اس میں حصہ لیتے رہے۔ ان میں مولوی ذکاءاللہ، اکبرالٰہ آبادی، وحید الدین سلیم، اسلم جیراجپوری، اقبال سہیل، ذاکر حسین، یلدرم، مولوی عبدالحق، جگر، جوش، فانی، نیاز، آل احمد سرور، جاں نثار اختر، جذبی، مسعود حسین خاں، خلیل الرحمٰن اعظمی، اسلوب احمد انصاری جیسے بے شمار اہل قلم کے نام شامل ہیں۔

علیگڈھ میگزین نے بڑے اہم اور خصوصی شمارے بھی شائع کیے ہیں جن میں:

| | |
|---|---|
| اقبال نمبر۔ | 1938 |
| علی گڑھ نمبر۔ | 1939 |
| احسن مارہروی نمبر۔ | 1941 |
| غالب نمبر۔ | 1943 |
| اکبرالٰہ آبادی نمبر۔ | 1950 |
| طنز و ظرافت نمبر۔ | 1953 |

علی گڑھ نمبر — 1953-55

مجاز نمبر -- 1945-55 وغیرہ بہت اہم ہیں۔

جنوری 1922 میں میاں بشیر احمد نے اپنے والد جسٹس شاہ دین ہمایوں کی یاد میں ماہنامہ ''ہمایوں'' لاہور سے جاری کیا۔ ہمایوں علمی، ادبی اور ثقافتی جریدہ تھا جس کا برصغیر ہند و پاک کے بلند پایہ اور معیاری جریدوں میں شمار ہوتا تھا۔ یہ پرچہ 1957 تک باقاعدگی سے جاری رہا۔ 1958 میں اس کا سالنامہ چھپا اور پھر اس کے بعد یہ رسالہ بند کر دیا گیا۔

''ہمایوں'' کے ادارتی معاونین میں اردو ادب کے بہت سارے اہم نام شامل رہے جن میں تاجور نجیب آبادی، حامد علی خاں، یوسف ظفر، مظہر انصاری اور ناصر کاظمی بہت اہم ہیں۔

فروری 1922 میں علامہ نیاز فتحپوری نے بھوپال سے ''نگار'' کا اجرا کیا۔ نگار محض ایک رسالہ نہیں بلکہ ایک تحریک اور ایک دبستان کی حیثیت رکھتا تھا۔ معاصر شعر و ادب پر نگار نے بہت گہرے اثرات مرتب کیے اور شعر و ادب کو ایک نئی جہت عطا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

بھوپال سے بہت جلد ''نگار'' کو لکھنؤ منتقل کر دیا گیا جہاں 1957 تک یہ بڑی آب و تاب کے ساتھ نکلتا رہا۔ نیاز فتحپوری نے پاکستان ہجرت کی اور نومبر 1962 سے یہی رسالہ نگار پاکستان کے نام سے پاکستانی سرزمین سے شائع ہونا شروع ہوا۔ نگار کے شماروں میں ایک بہت اہم سلسلۂ 'مالہ و ماعلیہ' کا تھا جس میں اُٹھائے جانے والے مباحث کافی ہنگامہ خیز ہوتے تھے۔ نگار کو صفِ اوّل کا ادبی رسالہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں لکھنے والوں کا اعلیٰ علمی و ادبی معیار رہا اور ہر جریدہ ان تحریروں کا اشاعتِ مکرر کا خواہاں رہا۔

یوں تو ''نگار'' پاکستان کی ابتدا سے ہی فرمان فتحپوری اس کی ادارت سے وابستہ رہے لیکن 1966 میں نیاز فتحپوری کی وفات کے بعد فرمان فتحپوری کی ادارت کا دور شروع ہوتا ہے جو تا حال جاری ہے۔ فرمان فتح پوری نے نگار کو سابقہ معیار پر جاری رکھنے کی پوری کوشش کی ہوئی ہے۔ یوں تو نگار نے بے شمار اہم اور خصوصی نمبر شائع کیے ان میں سے کچھ یہ ہیں:

ملاحظات نمبر — جنوری 1926

مومن نمبر — جنوری 1928

| | |
|---|---|
| بہادر شاہ ظفر نمبر— | جنوری |
| غالب کی شوخیاں نمبر— | جنوری1932 |
| اسلامی ہند نمبر— | جنوری1938 |
| نظیر نمبر— | جنوری1940 |
| معاصر غزل گو نمبر— | جنوری1941 |
| معاصر غزل گویوں پر تنقید نمبر— | جنوری1942 |
| جدید شاعری نمبر— | جنوری1944 |
| مآخذ القرآن نمبر— | جنوری1945 |
| تنقید نمبر — | جنوری رفروری1950 |
| حسرت نمبر— | جنوری رفروری1952 |
| اصناف سخن نمبر— | جنوری1957 |
| نظیر نمبر— | مئی1962 |
| سرسید نمبر حصہ اول— | نومبر ردسمبر 1970 |
| سرسید نمبر حصہ دوم— | جنوری رفروری1971 |
| جشن طلائی نمبر ''نیاز و نگار نمبر''— | جنوری رفروری1982 |
| فن تاریخ گوئی نمبر— | نومبر ردسمبر 1982 |
| ہندی شاعری نمبر— | فروری رمارچ1984 |
| کتابیات تحقیق نمبر— | ستمبر 1991 |
| مولوی عبدالحق نمبر— | اگست1992 |
| عورت اور فنون لطیفہ نمبر— | دسمبر1992 |
| مشکلات غالب از نیاز فتحپوری— | اکتوبر1993 |

جولائی 1924 میں حکیم محمد یوسف حسن نے ماہنامہ ''نیرنگِ خیال'' کا اجرا لاہور سے کیا۔ حکیم محمد یوسف حسن صاحب نے نیرنگ خیال کے ذریعہ اردو رسائل کی دنیا میں بہت سارے

تجربات کیے۔ اردو کی ادبی صحافت میں سالناموں اور خاص نمبروں کا سلسلہ نیرنگِ خیال کی ہی دین ہے۔ نیرنگِ خیال کا ایک اور بہت اہم کارنامہ اقبال نمبر ہے جو علامہ اقبال کی زندگی میں ہی 1932 میں شائع ہوا۔

اپنی انھیں گوناگوں خوبیوں کی بدولت 1924 سے 1947 کے دوران ''نیرنگِ خیال'' ہندوستان کا کثیرالاشاعت رسالہ بن کر اُبھرا۔ لیکن تقسیم ہند کے بعد یہ رسالہ اپنی آب و تاب برقرار نہ رکھ سکا۔ چنانچہ حکیم صاحب نے نیرنگِ خیال کو پہلے راولپنڈی منتقل کیا اور پھر 1967 میں نیرنگِ خیال کی ملکیت سلطان رشک کے نام منتقل کر دی۔ اب حکیم یوسف حسن نیرنگِ خیال کے مدیرِ اعلیٰ اور سلطان رشک مدیر تھے۔ چنانچہ ایک بار پھر نئی جوت اور روشنی کے ساتھ نیرنگِ خیال کا آفتاب طلوع ہوا اور دنیائے ادب کو روشنی بانٹنے لگا۔ 31 جنوری 1981 میں حکیم صاحب کی وفات کے بعد سلطان رشک اس کے مدیرِ اعلیٰ ہو گئے اور تا حال سلطان رشک کی ادارت میں راولپنڈی سے یہ رسالہ جاری ہے۔

''نیرنگِ خیال'' کے خصوصی شماروں کی طویل فہرست ہے۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں:

| | |
|---|---|
| عید نمبر — | 1925، جلد 2، شمارہ 10-9 |
| ادبی نمبر — | 1926، جلد 5، شمارہ 25 |
| سالنامہ — | جنوری 1929، جلد 9، شمارہ 66 |
| ایڈیٹر نمبر — | 1930، جلد 10، شمارہ 37 |
| جوبلی نمبر — | 1934، جلد 20، شمارہ 6-5 |
| افغانستان نمبر — | 1938، جلد 27، شمارہ 1 |
| مختصر افسانہ نمبر — | ستمبر 1959 |
| غزل نمبر — | نومبر 1967 |
| چینی افسانہ نمبر — | اپریل/مئی 1968 |
| اشاعت خصوصی — | ستمبر/اکتوبر 1982 |
| فن اور شخصیت ایڈیشن — | مئی 1984 |

| | |
|---|---|
| سالنامہ— | دسمبر 1988 |
| صبا اکبر آبادی نمبر— | دسمبر 1993 |
| ماہیا نمبر — | اکتوبر 1999 |
| سالنامہ— | اپریل 2004 |

1929 میں تاجور نجیب آبادی نے ''ادبی دنیا'' کا اجرا لاہور سے کیا۔ ادبی دنیا تین سال سے زائد عرصہ بہت شان سے نکالنے کے بعد مارچ 1932 میں مولانا صلاح الدین احمد کے ہاتھوں فروخت کر دیا جس کی ادارت کے فرائض 1932 سے 1938 کے درمیان منصور احمد، حفیظ ہوشیار پوری اور عاشق حسین بٹالوی نے انجام دیے۔ 1938 سے مولانا صلاح الدین احمد نے ادارت کی ذمہ داری خود اپنے سر لے لی جبکہ شریک مدیر کی حیثیت سے میراجی ساتھ رہے۔ دسمبر 1948 سے ایک سال کے وقفہ کے بعد دوبارہ ادبی دنیا کی اشاعت شروع ہوئی۔ 1959 سے 1964 تک یعنی مولانا صلاح الدین احمد کے انتقال تک وزیر آغا شریک مدیر کی حیثیت سے ''ادبی دنیا'' کے قافلے میں شامل رہے۔

1965 سے لے کر آخری شمارہ اپریل 1974 تک ادارت کی ذمہ داری محمد عبداللہ قریشی ادا کرتے رہے۔ ادبی دنیا کے کچھ خصوصی شمارے یہ تھے:

| | |
|---|---|
| نوروز نمبر— | جنوری 1932 |
| ڈراما نمبر— | جون رجولائی 1935 |
| اشاعت خاص— | نومبر ردسمبر 1951 |
| یادگار نمبر مولانا صلاح الدین احمد —دور ششم 1965 | |
| اقبال نمبر— | دور ششم شمارہ 24، اپریل 1967 |
| وحشت نمبر— | دور ششم شمارہ 50، 1973 |

1930 میں شاہد احمد بی اے (آنرز) دہلوی نے دہلی سے ''ساقی'' اردو کا ماہوار علمی و ادبی صحیفہ جاری کیا، جس کے مدیر مسئول سید انصار علی دہلوی اور مہتمم اشتیاق احمد چشتی دہلوی تھے۔ یہ رسالہ ابتدا تا 1964 بڑی آب وتاب کے ساتھ دہلی سے شائع ہوتا رہا۔

تقسیم ہند کے بعد ستمبر 1948 سے شاہد احمد دہلوی نے اپنی بیگم عاصمہ شاہد احمد کے ساتھ کراچی سے رسالہ ساقی کی اشاعت جاری رکھی۔ 27 مئی 1966 میں شاہد احمد دہلوی کا انتقال ہو گیا، جس کے بعد 1967 میں آخری شمارہ شاہد احمد دہلوی نمبر شائع ہوا جس کے مرتب نامور ادیب ڈاکٹر جمیل جالبی (مدیر نیا دور کراچی) تھے۔ ''جھلکیاں'' اور ''باتیں'' ساقی کے مستقل کالم تھے جنھیں ہمیشہ قارئین کی جانب سے قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ ساقی خالص ادب کا علم بردار رہا اور تمام برصغیر کے اردو ماہناموں میں ساقی کو ایک امتیازی حیثیت حاصل رہی۔

''ساقی'' کے کچھ اہم اور خصوصی شمارے یہ تھے:

| | |
|---|---|
| افسانہ نمبر— | جولائی 1930 |
| دہلی نمبر— | نومبر 1930 |
| ظریف نمبر— | اپریل 1933 |
| جاپان نمبر— | جنوری 1936 |
| راشد الخیری نمبر— | ستمبر 1936 |
| طنز و مزاح نمبر— | اپریل 1945 |
| ناولٹ نمبر— | جولائی 1960 |
| مشرقی پاکستان نمبر— | 1963 |
| جوش نمبر— | 1963 |
| اشاعت خاص— | اپریل 1966 |
| شاہد احمد دہلوی نمبر— | 1970 |

فروری 1930 میں مولانا سیماب اکبر آبادی نے قصر الادب آگرہ سے جمعیت الشعرائے ہند کے آرگن کے طور پر رسالہ ''شاعر'' کا آگرہ سے اجرا کیا۔ پہلے مدیر منظر اکبر آبادی اور نگراں سیماب اکبر آبادی صاحب تھے۔ رسالہ شاعر کے بنیادی مقاصد میں شعرا کو گمنامی اور ناقدری کی پستی سے نکالنا، تمام شاعروں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا، اردو شاعری کی ترویج اور شعرا کی تربیت وغیرہ شامل تھے۔ فروری 1932 منظر اکبر آبادی کی علالت کے سبب ادارت کی

ذمہ داریاں علامہ سیماب نے اپنے ہاتھوں میں لے لیں۔

1950 میں علامہ سیماب کراچی منتقل ہو گئے اور رسالہ شاعر اعجاز صدیقی کے ہمراہ بمبئی آ پہنچا جہاں اُنھوں نے 1978 تک شاعر کی ادارت کے فرائض انجام دیے اور رسالہ شاعر کو مایۂ ناز رسائل کی صف میں لا کھڑا کیا۔ تاجدار احتشام صدیقی 1978 سے 1981 اپنی وفات تک شاعر کے مدیر رہے اور اب 1981 تا حال افتخار امام صدیقی شاعر کے مدیر ہیں۔ رسالہ شاعر کے مدیران نے بدلتے وقت کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے شاعر کے مزاج میں مسلسل تبدیلیاں کیں اور نت نئے تجربات کے ذریعہ رسالے کو بلندیاں عطا کیں۔ آج رسالہ شاعر اردو کا مقبول ترین اور کثیر الاشاعت ادبی جریدہ ہے۔ رسالہ شاعر جس کا آج کل ہر شمارہ کسی کے گوشے پر مشتمل ہوتا ہے، ماضی میں کئی سارے اہم اور خصوصی نمبر شائع کر چکا ہے جن میں اہم ہیں:

| | |
|---|---|
| سالنامہ — | مئی 1937 |
| افسانہ نمبر — | اکتوبر/نومبر 1945 |
| منٹو نمبر — | مارچ/اپریل 1955 |
| ڈراما نمبر — | 1964 |
| کرشن چندر نمبر — | 1967 |
| غالب نمبر — | فروری/مارچ 1969 |
| بیاد سلام مچھلی شہری — | دسمبر 1973 |
| قومی یکجہتی نمبر — | 1974 |
| ہم عصر اردو ادب نمبر — | مئی/جولائی 1977 |
| خلیل الرحمٰن اعظمی نمبر — | اپریل تا جون 1980 |
| اقبال نمبر — | جنوری تا جون 1988 |
| عالمی اردو قلم کار خواتین ادب نمبر — | جنوری 1999 |
| اردو کی نئی بستیاں — | جون 1999 |

1935 میں چودھری برکت علی نے لاہور سے ''ادبِ لطیف'' کا اجرا کیا۔ ادبِ لطیف

کی خوش قسمتی ہے کہ ہمیشہ اس کی ادارت کسی بہت اہم اور قابل ادیب کے ہاتھوں میں رہی اور اسے ہر دور میں اہم قلمکاروں کا تعاون ۔ اصل رہا۔ ادبِ لطیف کی ادارت کے روشن سال کچھ اس طرح ہیں:

پہلے ایڈیٹر طالب انصاری مقرر ہوئے پھر 1936 سے 1941 تک مرزا ادیب ایڈیٹر ہوئے۔

1941 سے 1949 تک فیض احمد فیض، راجندر سنگھ بیدی، ممتاز مفتی، قتیل شفائی، فکر تونسوی اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ۔

1949 سے 1962 تک ایک بار پھر ادارت کی ذمہ داریاں میرزا ادیب نے ادا کیں۔

1962 سے 1986 تک انتظار حسین، کشور ناہید، مسعود اشعر، ذوالفقار تابش اور اظہر جاوید جیسے مایۂ ناز ادیب مختلف اوقات میں اس کی ادارت سے وابستہ رہے۔

1986 سے اب تک ادبِ لطیف کی میراث کو صدیقہ بیگم بخیر و خوبی سنبھالے ہوئے ہیں۔

''ادبِ لطیف'' اپنے بے شمار خاص نمبروں، سالناموں اور معیاری تخلیقات کی اشاعت کے لیے ہمیشہ اردو رسائل کی تاریخ میں یاد رکھا جائے گا۔

دیگر رسائل کی طرح ادبِ لطیف نے بھی بہت سارے خصوصی شمارے شائع کیے جن میں اہم یہ ہیں:

| | |
|---|---|
| سالنامہ ۳۶ء۔ | دسمبر 1935 |
| سالنامہ ۳۷ء۔ | دسمبر 1936 |
| افسانہ نمبر۔ | جون/جولائی 1937 |
| سالنامہ ۴۱ء۔ | جنوری 1941 |
| افسانہ نمبر۔ | مئی/جون 1941 |
| سالنامہ ۴۷ء۔ | اپریل/مئی 1947 |

مولوی عبدالحق نمبر — نومبر 1961
جوبلی نمبر — اگست 1963
غالب نمبر — جنوری 1969
فیض نمبر — مارچ/اپریل 1985
نظم وغزل نمبر — مارچ 1995
افسانہ نمبر — جولائی 1997

دکنی ادب کی ترویج اور دکن میں اردو کے فروغ میں ادارہ ادبیاتِ اردو حیدرآباد دکن کا بہت اہم رول ہے۔ جنوری 1938 میں اسی ادارہ کا ترجمان ماہنامہ ''سب رس'' معروف محقق، نقاد اور ادیب محی الدین قادری زور صاحب کے زیر نگرانی جاری ہوا، جس کے پہلے مدیر صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش تھے۔ جبکہ اشاعت کا اہتمام خواجہ حمید الدین کے ذمہ تھا۔ (خواجہ حمید الدین شاہد دسمبر 1977 سے نوے کی دہائی کے اواخر تک کراچی سے ''سب رس'' نکالتے رہے)۔ رسالہ سب رس ابتدا سے تا حال ایک الگ اور منفرد مزاج کا حامل رسالہ رہا، جس میں شعر و ادب کے علاوہ تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا ایک بہت معیاری حصہ شامل ہوتا ہے۔ خصوصاً دکنی ادب اور خطۂ دکن سے وابستہ تخلیق کاروں کی بازیافت کا عمل رسالہ سب رس نے بخوبی انجام دیا۔ پروفیسر مغنی تبسم کے طویل سلسلۂ ادارت کے بعد آج کل سب رس کے مدیر پروفیسر بیگ احساس ہیں۔ سب رس کے اہم اور خصوصی نمبر یہ تھے:

اقبال نمبر — جون 1938
مرقع دکن نمبر — جنوری 1939
ریڈیو نمبر — جنوری 1941
ترقی پسند ادب نمبر — جولائی 1944
سالار جنگ نمبر — اپریل 1949
اردو کانفرنس نمبر — جون/اگست 1954
یوم محمد قلی قطب شاہ نمبر — اپریل/جون 1958

ظفر نمبر — جنوری رفروری 1963

غالب نمبر - پہلا حصہ — ستمبر ر اکتوبر 1969

غالب نمبر - دوسرا حصہ — دسمبر 1969

سلور جوبلی تقریب یوم محمد قلی قطب شاہ نمبر — مارچ 1987

خواجہ حمید الدین شاہد نمبر — دسمبر 2001

غالب نمبر — فروری 2006

نومبر 1942 میں آغا محمد یعقوب دواشی کی ادارت میں پندرہ روزہ رسالہ ''آجکل'' شائع ہونا شروع ہوا۔ برصغیر کا ایک اہم ادبی رسالہ ہے جو حکومتِ ہند کے ادارۂ اشاعت وطباعت کے زیرِ نگرانی باقاعدگی سے شائع ہوتا ہے۔ یہ رسالہ گرچہ انگریزوں نے اپنی پالیسی اور پروگرام کی تشہیر واشاعت کے لیے جاری کیا تھا لیکن آزادی کے بعد اسے ثقافتی اور ادبی رسالہ بنا دیا گیا۔ یہ رسالہ دسمبر 1947 سے رگھوناتھ رینا کی ادارت میں ماہنامہ نکلنا شروع ہوا۔ اس دوران مختصر تعطل کا شکار ہوا جبکہ اکتوبر 1948 سے مسلسل شائع ہو رہا ہے۔

''آجکل'' کی ادارت سے مختلف ادوار میں اردو شعر و ادب کی بہت اہم اور مؤقر شخصیات وابستہ رہی ہیں جن میں آغا محمد یعقوب دواشی، معین احسن جذبی، سید وقار عظیم، جوش ملیح آبادی، عرش ملسیانی، مہدی عباسی، شہناز حسین، راج نرائن راز، عابد کرہانی، محبوب الرحمٰن فاروقی وغیرہ شامل ہیں۔ فی الحال اس کے مدیر ڈاکٹر ابرار رحمانی ہیں۔

رسالہ ''آجکل'' اپنے معیار اور اپنے مزاج کے اعتبار سے اردو کے بہت نمایاں رسائل میں سے ایک ہے۔ آجکل کے کچھ اہم نمبر یہ ہیں:

گاندھی نمبر — جنوری رفروری 1948

جمہوریت نمبر — فروری 1905

غالب نمبر — فروری !1952

شعر و شاعری نمبر — اگست 1953

ابوالکلام آزاد نمبر — اگست 1958

| | |
|---|---|
| جگر نمبر — | 1961 |
| بہادر شاہ ظفر نمبر — | نومبر 1962 |
| افسانہ نمبر — | اگست 1963 |
| تحقیق نمبر — | اگست 1967 |
| اردو نمبر — | اگست 1968 |
| جدید ہندوستانی شاعری نمبر — | اگست 1969 |
| سلور جوبلی نمبر — | جون 1970 |
| اردو طباعت و اشاعت نمبر — | دسمبر 1970 |
| طنز و ظرافت نمبر — | اپریل 1974 |
| امیر خسرو نمبر — | نومبر 1974 |
| حسرت موہانی نمبر — | اگست رستمبر 1981 |
| سہیل عظیم آبادی نمبر — | نومبر 1982 |
| چکبست نمبر — | فروری 1983 |
| میر تقی میر نمبر — | مارچ راپریل 1984 |
| اردو صحافت نمبر — | دسمبر 1984 |
| منتخب تخلیقات نمبر — | ستمبر را کتوبر 1988 |
| گولڈن جوبلی نمبر — | اپریل 1992 |
| اختر الایمان نمبر — | فروری 1994 |

1946 میں ماہنامہ ''افکار'' کا اجرا صہبا لکھنوی اور رشدی بھوپالی کی ادارت میں بھوپال سے ہوا۔ 1950 تک یہ رسالہ بھوپال سے شائع ہوتا رہا اور ترقی پسند تحریک کے ایک اہم آرگن کا کردار ادا کرتا رہا۔ صہبا لکھنوی کی پاکستان ہجرت کے بعد افکار 1951 سے کراچی سے شائع ہونا شروع ہوا۔ 2002 میں صہبا لکھنوی کی وفات کے بعد ڈاکٹر حنیف فوق کی ادارت کا سلسلہ شروع ہوا۔ 2004 میں افکار کا صہبا لکھنوی نمبر شائع ہوا جس کے بعد یہ شاہکار رسالہ بند

ہوگیا۔

اردو ادب کی تاریخ میں رسالہ افکار اپنے خاص نمبروں کے لیے ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ ملکی اور غیر ملکی زبانوں کے تراجم پیش کر کے اردو ادب کو دوسری زبانوں کے قریب لانے میں ''افکار'' نے بہت اہم کام انجام دیا اور خود نوشت سوانح عمریوں کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ افکار کے خاص نمبروں کی تفصیل کچھ یوں ہے:

| | |
|---|---|
| آزادی نمبر — | 1952 |
| دس سالہ نمبر — | اگست 1955 |
| مجاز نمبر — | جون 1956 |
| رائٹرس کنونشن نمبر — | مارچ 1959 |
| جوش نمبر — | نومبر 1961 |
| حفیظ نمبر — | اگست/اکتوبر 1963 |
| افسانہ نمبر — | اپریل/مئی 1964 |
| فیض نمبر — | اپریل/جون 1965 |
| غالب نمبر — | فروری/مارچ 1966 |
| غالب نمبر — | فروری/مارچ 1969 |
| ندیم نمبر — | جنوری/فروری 1975 |
| امیر خسرو نمبر — | نومبر/دسمبر 1975 |
| برطانیہ میں اردو — | اپریل 1981 |
| خاص نمبر — | اگست 1987 |
| منتخب افسانہ نمبر — | جنوری/فروری 1995 |
| منتخب مضامین نمبر — | اپریل/مئی 1995 |

جنوری 1947 میں چودھری نذیر احمد نے لاہور سے دو ماہی ''سویرا'' کی ابتدا کی۔ احمد ندیم قاسمی، فکر تونسوی اور چودھری نذیر احمد اس کے مرتبین تھے۔ سویرا کا مزاج ابتدا سے ہی

خالص ادبی رہا اور بہت اہم قلمکاروں کا ساتھ نصیب ہوا۔ چنانچہ سویرا کی روشنی بہت دور تک پھیلتی چلی گئی۔ اس دوران اس کے مرتبین میں عارف عبدالمتین، ظہیر کاشمیری اور احمد راہی ہو گئے۔ لیکن سویرا کے شمارہ 12 سے دائرۂ ادارت میں احمد راہی اور چودھری نذیر احمد کے نام سامنے آئے۔ سویرا کی ادارت مختلف ادوار میں جن ادبا نے اُٹھائی ان میں حنیف رامے، ظفر اقبال، محمد سلیم الرحمٰن، ریاض چودھری اور صلاح الدین محمود وغیرہ بھی شامل ہیں۔ سویرا کی اشاعت بے قاعدگی کے ساتھ آج بھی جاری ہے۔ سالوں بعد کبھی کبھار ایک آدھ شمارہ نظر سے گزر جاتا ہے۔ اس کے موجودہ مدیر سلیم الرحمٰن ہیں۔

لاہور کے محمد طفیل صاحب نے مارچ 1948 میں مشہور زمانہ رسالہ ''نقوش'' کا اجرا کیا جس کے پہلے مدیران احمد ندیم قاسمی اور ہاجرہ مسرور تھے (شمارہ 1 تا 10) مئی 1950 تا مارچ 1951، (شمارہ 11 تا 18) سید وقار عظیم نے رسالہ نقوش کے مدیر کی حیثیت سے نقوش کو ''زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا ترجمان'' بنانے میں اہم پیش رفت کی۔ اپریل 1951 میں ادارت کی ذمہ داریاں محمد طفیل صاحب نے خود سنبھال لیں جس کا سلسلہ محمد طفیل کی وفات 1986 تک پھیلا ہوا ہے اور یہی دور نقوش کا تابناک دور ہے جس نے محمد طفیل کو محمد نقوش بنا دیا (شمار 19 تا 132)۔ محمد طفیل نے اپنے دورِ ادارت میں نقوش کے ایسے ایسے نادر و نایاب نمبر ترتیب دیے کہ نقوش کے پرانے رسائل آج اہلِ علم اپنے کتب خانوں میں رکھتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں۔ مدیرِ نقوش محمد طفیل کی 1986 میں وفات کے بعد نقوش ان کے بیٹے جاوید طفیل کی ادارت میں نکلتا رہا اور خاص نمبروں اور سالناموں کا سلسلہ جاری رہا (شمارہ 133 تا 148)۔ بالآخر 2005 میں شمارہ 148 (گولڈن جوبلی نمبر) کے بعد یہ عظیم الشان رسالہ شائع نہ ہو سکا۔ خاص نمبروں اور سالناموں کے اس جریدے کے کچھ بہت اہم اور نایاب خصوصی شمارے یہ تھے:

جشن آزادی نمبر ۔۔ 1948
عالمگیر امن نمبر ۔۔ جون 1949
شخصیات نمبر ۔۔ جنوری 1955
افسانہ نمبر ۔۔ ستمبر 1955

طنز و مزاح نمبر--- جنوری رفروری 1959
پطرس نمبر--- ستمبر 1959
ادب عالیہ: نقوش کی دس سالہ تحریروں کا انتخاب: جولائی 1960
لاہور نمبر--- فروری 1962
آپ بیتی نمبر--- جون 1964
خاص نمبر --- اکتوبر ردسمبر 1966
غالب نمبر--- فروری 1969
اقبال نمبر--- ستمبر 1977
سالنامہ --- جنوری 1979
میر تقی میر نمبر --- اکتوبر 1980
ادبی معرکے نمبر 2-1 ستمبر 1981

''ماہِ نو'' 1948 میں کراچی سے پروفیسر سید وقار عظیم کی ادارت میں جاری کیا گیا۔ یہ سرکاری جریدہ ہندوستان کے سرکاری رسالہ ''آجکل'' کے طرز پر ادارۂ مطبوعات و فلمز کے زیر اہتمام نکالا گیا۔ 1950 میں پروفیسر حسن عسکری اس کے مدیر بنائے گئے۔

جولائی 1950 میں رفیق خاور (مدیر اردو لغت بورڈ) اور ظفر قریشی کی ادارت میں یہ شائع ہوا۔ مولانا چراغ حسن حسرت نے اس کا استقلال ایڈیشن شائع کیا۔ دارالحکومت اسلام آباد بننے کے بعد کراچی سے اس کو اسلام آباد منتقل کر دیا گیا۔ چند شماروں کے بعد پھر لاہور سے جاری ہوا اور کشور ناہید کی ادارت میں اس کے چالیس سالہ انتخاب بعنوان مخزن کے دو شمارے (1987) شائع کیے گئے۔ اب یہ صفدر بلوچ کی ادارت میں مطبوعات و فلمز پبلی کیشنز، حکومت پنجاب، لاہور سے شائع کیا جارہا ہے۔ سرکاری جریدہ ہونے کے باوجود ماہِ نو کا مزاج خالصتاً ادبی، علمی اور ثقافتی ہے۔ ماہِ نو کے خصوصی شماروں کی تفصیل بھی بہت طویل ہے، ان میں سے کچھ یہ ہیں:

خاص نمبر --- اگست رستمبر 1948
قائداعظم نمبر--- نومبر 1948

ایران نمبر۔۔ مارچ 1950
جشن استقلال نمبر۔۔ اگست 1951
خاص نمبر: بیادگار تحریک آزادی 1857۔ ۔ مئی 1957
انتخاب 1953 تا 1958 نمبر۔۔ 1958
اشاعت خاص۔۔ اکتوبر 1962
سیرت رسول نمبر۔۔ جولائی/اگست 1963
اشاعت خاص ۔۔ مارچ 1965
غالب کی صد سالہ برسی پر خصوصی اشاعت۔۔ جنوری/فروری 1969
انیس نمبر ۔ جولائی 1972
دبیر نمبر۔۔ ستمبر/اکتوبر 1975
اقبال نمبر۔۔ ستمبر 1977
بچوں کا ادب نمبر۔۔ نومبر 1979
مسلم فن وثقافت نمبر۔۔ مئی 1980
ادب اور قومی تشخص نمبر۔۔ اگست 1982
فن وثقافت نمبر ۔۔ مئی 1987
گولڈن جوبلی نمبر۔۔ اگست 1997

جنوری 1949 کو ترقی پسند مصنفین کا دو ماہی ترجمان شاہراہ کا پہلا شمارہ منظر عام پر آیا (پہلے شمارے پر ماہ وسال کا اندراج نہیں ہے۔ چنانچہ پہلے شمارے کے ماہ وسال کا اندازہ بعد کے شماروں سے لگایا گیا)۔ پہلے شمارے کے مدیران ساحر لدھیانوی اور رام پرکاش اشک تھے۔

شاہراہ نمبر 2 میں رام پرکاش اشک ادارت میں شامل نہیں تھے۔ شاہراہ 5 میں سرلا دیوی اور پرکاش پنڈت مدیران تھے۔ بعد میں عرصۂ دراز تک پرکاش پنڈت ہی رسالہ نکالتے رہے۔ پھر یوسف جامعی شاہراہ کے مدیر مقرر ہوئے جنھوں نے کئی خاص نمبر شائع کیے جن میں کہانی نمبر مارچ 1960 اور ناولٹ نمبر فروری 1958 اہم ہیں۔ ناولٹ نمبر میں ملکی اور غیر ملکی ادب

کے معروف ناولٹ جمع کیے گئے تھے۔

رسالہ شاہراہ اپنی اشاعت کے آخری مرحلے تک ترقی پسند تحریک کی مکمل نمائندگی کرتا رہا اور ترقی پسند تحریک کے اہم لکھنے والوں کو نمایاں طور پر رسالے میں شائع کرتا رہا۔ کچھ اہم خصوصی شمارے یہ تھے:

| | |
|---|---|
| کانفرنس نمبر — | اگست 1950 |
| سالنامہ — | مارچ 1951 |
| افسانہ نمبر — | ستمبر 1953 |
| طنز و مزاح نمبر — | جولائی 1955 |
| سالنامہ — | جنوری 1956 |
| کہانی نمبر — | مارچ 2006 |

مارچ 1953 میں آنجہانی گوپال متل نے ماہنامہ ''تحریک'' دہلی کی اشاعت کا آغاز کیا۔ تحریک کی اشاعت کے مختلف ادوار میں گوپال متل کے علاوہ مخمور سعیدی، تمکین کاظمی اور پریم گوپال متل نے بڑی جانفشانی سے رسالہ تحریک کو اپنے عہد کی ایک اہم اور باثر ادبی تحریک بنانے میں بہت موثر کردار ادا کیا۔ 29 برسوں تک جاری رہنے والے اس بلند پایہ رسالے کی اشاعت جون 1981 میں مستقل طور پر بند ہوگئی۔

رسالہ ''تحریک'' کی مقبولیت میں اس کے خاص نمبروں کا بھی اہم کردار رہا ہے جن کی مختصر تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

| | |
|---|---|
| سالنامہ — | مارچ 1955 |
| جگر نمبر — | اکتوبر 1960 |
| غالب نمبر — | اپریل رمئی 1961 |

خصوصی شمارہ: چین کے ادبی اور ثقافتی رجحانات پر ایک نظر — اگست 1962

| | |
|---|---|
| تاراسوف نمبر — | مئی 1963 |
| جگر نمبر — | اکتوبر 1964 |

| | |
|---|---|
| اقبال نمبر — | جون 1967 |
| انقلاب روس نمبر — | نومبر 1967 |
| آزادی نمبر — | ستمبر 1975 |
| سلور جوبلی نمبر — | جولائی/اکتوبر 1978 |

حکومت اتر پردیش کی منسٹری آف انفارمیشن کا رسالہ ''نیا دور'' اپریل 1955 میں لکھنؤ سے جاری ہوا۔ نیا دور کے پہلے ایڈیٹر علی جواد زیدی تھے جنھوں نے اپنی ذہانت اور اعلیٰ ادبی ذوق کی بدولت رسالے کو عروج عطا کیا اور رسالے کا ایک اہم ادبی مزاج متعین کیا۔ رسالہ نیا دور اپنے خصوصی شماروں کی وجہ سے اردو کے ادبی رسائل کی دنیا میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ نیا دور کے ذریعہ پیش کیے گئے یہ نمبرات دستاویزی اہمیت کے حامل ہیں۔

نیا دور کے موجودہ مدیر وضاحت حسین رضوی ہیں جو رسالہ نیا دور کو آج بھی اردو کے اہم اور مستند رسائل میں شامل کرنے میں کامیاب ہیں۔ جس کی زندہ مثالیں تازہ شائع شدہ نیا دور کے خصوصی شمارے ہیں جن میں رشید حسن خاں نمبر، عرفان صدیقی نمبر اور انقلاب 1857 اہم ہیں۔ کچھ اور اہم خصوصی شماروں کی تفصیل یوں ہے:

| | |
|---|---|
| جمہوریت نمبر — | 26/جنوری 1956 |
| تعمیری ادب نمبر — | جنوری 1957 |
| اسپیشل نمبر 1857 — | اگست 1957 |
| نہرو نمبر — | جولائی/اگست 1964 |
| جعفر علی خاں اثر نمبر — | ستمبر 1967 |
| غالب نمبر — | فروری/مارچ 1969 |
| گوشۂ ڈاکٹر ذاکر حسین — | جون 1969 |
| گوشۂ اقبال — | دسمبر 1973 |
| امیر خسرو نمبر — | دسمبر 1974 |
| عبدالماجد دریابادی نمبر — | اپریل/مئی 1978 |

| | |
|---|---|
| اطفال نمبر — | نومبر ر دسمبر 1979 |
| منشی نول کشور نمبر — | نومبر ر دسمبر 1980 |
| بہادر شاہ ظفر نمبر — | اکتوبر 1981 |
| فراق نمبر اول — | مارچ تا مئی 1983 |
| فراق نمبر دوم — | مئی تا جولائی 1884 |
| یادرفتگاں نمبر — | اپریل تا دسمبر 1988 |
| اودھ نمبر اول — | فروری ر مارچ 1994 |
| اودھ نمبر دوم — | اکتوبر ر نومبر 1994 |
| نصف صدی نمبر — | مارچ تا مئی 1995 |
| حریت نمبر — | اگست 1998 |
| وامق جونپوری نمبر — | جون 1999 |
| غالب نمبر — | دسمبر 1999 |
| کیفی اعظمی نمبر — | جولائی راگست 2002 |

1950 میں محمود ایاز نے بنگلور سے رسالہ ''سوغات'' کا اجرا کیا۔ یہ ایک رجحان ساز اور جدیدیت کا علمبردار رسالہ تھا۔ گو کہ سوغات کی اشاعت میں کبھی بھی تسلسل نہیں رہا۔ اشاعت میں طویل وقفوں کے ساتھ سوغات کی اشاعت تین مختلف ادوار پر مشتمل ہے۔

سوغات کا ہر شمارہ اپنے آپ میں اہم اور خاص شمارہ ہوتا تھا۔ جدید نظم نمبر بابت اپریل تا اکتوبر 1961 نے اردو ادب میں جدید نظم کی معنویت، اہمیت اور مزاج کے تعین میں اہم کردار عطا کیا۔ (کچھ عرصہ تک پاکستان میں غلام احمد صاحب اس کا کراچی سے ایڈیشن شائع کرتے رہے)۔ محمود ایاز کی وفات تک رسالہ سوغات اپنے مشمولات کے حوالے سے ایک اہم رسالے کی حیثیت سے شعرا وادبا میں بہت مقبول رہا۔ نومبر 1997 میں سوغات کے تیسرے اور آخری دور کا آخری شمارہ مریم ایاز کی ادارت میں شائع ہوا۔

احمد ندیم قاسمی نے 1963 میں لاہور سے ادبی رسالہ سہ ماہی ''فنون'' کی اشاعت

شروع کی جس کی ادارت وہ آخری سانس تک کرتے رہے۔فنون کے ذریعہ احمد ندیم قاسمی نے نئی سوچ اور نئی نسل کے شعرا و ادبا کو متعارف کرانے کا اہم کام انجام دیا۔اس کے علاوہ انھوں نے فنون کے دستاویزی اور یادگار نمبر شائع کیے جن میں غزل نمبر حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔اس میں کئی ایسے اہم شعرا کی غزلیں شامل ہیں جو اس سے قبل کہیں نظر نہیں آتیں۔منصورہ احمد نے احمد ندیم قاسمی کی وفات تک فنون کی ادارت میں اہم رول ادا کیا۔

10 رجولائی 2006 کو احمد ندیم قاسمی کی وفات کے ساتھ فنون کا تابناک عہد ختم ہو گیا تھا لیکن مختصر تعطل کے بعد ناہید قاسمی دختر اور نیر حیات قاسمی نے پھر فنون کی اشاعت کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔فنون کے کچھ خاص شماروں کی تفصیل یوں ہے:

| | |
|---|---|
| خاص نمبر— | جنوری 1964 |
| اشاعت خاص — | اپریل رمئی 1964 |
| خاص شمارہ — | مئی رجون 1965 |
| جدید غزل نمبر— | جنوری 1969 |
| اختر حسین جعفری نمبر— | مئی راگست 1992 |

معروف کہانی کار نسیم درّانی نے ستمبر 1964 میں کراچی سے رسالہ ''سیپ'' کا اجرا کیا۔ ان کے ساتھ شعبۂ اردو جامعہ کراچی کے پروفیسر جمیل احمد خاں، امید فاضلی، خواجہ رضی حیدر وغیرہ علمی و قلمی معاونت کرتے رہے۔جبکہ برصغیر کے ہر اہم لکھنے والے ادیب، نقاد اور شاعر کی تخلیقات و نگارشات کتابوں کے مطالعے اور تبصرے ''سیپ'' میں شائع ہوتے رہے۔سیپ کی شہرت ہر سو پھیلتی چلی گئی۔اگرچہ سیپ کی اشاعت کبھی بھی باقاعدہ نہیں رہی لیکن اپنی بے قاعدگی کے باوجود اردو ادب کے اہم رسائل میں سیپ نے اپنے لیے جگہ حاصل کر لی اور تا حال نسیم درّانی صاحب کی ادارت میں محوِ سفر ہے۔اردو افسانے کے فروغ اور ارتقا میں فکرِ نو کے ترجمان رسالہ سیپ نے بہت اہم رول ادا کیا۔

جنوری 1966 میں ''اوراق'' کا اجرا مشہور و معروف ادیب و شاعر وزیر آغا نے بیاد مولانا صلاح الدین بانی مدیر ادبی دنیا، لاہور سے کیا تھا جس میں معاون مدیر عارف عبدالمتین

تھے۔ جنوری فروری 1976 سے سجاد نقوی اوراق کی مجلس ادارت میں اعزازی مدیر کی حیثیت سے شامل ہوئے۔

اوراق ابتدا سے ہی عملی طور پر ششماہی رسالہ رہا اور بالعموم سالناموں اور خاص نمبروں کی صورت میں شائع ہوتا رہا۔ اوراق نے انشاپردازی کی صنف کو ایک نئی جہت دی اور اسے اردو ادب میں ایک اہم صنف کی حیثیت سے متعارف کروانے میں اہم رول ادا کیا۔ 'سوال یہ تھا'، 'ادھوری ملاقاتیں' اور 'میرا پسندیدہ فنکار' وغیرہ اوراق کے مختلف ادوار میں اہم سلسلے رہے۔

سنہ 2000 میں اوراق کی جلد 36 شائع ہوئی جس میں اوراق کے گزشتہ 35 سالوں کی اشاعت کا اشاریہ شامل کیا گیا تھا۔ اس کے بعد کچھ اور شمارے آئے لیکن پہلے سی آب و تاب باقی نہیں رہی تھی۔ پھر یہ رسالہ بند کر دیا گیا۔ آخری شمارے کا سراغ نومبر ردسمبر 2005 (جلد 41، شمارہ 12/11) تک ملتا ہے۔ اوراق کے کچھ خصوصی شماروں میں اہم یہ ہیں:

| | |
|---|---|
| شمارہ خاص — | 1967 |
| افسانہ، انشائیہ نمبر — | مارچ راپریل 1972 |
| جدید نظم نمبر — | جولائی راگست 1977 |
| خاص نمبر — | جنوری رفروری 1978 |
| سالنامہ — | فروری رمارچ 1981 |
| خاص نمبر — | اگست رستمبر 1995 |

جون 1966 میں شمس الرحمن فاروقی نے الہ آباد سے ''شب خون'' کا اجرا کیا۔ شب خون کے پہلے مدیر ڈاکٹر سید اعجاز حسین صاحب تھے اور مرتب کی حیثیت سے اہلیہ شمس الرحمن فاروقی محترمہ جمیلہ فاروقی کا نام شامل تھا۔ اپنے عہد کے نہایت اہم رسالوں میں شامل شب خون کو جدیدیت کا پیش رو قرار دیا گیا جس نے اردو قلم کاروں کی دو نسلوں کی رہنمائی اور تربیت کی۔

شمس الرحمن فاروقی نے ''شب خون'' کا آغاز جس شان و شوکت سے کیا تھا اسی اہتمام کے ساتھ جون 2005 میں اس کا اختتام بھی عمل میں آیا۔ دو بہت ضخیم جلدوں پر مشتمل ''شب خون'' کا آخری شمارہ منظر عام پر آیا جس میں شب خون کے گزشتہ چالیس سالوں کے

شماروں سے بہترین تخلیقات کا انتخاب شامل کیا گیا تھا۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ''مخزن'' سے ''شب خون'' تک رسائل و جرائد کا یہ تابناک دور ہمیشہ اردو کی ادبی صحافت میں سنہری روشنائی سے لکھا جائے گا۔ اردو کی ادبی صحافت کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ برصغیر سے کسی اور زبان میں اس قدر رسائل و جرائد نہیں جاری ہوئے جتنا کہ اردو زبان میں شائع ہوئے۔ بیسویں صدی کی ابتدا سے لے کر اردو رسائل و جرائد کی روشن روایت تا حال برقرار ہے۔ جن رسائل و جرائد کا ذکر کیا گیا ان کے علاوہ بھی بے شمار اہم رسائل و جرائد ایسے رہے کہ جن کے دم سے یہ کہکشاں منور رہی ہے۔ ان میں بہت اہم حسرت موہانی کا ''اردوئے معلٰی''، عبدالحلیم شرر کا ''دلگداز''، سائل دہلوی کا رسالہ ''زبان''، مولانا راشد الخیری کا ''تمدن''، مولوی عبدالحق کا رسالہ ''اردو''، ممتاز یار جنگ کا ''افسر'' خواجہ حسن نظامی کا ''نظام المشائخ''، پیارے لال شاکر میرٹھی کا ''ادیب''، خواجہ غلام الثقلین کا ''عصر جدید''، احسن مارہروی کا ''فصیح الملک''، ساغر نظامی کا رسالہ ''ایشیا''، عابد سہیل کا رسالہ ''کتاب''، مغنی تبسم اور شہریار کا ''شعرو حکمت''، دہلی اردو اکادمی کا ''ایوانِ اردو'' اور مکتبہ جامعہ کے ''کتاب نما'' کے علاوہ بہت سارے دیگر رسالے بھی شامل ہیں۔

ادبی صحافت کے جائزے کا ایک نقطۂ نظر یہ بھی ہے کہ اس کو ادب عوام اور ادب خواص میں بھی تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ادب خواص میں عموماً خالص ادبی اور لسانی معاملات کو زیر بحث لایا جاتا ہے جبکہ ادب عوام سے مراد وہ تحریریں اور متون ہیں جن میں معاشرتی مسائل کو عمومی انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ معلوم نہیں جاسوسی دنیا، رومانی دنیا اور خاتون مشرق وغیرہ جیسے رسائل اور کتابی سلسلوں کو ہم کیوں فراموش کر دیتے ہیں۔

اردو کی ادبی صحافت کی تاریخ جس قدر طویل ہے اسی قدر دلچسپ اور اہم بھی۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس موضوع پر کام بہت کم ہوا ہے۔ اردو کی ادبی صحافت پر جو بڑے پیمانے پر کچھ کام ہوئے ہیں انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ انور سدید کی کتاب ''پاکستان میں اردو رسائل و جرائد'' ضیاء اللہ کھوکھر کی ''ماہانہ رسائل کے خصوصی شمارے''، عزیز نبیل کے رسالے دستاویز کا ''اہم ادبی رسائل و جرائد نمبر'' اور حال ہی میں عبدالحئی خان کی کتاب ''ادبی صحافت

آزادی کے بعد' کے علاوہ اردو کی ادبی صحافت کی ترتیب و تدوین کی سمت کوئی خاص پیش رفت نظر نہیں آتی ہے۔

ادبی صحافت کے روشن اور تابناک ماضی کی کچھ اہم خصوصیات کا ذکر ضروری ہے۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جن کی روشنی ماضی کی سو سالہ ادبی صحافت کی تاریخ سے چھن چھن کر موجودہ ادبی صحافت کے مسافروں کو روشنی کا سرمایہ فراہم کر رہی ہیں۔

1- ادبی صحافت کی ابتدا میں رسائل و جرائد میں مسابقے کا مزاج بہت زیادہ غالب تھا۔ چنانچہ قبولِ عام کے حصول کے لیے رسائل نے خود کو زمانے کے ساتھ بہت تیزی سے تبدیل کیا، اہم اور معتبر تخلیق کاروں کی تخلیقات کے حصول کو یقینی بنایا اور نت نئے تجربات کے ذریعہ اپنے معیار کو بلند سے بلند تر کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

2- ماضی کی ادبی صحافت کی ایک اور اہم خصوصیت تھی جس کی وجہ سے یہ دور رسائل و جرائد کے معیار اور وقار کے اعتبار سے ایک انقلابی دور تھا۔ وہ خصوصیت یہ تھی کہ ان رسائل کے مدیران اعلیٰ درجے کے مصنف، شاعر، ادیب اور انشاء پرداز کی حیثیت سے اپنی علاحدہ شناخت اور ادب کی دنیا میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔ ان باکمال اور قابل مدیران کی دیکھ ریکھ میں ادبی رسائل و جرائد نے اردو کی ادبی صحافت کو آسمان بنادیا۔

3- ماضی کے رسالوں میں طبع زاد افسانے کی بہ نسبت دیگر زبانوں کے تراجم زیادہ شائع ہوتے تھے۔ اس لحاظ سے اردو کا سرمایۂ ادب گراں قدر ہوتا گیا۔

4- بدلتے ہوئے زمانے کے پیش نظر عصر حاضر میں ادب کو وہ مقام نہیں حاصل رہا جو کبھی تھا۔ چنانچہ ماہانہ رسائل کے مقابل سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ رسائل کی تعداد بڑھتی جارہی ہے اور جو رسائل جاری ہیں ان میں بھی صرف چند ہی رسائل کی اشاعت میں تسلسل پایا جاتا ہے۔

ایسے رسائل و جرائد کی ایک الگ تاریخ ہے جن کا اجرا بہت تزک و احتشام کے ساتھ عمل میں آیا لیکن گنتی کے چند شماروں سے زیادہ نہیں نکل سکے۔ اس کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں جن میں سب سے اہم قاری کی قلت، معیاری تخلیقات کی قلت اور مالی وسائل کی قلت ہے۔

ماضی قریب میں بہت سارے شہرۂ آفاق رسالے یا تو بند ہو گئے یا ان میں وہ پہلی سی روشنی نہیں رہی۔ افکار، اوراق، شب خون، سویرا، نقوش وغیرہ رسائل اس صدی کی پہلی دہائی میں اپنی آخری سانسیں لے چکے ہیں لیکن ساتھ ہی اس بات کی خوشی ہے کہ بہت سے رسائل مسلسل اپنی موجودگی سے روشن صبح کے باقی ہونے کی امید پیدا کیے ہوئے ہیں۔ چنانچہ طویل العمر معتبر رسائل میں شاعر، ادبِ لطیف، نیرنگِ خیال، سب رس، ماہِ نو، صحیفہ، آجکل، نیا دور، تخلیق، سیپ، شگوفہ اور کتاب نما جیسے رسائل آج بھی اپنی موجودگی درج کرار ہے ہیں نیز ایک حوصلہ افزا بات یہ بھی ہے کہ گذشتہ چند برسوں سے بہت سارے نئے اور معیاری رسائل کے اجرا کا سلسلہ بھی جاری ہے۔

# دسواں باب

## کاروانِ صحافت

# صحافیانِ صف شکن

## اور

## آزمائشِ دار و رسن

**پروفیسر شاہد حسین**

**صحافت** صرف خبروں کی ترسیل نہیں یہ سماجی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات و حالات کی بنا پر جو رائے قائم کرتی ہے وہ سماجی زندگی کی تعمیری کوششوں کو متاثر بھی کرتی ہے۔ اس سے رائے عامہ ہموار کرنے یا متاثر کرنے کا بھی کام لیا جاتا ہے۔ یہ عوامی رجحانات کی رہنمائی کے ساتھ ساتھ عوام کے حقوق کی پاسبانی بھی کرتی ہے۔

صحافت تجارت بھی رہی ہے اور اعلیٰ مقاصد کو مدنظر رکھنے کے لیے احترام و اکرام کی سزاوار بھی۔ اس کی اخلاقیات میں یہ بات بطورِ خاص شامل ہے کہ اسے سچائی کو بے نقاب کرنا اور لوگوں تک وہ سچ پہنچانا چاہیے جس کا جاننا ان کے لیے ضروری ہے۔

فرانس میں ہر طرح کی تحریر و تقریر پر پابندی عائد تھی۔ انقلاب 1779 کے بعد جو پہلی نیشنل اسمبلی بنی اس نے سب سے پہلے عوام اور صحافت کو تحریر و تقریر کی مکمل آزادی دی۔ محمد عتیق صدیقی اس واقعے کو صرف فرانس کی صحافتی تاریخ کا ہی نہیں بلکہ دنیا کی تاریخ کا اہم ترین واقعہ

قرار دیتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ یہ دنیا میں جدوجہد شہری حقوق کی پہلی کامیابی ہے۔

ہندوستان کو یہ حق کافی تاخیر سے حاصل ہوا، جس کی بنیادی وجہ برطانوی حکمرانوں کے ذریعہ ہماری محکومی اور غلامی تھی۔ 31 دسمبر 1600 ہندوستان کی تاریخ کے تاریک ترین باب کی ابتدا تھی کہ اسی دن ملکہ الزبتھ اول نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان میں تجارت کرنے کا اجازت نامہ تفویض کیا[1]۔انگریز تاجر کی حیثیت سے ہندوستان میں داخل ہوئے اور اپنی مکاری، فریب دہی، رشوت اور دغابازی سے اس ملک پر قابض ہو گئے۔

انگریزوں کے ظلم وزیادتی، فریب ومکاری کے خلاف پہلے انگریزی اخباروں نے ہی آواز اُٹھائی۔کیونکہ ہندوستان میں مطبوعہ صحافت کی ابتدا (1780) پہلے انھیں کے ذریعے ہوئی۔یہ اخبارات کچھ ایسی خبریں بھی چھاپ دیتے تھے جو جنگ کے نقطۂ نظر سے انگریزوں کے لیے نقصاندہ ہوتی تھیں۔کیونکہ وہ ٹیپو سلطان تک پہنچ جاتی تھیں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے جابرانہ اور انسانیت سوز منصوبوں پر بھی سوالیہ نشان لگاتی تھیں[2]۔چنانچہ 1799 میں ہی ان ضوابط کا اعلان کر دیا گیا اور ان میں بار بار اضافہ ہوتا رہا۔

جنگِ آزادی 1857 کا آغاز ہوا تو گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے صحافت کی نام نہاد آزادی بھی ختم کر کے ایسا صحافتی قانون وضع کیا جسے تاریخ صحافت میں ''قانون زبان بندی'' (Gagging Act) کے نام سے جانا جاتا ہے۔اس قانون کے تحت ہر چھاپے خانے کو لائسنس لینا ضروری ہو گیا۔

آزادیٔ صحافت کے خلاف ایک موثر قانون 1910 میں ''پریس ایکٹ'' کے نام سے بنا اور نافذ ہوا۔اس قانون کی دفعہ چار کے مطابق اگر کسی اخبار کی کسی تحریر سے لفظاً، معناً، کنایتاً یا کسی اور طریقے سے یہ پایا جائے کہ اس سے حکومت کے خلاف نفرت یا حقارت کے جذبات بھڑکائے گئے یا اس کی کوشش کی گئی یا ملکہ معظمہ کی رعایا کے دو طبقوں کے درمیان پھوٹ ڈالی گئی ہے تو انتظامیہ اس سے ایک ہزار سے دس ہزار تک کی ضمانت طلب کر سکتی ہے اور اگر اس کے باوجود اخبار باز نہ آئے تو طلب کی گئی ضمانت ضبط ہو سکتی ہے اور اس اخبار کا پریس بھی ضبط ہو سکتا ہے۔اس کی دفعہ چار اتنی ہمہ گیر تھی کہ کوئی اخبار کتنا ہی محتاط ہو اس کی زد سے نہیں بچ سکتا تھا۔اس قانون کے

خلاف محمد علی جوہر، ظفر علی خاں، ابوالکلام آزاد اور دوسرے قومی رہنماؤں نے باقاعدہ مہم چلائی۔ ظفر علی خاں اس کی منسوخی کے لیے انگلستان تک گئے مگر اسے منسوخ نہ ہونا تھا نہ ہوا اور اسے سیکڑوں مرتبہ آزادیٔ صحافت کو کچلنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ پریس ایکٹ نے ہندوستانی صحافت پر کتنا ظلم کیا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ پریس ایکٹ کے نفاذ کے پہلے پانچ سالوں میں ضمانت کی صورت میں حکومت کے خزانے میں تقریباً پانچ لاکھ روپے کی رقم جمع ہوگئی۔

1857 کی جنگ آزادی کی ناکامی نے مسلمانوں کو عملی طور پر صحافت سے بے دخل کردیا۔ جو اردو اخبارات جاری رہے یا جاری ہوئے ان کے ایڈیٹر دوسری قوم کے لوگ تھے۔ جے نٹراجن''ہسٹری آف انڈین جرنلزم''میں لکھتا ہے:

''...... انقلاب برپا ہوتے ہی شمال مغربی صوبہ جات کے زیادہ تر اخبارات بند ہوگئے۔[3]''

بہرحال بہت دنوں تک خاموشی رہی۔ پھر دھیرے دھیرے کچھ حالات سازگار ہوئے تو اردو صحافیوں نے اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے عوام کی آواز کو اُبھارنے کا آغاز کیا۔ مثال میں 1877 میں جاری ہونے والے ہفت روزہ''اودھ پنچ''کو پیش کیا جاسکتا ہے، جس کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین تھے۔

اخبارات اور صحافی بہت ہیں جو عوام کے حقوق اور آزادی کے لیے قربانیاں دیتے رہے لیکن اب ہم یہاں اردو صحافت کے عناصر اربعہ کا ذکر کریں گے جنھوں نے اپنی قربانیوں سے اردو صحافت کو ہمیشہ کے لیے سرخرو بنادیا۔ ان میں اہم نام حسرت موہانی کا ہے۔

حسرت موہانی نے 1903 میں علی گڑھ سے بی اے کیا۔ اگر وہ چاہتے تو تھوڑی سی کوشش سے معقول سرکاری ملازمت مل سکتی تھی۔ پھر بی اے کرلینے کے بعد انھیں وکٹوریہ کالج گوالیار سے عربی اور ریاضی کی پروفیسرشپ کی پیش کش بھی ہوئی[4]۔ مگر حسرت کی خودداری نے ملازمت کی ذلت گوارا نہ کی اور صحافت کا آزادانہ پیشہ اختیار کیا کہ اپنے نصب العین کو پورا کرسکیں۔ حسرت نے جولائی 1903 سے''اردوئے معلّٰی''کے نام سے ایک جریدہ جاری کیا، جو بیک وقت ادبی، سماجی اور سیاسی ماہنامہ تھا۔ جس نے آگے چل کر برطانوی حکمرانوں کی نیندیں

حرام کر دیں۔ دراصل ان کے دل و دماغ پر غلامی اور برطانوی حکام کے ظلم و استبداد کے خلاف ایسی نفرت تھی کہ وہ زندگی بھر باغی رہے اور صرف صحافت کے ہی ذریعے نہیں بلکہ عملی طور پر سیاست میں حصہ لے کر زندگی بھر لڑتے رہے۔

1908 میں ''اردوئے معلیٰ'' میں برطانوی حکومت کے خلاف ایک مضمون لکھنے کی پاداش میں حسرت کو دو سال قید با مشقت اور پانچ سو روپیہ جرمانے کی سزا ہوئی۔ جرمانے کی وصولی کے لیے ان کے نادر کتب خانے کو جو اس زمانے میں چار ہزار کی مالیت کا تھا محض ساٹھ روپے میں نیلام کر دیا گیا۔

حسرت تعلیم یافتہ تھے۔ عام خیال تھا کہ انھیں لکھنے پڑھنے کا کام دیا جائے گا مگر سیاسی قیدی اور تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود انھیں جیل میں کسی قسم کی مراعات حاصل نہیں ہوئیں بلکہ ان کے ساتھ اخلاقی قیدیوں سے بھی زیادہ بدتر سلوک کیا گیا۔ انھیں نینی جیل میں منتقل کیا گیا تو بیڑیاں پہنا کر لے جایا گیا جو خطرناک ملزموں کو پہنائی جاتی ہیں۔ وہ وہاں لوہار سے کٹوا کر کھلوائی گئیں۔ تقریباً تمام مدت قید میں انھیں ایک من گیہوں روز پیسنا پڑتا۔ حالانکہ عموماً اخلاقی قیدیوں سے بھی ایک یا دو مہینے سے زیادہ چکی نہیں پسوائی جاتی تھی۔

حسرت الٰہ آباد نینی جیل پہنچے تو ان کے ساتھ حوالات کے زمانے کے آئے ہوئے کچھ اخبارات، کتابوں اور کپڑوں کی ایک گٹھری تھی جیل میں داخل ہونے سے پہلے وہ لے لی گئی۔ جیل سپرنٹنڈنٹ نے ان کی عینک بھی چھین لی۔

سزا کی مدت پوری ہونے کے بعد رہا ہوئے تو ان کا حوصلہ اور بلند تھا۔ لہٰذا انھوں نے 1910 میں ''اردوئے معلیٰ'' پھر جاری کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جنگ طرابلس جاری تھی۔ مولانا نے اپنے رسالے میں اٹلی کے خلاف بائیکاٹ کا فتویٰ شائع کیا۔ برطانوی حکومت نے ان کے پریس کے لیے جس سے اردوئے معلیٰ چھپتا تھا اور جس کی کل کائنات ایک کاٹھ کی مشین اور تین پتھر تھے۔ تین ہزار روپے کی ضمانت طلب کی مولانا اتنی بڑی رقم ادا نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا پریس پھر ضبط ہو گیا اور ''اردوئے معلیٰ'' پھر بند ہو گیا۔

1857 کی جنگ آزادی کے بعد حسرت موہانی پہلے مسلمان اور بال گنگادھر تلک کے

بعد دوسرے ہندوستانی رہنما تھے جنھیں سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے انگریزوں کی قید میں بھی رہنا پڑا۔ امداد صابری لکھتے ہیں:

''اس دور میں جب لوگ جیل جانے کی قیمت وصول کر رہے تھے، کھدر پہننے کا معاوضہ وصول کر رہے تھے۔ اس نے اپنی خدمت کے صلے میں ایک پھوٹی کوڑی بھی وصول نہیں کی...... 1950 میں مولانا حسرت موہانی حج بیت اللہ کی واپسی پر پاکستان گئے۔ نیازمندوں نے درخواست کی کہ مولانا آپ پاکستان میں قیام فرمائیں۔ مولانا نے کہا میں ہندوستان کے مسلمانوں کو اس برے وقت میں چھوڑ دوں صرف اپنی آسائش کے لیے پاکستان چلا آؤں ایسا نہیں ہوسکتا[5]۔''

حسرت موہانی انڈین کانگریس، مسلم لیگ اور کمیونسٹ پارٹی کے نہایت سرگرم ممبر رہے۔ لیکن وہ جہاں بھی رہے ہندوستان کی مکمل آزادی اور ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ بلند کرتے رہے۔ تاریخ آزادی میں حسرت کا نام سنہرے حرفوں میں لکھا جائے گا۔

عناصر اربعہ کے دوسرے رکن مولانا محمد علی جوہر ہیں۔ وہ ایک ہمہ گیر عہد آفریں شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک سرفروش مجاہد آزادی، مسلم الثبوت صحافی، نامور شاعر، شعلہ بیان مقرر اور بہترین انگریزی داں تھے۔

مولانا نے سیاست میں کامیابی کے لیے صحافت کو حربے کے طور پر استعمال کیا۔ انھوں نے زمانہ طالب علمی ہی سے کالج میگزین اور دوسرے اخبارات اور رسائل میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ریاست بڑودہ کی ملازمت کے زمانے میں بھی وہ مضامین لکھتے رہے۔ اس دوران ''ٹائمز آف انڈیا'' میں ان کے مضامین خصوصیت سے شائع ہوتے۔ لاہور کے ''آبزرور'' اور ''ہندوستانی ریویو'' میں پہلے ہی ان کے مضامین شائع ہوتے تھے۔

مولانا کی صحافت کی باقاعدہ ابتدا 14 رجنوری 1911 میں ہوئی جب انھوں نے اپنا انگریزی ہفت روزہ ''کامریڈ'' کلکتہ سے جاری کیا۔ 1913 میں برطانوی حکومت نے اپنا دارالخلافہ کلکتہ سے دہلی منتقل کیا تو مولانا بھی ''کامریڈ'' کو دہلی لے آئے۔ مولانا جدید تعلیم سے

بہرہ ور اور نباضِ وقت تھے۔ لہٰذا کامریڈ میں صحافت کے جدید رجحانات کو اس طرح سمودیا کہ اس نے بہت جلد عوامی مقبولیت حاصل کر لی۔ ارکان پارلیمنٹ سے لے کر گورنر، وائسرائے تک اس کو پڑھنے لگے۔ لیکن یہ سب کچھ اسی وقت تک تھا جب تک مولانا محمد علی جوہر کا نام برطانوی حکام کے معتوبوں میں شمار نہیں ہوا تھا۔

مولانا محمد علی جوہر کا دوسرا صحافتی کارنامہ روزنامہ ''ہمدرد'' تھا۔ اسے انھوں نے فروری 1913 میں دہلی سے جاری کیا۔ مولانا ''ہمدرد'' سے دو کام لیتے ایک تو اس وقت مسلم ممالک میں ہو رہی جنگوں کی صحیح صورت حال سے ہندوستانیوں کو باخبر رکھتے۔ دوسرے عیسائی ذرائع سے موصول خبروں کا تجزیہ منطقی و استدلالی طریقے سے کرتے جس سے انگریزوں کی دروغ گوئی اور کردار سامنے آتا۔

1920 میں مولانا نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی والوں کو عدم تعاون اور ترک موالات کی تحریکات میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ کچھ طلبہ اس کی طرف متوجہ بھی ہوئے۔ مگر حکام نے نہ صرف یہ کہ توجہ نہ دی بلکہ ان کے ساتھ توہین آمیز سلوک کیا۔ مولانا نے اپنے ہم نواؤں کی ایک جماعت کے ساتھ علی گڑھ میں ہی مسلم یونیورسٹی کی حدود سے باہر خیموں کے اندر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد ڈالی۔ پھر کچھ عرصے بعد یہ درسگاہ دہلی منتقل ہو گئی۔

1914 میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو ترکی نے جرمنی کی طرفداری کی، جبکہ اسے دھمکی دی گئی تھی کہ وہ غیر جانبدار رہے۔ ''لندن ٹائمس'' نے اس پر ترکی کے خلاف ایک سخت مضمون لکھا۔ مولانا نے ''لندن ٹائمس'' کے جواب میں ایک مضمون "Choice of the Turks" کے عنوان سے لکھ کر کامریڈ میں شائع کیا، جس میں ترکوں کو اپنے اس انتخاب میں حق بجانب دکھایا تھا۔ برطانوی گورنمنٹ اس پر چراغ پا ہوگئی اور کامریڈ کی دو ہزار کی ضمانت ضبط کر کے دس ہزار کی ضمانت مانگ لی گئی۔ نتیجے کے طور پر یہ اخبار بند ہوگیا۔ اکتوبر 1914 میں اسے پھر سے شروع کیا گیا مگر مولانا کی عدیم الفرصتی و دیگر پریشانیوں کی وجہ سے بارہ تیرہ مہینے ہی جاری رہ سکا۔

''کامریڈ'' میں ہر طرح کے مضامین چھپتے تھے۔ کانپور کی مسجد کے سانحے پر حاکم اعلیٰ سر جیمس مسٹن کی خوب خبر لی۔ مثال کے لیے ''کامریڈ'' میں شائع چند مضامین کے عنوانات درج

ذیل ہیں:

1- The Kanpur Case. 16-8-1913

2- The Kanpur Sacrilege. 5-6-1913

3- The Kanpur Tragedy. 9-8-1913

4- The Restoration of Kanpur Mosque. 25-7-1913

5- Muslim Press and Press Act. 20-91913

1920 کے وسط میں وہ خلافت کا وفد لے کر انگلستان گئے۔ واپس آنے پر خلافت تحریک تو ختم ہوگئی مگر تحریک ترکِ موالات زوروں پر چل رہی تھی۔ مولانا نے اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے پورے ملک کا سفر کر کے جلسوں، کانفرنسوں سے خطاب کر کے عوام میں بیداری کی ایک لہر دوڑا دی۔

تحریک ترکِ موالات کی حمایت اور کراچی خلافت کانفرنس میں تقریر کرنے کے جرم میں آپ پر پھر مقدمہ چلا اور جیل بھیج دیے گئے۔ 1923 میں رہا ہوئے۔

مولانا محمد علی جوہر کے ہم عصروں میں ایک بڑا نام ظفر علی خاں کا ہے وہ بھی اسی مادرِ علم و فضل کے پروردہ تھے جہاں محمد علی جوہر نے تعلیم و تربیت حاصل کی تھی۔ ظفر علی خاں ایک حق گو و بیباک صحافی ہی نہیں بلکہ جنگ آزادی کے ایک ایسے سپاہی بھی تھے کہ ان کے ذکر کے بغیر ہماری تاریخ آزادی نامکمل رہے گی۔ انھوں نے برطانوی حکومت کی سیہ کاریوں کا اس جرأت کے ساتھ پردہ فاش کیا، اس کے خلاف اتنی بے لاگ تنقید کی کہ دلوں سے انگریزوں کا رُعب و دبدبہ دور ہوگیا۔ جذبۂ حریت کو اس طرح بیدار کیا کہ دبے کچلے لوگ بھی حصول آزادی کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ظفر علی خاں کے بارے میں، جلیان والا باغ میں گولی چلوانے والے ظالم وحشی مائیکل اڈوائر نے ایک رپورٹ میں لکھا:

> ''ظفر علی خاں اور محمد علی جوہر ماں کے پیٹ سے بغاوت کا قلم لے کر نکلے ہیں۔ انگریز دشمنی ان کی فطرت میں شامل ہے کوئی عام منصوبہ شروع کرنے سے پہلے ان کو گرفتار کرنا ضروری ہے[6]۔''

مولانا کے بارے میں علامہ اقبال نے لکھا:

''ظفر علی خاں غیر معمولی دل و دماغ کے آدمی ہیں۔ان کی ہمت بہت بلند ہے۔ان کا قلم اپنی روانی میں دنیا کے بڑے بڑے مجاہدین کی تلوار سے کم نہیں[7]۔''

ظفر علی خاں 1873 میں سیالکوٹ کے ایک گاؤں کوٹ میرتھ میں پیدا ہوئے۔علی گڑھ سے B.A اول درجے میں کرنے کے بعد حیدر آباد میں مترجم کے عہدے پر کام کرنے لگے۔وہیں سے ''فسانہ'' اور ''دکن ریویو'' نام کا ادبی ماہنامہ شروع کیا۔اسی زمانے میں ''بمبئی گزٹ'' اور ''ٹائمز آف انڈیا'' میں لکھنا شروع کردیا تھا۔مختلف وجوہات کی بنا پر ظفر علی خاں حیدر آباد سے پنجاب آ گئے۔یہاں ان کے والد نے ریٹائر ہونے کے بعد ایک ہفت روزہ ''زمیندار'' جاری کررکھا تھا۔پنجاب آنے کے بعد ہی والد کی وفات ہوگئی۔لہٰذا ظفر علی خاں نے اس کی ادارت سنبھالی اور جلد ہی اپنے آبائی وطن کرم آباد سے اسے لاہور لے آئے۔5/اکتوبر 1911 سے ''زمیندار'' روزنامہ ہوگیا۔اسی دوران اٹلی نے طرابلس پر حملہ کردیا۔جنگ طرابلس و بلقان کی خبروں، یورپی سیاست اور عالم اسلام کے اتحاد پر مولانا کے پرجوش اداریوں کی وجہ سے اس کی اشاعت ایک سال کے اندر چھ سات سو سے بڑھ کر پچیس ہزار تک پہنچ گئی۔ہر شخص صبح سویرے ''زمیندار'' کا منتظر رہتا۔سرحد کے ناخواندہ لوگ اسے دو پیسے میں خرید کر ایک آنے میں پڑھوا کر سنتے۔اس طرح اس کی آواز لاکھوں تک پہنچی۔

ظفر علی خاں نے ''زمیندار'' کے ذریعے نہ صرف خبریں اور جنگ کے حالات وکوائف پہنچائے بلکہ اس کے ذریعے اپیل کرکر کے، طرابلس اور بلقان کے مظلوموں کے لیے لاکھوں روپے چندہ جمع کرکے ترکی بھجوایا۔لہٰذا یہ برطانوی حکومت کے دلوں میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا۔نتیجہ یہ ہوا کہ پریس ایکٹ کے تحت زمیندار روزانہ اور ہفت روزہ سے الگ الگ ایک ہزار کی ضمانت طلب کرلی گئی۔جو مولانا نے جمع کرادی۔

1912 میں زمیندار اسٹیم پریس قائم ہوا جس میں یہ چھپنے لگا۔اخبار کی حالت مستحکم ہوگئی تو مولانا پریس ایکٹ کی منسوخی کے سلسلے میں لندن روانہ ہوگئے۔جولائی 1913 میں واپس آئے تو

کانپور کی مسجد کا واقعہ پیش آیا۔ اس کے خلاف ''زمیندار'' میں سخت تنقید کی۔ حکومت اس کی تاب کہاں لاسکتی تھی۔ دو ہزار کی ضمانت ضبط کر کے دس ہزار کی ضمانت طلب کر لی جو داخل کر دی گئی اور زمیندار کی اشاعت جاری رہی۔ اس کے کچھ عرصے بعد ظفر علی خاں دوبارہ انگلستان چلے گئے۔ حکومت نے جنوری 1914 میں دس ہزار کی ضمانت ضبط کر لی ساتھ ہی اسٹیم پریس بھی ضبط ہو گیا۔ اس وقت اس کی قیمت پچاس ہزار روپے تھی۔ ضمانت اور پریس ضبطی کی اطلاع ظفر علی خاں کو لندن میں تار کے ذریعے دی گئی۔ اُنھوں نے ہدایت بھیجی کہ نئے پریس کا انتظام کر کے ہر صورت میں ''زمیندار'' کی اشاعت جاری رکھی جائے۔ 1915 میں مسلم پرنٹنگ پریس کے نام سے دوسرا پریس قائم ہوا۔

20 ستمبر 1914 کو ظفر علی خاں انگلستان سے واپس لوٹے تو حکومت پنجاب کے حکم سے دسمبر 1914 میں ان کو کرم آباد میں نظر بند کر دیا گیا اور ان سے بیس ہزار روپے کا مچلکہ اور بیس ہزار روپے کی شخصی ضمانت طلب کر لی گئی۔ یہ نظر بندی 1919 تک چلی۔ اس دوران حکومت کی سختیاں اور خبروں پر سنسر اتنا بڑھا کہ ان کی بیگم نے تنگ آ کر ''زمیندار'' کو بند کر دیا۔ یہ 1916 سے 1920 تک بند رہا۔ 1920 میں اسے دوبارہ جاری کرنے کی اجازت ملی، مگر دو ہزار کی ضمانت طلب کر لی گئی جو جمع کرا دی گئی۔ جولائی 1920 میں سابقہ ضمانت اور مسلم پریس ضبط کر کے نئی ضمانت مانگی گئی۔

15 ستمبر 1920 کو لاہور اسٹیشن سے مولانا کو گرفتار کر کے ان پر ''حضرو'' کے ایک جلسے میں تقریر کرنے کے سلسلے میں مقدمہ چلایا گیا۔ مجسٹریٹ کے سامنے انھوں نے تقریر کرنے کا برملا اقرار کیا۔ چنانچہ مجسٹریٹ نے پانچ سال قید بامشقت اور ایک ہزار روپیہ جرمانہ اور دوسرے جرم میں دو سال قید کی سزا سنائی۔ یہ دونوں سزائیں ایک ساتھ شروع ہوئیں۔ اس سلسلے میں غلام حسین ذوالفقار لکھتے ہیں:

> ''مقدمۂ بغاوت کی سماعت 30 ستمبر کو ختم ہو گئی۔ مگر فیصلہ 27 راکتوبر کو سنایا۔ اس عرصے میں ظفر علی خاں کو حوالات اور سنٹر جیل کے ایک تنگ و تاریک کمرے میں بند رکھا گیا۔ جہاں نہ میز تھی نہ کرسی۔ سات آٹھ مربع

فٹ کے ڈربے میں ایک ٹوٹی پھوٹی چارپائی تھی۔ رفع حاجت کے لیے بھی اسی کمرے میں ایک کونے میں انتظام تھا۔ جیل میں جتنی عقوبت اور اذیت دی جا سکتی تھی وہ انھیں پہنچائی گئی۔ یہ صرف اس لیے کہ وہ گھبرا کر معافی مانگ لیں اور تحریک سے الگ ہو جائیں[8]۔''

پانچ سال کی یہ سزا کاٹ کر نومبر 1924 کو رہا ہوئے۔ 1925 میں منصور پریس کے نام سے اس کے لیے تیسرا پریس لگایا گیا۔ 1926 میں ''زمیندار'' کے ایڈیٹر سید لال شاہ کو ایک سال کی قید ہوئی اور زمیندار سے پانچ ہزار کی ضمانت مانگی گئی۔ 1927 میں پلول کے ایک دریدہ دہن کی گستاخی پر مولانا نے ایک نظم لکھ کر شائع کی جس کے باعث پانچ ہزار کی ضمانت ضبط ہوگئی۔ اس ضبطی کے بعد مولانا نے اکتوبر 1927 کو حکم کا پورا متن معہ ترجمہ اور وہ نظم دوبارہ زمیندار میں چھاپ دی۔ جس پر پانچ ہزار کی ضمانت ضبط ہوگئی اور تین ہزار کی ضمانت مانگ لی گئی۔

1930 میں نمک سازی کے معاملے میں مولانا کو گجرات جیل میں نظر بند کر کے زمیندار سے تین ہزار کی ضمانت طلب کی گئی۔ کشمیر ایجی ٹیشن میں شہید الٰہی بخش کے نام سے 1931 میں نظم لکھی جس پر پانچ ہزار کی ضمانت ضبط ہوئی اور دس ہزار کی ضمانت مانگ لی گئی۔ 1934 ''تعزیرِ جرم عشق'' نظم لکھنے اور شائع کرنے پر منصور پریس ضبط کر لیا گیا۔ 1937 میں مسلم لیگ تنظیم میں حصہ لینے پر زمیندار سے تین ہزار کی ضمانت ضبط کر کے پانچ ہزار کی ضمانت طلب کر لی گئی۔ 1940 میں ''خاکساروں'' پر گولی چلی۔ زمیندار نے اس پر زبردست تنقید کی جس کی وجہ سے پانچ ہزار کی ضمانت ضبط ہوگئی۔ 1946 میں ''فسادات بہار کا قاتل کون؟'' اداریہ لکھنے پر پانچ ہزار کی ضمانت ضبط ہوئی۔

''زمیندار'' کی تفصیلات 1947 ہی تک دستیاب ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ 1947 میں بند ہوگیا۔ زمیندار نے اپنے ہم عصر اخباروں میں سب سے زیادہ قربانیاں دیں۔ یہ اخبار پندرہ بار ضبط ہوا۔ اس کے تین پریس ضبط ہوئے۔ زمیندار کی ضبطیوں اور مولانا کی گرفتاریوں کے ساتھ ادا کیے گئے جرمانوں میں ڈیڑھ لاکھ روپیہ ادا کیا گیا۔ مگر برطانوی حکومت اپنی تمام تر بربریت، جارحیت، قوت واستحکام کے باوجود ظفر علی خاں کو حق گوئی اور تحریک آزادی کو

فروغ دینے سے باز نہ رکھ سکی۔

عناصر اربعہ کے چوتھے رُکن مولانا ابوالکلام آزاد ہیں۔ اُنھوں نے جس وقت ہوش سنبھالا، برطانوی اقتدار کے استحصالی رویے کی وجہ سے یہ ملک مفلسی اور بربادی کی انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ مولانا جیسا حساس، حق پرست اور محبت وطن انسان ایسے موقع پر خاموش کیسے رہ سکتا تھا۔ وہ ملک کی سلامتی، آزادی اور خوش حالی کے لیے تحریک آزادی میں پورے جوش وخروش کے ساتھ شامل ہو گئے۔ وہ اس میدان میں نہ کسی مجبوری کے تحت آئے نہ کسی فائدے کے خیال سے۔ اُنھوں نے اس میدان میں یہ سمجھ کر قدم رکھا تھا کہ یہ خسارے کا معاملہ ہے۔ مولانا کے والد عالم دین اور معروف و مقبول پیر تھے۔ ان کے مریدوں کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ مولانا اگر اپنی خاندانی روایات کی پیروی کرتے تو ان کی زندگی عیش وآرام میں گزر سکتی تھی۔ مولانا نے جس وقت سیاست میں قدم رکھا ان کی عمر بمشکل اٹھارہ سال تھی اور پھر پوری زندگی ہندوستانی عوام کی فلاح و بہبود کی نذر کر دی۔ وہ ''قول فیصل'' میں لکھتے ہیں:

> ''میں مسلسل بارہ سال سے اپنی قوم وملت کو آزادی وحق طلبی کی تعلیم دے رہا ہوں۔ میری اٹھارہ برس کی عمر تھی جب میں نے اس راہ میں تحریر وتقریر شروع کی۔[9]''

برطانوی حکومت اپنے مفاد کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں میں منظم طور پر نفرت پیدا کر رہی تھی۔ لہٰذا مولانا سمجھتے تھے کہ آپسی نفاق آزادی کی راہ کا سب سے بڑا روڑا ہے۔ لہٰذا وہ قومی اتحاد کے لیے پوری زندگی جد و جہد کرتے رہے۔ متحدہ قومیت کو قائم رکھنے اور فروغ دینے کے لیے اپنی تمام تر ذہنی، علمی اور استدلالی صلاحیتیں صرف کر دیں اور آخر تک اس پر قائم رہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کو ابتدا سے ہی صحافت سے دلچسپی تھی۔ تحریک آزادی میں سرگرم ہونے کے بعد انھوں نے محسوس کیا کہ عوام میں انقلابی جذبے کو فروغ دینے اور تحریک آزادی کو موثر بنانے کے لیے ایک اخبار جاری کرنا چاہیے۔ لہٰذا 1912 میں ''الہلال'' جاری کیا۔ الہلال اخبار ہی نہیں بلکہ ایک مشن بھی تھا، جس کے پیچھے ایک سوچا سمجھا ہوا لائحۂ عمل تھا۔ جد و جہد آزادی کو فروغ دینے کے علاوہ اس کا مقصد ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنا بھی تھا۔ چنانچہ اپنے

مشن، مولانا کے اسلوب اور جذبات کی صداقت کی وجہ سے بہت جلد مقبول خلائق ہوگیا اور اس کی تعداد اشاعت 26 ہزار تک پہنچ گئی۔ چھوٹے قصبے اور دیہاتوں میں لوگ گروہوں میں بیٹھ کر اس کے مضامین سنتے اور اگلے شمارے کا بے چینی سے انتظار کرتے تھے۔

برطانوی حکومت ''البلال'' کی بڑھتی مقبولیت اور باغیانہ عناصر سے خائف ہوگئی اور 1913 میں اس سے دو ہزار کی ضمانت طلب کرلی جسے مولانا نے جمع کرادیا۔ مگر اخبار کی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں کی تو حکومت نے دو ہزار کی ضمانت ضبط کر کے دس ہزار کی ضمانت طلب کرلی۔ بہت جلد یہ ضمانت بھی ضبط ہوگئی۔ پھر بھی مولانا نے اپنا موقف نہیں بدلا تو حکومت نے البلال پریس ضبط کرلیا۔ کچھ عرصے بعد مولانا نے البلاغ پریس قائم کیا اور البلال کو البلاغ کے نام سے نکالنے لگے۔ ابھی چند مہینے ہی گزرے تھے کہ حکومت بنگال نے انھیں حدود بنگال سے نکل جانے کا حکم جاری کردیا۔ بنگال سے نکل کر وہ رانچی کے مضافات کے ایک گاؤں میں مقیم ہوئے۔ تین مہینے بعد یعنی جولائی 1916 کو حکومت نے انھیں وہیں نظر بند کردیا۔ ان کی نظر بندی 1919 کے آخر تک چلتی رہی۔ ایسی صورت میں البلاغ بھی جاری نہ رہ سکا۔ البلال انھوں نے جولائی 1927 کو پھر شروع کیا مگر یہ دسمبر 1927 میں پھر بند ہوگیا۔ البلال کے تسلسل سے جاری نہ رہنے کی بنیادی وجہ مولانا کی عملی سیاست میں سرگرمی اور روز روز کی گرفتاری و نظر بندی تھی۔ کم عمر کے باوجود البلال اور البلاغ نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے وہ آب زر سے لکھے جانے کے لائق ہیں۔ سجاد انصاری لکھتے ہیں:

> ''البلال نے ہندوستان کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو اس طرح بیدار کردیا جس طرح نفخ صور سے لاکھوں برس کے سوئے ہوئے انسان زندہ ہوجائیں گے۔''

1920 میں خلافت تحریک شروع ہوئی تو اس میں مولانا آزاد نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اسی زمانے میں گاندھی جی نے عدم تعاون کی تحریک شروع کی تو اس تحریک کے لیے رائے عامہ ہموار کرنے کی غرض سے گاندھی جی، مولانا شوکت علی، محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد ہندوستان کے دورے پر نکلے۔ ان دونوں تحریکات میں حصہ لینے کی وجہ سے مولانا آزاد اور

سی آر داس کو گرفتار کر لیا گیا جو دسمبر 1923 کو رہا ہوئے۔

برطانوی حکام نے نمک قانون نافذ کیا تو کانگریس نے 1930 سے ستیہ گرہ شروع کی۔ پھر گرفتاریاں ہوئیں اس بار مولانا آزاد کو ڈیڑھ سال کے لیے میرٹھ جیل میں رکھا گیا۔ 1939 میں مولانا آل انڈیا کانگریس پارٹی کے صدر بنے۔ دوسری عالمی جنگ شروع ہوگئی تھی۔ برطانیہ بھی جنگ میں ملوث تھا اور ہندوستانیوں کا جنگ میں تعاون چاہتا تھا۔ کانگریس پارٹی نے ہندوستانی عوام کے جنگ میں تعاون نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ 1941 میں دوسرے لیڈروں کے ساتھ مولانا کو پھر گرفتار کر لیا گیا۔ جنگ میں تعاون کے مسئلے پر بات چیت کرنے کے لیے 1942 میں کرپس مشن آیا تو مولانا آزاد اور جواہر لال نہرو کو رہا کر دیا گیا۔ یہ گفتگو ناکام ہوگئی اور گاندھی جی نے جولائی 1942 کو ''ہندوستان چھوڑو'' تحریک شروع کر دی۔ چنانچہ تمام بڑے لیڈروں کے ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد کو بھی گرفتار کر کے احمد آباد اور بانکوڑہ جیل میں رکھا گیا۔ اس بار وہ جون 1945 تک قیدِ فرنگ میں رہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی شادی 1907 میں زلیخا بیگم سے ہوئی تھی۔ انھیں دق کا مرض لاحق ہوگیا جس کا اس وقت کوئی علاج نہیں تھا۔ سیاسی مصروفیات اور قید و بند کی وجہ سے مولانا کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ اپنی شریکِ حیات کی صحت پر پوری توجہ دے سکیں۔ چنانچہ 9/اپریل 1943 کو زلیخا بیگم کا انتقال ہوگیا۔

11/اپریل 1943 کو اپنے خط میں مولانا حبیب الرحمن شیروانی کو اپنی اہلیہ کے انتقال کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ جیل میں جب مولانا کو خط و کتابت کی اجازت ہوتی تھی تو ان کی اہلیہ کے خط برابر آتے رہتے تھے۔ مگر مرض کی شدت کے باوجود اپنی طبیعت کی خرابی کا ذکر اس لیے نہیں کرتی تھیں کہ مولانا جیل میں پریشان ہو جائیں گے۔

زلیخا بیگم کا انتقال ہوا تو مولانا قید میں تھے۔ ان کی آخری رسومات میں بھی شامل نہیں ہو سکے۔ رہا ہونے کے بعد کلکتہ آئے اور زلیخا بیگم کی قبر پر گئے۔ کہا جاتا ہے کہ مولانا کا صبر و تحمل مثالی تھا۔ بڑی سے بڑی پریشانی اور مصیبت میں بھی صبر و تحمل کا دامن ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹا مگر زلیخا بیگم کی قبر پر پہنچ کر ضبط کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور سر جھکائے بہت دیر تک

روتے رہے۔

دار و رسن کی ان تمام آزمائشوں کے باوجود صحافیان اردو لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں، گوکہ اب انھیں بھلا دیا گیا ہے مگر جب بھی کوئی منصف مزاج تاریخ نویس جنگ آزادی کی تاریخ لکھے گا تو انھیں نظر انداز نہیں کرسکتا۔

مذکورہ بالا صحافیوں کے علاوہ بھی بہت سے اردو کے صحافی اور اخبارات ہیں جو اپنے محدود دائروں میں رائے عامہ ہموار کرتے رہے، جنگ آزادی کو فروغ دیتے اور آوازِ حق کو بلند کرتے رہے۔ مگر سب کا ذکر یہاں ممکن نہیں یہاں صرف ان لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جو میر کارواں اور سالار کارواں تھے۔

## حوالے:


1- محمد عتیق صدیقی: ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں۔ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ۔ 1957۔ ص:46

2- عبدالسلام خورشید: صحافت پاکستان و ہند میں۔ مجلس ترقی ادب، لاہور۔ 1963، ص:59

3- J. Natrajan, History of Indian Journalism, Publication Division. N.Delhi.1955, p.68

4 - امداد صابری: تاریخ صحافت اردو۔ جلد سوم۔ چوڑی والان، دہلی۔ 1953۔ ص:5

5- امداد صابری: تاریخ صحافت اردو۔ جلد سوم۔ چوڑی والان، دہلی۔ 1953۔ ص:5

6،7- محمد افتخار کھوکھر: تاریخ صحافت۔ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد۔ 1995، ص:98

8- غلام حسین ذوالفقار: مولانا ظفر علی خاں: حیات، خدمات و آثار۔ سنگ میل پبلی کیشن، لاہور، 1993

9- محمد افتخار کھوکھر: تاریخ صحافت۔ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد۔ 1995، ص:86

# عبدالماجد دریابادی
## بااصول صحافت کا صاحبِ اسلوب علمبردار

پروفیسر تحسین فراقی

اردو کے صاحب اسلوب ادیب، نامور فکر کار اور منفرد مفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریابادی (1892-1977) اپنی جن چند حیثیتوں کے باعث دنیائے ادب میں ایک مدت تک یاد رکھے جائیں گے، انھی میں ان کی ایک بہت نمایاں حیثیت صحافی کی بھی ہے۔ صحافت ان کے لیے پیشہ یا کاروبار نہ تھی بلکہ خیر اور صداقت سے عبارت سرگرمی تھی۔ ان کی باقاعدہ صحافت کا آغاز جنوری 1925 سے ہوا اور وہ اپنی وفات سے چند ماہ قبل تک اس سے پوری طرح وابستہ رہے۔ یہ عرصہ نصف صدی سے کچھ زائد برسوں کو محیط ہے، گویا دو چار برس کی بات نہیں۔ اس عرصے میں اُنھوں نے اپنے کثیرالجہات قلم سے فضا میں ارتعاش پیدا کیا۔ بہت سی فکری لڑائیاں لڑیں، کئی معاصرین سے قلمی معرکے کیے۔ تہذیب مغرب کی بے اصلی، سطح بینی اور شدید مادیت پرستی کو نمایاں کرتے رہے۔ تقسیم کے بعد ہندوستان میں اعلیٰ اقدار اور اردو کا علم بلند کیے رہے۔ ایک بڑے اور سچے شخص کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے باطن کے خلاف گواہی نہیں دیتا اور اپنے اندر کی آواز پر کان

لگائے رہتا ہے۔ ماجد کی شخصیت جس صداقت سے عبارت تھی، اس کا اظہار ان کے ادب و انشاء اور ان کی دینی تحریروں کے علاوہ ان کی صحافت میں بھی اس بیبا کی سے ہوا کہ تقسیم کے بعد کے ہندوستان میں ان جیسا قلم اور ان جیسا دبنگ لہجہ بہت کم اردو صحافیوں کے حصے میں آیا۔ صحافت ان کے لیے عبادت تھی اور انھوں نے اس کا حق بخوبی ادا کیا۔

بیسویں صدی کا ہندوستان جس آتش فشاں التہابی دور سے گزر رہا تھا اس میں ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی، محمد علی جوہر اور ظفر علی خاں نے اردو صحافت میں ایک نئے آہنگ اور جرأت و بے خوفی کے ایک نئے اسلوب کی طرح ڈالی تھی۔ ظفر علی خاں نے تو کہنا چاہیے کہ صحافیوں کی ایک پوری نسل تیار کردی جس میں مہر، سالک اور شورش کاشمیری قابلِ ذکر ہیں۔ دریابادی صاحب کو محمد علی جوہر کے ساتھ ایک عرصے تک کام کرنے اور مکاتبت کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اس لیے یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ اُنھوں نے غیر معمولی بیبا کی اور مستقبل سے بے نیازی اور بے خوفی کی روایات دراصل محمد علی جوہر اور ان کے 'ہمزاد' کا مریڈ' سے ورثے میں پائی تھیں۔ وہی محمد علی جن کے بارے میں ایچ جی ویلز نے کہا تھا کہ اُنھوں نے برک کی زبان، میکالے کا قلم اور نپولین کا دل پایا ہے۔

مولانا ماجد نے اپنی باقاعدہ صحافیانہ زندگی کا آغاز اپنے اس مراسلے سے کیا جو 1904 میں، جبکہ وہ بارہ برس کے تھے، اودھ اخبار میں شائع ہوا تھا۔ جوں جوں ان کے قلم میں قوت اور روانی آتی گئی، ان کی تحریروں کی اشاعت کا دائرہ بھی پھیلتا گیا۔ چنانچہ ان کے علمی، ادبی، مذہبی مضامین ضیاء الاسلام، العصر، صبح اُمید، حقیقت، معارف، ہمدم اور ہمدرد وغیرہ میں شائع ہونے لگے۔ اس دَور میں ماجد نے خود کو محض اردو مضمون نگاری ہی تک محدود نہیں رکھا بلکہ انگریزی میں بھی مضامین اور تبصرے لکھنے لگے جو ایڈووکیٹ، نیچر، سیٹر ڈے ریویو، ماڈرن ریویو، انڈین ریویو، تھیوسوفسٹ اور ایسٹ اینڈ ویسٹ میں شائع ہوتے رہے۔

1919 کے آس پاس ماجد نے سب سے پہلے ''معارف'' میں مستقل شذرہ نگاری کا آغاز کیا۔ ان شذرات کے موضوعات ادبی اور علمی بھی ہوتے تھے اور سیاسی اور سماجی بھی۔ یہ شذرات ان کی ''سچی باتیں'' کے، جو سچ، صدق اور صدقِ جدید کا مستقل عنوان ہوا کرتی تھیں اور

جنھیں ہندو پاکستان کے بیشتر اخبارات اور رسائل نقل کیا کرتے تھے، پیش رو کہے جاسکتے ہیں۔ ان میں بھی وہی حکمت، مغرب کے معاملے میں اعتماد، نکتہ آفرینی اور عبرت آگینی ہوتی تھی جو سچی باتوں کا طرۂ امتیاز تھا۔ سیاسی، سماجی، تہذیبی اور اخلاقی سطح پر ہونے والے واقعات ان شذرات کے لیے غذا مہیا کرتے تھے۔

یہ بات معلوم ہے کہ رسالے ''الناظر'' میں وہ 1922 سے 1924 تک شذرات لکھتے رہے۔ اس کے ایڈیٹر ظفر الملک کے ساتھ ان کی دوستی اور قلمی تعاون کا نتیجہ تھا کہ دونوں نے ہفت روزہ ''سچ'' کا ڈول ڈالا اور جنوری 1925 میں اس کا پہلا شمارہ منصۂ شہود پر آیا۔ ابتدا میں اس پرچے کے ایڈیٹر ظفر الملک تھے لیکن اگست 1925 میں ماجد اس کے ایڈیٹر بن گئے اور ظفر الملک اس کے منیجر۔ ''سچ'' کی پیشانی پر ایک فارسی شعر مستقل طور پر درج ہوتا تھا:

راستی موجب رضائے خداست کس ندیدم کہ گم شد از رہ راست (سعدیؒ)

''سچ'' کے آغاز کے ساتھ اس کے دوسرے ہی نمبر سے عبدالماجد نے اس میں ''سچی باتیں'' کے مستقل کالم کا آغاز کیا جس کا سلسلہ ان کی وفات سے چند ماہ پہلے تک جاری رہا اور جو اپریل 1985 تک (یہ تاریخ ''صدق جدید'' کی بندش کی ہے۔ حکیم عبدالقوی صاحب نے خرابیِ صحت کی بنا پر اس کی اشاعت بند کردی) دوبارہ صدق اور سچ کے پرانے شماروں سے برابر نقل ہوتی رہیں۔ مولانا کی قرآن وسنت سے وابستگی اور اسلام سے والہانہ عقیدت، وہ چیزیں ہیں جن سے ''سچ'' کے کم وبیش سارے مشمولات ترتیب پاتے تھے۔

مولانا ماجد کے ادبی وعلمی مباحثوں اور مناقشوں کے ضمن میں ان کے طریق کار کو سمجھنا بے حد ضروری ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ خود اُنھوں نے ایک موقع پر اپنے حریف کو پچھاڑنے کے لیے اپنے طریق کار کی وضاحت کردی تھی:

> ''میری صحافتی Strategy (تدبیرِ جنگ) کو بھی اس سلسلے میں یاد رکھ لیا جائے۔ میں ملت کے مجرم کو زیادہ سے زیادہ isolate (یک وتنہا) کرلینا چاہتا ہوں۔ صرف مشتبہ یا خفیف قصور والوں کو اس سے الگ رکھنا چاہتا ہوں کہ مجرموں کو دوسروں کی آڑ اور سہارا لینے کا موقع کم سے کم مل سکے—

باقی تمام کمزوریوں سے بلند تر رہنے کا دعویٰ اپنے حق میں کیسے کرسکتا ہوں؟''[1]

علمی وادبی مباحثوں اور مجادلوں کے سلسلے میں عبدالماجد صاحب کی تدبیر جنگ یہ تھی کہ وہ حریف کو بالکل یکہ وتنہا کر دیتے تھے۔ اس سے ان کے طریق کار کے سائنٹیفک ہونے کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ وہ عظیم بیگ چغتائی کی قابل اعتراض کتب پر شور خیزی کا معاملہ ہو یا ''انگارے'' کے سلسلے میں تائید اندوزی کا، ''محشر خیال'' کی حد درجہ آزادہ روی کے خلاف رائے عامہ ہموار کرنے کا معاملہ ہو یا سینٹ گبریل میگزین میں حضور اکرمؐ کی ذاتِ بابرکات کی شان میں گستاخی پر مبنی مواد کی مذمت کا، جوزف ہیل کی کتاب ''عربوں کا تمدن'' میں قابل اعتراض مواد کا مسئلہ ہو یا یگانہ کے خلاف محاذ آرائی کا، نیاز فتحپوری کے خلاف صف بندی کا معاملہ ہو یا شاہد احمد دہلوی کو ''امہات الامہ'' کو دوبارہ شائع کرنے سے باز رکھنے کا، عبدالماجد نے ہر جگہ وہی حربہ استعمال کیا ہے، جسے سہولت کے لیے ہم ''تنہا کردن'' سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ان تمام معرکوں اور مجادلوں میں ان کی کامیابی کا سبب یہی تھا کہ وہ ان مسائل پر اس تفصیل سے اور زورِ قلم کی اس شدت سے لکھتے تھے کہ بالآخر وہ مسئلہ عوامی بن جاتا تھا اور ظاہر ہے کہ اس سیلاب کو روکنا آسان نہیں ہوتا۔

عبدالماجد کی یہ قلمی معرکہ آرائی صرف برعظیم ہی میں چھپی ہوئی کتابوں یا تحریروں کے سلسلے میں نہیں تھی بلکہ اس کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ چنانچہ جب رنگون کے سینٹ گبریل اسکول کی میگزین میں حضور اکرمؐ کے بارے میں ایک ناشائستہ مضمون شائع ہوا تو ماجد نے اس کے خلاف بھی شدید ردِ عمل ظاہر کیا اور نتیجہ یہ کہ نہ صرف اس میگزین کو واپس لے لیا گیا بلکہ مدیر موصوف کو بھی معذرت نامہ داخل کرنا پڑا[2]۔ اسی طرح وہ صدق کے صفحات میں اکثر مستشرقین کی تحریروں کا نوٹس لیتے رہتے تھے۔ چنانچہ آج اگر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (لیڈن) کے بعض مشمولات کو تنقید کی کسوٹی پر کسا جارہا ہے اور اس میں عمداً یا سہواً روا رکھی گئی خامیوں کی نشاندہی کی جارہی ہے تو کل ہنری ٹامس وغیرہ کی تصنیف Living Biographies of Religious Leaders پر جرح و تعدیل ہورہی ہے اور اس کے بعض افسوسناک مشمولات پر احتجاج کیا جارہا ہے[3]۔

ایک سچے اور دردمند عالم دین ہونے کی حیثیت سے ماجد ایسے تجاوزات وتسامحات کے خلاف لکھنا اپنا فرضِ عین سمجھتے تھے لیکن اس سے یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیے کہ ان میں رواداری کا فقدان تھا یا وہ مذہب اسلام کے علاوہ باقی مذاہب مثلاً ہندومت یا اس کی مذہبی کتب کے خلاف اہانت پر کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ بمبئی میں جب ایک موقع پر ہندو پریس میں غلط یا صحیح یہ خبر شائع ہوئی کہ وہاں کے کسی مسلمان نے گیتا کی توہین کی ہے تو ماجد کا ردِ عمل یوں تھا:

''گیتا کی توہین وتذلیل کوئی دیوانہ ہی مسلمان کرسکتا ہے۔ میں نے گیتا جو دراصل سری کرشن جی کے خطباتِ جنگ کا مجموعہ ہے انگریزی اور اردو ترجموں کی مدد سے پڑھی ہے اور پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ معرفت کی ایک اعلیٰ کتاب ہے اور جہاں تک بندہ کی فرض شناسی اور جہاد وقتال کی تعلیم کا تعلق ہے، اس کی تعلیم قرآن مجید سے بہت ملتی جلتی ہوئی ہے۔[4]

یہ بات جانی بوجھی ہے کہ ہر جریدہ، رسالہ یا اخبار اپنے مدیر کے مزاج سے پہچانا جاتا ہے۔ مدیر صدقِ جدید ایک ایسی شخصیت تھے جو آنکھ اور کان بند کرنا جانتے ہی نہیں تھے۔ اگر یہ چیزیں ان کے مزاج کا حصہ نہ ہوتیں تو وہ اپنی نو مسلمی کے جوش اور روایتی تصوف کے حلقہ بگوش ہونے کے کچھ ہی دیر بعد گوشہ نشین ہو چکے ہوتے لیکن اُن کی شخصیت میں تحرک، خودداری، صاف گوئی اور اسلام اور مسلم کلچر سے انوٹ محبت جیسے عناصر شامل تھے۔ ایسا شخص صحافت کا شغل کسی لحاتی تاثر کے نتیجے میں اختیار نہیں کرسکتا تھا بلکہ اس کے پیچھے ان کا کامل تدبّر اور سلیقہ برسرِ کار تھا۔ وہ صحافت کو ایک تحریک، ایک مشن، ایک عظیم واسطہ قرار دیتے تھے تاکہ اس کے ذریعے زندگی زیادہ سہل، باوقار اور باخدا ہو سکے۔ صحافت کے باب میں ان کا نظریہ کیا تھا، اسے جاننے کے لیے اُن کے مضمون ''ہفتہ وار صحافت کے آداب'' کا مطالعہ ضروری ہے۔ اس مضمون میں مولانا ماجد نے اپنے تجربے کی روشنی میں صحافت کے مقاصد کا تعین کچھ اس طرح کیا تھا:

1۔ مقصود خدمتِ دین وملت رکھیے۔ عام خدمتِ خلق بھی اسی کے تحت میں آجاتی ہے۔

2۔ وطن کا بڑا حق ہوتا ہے...... البتہ مسلمان ''پرستار'' وطن کا نہیں ہوسکتا۔ عبودیت کا یہ خصوصی

تعلق تو صرف ذاتِ حق کے لیے مخصوص ہے۔ اس کی مخلوق میں سے کسی کے حصے میں نہیں آ سکتا۔

3- خبر برائے خبر کا روز ناموں میں جو بھی درجہ ہو، ہفت روزے میں تو یہ ایک تقریباً مہمل چیز ہوگی۔ ہفت روزے میں اپنے تبصرے سے یا کم سے کم خبر کی سرخی ہی سے ہر خبر کو با مقصد بنا کر پیش کیجیے۔

4- پبلک کے جذبات کی محض نمائندگی پر اکتفا نہ کیجیے۔ پبلک کے مذاق اور جذبات کی اصلاح کی کوشش بھی جاری رکھیے۔

5- صحافت ایک قسم کی تجارت نہیں، ایک قسم کی عبادت ہے۔

6- دوسروں کا احتساب ہر پبلک معاملے میں ضرور کیجیے لیکن اپنے کو بھی احتساب سے بالا نہ خیال کیجیے۔ احتسابِ نفس کو سب پر مقدم رکھیے۔

7- بلا وجہِ معقول کسی کی دلآزاری کیا معنی دل شکنی بھی گوارا نہ کیجیے۔ مروت کے بھی حدود قائم کر لیجیے، ان کے آگے قدم نہ رکھیے۔

8- ملک کی اکثریت کا، حکومتِ وقت کے قانون کا ضرور لحاظ رکھیے، حتی الامکان راہِ سلامت روی اختیار کیجیے لیکن مرعوبیت اور احساس کمتری کی حد تک ہرگز نہ پہنچ جایئے۔ صلح و سازگاری دوسری چیز ہے اور بزدلی اور خوشامد بالکل دوسری۔

9- پبلک تنقید آزادی سے کیجیے۔ لیکن ذاتیات پر اُتر آنے سے اپنے کو اہتمام کے ساتھ بچایئے۔ کسی کے نسب پر، وطن پر، شکل و صورت پر طنز کرنا سب ذاتیات ہی کی شکلیں ہیں۔

10- خیال کر لیے اور ڈرتے رہیے اس وقت سے جب آپ کا سارا دفتر آپ کے سامنے ہوگا اور آخری اور حقیقی عدالت میں اس کے ایک ایک لفظ پر سوال ہو رہا ہوگا[5]۔

مذکورہ خیالات کا اظہار ماجد نے ایک استفسار کے جواب میں کیا تھا۔ یہ خیالات خلاصے کی شکل میں نگرانی کے الفاظ میں پیش کیے گئے ہیں۔ ان سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی نگاہ میں صحافت عبادت تھی اور وہ لکھے ہوئے ایک ایک لفظ اور حرف کے لیے خود کو مسئول سمجھتے تھے۔ پھر ان کے نزدیک صحافت کا سب سے بڑا مقصد خدمتِ دین وملت تھا۔ سچ، صدق

اور صدقِ جدید کے مشمولات اسی ایک مقصد سے پھوٹتے تھے۔ چنانچہ صدق کے حاوی مشمولات میں تفسیرِ قرآنی، مشورے اور گزارشیں (روحانی، اخلاقی و دینی اُلجھنوں کے حل کرنے کے سلسلے میں) اور سچی باتیں تقریباً مستقل عنوانات تھے۔ وقت کے جاری و ساری فتنوں پر تبصروں کے لیے ماجد کا مستقل کالم ''سچی باتیں'' جس قدر مقبول ہوا اس کی کوئی مثال بیسویں صدی کی اردو صحافت میں کم ملے گی۔

ماجد نے ''سچ'' کا نام سچ محض لندن کے ہفتہ دار Truth کی نقالی میں نہیں رکھ لیا تھا بلکہ اس کے پیچھے اُن کا صداقت شعار تصورِ صحافت کارفرما تھا۔ جس طرح سچ کی پیشانی پر درج شعر مولانا کی صحافتی تحریروں کا طغرا تھا اسی طرح جب 1935 میں صدق کا اجرا ہوا تو اب قرآنِ حکیم کی آیت اس کا سرعنوان بنی: وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَ صَدَّقَ بِہٖ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ [سورہ الزمر 33:39] (اور وہ جو سچی بات لے کر آیا اور جس نے خود بھی اس کو سچ مانا، وہی پرہیزگار ہیں) اپنی صحافتی زندگی میں مولانا کا ہمیشہ اس آیت پر عمل رہا۔ چنانچہ تقسیمِ ملک کے فوراً بعد جب ہندوستان کے طول و عرض میں بولی جانے والی اردو پر پیغمبری وقت پڑا تو وہ اس کی حمایت میں سینہ سپر رہے۔ وہ اکثریتی مذہب کے اہلِ قلم اور اہلِ سیاست کے اس دعوے کی مختلف مثالوں سے نفی کرتے رہے کہ مسلمان متعصب قوم ہیں اور اُنھوں نے ایک طویل عرصہ ہندوستان میں گزارنے کے باوجود اپنے اوپر ہندیت کا شائبہ تک نہیں پڑنے دیا۔ اس ضمن میں دریابادی صاحب ادب سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسی مثالیں پیش کرتے رہے، مثلاً ''گل بکاؤلی''، ''اندرسبھا'' اور ''فسانۂ عجائب''۔ فسانۂ عجائب سے ایک اقتباس نقل کرنے کے بعد جس میں سطریں کی سطریں ہندی اور سنسکرت الفاظ کی اور جوتش و نجوم کی اصطلاحات مثلاً ''پوتھی''، ''چندرماں''، ''ریگ تیگ''، ''پرتھوی میں دھوم مچے''، ''سنیچر پاؤں پڑے گا''، موجود ہیں، ماجد تبصرہ کرتے ہیں:

> ''ہند کا مسلم تمدن اور مسلم ادب کس حد تک ہندو عقائد، ہندو رسوم، ہندو شعائر سے متاثر ہو چکا ہے، یہ سب اگر اس کا کھلا ثبوت نہیں تو کیا ہے؟ یہ ہونا چاہیے تھا یا نہیں اور اسلامی نقطۂ نظر سے یہ جائز کہاں تک تھا، یہ سارے سوالات الگ ہیں۔ یہاں ذکر نفسِ واقعہ کا ہے[6]۔''

جہاں تک ماجد کی ''سچی باتیں'' کا تعلق ہے، وہ ان کے افکار و خیالات اور نظریات و میلانات کی اہم ترین نمائندہ کہی جاسکتی ہیں۔ اُن میں ادبی، علمی، فقہی، کلامی، تہذیبی تمام قسم کے موضوعات آتے تھے اور مولانا عام فہم مگر دل میں اُتر جانے والے پیرائے میں مسائل و مظاہر پر رائے زنی کرتے چلے جاتے تھے، خصوصیت کے ساتھ تہذیب مغرب کی بے اصلی، کم نگاہی، سطح بینی اور نام نہاد ترقی پر جو بیشتر کیمتی (Quantitative) ہے ان کا قلم بے حد رواں ہو جاتا تھا۔ وہ مغرب کے ساتھ مغرب ہی کے ہتھیاروں سے لڑتے تھے۔ یعنی اہلِ مغرب ہی کے ہاں سے ایسے مصنفین و افراد چُن لیتے تھے جنھوں نے مغرب کے اخلاقی، معاشرتی اور روحانی مفاسد کا ایک بے رحم سرجن کی طرح تجزیہ کر رکھا ہوتا تھا۔ یہ درست ہے کہ وہ مغرب کی بعض نارسائیوں اور برائیوں کو عام نظر کے بجائے محدب شیشے سے دیکھتے تھے لیکن اس کے پیچھے اصل میں اُن کا تمام تر اصلاحی اور اخلاقی نقطۂ نظر کارفرما ہوتا تھا۔ اُنھیں اندیشہ یہ تھا (اور وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی رہے تھے) کہ کہیں مغرب کی یہ سراسر مادہ پرستانہ تہذیب مشرق کے فضائل کا گلا نہ گھونٹ دے۔ کیونکہ اثر و نفوذ کے اعتبار سے یہ تہذیب جدید ہر پرانی تہذیب سے زیادہ متاثر کن تھی۔

مولانا دریابادی کی جدید کی طرح قدیم پر بھی گہری نظر تھی اور وہ خود احتسابی کے جذبے سے محروم ہرگز نہیں تھے۔ وہ عبرت اندوزی کے چراغ صرف مغرب ہی کی برق پاشیوں سے روشن نہیں کرتے بلکہ مشرق کی کبریت سے بھی جلاتے ہیں۔ 23 / مارچ 1946 کی ''سچی باتیں'' کے مستقل عنوان کے تحت لکھنؤ کے کسی اُستاد کا یہ شعر:

شفق گوں ہے ہوائے بامِ قاتل      کبوتر پر کبوتر گر رہا ہے

درج کرنے کے بعد اس کے پُرتکلف، مبہم اور پیچ دار مفہوم کی وضاحت کرتے ہیں اور پھر لکھتے ہیں کہ ہمارے قدیم و کلاسیکی ادب کا بیشتر حصہ ایسی ہی بے مغز و بے مزا سبالغہ آرائیوں سے بھرا پڑا ہے اور دینی، اخلاقی تو خیر یہ کسی فطری جذبے کی تسکین میں بھی ناکام رہا ہے۔ شذرے کے آخر میں لکھتے ہیں کہ:

> ''نئے ادب اور نئی شاعری کی عریانیاں یقیناً سزاوار ملامت، لیکن پرانے ادب اور پرانی شاعری کو صرف اس لیے بخش دیا جائے گا کہ وہ قدیم ہے۔

معیار ہمارے ہاتھ میں صرف عقل و شریعت کا ہے، اس پیانے سے
پرانے کو بھی ناپا جائے گا اور نئے کو بھی جانچا جائے گا۔[7]''

کیا اس آخری جملے کی موجودگی میں مولانا پر محض قدیم سے تقدس وابستہ کرنے کا الزام عائد کیا جاسکتا ہے؟[8]

مولانا عبدالماجد دریابادی کی صحافت میں بلکہ ہر تحریر میں جو چیز سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے اور شخصیت میں تلاطم اور ہیجان پیدا کر دیتی ہے، وہ ان کا منفرد اسلوب ہے۔ وہ بیک وقت ایک حکیم، خطیب، جراح اور ہمدرد طبیب کی طرح بظاہر مختلف حربوں سے کام لیتے ہیں مگر ان کا مقصود اصلی اور غایتِ اولیٰ مریض کی شفا کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ اپنے اسلوب کی اس تاثیر میں وہ بعض اوقات اپنے اس خاص حربے سے کام لیتے ہیں، جسے سرخی جمانے کا فن کہتے ہیں۔ صحافت میں سرخی جمانے کی اہمیت روشن ہے۔ قاری کے پورے وجود کو اپنی گرفت میں لے لینے اور اپنے موقف کو مختصر ترین لیکن ساتھ ہی ساتھ موزوں ترین لفظوں میں قاری تک پہنچانے میں بنیادی رول اسی ''سرخی'' کا ہوتا ہے۔ ماجد اس فن میں بڑے طاق تھے۔ اس ضمن میں وہ بعض اوقات برجستہ مصرعوں سے ایسا کام لیتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ مصرع خاص اسی موقع کے لیے خلق کیا گیا تھا۔ شاہد احمد دہلوی کی وفات کے بعد جب ایک موقع پر ساقی میں ایک تبرائی مضمون شائع ہوا تو ماجد نے حسب معمول اس کا بھی نوٹس لیا۔ بعد ازاں اپنے ادارتی صفحے پر اس ذیل میں بہت دلچسپ سرخی جمائی: ''ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی'' اور یوں اس مصرعے کا اطلاق کمالِ مہارت سے رسالہ ساقی کے اس خاص شمارے پر کر دیا۔ یا مثلاً ہندوستان میں اردو کی بے بسی اور بدحالی کی طرف محض ایسا چلتا سا اشارہ کر دینا کہ ہم بھی منھ میں ''زبان'' رکھتے ہیں، جس سے وہ خاص صورتِ حال ایجاز و ایما اور لطف و لذت کی سرمایہ دار ہو جائے، ماجد کا خاص فن تھا۔ اپنے ایک خط میں رئیس احمد جعفری کو جوش صاحب کے ہندوستان سے پاکستان منتقل ہو جانے پر ایسے شذرۂ موعودہ کی اطلاع دیتے ہیں جو ان کے خیال میں ایک مصرع میں سرتکز (Crystallize) ہوسکتا تھا، لکھتے ہیں: ''اب کے جوش پر کوئی نوٹ یا لیڈ نکلے تو بہترین عنوان پاکستان کی زبان سے یہ مصرع ہوسکتا ہے: ع تو برون در چہ کردی کہ درون خانہ آئی''[9]

کیا اس ایک مصرعے میں جوش کی پوری شخصیت نہیں سمٹ آتی ؟ ان کی چند اور ایسی سرخیاں دیکھیے: ''کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے''۔ ''مصطفےٰ نایاب دارزاں بولہب''، ''سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں''، ''اک کشمکش برق و شرر دونوں طرف ہے''، ''دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی''، ''ذکرِ حسین، ذاکرِ حسین کی زبان سے'' وغیرہ۔

بہرحال باون برس کی صحافیانہ خدمات مولانا عبدالماجد کا وہ طغرائے امتیاز ہیں کہ تنہا یہی کوئی کم اعزاز نہیں چہ جائیکہ اس صحافت کے ذریعے فکر و فرزانگی، حکمت و دانش، سوز و سرور اور جذب وجنوں کی کتنی ہی نئی حکایتیں رقم کی جائیں۔

مولانا کا قلم ایک سحرآفریں اسلوب کا حامل تھا۔ زبان کے مختلف حربوں پر ان کی گہری نظر تھی۔ طنز، عبرت آفرینی اور وسعتِ علم ان کے حرف حرف سے چھلکتی تھی۔ ''صدق'' میں چھپی ان کی یہ عبارت دیکھیے جس میں اُنھوں نے کائنات کے بدلتے رنگوں کا کیسا عبرت آفریں نقشہ کھینچا ہے:

''مزار کی پائنتی ایک نیم کا درخت ہے۔ ہر سال اپنے موسم پر نئے پھول لاتا ہے۔ نئے سرے سے سرسبز و شاداب ہو جاتا ہے۔ اب کی بھی اس پر بہار ہے۔ ابھی کل تک کیا سوکھا سا کھا بے رونق، ٹھونٹھ ایسا کھڑا تھا۔ آج کیسا گلزار ہے، کیا مہک دے رہا ہے۔ نرم نرم ہلکی ہلکی ہری پتیاں کیسی آنکھوں میں کھبی جا رہی ہیں۔ سفید سفید پھول کیسے خوشنما کھلے ہوئے ہیں جیسے مردے میں جان پڑ گئی۔ اللہ اللہ درخت کے لیے یہ سرفرازیاں اور انسان کی قسمت میں محرومی۔ بہاروں پر بہاریں گزرتی جائیں گی اور یہاں دید وشنید کی حسرتیں حسرتیں ہی بنی رہیں گی:

بہ ہر بہار گل از زیرِ گل برآرد سر
گلے برفت کہ ناید بہ صد بہار دگر

کیا آج کی اردو صحافت کو ایسا بہار آفریں اور عبرت انگیز قلم عطا ہوا ہے؟ ہرگز نہیں۔

## حواشی:

1- عبدالماجد دریابادی: از مذہب من گبر و مسلماں گلہ دارد'، مشمولہ "صدق جدید"، 2/جولائی 1965، ص:7
2- دیکھیے: "St. Gabriel's High School Magazine" مارچ 1932، ص:15-18
3- دیکھیے صدق جدید، 12/اکتوبر 1956، ص:4
4- صدق جدید، 13/اکتوبر 1956، ص:2
5- نیا دور، مولانا عبدالماجد دریابادی نمبر، اپریل مئی 1978، ص:57
6- سچی باتیں، مشمولہ صدق جدید، 17 دسمبر 1954، ص:1
7- صدق، 23/مارچ 1946، ص:1
8- عبدالماجد کے موقف کی مزید وضاحت کے لیے دیکھیے صدق جدید کا شمارہ، 27/جنوری 1967، جس میں انھوں نے تبحر علمائے دین کو نشانۂ طنز بنایا ہے۔
9- مکتوب ماجد بنام رئیس احمد جعفری، محررہ 19/دسمبر 1955، (غیر مطبوعہ)

# بہار کے چند گمنام صحافی

ڈاکٹر منظر اعجاز

ہندوستان میں اردو صحافت کا آغاز مولوی اکرم کے ''اردو اخبار'' 1810 یا سدا سکھ لال کی ادارت میں شائع ہونے والے ''جام جہاں نما'' 1822 کو تسلیم کیا جائے جو کلکتے سے ہی شائع ہوئے لیکن بہار میں اردو صحافت کا آغاز ''نورالانوار'' آرہ مجریہ 1853 سے ہی مانا جاتا ہے۔ کہیں کہیں 1852 بھی درج ہے لیکن ڈاکٹر سید مظفر اقبال نے تو اس کے وجود پر ہی سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ رقم طراز ہیں:

> ''1857 سے قبل شائع ہونے والے اخبارات میں ''نورالانوار'' آرہ کے متعلق مجھے شبہ ہے کہ آیا 1852 یا 1853 میں اس نام کا اخبار آرہ سے جاری ہوا یا نہیں؟''
> (بہار میں اردو نثر کا ارتقا۔ جنوری 1980، ص:175)

سید مظفر اقبال کا یہ شبہ رخشاں ابدالی اور عتیق صدیقی کے اس بیان پر ہے جو اختر شہنشاہی سے ماخوذ ہے۔ جبکہ اختر شہنشاہی کے مطالعے سے سید مظفر اقبال نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے، وہ انھی کے الفاظ میں درج ذیل ہے:

''اختر شہنشاہی میں اخبار اور مطابع کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا ہے اور انداز بیان سے پتہ چلتا ہے کہ مؤلف اختر شہنشاہی نے ''نور الانوار'' مطبع کا ذکر کیا ہے جسے رخشاں ابدالی اور عتیق صدیقی نے غلط طور پر اخبار سمجھ لیا ہے۔'' (ایضاً۔۔175)

لیکن تقریباً 160 سال بعد بھی بہار کی اردو صحافت کے محققین و مورخین یا تذکرہ نگاران صحافت ''نور الانوار'' ہی کو اردو کا پہلا اخبار قرار دیتے ہیں۔ لامحالہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے مدیر کون تھے؟ اور جب تک ہم اس سوال کا جواب تلاش نہیں کر لیتے، اس کے مدیر کو گمنام صحافیوں میں ہی شمار کرنا ہوگا اور اگر ''نور الانوار'' کو مفقود الوجود تسلیم کر لیا جائے تو لامحالہ ''پٹنہ ہرکارہ'' مجریہ 21 راپریل 1855 کو ہی بہار کا پہلا اردو اخبار قرار دینا ہوگا جو خواجہ کلاں، پٹنہ سے انگریزی کیلنڈر کے مطابق پہلی، گیارھویں اور اکیسویں تاریخ کو شائع ہوتا تھا۔ اس کے مالک اور مہتمم شاہ ابوتراب مالک مطبع بھی تھے۔ مدیر کا نام کہیں درج نہیں لیکن ڈاکٹر سید مظفر اقبال کا قیاس ہے کہ شاہ ابوتراب ہی اس کے مدیر بھی تھے۔ اس لحاظ سے شاہ ابوتراب ہی بہار میں اردو صحافت کے بنیادگزار قرار دیے جاسکتے ہیں۔ ڈاکٹر سید مظفر اقبال کے مطابق:

''یہ اخبار یکم مارچ 1856 تک جاری رہا۔ اس اخبار کا ذکر اردو صحافت کی مطبوعہ تاریخوں میں سے کسی میں بھی موجود نہیں۔'' (ایضاً۔ ص:144)

گویا یہ ڈاکٹر مظفر اقبال کا محققانہ انکشاف ہے لیکن بہار میں اردو صحافت کے اس بنیادگزار کے بارے میں نام کے سوا ہم کچھ بھی نہیں جانتے۔

سید مظفر اقبال نے 1914 تک 62 اخبارات و رسائل کا ذکر کیا ہے جن کے مدیران گرامی مسلمان بھی ہیں اور غیر مسلم بھی لیکن ان میں چند ایک کے سوا سبھی گمنام ہیں اور گمنام سے مراد یہ ہے کہ ہم ان کے سوانحی احوال وکوائف اور صحافتی کارگزاریوں سے بے خبر ہیں۔ مثلاً ''اخبار بہار'' کے ایڈیٹر لالہ بندا پرشاد متخلص بہ حسرتی۔ تخلص سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شاعر ہوں گے، ممکن ہے کہیں شاعروں کے تذکرے میں کچھ تفصیل آئی ہو۔

منشی اجودھیا پرشاد منیری کا ''اخبار الاخیار'' کے حوالے سے کئی کتابوں میں ذکر آیا

ہے۔ یہ اخبار سر سید احمد خاں کی قائم کردہ سائنٹفک سوسائٹی کی شاخ مظفر پور بہار سے 15 ستمبر 1868 کو جاری ہوا۔ یہ سائنٹفک سوسائٹی کا ترجمان تھا۔ اس کے پہلے مدیر اجودھیا پرشاد منیری تھے۔ اخبار میں مدیر کی حیثیت سے ان کا نام 15 ستمبر 1870 تک درج ہوتا رہا۔ یکم اکتوبر 1870 سے 15 دسمبر تک کے شمارے پر ایڈیٹر کی حیثیت سے منشی قربان علی خاں کا نام درج ہوا کیا۔ منشی اجودھیا پرشاد منیری دوسری جہتوں سے بھی قابل تذکرہ سمجھے گئے لیکن قربان علی خاں کے تعارف سے تذکرے خالی ہیں۔

''اخبار الاخیار'' بہار سائنٹفک سوسائٹی کا ترجمان تھا۔ اس لیے سائنٹفک سوسائٹی کے اغراض و مقاصد پر بھی روشنی ڈالی جاتی تھی۔ اس کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ انگریزی اسٹائل میں بائیں سے داہنی طرف کو لکھا اور پڑھا جاتا تھا۔ مطبع ''چشمۂ نور'' مظفر پور ہی میں طبع ہوتا تھا۔ دراصل سائنٹفک سوسائٹی کی بہار شاخ کے ساتھ ہی پریس بھی قائم کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کالج قائم کرنے کا بھی منصوبہ تھا جو بالآخر لنگٹ سنگھ کالج کی صورت میں روبہ عمل آیا۔ اس سوسائٹی کے تین سو سے زیادہ ارکان تھے جن میں کچھ مسلمان اور عیسائی تھے۔ غالب اکثریت غیر مسلموں کی تھی۔ مقصد وہی تھا کہ مشرقی علوم کے ساتھ ساتھ مغربی علوم کی بھی ترویج و اشاعت ہوتی رہے۔

اجودھیا پرشاد منیری متخلص بہ بہار اپنی معرکہ آرا تصنیف تاریخی ''گلزار بہار'' معروف بہ ''ریاض تربت'' کے حوالے سے جانے جاتے ہیں۔ یہ کتاب 1868 میں تالیف کی گئی اور اسی سال طبع بھی ہوئی۔

''بہار پنچ'' پٹنہ مجریہ 26 نومبر 1876 کے بارے میں سید مظفر اقبال رقم طراز ہیں کہ:

> ''اختر شہنشاہی میں لکھا ہے: ''بہار پنچ پٹنہ محلّہ لودی کٹرہ ہفتہ وار ......
> 4 ورق اوسط یوم جمعہ مالک محمد اکبر خاں، مہتمم منشی نوروز علی خاں شیدا از مطبع انتظامی اجراء 26 نومبر 1876 '' امداد صابری نے اپنی کتاب میں اس کو نقل کیا ہے۔ واضح رہے کہ یہ لکھنؤ کے مشہور اخبار اودھ پنچ کے اجرا سے ایک سال پہلے جاری ہوا۔'' (بہار میں اردو نثر کا ارتقا: ص: 152)

''بہار پنچ'' چونکہ ''اودھ پنچ'' سے پہلے جاری ہوا اور اس کے بعد کئی پنچ نکلے۔ مثلاً الپنچ،

گیا پنچ اور گدھ پنچ وغیرہ، جن کے ذریعے اردو صحافت میں ایک خاص رجحان فروغ پذیر ہوا، اس وجہ سے "پٹنہ ہرکارہ" کی طرح ہی اس کی قدر و قیمت اور اہمیت دوسرے اخبارات و رسائل کے مقابلے میں زیادہ سمجھی جاسکتی ہے لیکن اولاً تو اس کے ایڈیٹر کا نام ہی نہیں۔ دوم یہ کہ اس کے مالک اکبر خاں یا مہتمم منشی نوروز علی کو ہی اس کا ایڈیٹر مان لیا جائے تب بھی یہ سوال قائم رہتا ہے کہ یہ کون لوگ تھے۔ ہم ان کے منظر و پس منظر سے ناواقف ہیں۔ اس لیے انھیں سر دست گمناموں کی فہرست میں ہی ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ناموروں کی فہرست میں ادب کے حوالے سے شاد و فضل حق آزاد جس مقام و مرتبے کے حامل ہیں، ان سے دنیا واقف ہے، لیکن ان کی یہی ناموری بحیثیت صحافی ان کی گمنامی کا بھی سبب ہے۔

"گدھ پنچ" کے ذکر سے اپنا بھولا ہوا زمانہ یاد آرہا ہے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ گدھ پنچ کے ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر سب کچھ اعجاز علی ارشد تھے اور غالباً ان کی عملی زندگی کا آغاز صحافت کے پیشے سے ہی ہوا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ 1977 کے اواخر یا 1978 کے اوائل میں ان سے میری پہلی ملاقات ہند آرٹ پریس سلطان گنج، پٹنہ میں ہوئی تھی۔ میں ان دنوں ماہنامہ انجو کی مجلس ادارت سے وابستہ تھا۔ 82-1981 میں جب میری ادارت میں مظفر پور ہی سے پندرہ روزہ انعکاس شائع ہورہا تھا، اس زمانے میں بھی دفتر انعکاس کو گدھ پنچ موصول ہوتا تھا۔ آج اعجاز علی ارشد کو کتنے لوگ صحافی کی حیثیت سے جانتے پہچانتے ہوں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ شخصیت اگر کثیر الجہات ہو اور شہرت و مقبولیت اور عزت و وقار کے آیات و آثار کسی خاص پہلو سے مترشح ہوتے ہوں تو بعض دوسرے اہم پہلو روپوش ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی صحافیوں میں قیوم انصاری، سید ریاست علی ندوی، قیوم خضر، بیتاب صدیقی، وفا ملک پوری، مظہر امام، منظر شہاب، نادم بلخی، لطف الرحمٰن، وغیرہ کا نام بھی لیا جاسکتا ہے۔

اخباری صحافت میں پلے بیک ایڈیٹر شپ کی بھی نہایت مضبوط و مستحکم روایت رہی ہے۔ اس لیے قائدانہ صلاحیت کی وجہ سے کچھ لوگ نامی گرامی مدیر ہوتے رہے ہیں اور مدیرانہ صلاحیت والے گمنامی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ ایسے لوگوں میں قمر اعظم ہاشمی، بیتاب صدیقی، شارق ایجے پوری وغیرہ گزر چکے ہیں۔ زندہ لوگوں میں خالد رشید صبا بھی ہیں جن کی ادبی

اور سیاسی شناخت برقرار ہے۔ ان کے علاوہ معاصرین میں ریحان غنی، راشد احمد راشد، خورشید کاکوی، اشرف استھانوی، شہباز عالم، خورشید ہاشمی وغیرہ ایسے لوگ ہیں جنھیں مقامی معاصرین جانتے پہچانتے ہیں۔

عبدالمغنی اور وہاب اشرفی گزر چکے ہیں۔ ادب کے حوالے سے یہ بڑے لوگ زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے لیکن صحافت کے حوالے سے زندگی میں بھی زندہ درگور رہے۔

وہاب اشرفی نے کلکتہ سے اپنی عملی زندگی کا آغاز صحافت کے پیشے سے کیا تھا جب وہ گریجویشن میں تھے۔ کئی اخباروں سے گزرتے ہوئے باضابطہ ملازمت ''الحق'' میں اختیار کی تھی۔ 1957 میں لائف انشورنس کے ملازم کی حیثیت سے پٹنہ ڈویژن میں جوائننگ دی تھی اور 1958 میں رفیع احمد کے مالی صرفے سے ''صنم'' کا اجرا کیا تھا جس میں رفیع احمد ہی مدیر اعلیٰ تھے اور وہاب اشرفی مدیر۔ 1960 میں لکچراری کی ملازمت کی وجہ سے اس رسالے سے سبکدوشی حاصل کر لی تھی۔ ملازمت کے ارتقائی مراحل سے گزرتے ہوئے جب سبکدوش ہوئے تو نومبر 2000 میں ''مباحثہ'' کا اجرا کیا اور اس کے ذریعے نہایت فراخ دلی کے ساتھ نئی نسل کو پروان چڑھانے کی کامیاب کوشش کی۔ ''مباحثہ'' جولائی 2012 تک شائع ہوتا رہا اور ان کی وفاتِ حسرت آیات کے ساتھ بند ہو گیا لیکن میری محدود معلومات کے مطابق صحافت کے حوالے سے وہ اب تک گمنام ہی ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ گمنام صحافیوں کی فہرست نہایت طویل ہے۔ ان صحافیوں کے تفصیلی تذکرے کے لیے اس مختصر سے مقالے میں گنجائش نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے بہار کے اردو صحافیوں کے تذکرے پر مشتمل ایک ضخیم کتاب ہونی چاہیے۔ میں ابھی سے اس کا منتظر ہوں۔

# مولانا علی میاں ندوی اور اردو ایڈیٹرس کانفرنس

عبدالعزیز

آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس کی تشکیل 72-1971 میں ہوئی تھی۔ روزنامہ سنگم کے ایڈیٹر غلام سرور اس کی داغ بیل ڈالنے میں پیش پیش تھے۔ کلدیپ نیر اس وقت ''اسٹیٹسمین'' دہلی کے ایڈیٹر تھے۔ ان کا پورے ملک میں صحافی کی حیثیت سے شہرہ تھا۔ پہلی کانفرنس میں انھیں صدر کی حیثیت سے دعوت دی گئی تھی۔ موصوف کے آنے سے کانفرنس کی اہمیت بڑھ گئی تھی۔ بہار کے اس وقت کے وزیر اعلیٰ نے شرکت کی۔ کرپوری ٹھاکر بھی آئے۔ ایڈیٹروں کے ساتھ مل جل کر رہے یہاں تک کہ سب کے ساتھ ڈنر میں شریک رہے۔ وزیر اعلیٰ بہار نے ملک بھر کے ایڈیٹروں کو عشائیہ دیا۔ کئی اور لوگوں نے ایڈیٹروں کی ضیافت کی۔ راقم کو اس میں شرکت اور خیالات کے اظہار کا موقع ملا۔ مظہر امام صاحب اس وقت پٹنہ ہی میں آل انڈیا ریڈیو کے سربراہ تھے۔ انھوں نے بھی شرکت کی کلکتہ کے لوگوں سے مل کر انھیں خاص طور پر خوشی اور مسرت ہوئی۔

پٹنہ کے بعد 1973 کے آخر میں لکھنؤ میں کانفرنس بڑی آن بان سے منعقد ہوئی ملک کی وزیر اعظم اندرا گاندھی نے افتتاحی تقریب سے خطاب کیا۔ محترمہ اندرا گاندھی نے دوران تقریر کہا

کہ وہ جب الٰہ آباد میں اپنے والدین کے ساتھ تھیں تو اردو بولتی تھیں مگر دہلی میں آکر اردو بھول گئیں۔ شمیم احمد شمیم اس وقت پارلیمنٹ کے ممبر تھے۔ ''آئینہ'' سری نگر کے ایڈیٹر۔ اُنھوں نے تقریر کے وقت اندرا گاندھی کی طرف رخ کرتے ہوئے بڑی دلیری سے کہا کہ ''محترمہ آپ جو کچھ بول رہی تھیں یہی اردو ہے، ہم لوگ اسی اردو کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں، اسی کے لیے اکٹھا ہوئے ہیں۔''

اس میں اردو کے تین بڑے صحافی بھی شریک تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا محمد عثمان فارقلیط اور مولانا محمد مسلم۔ جب اندرا گاندھی تقریر کر رہی تھیں تو مولانا عثمان فارقلیط اسٹیج پر بیٹھے ہوئے تھے، ان کی بے اعتنائی دیکھنے کی چیز تھی۔ جب انھیں دعوت تقریر دی گئی تو بڑی بے نیازی سے اُٹھے تقریر دس منٹ کی تھی مگر اردو صحافیوں کے لیے ان کی تقریر میں زبردست رہنمائی تھی۔ مولانا محترم نے کہا: ''میں اس دور کے صحافیوں سے مختلف ہوں، صحافت میرا پیشہ نہیں ہے بلکہ عبادت ہے۔''

لکھنؤ کی کانفرنس میں جسے کانفرنس کا حاصل کہنا غلط نہ ہوگا۔ حضرت مولانا ابوالحسن علیؒ ندوی کا وہ خطاب تھا جسے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں اخبار نویس برادری سے کیا تھا۔ ان باتوں کو کہے ہوئے بیالیس، تینتالیس سال ہو گئے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج کے حالات کے پیش نظر فرما رہے ہیں۔ یہ بھی غور وفکر کے لائق ہے کہ اردو کے صحافیوں سے مخاطب ہیں:

> ''اخبار نویس وہ معلم ہے جس کا مدرسہ پورا ملک ہوتا ہے اور جس کے تلامذہ میں دہقان ومزدور سے لے کر وزیر اور صدر مملکت تک تمام بڑے اور چھوٹے شریک ہوتے ہیں۔ اخبار نویس وہ مبلغ ہے جس کی دعوت گھر گھر، دکان دکان اور دفتر دفتر گونجتی ہے۔ اخبار نویس دنیائے سیاست کا حریف ہوتا ہے جس کی کسوٹی اصولوں کو پرکھتی اور جس کی ترازو حوادث کو تولتی رہتی ہیں۔ اخبار نویس سیاسی اختلافات سے بھری ہوئی دنیا میں عدالت کی کرسی جما کر بیٹھتا ہے اور فریضہ قضا سرانجام دیتا ہے۔ یہ ہے صحافت کی اہمیت اور اس اہمیت کے معنی یہ ہیں اگر صحافت حق، عدل، خیر

اور فلاح کے لیے کام کرے تو انسانیت کے لیے اس سے مفید طاقت کوئی نہیں اور اگر صحافت میں بگاڑ آجائے اور وہ کذب، باطل، شر اور فساد کے لیے ہی سرگرم عمل ہو جائے تو پھر نوع انسانی کے لیے اس سے زیادہ مہلک کوئی دوسری قوت نہیں۔ آپ ذرا غور فرمایئے کہ کسی شہر کا ہیلتھ ڈپارٹمنٹ خود اسباب مرض پھیلانے کی مہم شروع کر دے۔ اگر پولیس اور عدالت ہی جرائم کے سرپرست بن جائیں تو پھر نتائج کیا نکلیں گے۔ جو کچھ نتائج ان صورتوں میں نکلیں گے بعین وہی نتائج صحافت کے اختلال پذیر ہونے سے نمودار ہوتے ہیں۔ صحافت اگر آلۂ خیر ہو تو نعمت عظمیٰ ہے اور اگر آلۂ شر بن جائے تو لعنت کبریٰ بن جاتی ہے۔ ایک سچا اخبار نویس، خالص سیاسی نقطۂ نگاہ سے حکام اور پبلک کے درمیان ایک ذریعہ بنتا ہے۔ عوام میں بگاڑ آجائے تو وہ ان کی اصلاح کرتا ہے اور حکمرانوں کی طرف سے اگر مفسدات ظہور کریں تو ان کی بھی خبر لیتا ہے۔ دونوں کے درمیان ثالث بن کر فیصلہ دیتا ہے اور اگر صلح نہ ہو تو وہ اپنا فرض سمجھتا ہے کہ پورا وزن حق کے پلڑے میں ڈال دے، چاہے حق حکومت کی طرف یا عوام کی طرف اپنے موقف کے لحاظ سے درحقیقت اخبار نویس رائے عام کا ''دماغ'' ہوتا ہے۔ اگر یہ دماغ ہی بگڑ جائے تو چارہ کار کیا ہے؟ فی الواقعہ کوئی راہِ نجات نہیں۔ یہ بات کہتے ہوئے انتہائی دُکھ ہوتا ہے کہ آج کا اخبار نویس احساس ذمہ داری سے بڑی حد تک بے نیاز اور اوصاف پسندی میں انتہائی کوتاہ ہے۔ کوچۂ صحافت کا یہ سماں ہے۔ یہاں گزرے تو نہ کپڑوں کی صفائی کی خیر ہے اور نہ سلامتی کی ضمانت ہے، نہ حواس کے چاہنے کا بھروسہ ہے اور ذوق کی بابت کا یقین ہے۔ ہماری صحافت کچھ ایسی ہوگئی ہے کہ ہمارے اکثر اخبارات ایسے ہیں جو بے اصولے پن کی کوکھ سے پیدا ہوئے ہیں۔ بے اصولے پن کی چھاتیوں سے دودھ پی کر پلے اور بے اصولے پن کی انا نے انھیں انگلی پکڑ

کر چلنا بھی سکھایا۔ مراد یہ کہ ایک نیا اخبار جب نکلتا ہے تو شاید ہی ایسا ہوتا ہے کہ وہ کسی اصول یا مقصد کی خاطر باقاعدہ اسکیم بنا کر نکالا گیا ہے۔ بلکہ عموماً اخبارات کاروباری نقطۂ نظر سے جاری کیے جاتے ہیں اور ان کے لیے اگر کوئی اصول و مقصد اختیار کیا جائے تو صرف یہ سوچ کر کہ اصول و مقصد کے ذریعے اخبار چل جائے گا۔ اصول وہ تاگا ہے جو ایک اخبار کی تمام تحریروں کو پرو کر ایک ہار بنا تا چلا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے یہ پیش گوئی کی جاسکتی ہے کہ فلاں اخبار، فلاں معاملے میں فلاں رویہ اختیار کرے گا۔ لیکن بے اصول اخبارات کے متعلق کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا وہ کس مرحلے پر کون سا موڑ مڑیں گے۔ عام طور پر اخبار نویس جس سے اختلاف کرتا ہے اُسے کہیں کا نہیں رکھتا۔

وہ مخالف کی کہی ہوئی باتوں کو مسخ کر دیتا ہے بلکہ خود اپنی طرف سے کچھ باتیں اس کے منھ میں ڈالتا ہے پھر اخبار نویس تمام اخلاقی حدود کو پھاند جاتا ہے اور وہ سیدھی صاف بات کرنے کے بجائے گالیوں پر اتر آتا ہے، کیچڑ کے چھینٹے ڈالتا ہے، پگڑی اچھالتا ہے، نام بگاڑتا ہے۔ اخبار نویس میں کاروباری زاویۂ نگاہ رکھنے والوں کی جو بڑی تعداد ہے وہ حکمراں طاقت کے درباری خوشامدیوں میں بار بار شامل ہوتی رہتی ہے اور جہاں پناہ کا دل خوش کرنے کے لیے انھیں غلطیوں سے پاک اور ان کے ناقدین کو قابل گردن زدنی ہی قرار دیتا ہے۔ یہ مقام افسوس ہے کہ موجودہ جمہوری دور میں قدیم بادشاہوں کے درباری شاعروں، بھانڈوں اور خوشامدی، مصاحبین کا منصب اور مقام صحافیوں کے حصے میں آیا ہے۔ بہر حال یہ صحافت کا مستقل فساد خون ہے اور اس کی اصلاح کی فکر اگر نہ کی گئی تو یہ فساد خون ہماری آئندہ نسلوں کو ورثے میں ملے گا اور قوم کی قوم اخلاقی صحت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے برباد کر دے گی۔‘‘

# الرفیق ــــ عبدالسلام رفیق

**پروفیسرایازرسول نازکی**

آج جب ہم اردو صحافت کے دوسو برس منا رہے ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ ماضی کے آئینے میں جھانک کر ان تاریخی ہستیوں کو یاد کیا جائے جنھوں نے اپنے اپنے زمانوں میں ناسازگار حالات کے باوجود اردو صحافت کی آبیاری کی۔ کشمیر میں اردو صحافت کی تاریخ رقم کرنے والے بیشتر اصحاب ایک ایسی شخصیت سے یا تو ناواقف تھے یا پھر سہواً اسے نظرانداز کرتے رہے، جس نے ریاست میں صحافت کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس نشست میں اس ہستی کا تعارف پیش کرنے کی سعی کی جائے گی۔ جی ہاں اس شخص سے میری مراد کشمیر کے ایک مایۂ ناز سپوت سے ہے جو بیک وقت صحافت، سیاست، تجارت، ادب اور شاعری اور جانے کن کن دیاروں کی سیاحت میں مصروف رہے۔

کشمیر کے شرفا میں ایک خاندان رفیقیوں کا بھی ہے۔ کشمیر میں اس خاندان کی بنیاد ڈالنے والے شخص کا نام طاہر رفیق تھا جو 1560 عیسوی یعنی 920 ہجری کے آس پاس عراق سے بسلسلۂ تجارت سفر کرتے ہوئے کشمیر وارد ہوئے۔ اس دور میں کشمیر میں حضرت میر محمد ہمدانی ؒ

موجود تھے۔ طاہر رفیق ان کے کام سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ انھوں نے کشمیر کو اپنا وطن بنایا اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ڈوگرہ حکومت کے آغاز میں اس خاندان کے ایک فرد حبیب اللہ رفیقی نے کشمیریوں پر ہونے والے مظالم سے دل برداشتہ ہو کر احتجاج کا راستہ اختیار کیا اور کئی پمفلٹ تحریر کیے اور انھیں تقسیم کیا۔ اس جرم کی پاداش میں وہ ملک بدر کیے گئے۔ انھوں نے کانگڑہ کی وادی میں ایک گاؤں نور پور ہجرت کی۔ ان کے دو بیٹے تھے، بدرالدین اور یحییٰ۔ یہ خاندان کانگڑہ میں کشمیری پیر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ بدرالدین کے بھی دو صاحبزادے تھے۔ عبدالسلام اور قاسم۔ یحییٰ صاحب کی ایک بیٹی تھی۔

عبدالسلام رفیقی کی زندگی کا سفر اسی گاؤں سے شروع ہوا۔ بدرالدین صاحب نے اپنے صاحبزادے کو مروجہ تعلیم سے آراستہ و پیراستہ تو کیا ہی اور چھوٹی سی عمر میں عبدالسلام حافظ قرآن بھی ہو گئے اور نو سال میں مولوی سلام کہلانے لگے۔ اُن کے والد زمانہ شناس تھے۔ وہ آنے والے وقتوں میں مغربی طرز تعلیم کی اہمیت اور افادیت بھانپ گئے تھے۔ اُنھوں نے عبدالسلام کو مقامی مشن اسکول میں داخل کروایا۔ جب کشمیر میں رہنے والے اُن کے رشتے داروں کو اس ناپسندیدہ عمل کی خبر ہوئی تو اُنھوں نے بدرالدین اور ان کے خاندان کا بائیکاٹ کیا، جس کا سیدھا سیدھا یہ نتیجہ نکلا کہ بدرالدین اپنے چھوٹے صاحبزادے قاسم کو مغربی طرز کی تعلیم و تربیت نہ دے سکے۔ عبدالسلام مشن اسکول سے فارغ التحصیل ہوئے اور علوم مشرقیہ کے ساتھ ساتھ وہ مغربی علوم سے آشنا ہو گئے۔

1893 میں عبدالسلام کی اپنی چچیری بہن سے شادی ہو گئی، اس کے ساتھ ہی وہ ڈلہوزی کی جامع مسجد میں امامت کے فرائض دینے کے لیے منتخب ہو گئے۔ ڈلہوزی کے قیام کے دوران ایک دن چہل قدمی کرتے ہوئے ڈلہوزی کے ''انگلش کلب'' کے باہر آویزاں تختی پر ان کی نظر پڑی۔ اس پر تحریر تھا "Dogs & Indians not allowed"۔ وہ یہ برداشت نہیں کر پائے۔ تختی اُتار کے اس کے ریزے ریزے کر دیے اور یہ ٹکڑے اُٹھائے کلب میں داخل ہوئے اور منیجر کو پوری کارروائی سے آگاہ کیا۔ حکومت حرکت میں آ گئی۔ گرفتار ہوئے اور اپنے والد کی روایت برقرار رکھتے ہوئے ڈلہوزی سے جلا وطن کر دیے گئے۔ اس جلاوطنی کے نتیجے کے طور پر وہ واپس

اپنے آبائی وطن آئے، یہ 1894 کا سال تھا۔ انھوں نے فتح کدل میں ایک مکان بنوایا۔ مگر بیشتر وقت ہاؤس بوٹ میں رہنے لگے۔ کشمیر واپسی سے پہلے وہ سرسید احمد خان سے مل چکے تھے اور وہ سرسید کی اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس کے بانی ممبروں میں تھے۔ کشمیر وارد ہوکر انھوں نے کشمیریوں کی حالت زار کا مشاہدہ کیا اور مولانا رسول شاہ صاحب میر واعظ کشمیر کو انجمن نصرت الاسلام کی داغ بیل ڈالنے کی تحریک دی۔ اس تنظیم کی بنیاد 1899 میں ڈالی گئی لیکن وہ یہ دن دیکھنے کے لیے 1899 میں کشمیر میں موجود نہیں تھے۔ کیونکہ دو سال قبل 1896 میں اپنے ذاتی ماہنامے الرفیق کے صرف دو شمارے جاری ہو جانے کے بعد وہ زیر عتاب تھے۔ انھوں نے پہلے شمارے سے ہی اپنے ارادے مشتہر کرادیے تھے اور حکومتِ وقت کی زبردست نکتہ چینی کی تھی۔ مہاراجا پرتاپ سنگھ نے پہلے تو انھیں رام کرنے کی کوشش کی اور انھیں وزارت کے عہدے کی پیشکش کی جو عبدالسلام نے کھڑے کھڑے ٹھکرادی۔ الرفیق پر پابندی لگی۔ ہرکھ پرشاد کے تحفۂ کشمیر پریس پر تالا پڑا اور عبدالسلام رفیقی کو پھر ایک بار ملک بدر کردیا گیا۔ وہ شملہ چلے گئے۔

1901 کی اینگلو اورینٹل کانفرنس میں مہاراجا پرتاپ سنگھ بھی شریک ہوئے تھے۔ انھوں نے اس کی نشست کے دوران خود کو عبدالسلام رفیقی کے بہت پیچھے بیٹھا پایا۔ سیخ پا ہوئے۔ مہاراجا نے حکومت ہند سے شکایت کی اور عبدالسلام رفیقی پر شکنجہ کسنے کی صلاح دی۔ رفیقی شملہ سے نکلے دہلی گئے، وہاں سے کلکتہ گئے مگر کہیں بھی چین اور سکون سے نہ رہ پائے۔ آخر کار وہ رنگون برما وارد ہوئے، کشمیر سے ہجرت کے ساتھ جو خانہ بدوشی کا سلسلہ شروع ہوا تھا اس کے دوران ایک چیز پر وہ مستقل طور پر کاربند رہے۔ یہ تھی الرفیق کی اشاعت۔ اس طرح چلتے چلتے الرفیق رنگون برما سے شائع ہونے لگا اور اس میں حکومتِ وقت کو برابر نشانہ بنایا جاتا رہا۔ جس شہر سے بھی انھوں نے الرفیق شائع کیا، اس پر پابندی لگی، پریس ضبط ہوا، دیس نکالا ملا اور وہ آگے بڑھتے گئے۔ کلکتہ میں تو وہ گرفتار بھی کیے گئے اور انھیں سزا بھی ہوئی۔ سزا کاٹ لینے کے بعد رہائی کے موقع پر ہی حکام نے انھیں کلکتہ چھوڑ دینے کا حکم سنایا۔ رنگون میں آمد پر وہ کچھ دیر خاموش رہے، اپنی قوتیں مجتمع کرتے رہے، ایک تجارت پر دھیان مرکوز کیا تاکہ اپنے اوپر جمع ہوئے قرضے ادا کر پائیں۔ انھوں نے ٹیک کی لکڑی برطانیہ، گلاسگو برآمد کرنے کا کام شروع کیا اور پھر جاپان کے ساتھ بھی تجارتی

روابط استوار کیے۔ مزید وہ ٹائپ رائٹروں کی تجارت بھی کرتے تھے۔ اس سلسلے میں الرفیق کے مارچ 1907 کے شمارے میں متفرق خیالات کے عنوان کے تحت شائع یہ اشتہار ملاحظہ ہو:

''از رفیق تا حافظ'' — شکر ہے کہ رنگون میں جناب عبدالسلام رفیقی اور گلاسگو میں جناب حافظ عبد الرحمان، بس اب کسی بات کی کمی نہیں، سوداگران رنگون و برما بلا دریغ مال واسباب منگائیں، کارخانہ جات کے لیے عمدہ کلیں۔ یہ دونوں اصحاب معاملہ خوب سمجھتے ہیں اور قوم کے بہی خواہ ہیں۔ حضرت رفیقی کے وسیلے صدہا نوجوان علوم وفنون کے سیکھنے کے لیے گلاسگو آجائیں۔ اُن کے لیے حافظ جی اچھا انتظام کریں گے۔ ہندی، برمی، چینی اور جاپانی تاجران احباب کی خدمت سے مستفید ہو سکتے ہیں۔''

اسی دوران سلام صاحب نے آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے رنگون میں موجود مزار کی کس مپرسی سے متاثر ہو کر پہلے تو حکومت سے اس کی تعمیر وتجدید کی مانگ کی، مگر بعد میں عوامی عطیات جمع کر کے خود اس کی تعمیر مکمل کروائی۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران سلام صاحب نے برٹش سرکار کو مشورہ دیا کہ وہ ہندوستان کو Dominion Status دے تاکہ ہندوستانی اپنی رضا سے اس جنگ میں شریک ہوں۔ ظاہر ہے حکومت برطانیہ اس پر آمادہ نہیں ہوئی۔ اس کے بعد سلام صاحب نے ہندوستانیوں کو مشورہ دیا کہ وہ برطانوی فوج میں شامل ہو جائیں، فوجی مہارت حاصل کریں اور بعد ازاں برطانیہ کے خلاف جنگ لڑیں۔ اس پر انھیں گرفتار کیا گیا۔ ان کی تمام املاک ضبط ہوئیں اور ان کے تمام خاندان کو برما سے نکل کر کشمیر جانے کا حکم دیا گیا۔ جیل میں سلام صاحب کو خبر ہوئی کہ انھیں غداری کے الزام میں موت کی سزا دی جانے والی ہے۔ کچھ آزادی پسند ہندوستانیوں اور برمی خیر خواہوں کی مدد سے وہ جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے اور جاپان کی جانب چل پڑے۔ انھیں جاپان میں قرار نہ آیا اور جکارتا جا پہنچے جسے اُس زمانے میں بٹویا (Batavia) کہا جاتا تھا۔ یہاں وہ عرب نسل کے باشندوں کے ساتھ گھل مل گئے۔ کیونکہ وہ عربی الاصل کی طرح عربی بول سکتے تھے۔ ان کے وہاں موجود ہونے کا راز زیادہ دیر تک راز نہ رہ

سکا اور علاقے کی ایسٹ انڈیز حکومت نے ان کی موجودگی کی اطلاع برطانیہ سرکار کو دے دی۔ برطانوی سرکار نے جی توڑ کوشش کی کہ سلام صاحب کو اس کے حوالے کیا جائے مگر ایک بہترین وکیل کی خدمات اس میں مانع ثابت ہوئیں۔ بالآخر ڈچ حکام نے سلام صاحب کو مغربی تمور کے دور دراز علاقے میں کوپانگ نامی گاؤں کو روانہ کیا۔ ان کی نگرانی کے لیے ایک نیوزی لینڈی باشندے Mr.Piliet کو مقرر کیا گیا۔ اس کے ذمے یہ کام تھا کہ سلام کسی غیر پسندیدہ عمل کے مرتکب نہ ہوں۔ سلام صاحب اگر چہ اس گاؤں میں آزاد زندگی گزارنے کے حقدار تھے مگر وہ کسی غیر ملکی ادارے یا کمپنی کے ساتھ کوئی تجارتی رشتہ پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ انھیں اسی گاؤں میں اپنے روزگار کو تلاش کرنا تھا۔ اُن کے پاس یہ شرائط قبول کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ کیونکہ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں اندیشہ یہ تھا کہ انھیں حکومت برطانیہ کو سونپ دیا جاتا اور ان کی آزادی خطرے میں پڑ جاتی۔ انھوں نے خاموشی سے ایک چھوٹی سی کرانے کی دُکان شروع کی اور دیہات سے سامان خرید کر پاس والے قصبہ جات کے بازاروں کو سپلائی کرنے لگے۔ کاروبار تیزی سے پھیل گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک کامیاب تجارتی ادارے کے مالک بن گئے۔ مقامی آبادی میں ان کی بے پناہ عزت کے باعث انھیں ''تواں سلام'' کہا جانے لگا۔ اُنھوں نے دامنِ کوہ میں ایک ندی کے کنارے پر عالیشان کوٹھی تعمیر کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انڈونیشیا کے عوام ڈچ سے آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے۔ اس تحریک کے کئی سرکردہ رہنماؤں کو گرفتار کر کے سزا کے طور پر کوپانگ روانہ کیا جاتا تھا۔ ''تواں سلام'' ان رہنماؤں کے مشیرِ اعلیٰ بن گئے۔ انڈونیشیا کے صدر ''سوکارنو'' تواں سلام کے خاص معتقدوں میں شامل تھے اور صدر بن جانے کے بعد کئی بار ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سلام صاحب نے 1920 میں ایک چینی خاتون سے شادی کی۔

Marcopolo of Kashmir/India کا خطاب پانے والے اس مردِ مجاہد نے مختصر علالت کے بعد جکارتا میں وفات پائی۔ ملک کے مقتدر روزنامے ''جکارتا ڈیلی'' نے ان کی وفات کا اعلان ان الفاظ میں کیا۔

> ''بروز بدھ 3 جولائی 1941 ''تواں سلام'' کا انتقال ہوگیا۔ اسلامی رسوم کے مطابق ان کی تدفین ''کیرٹ دی بیٹادی'' میں ہوئی ان کے جنازے

میں شامل ہونے والوں میں ہندوستان، انڈونیشیا اور تقریباً سب ہی یورپی ممالک کے افسران تھے۔ سیلام پنجاب ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے اور سیاست میں سرگرم تھے۔ اُنھوں نے کئی زبانوں میں لکھا جن میں اردو، فارسی اور عربی شامل ہیں۔ جناب حق نے المرحوم جناب سیلام کی حیات کے بارے میں تقریر کی اور ان لوگوں کا شکریہ ادا کیا جو جنازے میں آئے۔ خاص طور پر ڈاکٹر سہارٹو اور ان کی بیگم کا۔''

جناب میر غلام رسول نازکی نے عبدالسلام رفیقی کے حوالے سے یوں تحریر کیا ہے اور اسی اقتباس پر یہ تحریر اختتام کو پہنچتی ہے۔

''عبدالسلام رفیقی کے دوستوں میں سرسید احمد خان، مولوی ذکاء اللہ، شبلی وغیرہ تھے اور یہ ''الرفیق'' میں لکھتے تھے۔ خود عبدالسلام رفیقی کا اندازِ تحریر سرسید کی طرزِ تحریر سے ملتا جلتا ہے۔ فارسی زبان کے بہت اچھے شاعر تھے''۔

ایک غزل کے چند شعر یہ ہیں:

نیست محرابِ دلم جُز خمِ ابروئے دوست
قبلۂ نفل و نمازِ من خیالِ روئے دوست

مردم از بیماریٔ عشقش ولے روزِ جزا
خوں بہا خواہم نگاہِ نرگسِ جادوئے دوست

شاہد و مشہود شد زانو بہ زانو گوش کن
در رموزِ عشق باشد جملہ گفتگوئے دوست

گر سرِ زلفم پریشاں از ہوائے عشق شد
پیچ و تاب آموختم چوں مار از گیسوئے دوست

آرزوئے من رفیقی نیست بعد از مرگ ہیچ
جُز کہ باشد خوابگاہِ ناز در پہلوئے دوست

# گیارھواں باب

## اردو صحافت مسائل و امکانات

# نیا ترسیلی بیانیہ اور اردو صحافت

پروفیسر شافع قدوائی

نئی صارف اساس اطلاعاتی تکنالوجی کے حوالے سے مرتب اور متشکل ہونے والی اکیسویں صدی کو متعدد متعین امتیازات کے باعث مابعد صداقت اور قومیت (Post-truth and Nation Century) عہد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس عہد کا اہم ترین شناس نامہ موبائل فون اور انٹرنیٹ کا پیہم استعمال ہے جس کی اساس اصلاً بولے ہوئے لفظ (Spoken Word) پر قائم ہے اور Chatting سمیت دیگر ذرائع ترسیل میں Spoken Word کی ہمہ گیر بالادستی کے پیش نظر اب رسم الخط کی حاکمیت کے خاتمے (End of tyranny of script) کے تصور کو بھی فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ اس تعبیر آشنا اور فتوحات اور کامرانیوں کے نئے امکانات کی مسلسل آبیاری کرنے والی کائنات اب کسی نجات کوش فلسفہ (Emancipatory Philosophy) یا خوش آئند نظریۂ حیات یا وسیع تر سیاسی سیاق کو محیط منظم کوشش یا لسانی یا ثقافتی آرزومندیوں کو بروئے کار لانے والی حکمت عملی کو قبول نہیں کرتی بلکہ انسان اور دیگر نوامیس فطرت کے باہمی ارتباط کی نوعیت اور انسان کے پرپیچ اور سنگین خارجی مسائل اور اس کے وجودی سروکاروں اور حسیاتی اور جمالیاتی منطقوں کی

شیرازہ بندی اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ایک ہمہ جہت ترسیلی بیانیہ کی تشکیل کرتی ہے جو انسان کے جملہ مسائل کو بیک وقت مرکز نگاہ بناتا ہے اور ان کے ازالے کا مکالمہ قائم کرتا ہے۔ ذرائع ابلاغ اور عمل ترسیل اب کسی شے کے حصول کا ذریعہ نہیں بلکہ فی نفسہ End ہو گئے ہیں۔ حسن و قبح اور رد و قبول کا عمل کسی مذہبی، مابعد الطبیعیاتی، سیاسی اور سماجی احکام کا پابند نہیں بلکہ معاشرے کا حاوی ڈسکورس (Dominant Discourse) ذرائع ابلاغ ایک ایسے ترسیلی بیانیہ کے حوالے سے قائم کرتے ہیں کہ اس کی اثر پذیری سے زندگی کا کوئی گوشہ نہیں بچ پاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معاصر معاشرے کو Spectacle Society یا تماشہ معاشرہ بھی کہا جاتا ہے۔ خرید و فروخت کی سرگرمیوں سے قطع نظر جذبوں کے اظہار اور عقیدے سے متعلق رسومیات بشمول مذہبی تقریبات اور تہواروں کے انعقاد اور ان کی تاریخوں کا تعین بھی ذرائع ترسیل کرتے ہیں۔ محبت کے جذبے کی نوعیت اور اس کے اظہار کی تاریخ کا تعین انسانی تاریخ میں ہمیشہ مذاہب یا معاشرتی رسومیات کی رو سے کیا جاتا رہا ہے۔ کرسمس، دیوالی، ہولی اور عید وغیرہ کی مثالیں سامنے کی ہیں۔ اسی طرح زندگی کے مختلف میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دینے والوں کے یوم پیدائش یا یوم وفات یا پھر کسی قومی مملکت (Nation State) کی تاریخ میں کسی اہم دن پر تقریبات کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ مگر بازار اساس معاشرہ، جن کے پاس خریدنے اور بیچنے کی طاقت کے علاوہ کوئی اور قوت نہیں ہے، اب ذرائع ابلاغ کے توسط سے انسان کے معتقدات اور جذبات کو بھی کیش کرنے پر قادر ہو گیا ہے۔ ماں سے یا باپ سے محبت کا اظہار کسی بھی دن کیا جا سکتا ہے مگر اسے ایک مخصوص دن سے وابستہ کرکے اور کارڈ کی صورت میں اس رسم کی ادائیگی کو قابلِ قبول بنا دینا اسی روش کا غماز ہے۔ اسی طرح جنس مخالف سے محبت کے اظہار کو 14 / فروری کو Valentine's Day سے مربوط کر دینا وغیرہ اس نوع کی اہم مثالیں ہیں۔ فنون لطیفہ اور کلچر کے اعلیٰ ترنمونوں کے بجائے اس کی مقبول عام اور پست سطح کو فروغ دینا بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

نیا ترسیلی بیانیہ، جس کے محور پر سمعی و بصری ذرائع ابلاغ کے علاوہ اخبار اور جرائد بھی گردش کرتے ہیں، محض خارجی حقائق اور واقعات کو مرکز نگاہ نہیں بناتا یا حقیقت کی عکاسی نہیں کرتا بلکہ حقیقت کی خود تشکیل کرتا ہے اور پھر زبان، تصاویر اور متحرک امیج کے توسط سے یہ باور کراتا ہے

کہ اصل حقیقت یہی ہے۔ کاشتکاروں کی خودکشی کے واقعات کو نظر انداز کر کے قارئین یا ناظرین اور سامعین کو بتایا جاتا ہے کہ نمبر ایک سلمان خان ہے یا شاہ رخ یا بگ باس کے گھر میں گزشتہ شب کیا ہوا۔ یہی سب سے اہم واقعہ ہے اور قارئین کی تمام تر دلچسپی کا مرکز اسی نوع کے واقعات ہیں۔

نیا ترسیلی بیانیہ اطلاع رسانی، ذہن سازی اور انبساط آفرینی سے بیک وقت کسب فیض کرنے کے بجائے اب محض Infotainment Model کو پیش نگاہ کرتا ہے یعنی اطلاع کی ترسیل میں بھی تفریح رسانی کے نت نئے امکانات کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ ہر خبر ایک روزہ کرکٹ میچ کی سنسنی خیزی کے ساتھ پیش کی جاتی ہے اور اب خبر اور رائے کا فرق بھی تقریباً معدوم ہو گیا ہے۔ اخبار کی سوچی سمجھی رائے کا اظہار اداریے میں ہوتا تھا مگر اب اہم خبروں کے ساتھ رائے کا بھی برملا اظہار کر دیا جاتا ہے۔ ٹائمس آف انڈیا نے بعض اہم خبروں کے آخر میں ٹائمس آف انڈیا کی رائے (Times of India's Views) کے عنوان سے خبر پر رائے زنی کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ اس طرح اداریے کی مرکزیت اور اس کے تقدس کے تصور کو بھی تہ و بالا (Subvert) کر دیا گیا ہے۔ ٹیلی ویژن میں ظاہر ہے کہ اداریے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی، لہٰذا اہم موضوعات پر مذاکرے کا اہتمام کیا جاتا ہے اور ہر ٹی وی اینکر (Anchor) کی کوشش ہوتی ہے کہ معروضی اور سنجیدہ بحث کے بجائے مجادلے کی سی صورت (Fight like situation) پیدا کر دی جائے تاکہ انسان کی خلقی کج روی (Wickedness) اس نوع کی سرگرمیوں سے بطور خاص محظوظ ہوتی رہے۔ بگ باس (Big Boss) کی مقبولیت کا اصل سبب یہی ہے۔

نیا ترسیلی بیانیہ سنجیدہ اور باخبر (Informed) قاری/سامع/ناظر کے بجائے انسانی دردمندی سے عاری تماش بین کو وجود میں لا رہا ہے، جس کے نزدیک اطلاف انسانی سے کہیں زیادہ اہم اداکار کی ذات ہے۔ یہی سبب ہے کہ کار سے کچل کر جاں بحق ہونے والے مزدوروں کے ملزم کو جب بری کیا گیا تو اس کا جشن ڈھول تاشے کے ساتھ سڑکوں پر منایا گیا۔ انسانی بے حسی کے ایسے مناظر اب عام ہو گئے ہیں۔ ترسیل کی نئی حکمت عملی دراصل زبان کے تکلمی کردار کو پیش نگاہ رکھتی ہے اور خبروں کی پیش کش کے طریقوں پر تقریر (Speech Act) کے سائے لرزاں نظر آتے

ہیں۔ بول چال کے الفاظ کے پیہم استعمال سے تحریر میں بھی گفتگو کی سی برجستگی پیدا کر دی جاتی ہے اور الفاظ کی صحت یا ان کے صحیح تلفظ پر توجہ نہیں دی جاتی ہے۔ جو عوامی سطح پر رائج ہے وہی صحیح بھی ہے۔ نیا ترسیلی بیانیہ زبان کے تئیں اسی نقطۂ نظر کا موید ہے۔

نیا ترسیلی بیانیہ ماضی کے برخلاف ترسیل کے بڑی حد تک یکطرفہ ہونے کا قائل نہیں ہے۔ اب ترسیل کا بہاؤ لازماً ماخذ سے وصول کنندہ تک نہیں ہوتا بلکہ اکثر یہ ترتیب معکوس صورت بھی اختیار کر لیتی ہے۔ نیا بیانیہ زیادہ Participatory یا قاری/ناظر/سامع اساس ہو گیا ہے۔ اخباروں میں تو مراسلے کے کالم کی روایت زمانۂ قدیم سے قائم ہے مگر اب ٹی وی میں ناظر اپنے ویڈیو بھی بھیج سکتے ہیں۔ اسی طرح اب Citizen Journalism کا نیا دور شروع ہوا ہے۔ مختلف ٹی وی چینلوں نے سوشل میڈیا مثلاً یوٹیوب، فیس بک اور ٹوئٹر جن کی نوعیت تعاملی (Interactive) ہے، کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ناظر کی مرسلہ خبروں اور رپورٹوں کو نشر کرنا شروع کیا ہے۔

انسان کی جملہ ضروریات اور اس کی حسی و جذباتی تسکین کو اولین ترجیح دینا نئے ترسیلی بیانیہ کا مابہ الامتیاز عنصر ہے۔ ٹی وی سے قطع نظر اگر محض اخبارات کو مرکز نگاہ بنایا جائے تو یہ منکشف ہوگا کہ اب محض اداریہ یا مضامین کے توسط سے کسی موضوع سے متعلق تمام اہم مباحث سے قاری کو واقف نہیں کر دیا جاتا بلکہ اب ادارتی صفحے کے علاوہ دیگر صفحات پر بھی کسی اہم موضوع یا کسی اصطلاح (Term) کی وضاحت کے لیے خصوصی کالم شائع کیے جاتے ہیں اور اسے e-explained کے عنوان سے چھاپا جاتا ہے۔ انڈین ایکسپریس نے یہ اہم اور خوش آئند سلسلہ شروع کیا ہے۔ اخبار کے تجربے کار ادارتی عملے کا کوئی رکن خصوصاً اسسٹنٹ ایڈیٹر یہ کالم لکھتا ہے اور آخر میں مزید مطالعے کے لیے مفید کتابوں اور ویب سائٹوں کی بھی نشاندہی کی جاتی ہے۔ اسی طرح صحت اور تندرستی سے متعلق مضامین کے لیے ہفتے میں ایک صفحہ مختص کیا جاتا ہے اور اکثر کسی ڈاکٹر یا تغذیہ کے ماہر کے قارئین کے ساتھ سوال و جواب کا کالم بھی شائع کیا جاتا ہے۔ کچھ اخباروں میں نئی کتابوں کے تبصروں پر مشتمل ہفتہ وار خصوصی صفحہ شائع کیا جاتا ہے، اسی طرح مذہب اور اخلاقی تعلیمات سے متعلق خصوصی کالم بھی اشاعت پذیر ہوتا ہے۔ ٹائمس آف انڈیا

میں اس کالم کا عنوان Speaking Tree ہے۔

اس نئے ترسیلی بیانیہ کے امتیازات پر قدرے تفصیلی گفتگو کے بعد یہ ضروری ہے کہ اس پس منظر میں اردو صحافت علی الخصوص اردو اخبارات کا جائزہ لیا جائے۔ اردو صحافت کی 200 سالہ تاریخ پر نظر ڈالنے سے منکشف ہوگا کہ اردو صحافت ابتدا ہی سے اطلاع رسانی اور مختلف علوم سے اور نئی سائنسی ایجادات سے قارئین کو واقف کرانے کا فریضہ انجام دیتی رہی ہے۔ اردو کے اولین صحافیوں مولوی اکرام، منشی سدا سکھ لال، سید محمد باقر، سید محمد خاں، نول کشور اور سرسید نے صحافت کے جس تصور کی آبیاری کی اس میں واقعات کے سنسنی خیز بیان کے بجائے رونما ہونے والے اہم واقعات اور مختلف میدانوں میں ہونے والی نئی علمی پیش رفت سے قارئین کو واقف کرانا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اردو صحافت نے ابتدا ہی سے غیر ملکی تسلط کے خلاف صدائے احتجاج کو اپنا شعار بنایا تھا اور سید محمد باقر کو اس سلسلے میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنا پڑا تھا۔ صادق الاخبار کا طرز عمل بھی کم وبیش یکساں تھا تاہم 1857 کی ناکام جنگ آزادی کے بعد صورتحال خاصی تبدیل ہوئی۔ سرسید نے 1866 میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نکال کر اردو صحافت کو ایک نئے ذائقے سے آشنا کیا اور قارئین کے جذبات کو برانگیختہ کرنے کے بجائے ان میں مسائل کے تئیں معروضی نقطۂ نظر پیدا کرنے کی کوشش کی۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے خبر اور اداریہ میں واضح فرق کی نشاندہی کرتے ہوئے اداریہ کی باقاعدہ اشاعت کا اہتمام کیا۔ سرسید کی روش پر اردو صحافت کم ہی عمل پیرا ہوئی اور احتجاج کی لے ہمیشہ تیز رہی ہے۔ جدو جہد آزادی کے دوران اور تقسیم وطن کے بعد بھی اردو صحافت جس نوع کے ترسیلی بیانیہ سے کسب فیض کرتی رہی، اس کی نوعیت بڑی حد تک احتجاجی ہی تھی۔ بابری مسجد کے انہدام کے بعد صورتحال میں نمایاں تبدیلی آئی اور اب اردو صحافت محض احتجاج کو اپنا مقصود نہیں جانتی اور اہم معاصر اخباروں مثلاً سیاست (حیدرآباد)، انقلاب (ممبئی، دہلی)، منصف (حیدرآباد)، راشٹریہ سہارا (نئی دہلی) اور اخبار مشرق (کلکتہ) وغیرہ پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب اردو اخبارات اردو، مسلم یونیورسٹی، فرقہ وارانہ فسادات اور مسلم پرسنل لا کو محض مرکز نگاہ نہیں بناتے بلکہ وہ اپنے قارئین کے جملہ تقاضوں پر پورا اترنے کی کوشش کرتے ہیں اور نئے ترسیلی بیانیہ سے جس کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے، خود کو مربوط کرنے کی بھی سعی کرتے

ہیں۔ اردو اخبارات میں ملک کے مشہور کالم نگاروں اور سیاسی مبصروں کے سنجیدہ تجزیے شائع ہوتے ہیں اور خبروں کے انتخاب میں بھی محض کسی ایک فرقے کے مذہبی جذبات کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ ''مسلمان کیا کریں'' اردو صحافت کا انتہائی مرغوب سوال رہا ہے تاہم اب اردو اخبار مسلمانوں کے مسائل کو سماج کے دیگر محروم اور حاشیے پر سانس لینے والے افراد کے مسائل کے تناظر میں پیش کرنے لگے ہیں۔

اردو صحافت علی الخصوص اخبارات نئے ترسیلی بیانیہ کی پاسداری کرنے کے ساتھ بعض خوشگوار نقطہ ہائے انحراف کی خبر بھی دے رہے ہیں۔ اولاً تو یہ کہ اردو اخبار اب بھی Infotainment یا Page Three Journalism کے قائل نہیں ہیں، لہٰذا Entertainment World کی خبروں کی اشاعت کے لیے کوئی صفحہ مخصوص نہیں کیا گیا ہے اور نہ celebrities کے ساتھ چیٹنگ کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اسی طرح ضعیف الاعتقادی اور اوہام پرستی کے فروغ سے متعلق مواد بہت کم اشاعت پذیر ہوتا ہے۔ ستاروں کی چال یا قسمت کا حال کالم بھی بہت کم اردو اخباروں میں شائع کیا جاتا ہے۔

اردو اخبارات کے انٹرنیٹ ایڈیشن شائع ہونے لگے ہیں اور اردو اخبارات بھی بڑی حد تک Interactive ہو گئے ہیں۔ e-learning کا تصور ابھی زیادہ مقبول نہیں ہو سکا ہے اور اس ذریعے سے قارئین کی ذہن سازی کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی ہے۔

زبان، تصاویر اور دیگر بصری مواد کی اشاعت کی سطح پر اردو اخبار نئے ترسیلی بیانیہ سے پوری طرح ہم آہنگ ہے جو اردو اخبارات کے خوش آئند مستقبل کا اشاریہ ہے۔

# اردو صحافت اور اِمکانات

**شاہد لطیف**

سب سے پہلے ادارہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا شکریہ کہ اس نے اہل اردو زبان اور اہل اردو صحافت کو قومی اور عالمی سطح پر یاد دلایا کہ کل تک محبوب اور آج کی معتوب زبان اردو کی صحافت دو سو سال پورے کرنے کا اعزاز حاصل کر چکی ہے۔ یہ نہ ہوتا تو اخبارات میں اکا دکا مضامین شائع ہو جاتے اور بات آگے نہ بڑھتی۔ ایسی صورت میں اردو عوام کو معلوم ہی نہ ہوتا کہ اردو صحافت کتنا طویل سفر طے کر چکی ہے۔

دو سو سال کم نہیں ہوتے۔ دورِ حاضر میں دو سو سال یعنی تین تا پانچ نسلوں کا اوسط عرصۂ حیات۔ آزادی کے بعد جس زبان کے امکانات کا گلا گھونٹنے کی شد و مد سے کوشش کی گئی، سچ پوچھیے تو وہی زندہ و تابندہ نہیں ہے بلکہ اس کی صحافت بھی، جسے چراغ آخر شب سمجھا جا رہا تھا، اپنے محدود وسائل کے باوجود روشنی بکھیرنے اور نئے امکانات تلاش کرنے میں مصروف ہے۔ نئے امکانات کا یہ سفر زبان کے امکانات سے مربوط اور مشروط ہے۔ اگر زبان پھلتی پھولتی رہی تو اردو صحافت کو کبھی پیچھے دیکھنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی اور اگر خدانخواستہ زبان کی ترویج و

اشاعت محدود اور مخدوش رہی تو اردو صحافت کے امکانات بھی معدوم ہوتے چلے جائیں گے۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ اردو زبان کے مستقبل کے تعلق سے کوئی بھی بات وثوق سے نہیں کہی جاسکتی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ زبان اپنی جلوہ سامانیوں کے ساتھ زندہ رہ سکے گی یا چند یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے علوم مشرقیہ میں سمٹ کر رہ جائے گی۔ اس وقت بھی یہ کہنا مشکل ہے کہ زبان اپنی تہذیبی قدروں کے ساتھ صحت مند زندگی گزار رہی ہے یا جاں بہ لب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر زبان کے مستقبل کے تعلق سے کوئی سمینار منعقد کیا جائے تو شرکائے سمینار دو حصوں میں منقسم نظر آئیں گے۔ ایک گروہ کہے گا کہ زبان کا مستقبل تابناک ہے اور اس کے پاس اپنے دلائل ہوں گے، جنھیں مسترد نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح دوسرا گروہ کہے گا کہ زبان کا مستقبل تابناک نہیں ہے اور اس کے پاس بھی اپنے دلائل ہوں گے۔ انھیں بھی مسترد نہیں کیا جاسکے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ زبان کا مستقبل تابناک نہیں ہے لیکن مایوس کن بھی نہیں ہے۔ اہل اردو اپنے روایتی تساہل و تغافل کو تج دیں اور میدان عمل میں آجائیں تو غیر ممکن ہے کہ اردو کے تعلق سے ملکی اور غیر ملکی سطح پر حالات نہ بدلیں لیکن اہل اردو ہیں کہ میدان عمل کے نام ہی سے بدکتے ہیں۔ ان کے نزدیک میدان تو ٹھیک ہے لیکن عمل حشو ہے، حشو قبیح۔ یہ لوگ عمل سے عاری نہ ہوتے تو ملک کے طول و عرض میں ایسے خدام اردو سے جابجا ملاقات ہوتی جو غیر اردو داں طبقے کو اردو سکھاتے اور اردو داں طبقے کی اردو درست کرتے۔ آج بھی ملک میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو اردو کے تئیں رغبت اور دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہیں، اردو سیکھنا چاہتے ہیں اور اگر تھوڑی بہت توجہ دلائی جائے یا وسائل فراہم کردیے جائیں تو وہ اردو سیکھ لیں گے۔ یہ لوگ براہ راست اردو کے دائرے میں نہیں ہیں لیکن اردو کا اثاثہ تصور کیے جاسکتے ہیں، اُردو کے جائز مقام کی جدوجہد میں ان کا گرانقدر تعاون بآسانی حاصل ہوسکتا ہے بلکہ ماضی میں ہوا بھی ہے۔ شرط اپنے متحرک ہونے کی ہے۔ یہ بحث خاصی طویل ہوسکتی ہے لیکن چونکہ اس مقالے کا عنوان اردو کا مستقبل نہیں بلکہ اردو صحافت اور امکانات ہے اس لیے اردو کے تحفظ اور فروغ کے نام پر کیا ہوتا رہا اور کیا ہونا چاہیے کے بجائے آیئے اردو صحافت کی موجودہ صورت حال اور مستقبل سے وابستہ اُمیدوں پر تھوڑی بہت گفتگو کرلی جائے۔ اردو کی موجودہ صورت حال پر جو چند باتیں جملہ ہائے معترضہ کی شکل میں

بالائی سطور میں جگہ پا گئی ہیں وہ اس لیے ضروری تھیں کہ اردو صحافت کے امکانات کو اردو زبان کے امکانات سے کسی صورت علاحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

ٹکنالوجی کی حیران کن ترقی کے اس دور میں موبائل، کمپیوٹر، سیکڑوں اَیپ، انٹرنیٹ، فیس بُک، ٹویٹر اور ایسے ہی دیگر آلات و انتظامات نے انسانی زندگی کو وہ سہولتیں بہم پہنچائی ہیں کہ جن کا تصور بھی ماضی میں ممکن نہیں تھا۔ ان کی بدولت خبر رسانی اتنی آسان ہو گئی ہے کہ اگلے وقتوں کے کسی ایسے صحافی کو، جو تکنیکی تجربے کا حامل رہا ہو، دوبارہ زندگی مل جائے اور وہ دورِ حاضر کے اخبارات کی تیاری اور طباعت کا نظم دیکھ لے تو ممکن ہے کہ غش کھا کر گر پڑے۔ مضمون اِس ہاتھ ای میل کیجیے، اُس ہاتھ حاصل کر لیجیے۔ اخبار کا تیار شدہ صفحہ ادھر ایف ٹی پی (فائل ٹرانسپورٹ پروٹوکول) کے حوالے کیجیے، اُدھر پورا صفحہ نکال لیجیے اور تصویر یہاں اَپ لوڈ کیجیے، وہاں وصول کر لیجیے۔ وہ ٹیلی پرنٹر جس پر خبریں موصول ہوتی تھیں، مفقود الخبر ہو چکا ہے۔ اُس قلم اور دوات کو جس کے بغیر خوش نویس حضرات کی شخصیت ادھوری معلوم ہوتی تھی، آثارِ قدیمہ کا درجہ حاصل ہو چکا ہے۔ چھپائی کی وہ مشینیں جو آج کی مشینوں کے مقابلے میں کچھوے کی رفتار سے چلتی تھیں، پرانے البم ہی میں مل سکتی ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کل کے لینڈ لائن ٹیلی فون کے مقابلے میں آج جو حیثیت موبائل اور واٹس ایپ کو حاصل ہے تقریباً وہی حیثیت ماضی کی اخبار سازی کے مقابلے میں آج کی اخبار سازی کو حاصل ہے بلکہ اب تو وہ اخبارات بھی منظر عام پر ہیں جو کاغذ پر نہیں چھپتے بلکہ ویب سائٹس کے اُفق پر جلوہ گر ہوتے ہیں اور قارئین سے داد تحسین وصول کرتے ہیں۔ جدید ٹکنالوجی کے اس طلسم ہوش رُبا نے اردو صحافت کو بھی کم و بیش وہی سہولتیں فراہم کی ہیں جو کسی بھی دوسری زبان کی صحافت کو حاصل ہیں۔ خبر ٹائپ کرنے سے لے کر اخبار کی کاپی پریس کے حوالے کرنے تک اور تازہ شمارہ ویب سائٹ پر اَپ لوڈ کرنے سے لے کر ای پیپر نذرِ قارئین کرنے تک اردو صحافت اپنے روشن امکانات کو حیرت سے دیکھ رہی ہے اور بلّیوں اُچھل رہی ہے۔ کل تک کسی شہر سے شائع ہونے والا اردو اخبار آس پاس کے شہروں تک بھی نہیں پہنچ پاتا تھا۔ ڈاک سے چند سو کاپیاں دور و نزدیک کے شہروں تک بھلے ہی رسائی حاصل کرتی رہی ہوں لیکن ڈاک اور تاخیر کے لازم و ملزوم ہونے سے تاوقتیکہ اخبار کا پتا اپنے پتے پر پہنچتا، اس کی خبریں

سڑ گل جاتی تھیں لیکن اب نیٹ ایڈیشن اور ای پیپر کے ذریعہ ہزاروں لاکھوں میل کی دوری پر واقع شہروں میں بھی اخبار، باقاعدہ اخبار سے پہلے دیکھا اور پڑھ لیا جاتا ہے۔ اس طرح ہفت خواں کا سفر بھی اتنا آسان ہو گیا ہے کہ جیسے پلک جھپکتی ہے ویسے ہی اخبار ملکی و غیر ملکی قارئین کی خدمت میں پہنچ جاتا ہے۔ اس سے قارئین کی تعداد میں حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے۔ یہ الگ بات کہ اب یہ قارئین ''وزیٹر'' کہلاتے ہیں جو آپ کی ویب سائٹ یا ای پیپر کو وزٹ کرتے ہیں۔ وزیٹر کا اردو متبادل ہر چند کہ ملاقاتی ہے لیکن ہم اسے ملاقاتی نہیں سمجھتے، وہ قاری ہے جو نئی تکنالوجی کی مدد سے اخبار کو نہ صرف دیکھتا ہے بلکہ اپنی پسند کے مطابق خبروں اور مضامین کو سطر بہ سطر پڑھتا ہے اور اپنی رائے سے نوازتا ہے۔ آج اردو کے اخبارات وہاں وہاں پڑھے جا رہے ہیں جہاں جہاں اردو پڑھنے والے بود و باش اختیار کیے ہوئے ہیں۔ وہ چاہے امریکہ ہو یا برطانیہ، کناڈا ہو یا افریقہ، جرمنی ہو یا فرانس۔ لطف کی بات یہ بھی ہے کہ یہ ''ون وے ٹریفک'' نہیں ہے۔ جو قارئین اخبار پڑھتے ہیں وہ لکھتے بھی ہیں، خواہ اپنی رائے قلمبند کریں یا مضامین، اپنے ملکوں اور وہاں کے شب و روز کی تفصیل فراہم کریں یا عالمی حالات پر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ ایسے قارئین جو کل تک اخبارات کی دسترس سے دور تھے، اب بآسانی میسر ہیں جن کی وجہ سے اخبارات کا تنوع بڑھ رہا ہے اور معیار بھی قابل قدر ہوتا جا رہا ہے۔ مختصر یہ کہ تکنالوجی نے دیگر زبانوں کی صحافت کو جن سہولتوں سے مالا مال کیا ہے وہی سہولتیں اردو صحافت کے قدموں میں بھی ڈال دی ہیں۔ یہ ایسی نعمت غیر مترقبہ ہے کہ جس سے امکانات کی نئی فصلیں لہلہانے لگی ہیں۔ بعض اوقات دل باغ باغ ہو جاتا ہے جب کسی غیر ملکی قاری سے بذریعہ ای میل ملاقات کا موقع ملتا ہے۔ دیار غیر سے اپنی زبان کا کوئی دلدادہ، اپنی ہی زبان میں اور اپنی ہی صحافت پر گفتگو کرتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ الفاظ ہجرت کرنے والے وہ پرندے ہوں جو منگولیا اور سائبیریا سے برصغیر آئے ہوں۔

نئی تکنالوجی نے اُردو صحافت کو سہولتیں، آسانیاں اور دور دراز کے قارئین ہی بہم نہیں پہنچائے ہیں، مواقع بھی مہیا کیے ہیں۔ کمپیوٹر ان پیج کی ٹائپنگ، کمپیوٹر ہی کے ذریعہ پیج میکنگ، لے آؤٹنگ اور ڈیزائننگ وغیرہ کی وجہ سے اخبار نکالنا خاصا آسان ہو گیا ہے جو نسبتاً کم سرمائے سے جاری کیا جا سکتا ہے اور جاری رکھا جا سکتا ہے۔ وہ زمانہ اب بھی بہتوں کو یاد ہو گا جب اخباری

کاغذ کی قیمت اور طباعت کے اخراجات کی وجہ سے اچھے اچھوں کے پسینے چھوٹ جاتے تھے لیکن اَب ویب جرنلزم نے کم خرچ بالانشیں کی مثل کو عملاً ممکن بنادیا ہے۔ ہینگ لگے نہ پھٹکری رنگ چوکھا آئے۔ یہ ہے ویب جرنلزم جو آن لائن جرنلزم بھی کہلاتی ہے اور ڈجیٹل جرنلزم بھی۔ صحافت کے اس نئے طریقے نے اردو صحافت کے امکانات کو وسیع تر کردیا ہے، یہ الگ بات کہ اس طرز صحافت میں خرچ تو کم آتا ہے لیکن آمدنی کے امکانات اب بھی محدود ہیں، جس دن اس طرز صحافت کے لیے آمدنی کے دریچے وا ہوں گے، عجب نہیں کہ برقی اخبارات، کاغذ پر شائع ہونے والے اخبارات سے تعداد میں تجاوز کرجائیں۔ آج نہیں تو کل وہ دن ضرور آئے گا کیونکہ وقت کے ساتھ ڈجیٹل اخبار کا چلن بڑھ رہا ہے اور نئی نسل لیپ ٹاپ پر یا اسمارٹ فون پر اخبار دیکھنے اور پڑھنے کو ترجیح دے رہی ہے۔ عنقریب یہ بھی ممکن ہے کہ اردو اخبارات کے نیوز ایپس کا دور دورہ ہو اور اہل اردو کو موبائل پر اردو میں نیوز الرٹس ملنے لگیں۔ اردو صحافت کو تکنالوجی کے زاویۂ نظر سے اور تکنالوجی کو اردو صحافت کے نقطۂ نگاہ سے دیکھنے والے محسوس کررہے ہیں کہ صحافت کا، خواہ وہ کسی زبان کی ہو اور اردو اس سے مبرّا نہیں ہے، مستقبل ڈجیٹل فارمیٹ میں ہے۔ کاغذ پر شائع ہونے والے اخبارات باقی تو رہیں گے لیکن ڈجیٹل کا رجحان، عادت، ذوق اور شوق پروان چڑھے گا جس کی ابتدا ہوچکی ہے۔

اب تک کی گفتگو میں آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ صحافت کے حوالے سے بات تکنالوجی کی ہورہی ہے، زبان کی نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گُل تکنالوجی نے کھلائے ہیں، زبان نے نہیں۔ زبان گُل کھلاتی تو اس کم مایہ کے پاس ڈجیٹل اور ویب کا اردو متبادل ضرور ہوتا۔ ہم اردو والے اتنے سہل پسند واقع ہوئے ہیں کہ متبادلات پر مغز پاشی نہیں کرنا چاہتے۔ اس سہل پسندی کو ہم نے اردو کی فراخدلی کا نام دے رکھا ہے کہ اُردو ہر زبان کے الفاظ کو اپنے دامن میں جگہ دینے اور اُنھیں اپنے اندر جذب کرلینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ تسلیم کہ اردو زبان کی یہ بڑی قابل قدر خصوصیت اور صلاحیت ہے لیکن ہماری صلاحیتوں کا کیا؟ ہم اپنی صلاحیتوں کے ذریعہ دیگر زبانوں کے الفاظ کا اردو متبادل وضع تو کرسکتے ہیں!! لیکن ہم نہیں کرنا چاہتے۔ یہی وجہ ہے کہ تکنالوجی پر مبنی مضامین یا معاشی خبروں اور مضامین کا ترجمہ کرنا کارے دارد ہے۔ اصطلاحات کو سمجھ کر ایک ایک اصطلاح

کا مفہوم کئی کئی جملوں میں سمجھانا جس ذہنی کوفت سے دوچار کرتا ہے اُسے وہی محسوس کر سکتا ہے جو ایسی خبروں کا ترجمہ کرتا ہے۔ اس مثال کے ذریعہ راقم یہ بتانا چاہتا ہے کہ ٹکنالوجی تو بڑھ رہی ہے لیکن زبان کی پیش رفت مسئلہ ہے۔ عین ممکن ہے کہ کل کا قاری یہ کہے کہ جب اردو کی خبروں یا مضامین میں انگریزی الفاظ کی اتنی بھرمار ہے تو میں اردو اخبار کیوں پڑھوں، انگریزی کیوں نہ پڑھوں!!

زبان ہی کے حوالے سے یہ مسئلہ بھی سامعین و قارئین کے گوش گزار کر دوں کہ اَب اردو صحافت کو اچھے صحافی آسانی سے نہیں ملتے۔ ہر چند کہ ماس کمیونی کیشن کا دور دورہ ہے اور نوجوان نہ صرف یہ کہ صحافت پڑھتے ہیں بلکہ صحافت کے تھوڑے بہت عملی تجربے سے بھی گزر چکے ہوتے ہیں، اس کے بعد ہی میدان عمل میں آتے ہیں لیکن زبان و بیان، ذخیرۂ الفاظ، شعر و ادب، مترادفات، محاورات اور ضرب الامثال کا علم جو ایک اچھے صحافی کی بنیادی شناخت ہے، اگر غیر اہم نہیں تو کم اہم ہو کر رہ گیا ہے۔ اردو کی نئی نسل کو نہ تو ان چیزوں سے شغف ہے نہ ہی وہ صحافت میں آنے کے بعد اُن کے تعلق سے دلچسپی پیدا کر پاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زبان اپنی قدر و قیمت اور کشش کھوتی جارہی ہے۔ ویسے بھی ادب کی زبان اور اخبار کی زبان میں ہمیشہ سے فرق رہا ہے لیکن اب یہ فرق بڑھ رہا ہے۔ مثال کے طور پر عوام کو تانیث لکھنا اور جذبات کو جذباتوں لکھ جانا غلط ہونے کے باوجود عام ہو رہا ہے اور شاید غلط العام کی سند پا جائے لیکن معاملہ چند ایک الفاظ کا نہیں، ایسے کئی الفاظ ہیں جن پر ماتھا ٹھنکتا ہے۔ کئی لکھنے والے، ماتھے کو ٹھنکنے کا عادی بنا دینا چاہتے ہیں۔ اُن کے جملوں کی بندش بھی مسئلہ ہے اور اُن کے ہاں تذکیر و تانیث اور واحد جمع کے شعور کا بھی فقدان ہے۔ ٹائپنگ کے بنیادی اصولوں سے ناواقفیت کی بنیاد پر اُن کا ٹائپ شدہ مواد بعض اوقات اتنا پریشان کرتا ہے کہ خدا کی پناہ۔ یا تو اسپیس ہی نہیں ہوتا یا اسپیس ہی اسپیس ہوتا ہے۔ (دیکھیے متبال الفاظ کا مسئلہ، اسپیس کو اسپیس ہی لکھنا پڑا ہے)۔ اردو کے ڈیزائنرس میں بہت کم ایسے ہیں جو پُر کشش اور دیدہ زیب اشتہارات ڈیزائن کر پاتے ہیں۔ پیج میکنگ کا معاملہ بھی یوں ہی سا ہے۔ وہ خوب صورت لے آؤٹ جو آنکھوں کو بھلا معلوم ہو، شاذ و نادر ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سارے مسائل داخلی ہیں جن کی طرف توجہ ہمیں کو یعنی اہل اردو ہی کو دینی ہوگی۔ ہماری یہ مشکل نہ تو سرکاری رعایت و اعانت سے دور ہو سکتی ہے نہ ہی ٹکنالوجی کے فروغ

پانے سے از خود حل ہو جائے گی۔ انگریزی میں اسپیل چیک ہوتا ہے، اردو میں اب تک نہیں ہے اور کسی اردو والے نے اس کی کوئی خاص ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ اس کی وجہ سے اردو صحافت کو ٹائپنگ کی غلطیوں کا بوجھ سہنا پڑ رہا ہے۔ جس طرح صحیح تلفظ کے ساتھ لفظ کی ادائیگی، اُسی طرح صحیح املا کے ساتھ الفاظ اور جملوں کی ٹائپنگ ضروری ہے لیکن اس طرف کم کم ہی توجہ دی جا رہی ہے۔ یہ ستم کیا کم تھا کہ اب ریڈی میڈ ترجمہ کی سہولت میسر آ گئی ہے جس کے ذریعہ بعض الفاظ کا ترجمہ کیا ہوتا ہے، یوں محسوس ہوتا ہے جیسے بقول غالب اِک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے۔ نئی نسل کے اردو صحافی اس جانب توجہ نہیں دیں گے تو صحافت کا وہ معیار قائم نہیں رہ پائے گا جس میں زبان اہم رول ادا کرتی ہے۔

اس سے قبل کہ یہ مقالہ اپنے اختتام کو پہنچے، راقم الحروف واضح کرنا چاہتا ہے کہ تکنالوجی کی فراہم کردہ سہولتیں نہ صرف یہ کہ اہلِ اردو کو بھی میسر ہیں بلکہ اُنھیں جدید تر بنانے کی کوشش بھی جاری رہتی ہے جسے تکنالوجی کی زبان میں اَپ گریڈیشن کہا جاتا ہے لیکن زبان کی صحت اور معیار اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ایجنسی کی خبروں کے بجائے اپنی خبروں پر انحصار، انھی کی جستجو اور انھی کو فوقیت ایسے تقاضے ہیں جن کی تکمیل اُردو صحافت کو مقبولیت کی نئی بلندیوں تک لے جا سکتی ہے۔ چونکہ اپنی خبروں پر انحصار کی جانب توجہ ہونے لگی ہے اور کئی اردو اخبارات اپنے نمائندوں اور نامہ نگاروں کی خبروں کو اہتمام کے ساتھ شائع کرنے لگے ہیں، اس لیے اردو صحافت کے امکانات وسیع ہوتے جا رہے ہیں۔ اس سے یہ اُمید بھی پیدا ہو رہی ہے کہ جلد ہی وہ دَور بھی آئے گا جب اردو صحافت تحقیق و تفتیش کو خاص طور پر اہمیت دے گی جس کی کمی عرصۂ دراز سے کھٹکتی رہی ہے۔

چونکہ اردو اخبارات کی رسائی اب دور دور تک ہے، اس لیے امکانات بھی بھرپور ہیں۔ ملک کے بڑے اور ممتاز اخباری اداروں کی اردو اخبارات سے دلچسپی نے، جو اِن اخبارات کو حاصل صحافتی آزادی کے ساتھ قائم ہے، نئے اُفق روشن کیے ہیں۔ یہ اُمید افزا منظر نامہ اگر کوئی تقاضا کرتا ہے تو یہی کہ اردو کی پرانی بستیاں مستحکم رہیں، نئی بستیاں آباد ہوں اور اردو کو دیگر زبانوں کے لوگوں تک لے جانے کی کوششیں بڑے پیمانے پر جاری ہوں تو دو سو سالہ جشن منانے والی اردو صحافت چار سو سالہ جشن بھی آب و تاب کے ساتھ منائے گی، ان شاءاللہ!

# اردو صحافت: بے انتہا مسائل، بے شمار امکانات

زین شمسی

اردو صحافت کی صورت حال ٹھیک ویسی ہی ہے جیسے اردو زبان کی ہے اور یا ہندوستانی مسلمان کی ہے۔ اسی لیے ہندوستان میں اس کا مستقبل اردو زبان اور اہل زبان کے ساتھ ہی جڑا ہوا ہے۔ نامساعد حالات کے سمندر میں تکلیفوں اور مصیبتوں کے بھنور میں پھنسی کشتی نکالنے کی کوشش اردو زبان بھی کر رہی ہے، مسلمان بھی کر رہے ہیں اور اردو صحافت بھی۔

اردو صحافت کی بے حد درخشاں تاریخ ہے اور ساتھ ہی اردو صحافیوں کے قابل فخر کارنامے بھی ہیں جن کی تفصیلات اردو صحافت کی تاریخ میں درج ہے۔ جس طرح اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا پر ریسرچ کرتے ہوئے کئی ماہرین لسانیات نے اسے کبھی پنجاب سے جوڑا، کبھی دکن سے نکالا کبھی کشمیر تک پہنچے تو کبھی دوآبہ میں تلاش کیا۔ پھر تھک ہار کر متفق ہو گئے کہ اردو دہلی کے گرد و نواح میں ہی پیدا ہوئی۔ اسی طرح اردو صحافت کی تاریخ لکھنے والوں نے بھی بڑی محنت و جدو جہد کے بعد اردو صحافت کے بارے میں کئی انکشافات کیے۔ کسی نے ''جام جہاں نما'' کو تو کسی نے ''دہلی اخبار'' کو تو کوئی ٹیپو سلطان کی پریس ریلیز تک جا پہنچا۔ قابل تعریف ہیں یہ لوگ جو

تاریخ کے جھروکوں میں جھانکتے ہیں اور وہاں پڑی بوسیدہ چیزوں کو چمکا کر بازار میں لے آتے ہیں۔ اچھی بات ہے اور ضروری بھی کہ تاریخ کی سمجھ ہمیں غلطیوں سے بچاتی ہے اور مستقبل کی رہنمائی بھی کرتی ہے۔ تاریخ سے ہم بہت کچھ سیکھتے ہیں، لیکن سب سے بڑی سیکھ جو ہمیں تاریخ سے ملتی ہے وہ یہ کہ اگر پرانے اور ذہین لوگ اپنے حال کو درست رکھتے تو شاید تاریخ میں ہمیں کوئی کھوٹ دکھائی نہیں دیتی۔ آج جو پل ہے وہی کل کی تاریخ ہے اور اسی لیے ہم اس حال کو بہتر بنالیں تو شاید کل کا مورخ جب تاریخ لکھے تو اسے ہم سب ایک بے عیب انسان نظر آئیں۔

ہم نے صحافت کی کئی ادوار دیکھے اور پڑھے ہیں اور ہر دور میں ہم نے اسے ثابت قدم ہی پایا ہے۔ کچھ سوالات بھی پیدا ہوئے ہیں اور ایسے ہی کچھ سوالات آج بھی ذہن میں مچل رہے ہیں۔

تفصیلات میں جانے سے قبل کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ چونکہ باتیں اردو صحافت کی ہورہی ہیں تو شروعات اردو سے ہی ہونی چاہیے۔ اردو کے ساتھ ایک انوکھا معاملہ یہ رہا کہ جہاں اردو بولنے والوں کی تعداد میں بے تحاشہ اضافہ ہوا، سمجھنے والوں کی تعداد اس سے بھی زیادہ بڑھی ہے، وہیں پڑھنے والوں کی تعداد میں بے انتہا کمی آئی ہے۔ یہ موضوع بحث نہیں ہے کہ ایسا کیوں ہے۔ اس کا رسم الخط یا اس کا کسی ایک مخصوص کمیونٹی سے جڑا ہونا یا پھر اس کے لیے اردو کے لوگوں کی بے حسی۔ وجوہات کئی ہوسکتی ہیں، لیکن اسے اس طرح سمجھا جانا چاہیے کہ ہندوستان کی فلم انڈسٹری اربوں کی انڈسٹری ہے اور اس کی بنیاد میں اردو ہے، لیکن کوئی بھی فلم اردو فلم نہیں کہلاتی۔ اسی طرح کاروباری گھرانہ جیسے جاگرن اور سہارا گروپ اردو اخبارات کا بزنس کرتا ہے اور کامیاب ہے۔ تیسری مثال ریختہ ڈاٹ او آر جی کی لے سکتے ہیں جس نے اپنی ویب سائٹ میں اردو کو محفوظ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ تو کیا ہمیں اردو کی تجارت اور تشہیر نہیں آتی۔

سرکاریں اردو کے لیے کچھ نہیں کرتیں۔ یہ بھی نہیں کہہ سکتے۔ صرف قومی اردو کونسل کا بجٹ 50 کروڑ سے زیادہ ہے۔ مگر اردو میں اسامیوں کی تعداد تقریباً نہ کے برابر ہے۔ طلبہ شاید ہماری بات کی تصدیق کریں گے کہ صرف دہلی کی تین یونیورسٹیوں، دہلی یونیورسٹی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ہر سال جتنے ریسرچ اسکالر نکلتے ہیں، اتنی اسامیاں پورے

ملک میں بھی نہیں نکل پاتیں تو آخر اردو کو کوئی اپنا مستقبل کیوں بنائے اور پھر اس کا مستقبل کیا ہے اور ظاہر ہے جب بات اردو کے مستقبل کی ہی ہونے لگے تو اردو صحافت کا مستقبل کیسے طے کریں گے۔

زیادہ نہیں دو تین باتیں ہیں۔ پہلی تو یہ کہ ورکنگ اور پریکٹیکل جرنلزم کی شد بد رکھنے کے ناطے میں اکثر سوچتا ہوں کہ کیا ہندوستان کا کوئی بھی شہری یا طالب علم اردو جرنلزم کو اپنا کریئر بنانا چاہے گا۔ کیا واقعی وہ چاہے گا کہ لکھ پڑھ کر وہ اردو صحافت کا حصہ بنے۔ دوسری بات یہ کہ اردو اخبارات کی دوڑ یا رسائی کہاں تک ہے۔ اس کا کتنے لوگ نوٹس لیتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ اردو پرنٹ میڈیا کے مسائل اور وسائل کا تدارک کس کی ذمہ داری ہے اور یہ بھی کہ اتنی درخشاں تاریخ کے باوجود کیا اردو صحافت اپنے کردار کا اعتراف کرا چکی ہے یا صرف مسلم تنظیموں اور مسلمانوں کے مسائل تک محدود ہو کر سمٹی پڑی ہوئی ہے یا پھر معاشی، سیاسی اور نظریاتی دباؤ میں سسک رہی ہے۔ ایسے کچھ سوالات ہیں جو اردو صحافت کی بھٹی میں پک رہے ہیں۔

دوسرے معنوں میں دیکھیں تو اردو صحافت ان بے روزگاروں کا بوجھ اُٹھاتی ہے جو یونیورسٹیوں یا کالجوں میں جانے سے محروم رہ گئے ہیں اور آہستہ آہستہ وہ اسی دشت وصحرا کا حصہ ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ شوق سے صحافت میں نہیں آتے۔ مجبوری میں اسے گلے لگاتے ہیں۔ آج بھی اگر اردو صحافت کا اس نظریے سے سروے کیا جائے تو جو بات کہی گئی وہ غلط ثابت نہیں ہوگی۔ آج بھی وہ صحافی جو برسوں سے اس میدان میں اپنا سر کھپا رہے ہیں انھیں اکیڈمک کریئر مل جائے تو وہ صحافت چھوڑنے میں ایک پل کی تاخیر نہیں کریں گے۔ اردو صحافت نے روزگار کے مواقع اس طرح دیے کہ اس کے علاوہ کہیں کوئی روزگار نہیں ہے۔ کم تنخواہوں کے ساتھ ہی سہی کم سے کم اپنی صلاحیتوں کا کچھ مظاہرہ اس میدان میں بھی ہو جاتا ہے، مگر ان میں سے ہی کچھ لوگ ہیں جو اپنی تکلیفوں کو اپنے قلم میں ڈھال لیتے ہیں اور آگے جا کر کچھ شہرت کما لیتے ہیں، جس کا حوالہ تاریخ داں کو وقت کی تاریخ لکھتے وقت دینا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے اس پس منظر میں اردو اخبارات مالی قوت سے ضرور جوجھ رہے ہوتے ہیں لیکن افرادی قوت سے مالا مال رہتے ہیں۔ اب یہاں پر ایک سوال اُٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ جب بھی کوئی شخص اپنے کام کو مجبوری سمجھے تو کیا وہ اس میدان میں

اپنی پوری صلاحیت کا مظاہرہ کر پائے گا۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ جب اردو زبان ہی حاشیے پر ہے تو اردو صحافت کا حاشیے پر رہنا فطری ہی ہے۔ ایسے میں ہم خواہ اردو صحافیوں کی خدمات کا قصیدہ پڑھ لیں، خواہ سماجی اور سیاسی اصلاح میں اردو صحافت کے کردار کا اعتراف کرالیں، لیکن کیا یہ سوچنا ہمارا کام نہیں ہے کہ اردو صحافت مین اسٹریم سے اب تک کیوں نہیں جڑ پائی ہے۔ مدارس اور ملی تنظیموں کے درمیان گھومتی ہوئی یہ صحافت اپنی حدوں کو پار کرنے میں کیوں ناکام ہے؟

ہم اگر سوچیں گے بھی تو کیا سوچیں گے۔ سرکار کی زبان اردو نہیں۔ اکثریت کی زبان اردو نہیں۔ قومی زبان بھی اردو نہیں اور تو اور بیشتر مسلمانوں کی بھی زبان اردو نہیں تو پھر اسے کون پڑھے اور کیوں پڑھے؟ اسی لیے محدود قارئین کی دلچسپی کا سامان پیدا کر کے اردو اخبارات اپنی بقا کی جنگ میں مصروف رہتے ہیں۔ رہا سوال مواد کا اور خبروں کی ترجیحات کا تو اس معاملہ میں ہمیں اردو اخبارات کا احسان مند رہنا چاہیے کہ یہ ہمیں اس بات کی جانکاری دیتے ہیں جس کا سروکار خود ہم سے ہی ہوتا ہے۔ کسی نے بہت اچھی بات کہی کہ اس ملک میں اگر کوئی آدمی صرف ہندی اخبار پڑھے تو اسے پتہ ہی نہ چلے کہ اس ملک میں مسلمان بھی رہتے ہیں۔ انگریزی اخبارات کا رجحان بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ مسلمانوں کے مسائل سے انھیں کوئی سروکار نہیں ہے۔ ہاں اگر مسلمانوں کے تعلق سے کوئی منفی خبر ہے تو اس کی تشہیر زوروں سے ہو رہی ہوتی ہے۔ کسی مسلمان کی گرفتاری ہے تو فرنٹ پیج پر اور اگر وہی شخص جب بے قصور ثابت ہوتا ہے، اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملتا اور عدالت اسے باعزت رہا کر دیتی ہے تو خبر ندارد۔ ایک قدم آگے بڑھ کر یہ کہوں تو شاید آپ لوگوں کو اچھا نہ لگے لیکن جمہوریت کے چار ستونوں میں سے اگر سب سے پہلے کوئی فرقہ پرست ہوا تو وہ انگریزی اور ہندی کے اخبارات ہی ہیں۔ قومی میڈیا کے تعصبانہ قدم نے ہی سماج کا شیرازہ بکھیرا۔ اسی کمی اور کمزوری کو سمیٹنے کی کوشش کرتی رہتی ہے اردو صحافت۔ وہ اپنی باتیں نرم روی کے ساتھ کرتی ہے۔ تہذیب کے دائرے میں کرتی ہے۔ زبان کے اردو ہونے کی وجہ سے یوں ہی باتیں سخت نہیں ہو پاتیں۔ یہ روایت اسے وراثت میں ملی ہے۔ وہ جارح نہیں ہوتی۔ ییلو جرنلزم (زرد صحافت) اردو صحافت کی پیداوار نہیں ہے اور اسی لیے اردو صحافت میں سامنا، پانچ جنیہ اور

آبزرور جیسے اخبارات نہیں نکلتے۔ کچھ حقیقت بیانی کی جرأت 'نئی دنیا' نے کی تو اس پر بھی اردو صحافیوں نے ہی یہ کہہ کر انگلی اٹھائی کہ اس کے مضامین اشتعال پیدا کرتے ہیں۔ حالانکہ نئی دنیا نے مستقبل کی سیاست سے پردہ اُٹھایا، جو بعد میں سیاست کا حصہ بھی بنیں۔ اس معنی میں اردو صحافت کی قدر کی جانی چاہیے۔

لیکن کمی کہاں ہے۔ جب اس کی تلاش کرتے ہیں تو اردو اخبارات قارئین کی طرف بھاگتا ہوا نظر آتا ہے۔ مدیر کو معلوم ہے کہ ہم کون سی لائن لیں گے تو قاری ان سے وابستگی محسوس کرے گا۔ اپنے قاری کو پکڑنے کی جستجو میں اس سے ایک غلطی ہو جاتی ہے اور وہ غلطی ہے تو می خبر پر ملی خبروں کو ترجیح دینا۔ ہمارے یہاں مودی اہم نہیں ہیں۔ ہمارے یہاں ارشد مدنی اہم ہو جاتے ہیں۔ ہمارے یہاں سرکاری اسکیمیں اتنی اہم نہیں ہوتیں جتنی کسی غیر معروف تنظیم کے ذریعہ کیا گیا مشاعرہ اور شاید یہیں پر ہم مار کھا جاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اردو اخبارات کے مدیران کو اپنے قارئین کی تربیت بھی کرنی چاہیے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ جو قاری پسند کر رہا ہو وہی مواد پیش کیا جائے۔ ایسے میں اردو اخبار کا قاری ملکی مسائل سے علاحدہ ہو جاتا ہے۔ اردو کے قارئین کو مین اسٹریم سے جوڑنے کا کام اردو اخبار کی ذمہ داری ہونی چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے کچھ قارئین ناراض ہو جائیں لیکن بعد میں وہ بھی اس کی ضرورت کو محسوس کریں گے۔ اخبار کے لیے اپنے قارئین کو پکڑے رہنا اردو صحافت کے لیے ایک بڑا چیلنج ہے۔ چونکہ قارئین کا دائرہ محدود ہے اور اخبارات زیادہ ہیں۔ ایسے میں ہر اردو اخبار اپنے قارئین کی دلچسپی اور ان کے رجحان کو مدنظر رکھتے ہوئے مواد فراہم کرتا ہے۔ اردو اخبارات کا عملہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اخبار کی رسائی سب سے زیادہ مدرسوں میں ہے۔ اس لیے مدارس کے مفادات و مسائل کی ترجیح اس کا فرض اولین ہے۔ اخبار مالکان یہ بھی جانتے ہیں کہ وہیں سے انھیں اشتہارات بھی مل سکتا ہے۔ اسی لیے مدرسوں اور تنظیموں سے منسلک خبروں کو لگانا ان کی ذمہ داری بھی ہے اور مجبوری بھی ہے۔

اخبار کی بقا کی فکر نے بھی اردو صحافی کو آزادانہ کام کرنے سے روکا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ ہندوستان کی بڑی کمپنیاں ان کی طرف توجہ نہیں دیتی ہیں۔ لکس ہو یا کولا ہو، تعمیراتی کمپنیاں ہوں یا کپڑوں کی صنعت ہو، وہ اردو اخبارات کو اپنے پروڈکس کی تشہیر کا ذریعہ نہیں مانتی

ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اردو زبان جاننے والوں کے گھر میں بھی وہ ساری مصنوعات نظر آتی ہیں جو انگریزی جاننے والوں کے گھر میں ہوتی ہیں۔ اس کے باوجود ان کا یہ متعصبانہ رویہ جاری ہے۔ اردو اخبارات سے انھیں کسی طرح کا خوف نہیں ہے۔ اگر اردو اخبارات ایسی مصنوعات کے بائیکاٹ کا اعلان بھی کرتے ہیں تب بھی ان کے بزنس پر کوئی فرق نہیں پڑنے والا ہے۔ اسی طرح سرکاری ایڈ ایجنسیاں بھی اردو اخبارات کے ساتھ امتیاز برتتی ہیں۔ جہاں انگریزی کو روزانہ ایڈ جاری ہوتا ہے وہیں اردو کو ہفتہ میں ایک دن اور کبھی کبھی تو مہینے میں ایک آدھ ایڈ دے کر اپنی ذمہ داریاں نبھا دیتی ہیں۔ اسی وجہ سے اردو اخبارات والے بھی اسی طرف زیادہ توجہ دینے لگتے ہیں جہاں سے انھیں کچھ اشتہارات ملنے کی توقع ہوتی ہے۔ سرکار ڈی اے وی پی کے ذریعہ اشتہارات دیتی ہے۔ اس میں بھی وہ زمرہ بندی کرتی ہے۔ بڑے اخبارات، منجھولے اخبارات، چھوٹے اخبارات، بہت چھوٹے اخبارات۔ اس کے بعد وہاں بھی سیٹنگ، رشوت، کھانا پینا وغیرہ وغیرہ۔ اخبار نکالنا جوئے شیر لانا ہی ہے۔ پریشانی یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔

اردو صحافت کی پریشانیوں پر ہماری نظر اس لیے نہیں جاتی کہ ہم صرف 8 یا 12 صفحات کے اخبارات میں اپنی خبریں تلاش کرنے میں محو ہو جاتے ہیں۔ اگر اخبار کے بننے اور اس کی تقسیم کے بارے میں جانیں گے تب اس بات کا احساس ہوگا کہ پریشانیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ اشتہارات اور پیسے کی بات جانے دیں۔ آپ کے پاس جو اخبار پہنچتا ہے وہ کتنے ہاتھوں سے ہو کر گزرتا ہے، ایڈیٹنگ سے لے کر پریس تک اور پریس سے لے کر گھروں تک پہنچنے کے اس پورے مرحلے میں ہر قدم پر اردو صحافت اپنے آپ کو بے یار و مددگار پاتی ہے۔

سب سے پہلے ہم خبر کو لیتے ہیں۔ خبر ہمیں نیوز ایجنسیوں سے ملتی ہے۔ ہمارے پاس نیوز ایجنسی کے نام پر ایک ہی بڑی ایجنسی ہے جو سرکار کی ہی مرہون منت ہے، 'یو این آئی'۔ اس ایجنسی کو قومی اردو کونسل اس لیے مالی تعاون دیتی ہے کہ اخبارات کو سبسڈی مل جائے۔ اچھی بات ہے لیکن سرکاری ایجنسی ہونے کے ناطے اس کا سارا فوکس سرکاری اسکیموں اور سرکاری بیان بازیوں پر ہوتا ہے، پھر اس کے کالم طے ہیں کہ وہ 30 یا 36 کالم کی خبر ہی ایک دن میں ارسال کر پاتی ہے۔ کیونکہ ان کے یہاں بھی ملازموں کی کمی ہے۔ چونکہ وہ ملک گیر ایجنسی ہے۔ اس لیے

اسے تمام ریاستوں کی خبریں کور کرنی پڑتی ہیں۔ حیدرآباد، جموں وکشمیر، مغربی بنگال حتیٰ کہ آسام کی خبروں کو بھی اسے ترجیح دینی ہوتی ہیں، لیکن دہلی سے شائع ہونے والے اخبارات کے لیے ان تمام ریاستوں کی علاقائی خبریں فضول ہو جایا کرتی ہیں، سوائے ایک دو کے۔

پھر خبریں کہاں سے لائیں۔ تب اخبارات کے ملازمین ہندی اور انگریزی کی نیوز ایجنسیوں سے ترجمہ کر کے خبریں بناتے ہیں۔ اگر آپ نے پی ٹی آئی اور آئی اے این ایس جیسی ایجنسیاں لے لی ہیں تو اس کی بہت زیادہ قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ فوٹو ایجنسی کو بھی سبسکرائب کرنا پڑتا ہے۔ آپ کے پاس نامہ نگار ضرور ہوتے ہیں، مگر ان میں اتنا دم خم نہیں ہوتا کہ وہ سرکار یا صنعت کار کے پیٹ میں گھس کر خبریں لے آئیں۔ یہ وجہ بھی ہے کہ اردو اخبارات میں انکشافاتی خبریں نہیں ہوا کرتیں۔ اپنے اخبار کو نمایاں بنانے کے لیے بہت سارے اخبارات نیوز ایجنسیوں کی خبروں کو اُلٹ پھیر کر کے اپنے نامہ نگاروں کا نام ڈال دیتے ہیں تاکہ قارئین کو یہ محسوس ہو کہ یہ اخبار کی اپنی خبر ہے۔ ایسا زیادہ تر بڑے اخباروں کی ڈیٹ لائن دیکھ کر آپ کو پتہ چل سکتا ہے۔

یہ تو ہوئیں خبروں کی دشواریاں، اخبار مکمل ہو جانے کے بعد پریس میں جاتا ہے۔ وہاں الگ پریشانی ہے۔ ایک بھی پریس اردو جاننے والوں کا نہیں ہے۔ اس لیے دفتر کا کوئی نہ کوئی آدمی وہاں موجود رہتا ہے جو یہ دیکھتا رہتا ہے کہ پریس والوں نے پلیٹ الٹی تو نہیں لگا دی۔ اشاعت کے بعد اخبارات کا بنڈل ایجنٹ کے پاس پہنچتا ہے۔ دہلی ہی نہیں پورے ہندوستان میں کہیں بھی کوئی بھی اخبار کا ایجنٹ اردو جاننے والا نہیں ہے اور نہ ہی اسے اردو اخبارات سے کوئی دلچسپی ہوتی ہے۔ ہر ایجنٹ تمام اخبارات مالکوں سے 500 سے 600 روپے وصول کرتا ہے، ورنہ اس کا بنڈل کہیں بھی پھینک سکتا ہے۔ ایجنٹ کے بعد آیئے ڈسٹری بیوٹروں کے نخروں کی طرف۔ یہاں بھی آپ کو غیر اردو داں طبقے سے پالا پڑے گا۔ اسے اگر خوش نہیں رکھ سکے تو وہ بھی وہی کام کرے گا۔ اخبار کو دوسرے اخبار کے نیچے چھپا دے گا۔ مانگنے پر یہ کہہ دے گا کہ آج یہ اخبار شائع ہی نہیں ہوا ہے۔ ٹرانسپورٹ کا خرچ الگ ہے۔ اگر دہلی سے مغربی اتر پردیش اخبار بھجوانا ہے تو آپ کو ٹائمس آف انڈیا یا جاگرن کی گاڑی سے ہی اپنا اخبار بھجوانا ہوگا۔ اس کا وقت طے ہے وہ آپ کے اخبار کو لینے کے لیے 5 منٹ کی بھی تاخیر نہیں کرے گا۔ اگر کسی وجہ سے آپ کا اخبار تاخیر

سے چھپتا ہے تو ڈاک کاپی کے لیے آپ کو ٹرانسپورٹ ہی نہیں ملے گا۔ یعنی اخبار میں آپ نے ہیرے موتی جڑ دیے ہوں، مگر وہ کوڑے کے ڈھیر میں تبدیل ہو گیا، کیونکہ آپ کے پاس ٹرانسپورٹ کا وسیلہ بھی نہیں ہے۔ اس کے بعد آخری آدمی وہ ہے جو سائیکلوں پر گھر میں اخبار پھینکتا ہے۔ آپ اسے اُٹھاتے ہیں اور یہ کہتے ہوئے میز پر رکھ دیتے ہیں کہ اخبار میں کچھ ہے ہی نہیں۔

ذرا سوچیے یہ کتنا جوکھم بھرا کام ہے۔ روزانہ اس طرح کے کام سے اخبار والے نبرد آزما ہوتے ہیں۔ اس کے بعد بھی وہ نہیں تھکتے اور مسلسل اردو صحافت کے لیے اپنی زندگی صرف کر دیتے ہیں۔ ان کے مسائل ان کے اپنے ہیں۔ وہ جب زیادہ پریشان ہوتے ہیں تو اخبار کو بند کر دیتے ہیں۔ یہاں پر ایک افسوسناک خبر بھی بتاتا چلوں کہ ممبئی کا ایک بہترین اردو اخبار اردو ٹائمز بھی مالی تفرقہ یا مالی دشواریوں کی وجہ سے بند کر دیا گیا۔ معروف صحافی شاہد صدیقی نے بہترین اخبار 'عوام' کے نام سے نکالا تھا، لیکن کئی پریشانیوں کی وجہ سے، جس میں مالی پریشانی بھی رہی ہوگی، اب بازار میں نظر نہیں آتا۔

اتنی پریشانیوں اور مشقتوں کے باوجود آر این آئی یعنی اخبارات کا رجسٹری دفتر کہتا ہے کہ ہندوستان میں اردو اخبارات کی اشاعت میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ ہندوستان میں انگریزی اور ہندی کے بعد اردو اخبار کی اشاعت سب سے زیادہ ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اردو اخبارات کا دائرہ بڑھ رہا ہے۔ اس کے قارئین کی تعداد میں بھی مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ ساتھ ہی اخبارات کا بزنس بھی بڑھتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ یہ بزنس کا ہی کرشمہ ہے کہ جاگرن گروپ نے ممبئی کے سب سے مقبول اخبار کو کروڑوں روپے میں خریدا ہے اور روزنامہ راشٹریہ سہارا کارپوریٹ کی جانب سے نکالا جا رہا ہے۔ یہ اس طرف صاف اشارہ کرتا ہے کہ اگر اسے بہترین مینجمنٹ کے ساتھ چلایا جائے تو یہ منفعت بخش کاروبار بھی ہے۔

ضرورت اس میدان میں توجہ دینے کی ہے۔ اگر اردو ادب کی طرح اردو اخبارات پر بھی اردو تنظیموں، اداروں اور یونیورسٹی اور کالجوں کے لوگ توجہ مرکوز کریں تو اردو اخبارات میں اتنی صلاحیت آج بھی ہے کہ وہ سماج میں ایک اصلاحی اور انقلابی بیداری پیدا کر سکیں۔ ایوان اقتدار تک اپنی آواز مضبوطی کے ساتھ پہنچا سکیں۔ اہل زبان اور اقلیتوں کے مسائل کو قومی

منظر نامے میں مضبوطی سے رکھ سکیں۔

یہاں پر ایک بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ صرف اخبارات کی مدد کر کے ہم اردو صحافت کی مدد نہیں کر پائیں گے۔ اردو اخبارات جس مسئلہ سے نبرد آزما ہیں، حل بھی اسی مسئلے میں پوشیدہ ہے۔ جس طرح قومی کونسل یو این آئی کو سبسڈی دیتی ہے، ایسا کوئی نظم کرنا چاہیے کہ اردو پریس قائم ہو سکے۔ خواہ وہ سرکار کی مدد سے ہی کیوں نہ ہو یا پھر سرکار جتنے اردو اداروں کو فنڈ دیتی ہے، وہی ادارے مشترکہ طور پر ایک پریس قائم کریں جس میں اردو اخبارات کی چھپائی میں سبسڈی مل جائے تا کہ ان کا یہ خرچ آدھا ہو جائے۔ این سی پی یو ایل جس طرح تین میگزین نکالتی ہے۔ کمپیوٹر کورسز چلاتی ہے۔ کتابوں کی اشاعت کے لیے مالی تعاون دیتی ہے۔ وہ وزارت فروغ انسانی وسائل کو اس کے لیے راضی کر سکتی ہے کہ اس کا دائرہ مزید وسیع ہو کر اردو اخبارات کے فروغ تک پہنچ جائے۔ اردو زبان کے فروغ میں اخبارات کے کردار سے کسے اختلاف ہوگا۔ ابھی این سی پی یو ایل کے ڈائریکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم صاحب نے حقیقت بیانی سے کام لیتے ہوئے کہا تھا کہ زبان کی معیار بندی میں صحافت کا بڑا اہم رول ہوتا ہے۔ جس اخبار کی زبان جتنی اچھی ہوگی اس کا اثر اتنا ہی اچھا قارئین پر مرتب ہوگا۔ اگر زبان صحیح نہیں ہے تو کوئی بھی خبر قارئین کی توجہ حاصل کرنے میں ناکام رہے گی۔ اُنھوں نے اردو صحافت کی اہمیت کو سمجھا ہے، اسی لیے اپنا عہدہ سنبھالنے کے بعد انھوں نے اردو صحافت کا جشن منانے کا فیصلہ لیا جو کولکاتہ، سری نگر سے گزرتا ہوا، دہلی میں اپنے آب و تاب کے ساتھ جاری ہے۔ یہاں پر ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ پریس میں سبسڈی یا سرکاری پریس میں اردو اخبار کی اشاعت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ وہ سرکاری طور پر اس کی یرغمال بن کر رہ جائے۔ یہ تو پھر اظہار رائے کی آزادی چھن جانے کا معاملہ ہوگا۔ حکومت اردو اخبارات کی بقا کے لیے اس کا ہاتھ پکڑ سکتی ہے، مگر اسے خرید نہیں سکتی۔ کیونکہ اردو صحافت کا یہ ماضی رہا ہے کہ اس نے سرکاروں کا ان کی غلطیوں کے لیے کان پکڑا ہے۔ آج خواہ اردو صحافت کمزور پڑ رہی ہو، لیکن اس سے منسلک صحافی حضرات آج بھی جس طرح کی سچائیاں لکھ رہے ہیں، وہ کسی دوسری زبان کے صحافیوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی آواز دور تک اور وہاں تک نہیں پہنچ پاتی جہاں تک اسے پہنچنا چاہیے۔

آخر میں بس یہی کہنا چاہوں گا کہ سچ ہے کہ اردو صحافت اپنے روایتی طریقہ کار پر چلنے کی وجہ سے زمانے کی تبدیلیوں کا سامنا نہیں کرسکی ہے جس کی وجہ سے صحافیوں کے اندر پیشہ ورانہ صلاحیتیں پیدا نہیں ہو پائیں، رپورٹنگ کے معاملے میں بھی اردو صحافت نے خود کو اپنی حدود میں قید رکھا ہے۔ وسائل کی کمی اور جدید تکنالوجی کا فقدان اور آج کے دور میں کمپیوٹر سے روابط میں تاخیر نے اسے بیک فٹ پر لا کھڑا کیا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نامساعد حالات کے باوجود آج بھی اردو صحافت اپنی شان و شوکت کے ساتھ رواں دواں ہے۔

# اردو صحافت مسائل کے گھیرے میں

ڈاکٹر سید شجاعت بخاری

ریاست جموں وکشمیر میں بالعموم اور کشمیر وادی میں بالخصوص صحافت کی تاریخ یہاں کی سیاست ہی کی طرح غیر یقینی صورت حال سے نبرد آزما رہی ہے۔ دھونس دباؤ اور سیاسی انتقام کی وجہ سے شروع سے ہی ان لوگوں کا قافیہ ہمیشہ تنگ رہا ہے جنھوں نے صحافت کو ایک پیشہ بنا کر یہاں کے مظلوموں کو آواز دینے کی کوشش کی ہے۔ ہر چند کہ آج اردو صحافت کئی چیلنجوں کے باوجود ایک تناور درخت کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ پھر بھی غیر محسوس طریقے سے جو قدغنیں یہاں کے پریس پر لگائی جاتی ہیں وہ حقیقی صورت حال کو سامنے لانے میں مشکلات پیدا کرتی آئی ہیں۔

کشمیر میں اردو صحافت کا باقاعدہ آغاز 1896 میں اس وقت ہوا جب یہاں کے ایک فرزند جلیل عبدالسلام رفیقی نے ''الرفیق'' نام سے ایک اخبار شروع کیا لیکن اس وقت کی ڈوگرہ شاہی حکومت جس کی سربراہی پرتاپ سنگھ کر رہے تھے، نے صرف دو شماروں کے بعد اس پر پابندی لگادی۔ رفیقی نے بعد میں یہ اخبار رنگون سے نکالا۔ 1904 میں کشمیر کے معروف مورخ محمد دین فوق

نے اخبار''کشمیر'' نکالنے کے لیے اس وقت کی شخصی حکومت کو اجازت کے لیے عرضی دی تھی لیکن وہ مسترد کر دی گئی۔ پھر 1924 میں لالہ ملک راج صراف کو اخبار نکالنے کی اجازت دے دی گئی اور انھوں نے جموں سے''رنبیر'' نام کا اخبار شائع کیا۔ 1930 کے آس پاس میر عبدالعزیز نے''مسلم'' اخبار شروع کیا۔ بعد ازاں پنڈت پریم ناتھ بزاز نے''ویتستا''(Vitasta) اخبار وادی سے نکالا۔ بزاز چونکہ شیخ محمد عبداللہ کے حلیف تھے اسی بنیاد پر انھوں نے 1935 میں شیخ کی شراکت میں ''ہمدرد'' اخبار نکالا جو بہت ہی مقبول ہوا۔ ہمدرد سے پہلے محمد یحییٰ رفیقی نے''حقیقت'' اور ''صداقت'' اخبار بھی نکالے۔ عزیز کشمیری کی ادارت میں''روشنی'' اخبار منظر عام پر آیا جو ان ایام کا واحد اخبار ہے جو آج بھی شائع ہو رہا ہے۔ اس دوران کئی اور اشخاص نے صحافت کے سنگلاخ میدان میں قدم رکھا جن کی سعی کے نتیجے میں خالد، اصلاح، البرق اور کشمیر ٹائمز (اردو) جیسے اخبار منظر عام پر آئے۔ جب ہمدرد 1947 کے بعد عوامی راج کے ہتھے چڑھ گیا تو یہاں ایک خلا پیدا ہو گیا جس کو پورا کرنے کے لیے نندلال واتل نے''نو یوگ'' نام سے ایک اخبار جاری کیا۔ البتہ غلام رسول عارف نے ہمدرد کو ایک نئی شکل میں لا کر 1955 میں ایک مستحسن کوشش کی۔ اسی دوران کشمیری پنڈتوں نے''مارتنڈ'' اخبار بھی نکالا تھا۔ جبکہ اخبار''خدمت'' بھی منظر عام پر آیا تھا لیکن وہ ایک سرکاری گزٹ زیادہ اور عوامی اخبار کم تھا۔ بخشی غلام محمد نے بھی''نوائے کشمیر'' نامی اخبار شروع کیا جو ان کی تنظیم کا ترجمان تھا۔ اسی طرح محاذ رائے شماری نے بھی''محاذ'' نامی اخبار شروع کیا۔

کشمیر میں صحافت کا باضابطہ آغاز 1958 میں اس وقت ہوا جب مرحوم خواجہ ثناءاللہ بٹ نے''آفتاب'' جاری کیا۔ یہ یہاں کی صحافت کی اصل بنیاد تھی۔ کیونکہ انھوں نے اخبار کو اس وقت پیشے کے تقاضوں کے مطابق چلانے کا کام کیا۔ ہاکر، رپورٹر اور سب ایڈیٹر کا تصور متعارف کرانے کے ساتھ ساتھ انھوں نے تزئین کاری پر بھی دھیان دیا۔ یہ اخبار کافی مقبول ہوا اور آج بھی یہاں کی صحافت میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ بٹ صاحب کے بعد شمیم احمد شمیم نے 1964 میں ہفت روزہ''آئینہ'' جاری کیا جو بعد ازاں روزنامہ میں منتقل کر دیا گیا۔ آئینہ شمیم کے مخصوص انداز تحریر کی وجہ سے ایک منفرد مقام پا گیا۔ بعد میں 1969 میں سری نگر ٹائمز کی بنیاد صوفی غلام محمد نے ڈالی۔ یہ اخبار آج بھی شائع ہو رہا ہے اور بالخصوص اس کے کارٹون کی وجہ سے مقبول ہے۔''آفتاب'' اور

''سرینگر ٹائمز'' کئی سال تک یہاں کی صحافت پر چھائے رہے اور ان کے سائے کے نیچے کوئی اور اخبار پنپ نہ سکا۔ البتہ اس دوران دہلی سے شائع ہونے والے قومی آواز نے سری نگر ایڈیشن نکال کر صحافت کے اس خاکے میں کئی رنگ بھر دیے۔ بہترین طباعت کے ساتھ اس اخبار نے اردو صحافت کو ایک نئی جہت دی لیکن نا مساعد حالات کی وجہ سے کچھ ہی مہینوں کے بعد بند ہو گیا۔

1990 کے اوائل میں جب یہاں مسلح جد و جہد شروع ہو گئی تو کشمیری سماج کا تانا بانا بکھر گیا اور صحافت کا شعبہ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مخدوش صورت حال کا سایہ یہاں کی صحافت کا پیچھا کرتا رہا۔ کئی مہینوں تک اخبارات بند رہے اور دونوں طرف سے دھونس اور دباؤ نے آزاد صحافت کے امکانات محدود کر دیے لیکن جلد ہی اس نئی سیاسی صورت حال نے صحافت کے ایک نئے دور کو جنم دیا۔ 1990 سے پہلے یہاں کے اخبارات کی تعداد 15 سے زائد نہ تھی اور آج محکمۂ اطلاعات کے پاس رجسٹرڈ اخبارات کی تعداد 74 ہے جن میں سے 29 رنگین ہیں۔ اگرچہ اخبارات کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے تاہم کشمیر میں اردو صحافت کو معیار کے اعتبار سے متعدد چیلنجوں کا سامنا ہے۔ تعداد میں اضافے کا البتہ ایک مثبت پہلو یہ ہے کہ جہاں پوری دنیا میں اخبارات کی تعداد گھٹتی جا رہی ہے اور کئی بڑے اخباری ادارے بھی زوال پذیر ہو رہے ہیں، کشمیر واحد جگہ ہے جہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اس کے پیچھے کون سے عوامل کارفرما ہیں ان پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ کئی مبصرین اس کو یہاں سیاسی تنازعہ سے پیدا صورت حال کے ساتھ جوڑتے ہیں کیونکہ اکثر اس طرح کی صورت حال میں مختلف نقطۂ نگاہ رکھنے والے طبقے اپنی رائے کو لوگوں تک پہنچانے یا ان کے اذہان کو متاثر کرنے کے لیے اخبارات جیسے ہتھیار کا استعمال کرتے ہیں۔ میں نے اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی دعوت اس لیے دی کیونکہ اخبارات کی محض تعداد میں اضافے کا منفی اثر یہ نکلا کہ ایک تو عوام کی صحافت کے پیشے سے وابستہ توقعات کو دھچکا لگا اور دوسرے ان رہنما اصولوں پر شک کا مہیب سایہ پڑ گیا جن کی پاسداری سے لوگوں میں صحافت کے تئیں اعتماد پیدا کیا جاتا ہے۔ اردو صحافت کو درپیش مسائل کا تعلق قدرتی طور پر ان مسائل سے بھی ہے جو اردو زبان کو درپیش ہیں۔ اگرچہ اردو ریاست کی سرکاری زبان ہے لیکن اس کے باوجود اس کا مستقبل مخدوش نظر آ رہا ہے۔ جہاں ریاستی سرکار اس کو جائز مقام دینے میں ناکام

ہوئی وہیں یہاں کی نئی نسل اردو کی طرف توجہ دینے میں عدم دلچسپی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ سرکار کے امتیازی سلوک کی وجہ سے اس کے مستقبل پر سوالیہ نشان لگ رہا ہے اور دوسرا یہ کہ انگریزی تیزی سے یہاں کی پہلی بار ترجیحی زبان بن رہی ہے۔ ہر چند کہ یہاں اردو اخبارات کی تعداد انگریزی اخبارات سے کئی گنا زیادہ ہے لیکن ان کو سرکاری سطح پر اب سنجیدہ نہیں لیا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ یہاں کے سیاست داں اور بیوروکریٹ اردو زبان سے تقریباً نابلد ہیں یا پھر انھوں نے اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔ اخبارات لوگوں کی اُمنگوں، خواہشات اور مسائل کے آئینہ دار ہوتے ہیں اور اخبار چھاپنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ارباب اقتدار ان مسائل کا نوٹس لیں جو ان اخبارات میں جگہ پاتے ہیں لیکن چونکہ ان کی ترجیح انگریزی زبان ہے اس لیے وہ اردو اخبارات کی طرف شاید دیکھتے بھی نہیں۔ انگریزی اخبارات میں جو چیزیں چھپتی ہیں ان کا نوٹس سیاستدان اور افسران ضرور لیتے ہیں اس طرح سے اردو صحافت کی افادیت کم ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن یہ بات بھی غور کرنے کے لائق ہے کہ اس وقت بھی کشمیر میں اردو اخبارات پڑھنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے اور ان کے مسائل کا نوٹس لینے کے لیے ضروری ہے کہ وقت کی سرکار اردو پریس کو سنجیدگی سے لے اور یہاں کی افسر شاہی اردو پریس میں شائع ہو رہے مسائل کا نوٹس لے کر انتظامی امور کی انجام دہی میں پائی جانے والی خامیوں اور کمیوں کو دور کرنے کی سعی کرے۔ اردو زبان کے ساتھ ناانصافی جب تک جاری رہے گی تب تک یہاں صحافت کے لیے مشکلات میں اضافہ ہوتا رہے گا۔

اردو صحافت میں کوالٹی کو بہتر بنانے میں جہاں سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر کئی اقدامات کی ضرورت ہے وہیں یہاں کے ان صحافیوں، جو اردو اخبارات نکالتے ہیں، پر بھی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ خود اپنا احتساب کریں۔ یہ دیکھنا ضروری ہے کہ صحافت میں ایسے کتنے لوگ ہیں جو اسے ایک مشن کے طور پر لیتے ہیں۔ اخبارات نکالنا یہاں ایک فیشن بن گیا ہے۔ اسے نہ صرف ایک Status حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے بلکہ بدقسمتی سے اسے بلیک میلنگ کا ایک ذریعہ بھی بنایا جاتا ہے۔ اگر اخبار نکالنا صرف حکومتی امتیاز حاصل کرنے کے لیے ہے اور ہفتے کے آخر میں جمع تفریق کر کے اپنی مختصر آمدنی کا ذریعہ ہے تو یہ صحافت کے پیشے کے

ساتھ ناانصافی ہے۔ کشمیر میں بلکہ ایک نئی اور انوکھی روایت قائم کی گئی ہے۔ یہاں ایک ہی شخص کئی ٹائٹل نکال کر اخبارات کو شائع کرنے کے لیے ٹھیکے پر دیتا ہے۔ ہر چند کہ یہ عمل صرف کچھ اخبارات تک محدود ہے تاہم اس سے صحافت پر بحیثیت ایک ادارے کے کاری ضرب لگتی ہے۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ ہر ایک اخبار ایک ادارے کی شکل پاتا جہاں ایڈیٹر، سب ایڈیٹر رپورٹر اور باقی پیشہ ورانہ عملے کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ فی الحال تو یہ طریقہ صرف چند ایک اخبارات ہی میں رائج ہے جن میں ''کشمیر عظمیٰ'' سرفہرست ہے اور کماحقہ ہم نے ''بلند کشمیر'' میں اس حوالے سے ایک کوشش کی ہے۔

آج کشمیر سے 100 کے قریب اردو اخبارات شائع ہوتے ہیں اس بات کی طرف توجہ ضروری ہے کہ آئندہ آنے والے وقت میں ان کا مستقبل کیا ہوگا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ تقریباً 95 فیصد اخبارات کا انحصار حکومت کی طرف سے دیے جانے والے اشتہارات پر ہے۔ آج کی ٹیکنالوجی کے دور میں اب حکومتی سطح پر بھی آن لائن کام کرنے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ یہاں بھی ریاستی حکومت نے کچھ محکموں میں ای ٹینڈرنگ کا عمل شروع کیا ہے اور ظاہری بات ہے کہ یہ سلسلہ آگے بڑھتا جائے گا اور اس صورت میں حکومتی معاملات کو عوام تک پہنچانے میں اخبارات کا رول کم ہوتا جائے گا۔ اس صورت میں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ وہ اخبارات جو صرف اور صرف حکومت کی طرف سے دیے گئے اشتہارات کے بل بوتے پر چھپتے ہیں ان کا مستقبل کیا ہوگا۔ ویسے بھی جموں و کشمیر کے محکمۂ اطلاعات نے پہلے ہی بیشتر اخبارات کے لیے مہینے میں 15 دن اشتہارات دینے کا عمل شروع کیا ہے۔ اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو آنے والا وقت اخبارات کی بقا کے لیے مشکل ہی ثابت ہوگا، اگر ان کے مالکان نے ان کی اشاعت کو برقرار رکھنے کے لیے متبادل راستوں کو تلاش شروع کرنے کی سعی نہیں کی۔

اس کے علاوہ ایک اور اہم بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے وہ یہ کہ جیسے میں نے پہلے ہی عرض کیا ہے کہ ریاست جموں و کشمیر میں نئی نسل کا اردو کی طرف رجحان کم ہوتا نظر آ رہا ہے۔ ہر چند کہ اردو ریاست کی سرکاری زبان ہے لیکن اس کے باوجود کشمیر میں صحیح معنوں میں یہ زبان اپنانے والوں میں کمی ہوتی جا رہی ہے۔

اس پس منظر میں بھی یہ بات دیکھنے لائق ہے کہ آئندہ 15 سے 20 سال تک یہاں اردو اخبار پڑھنے والوں کی تعداد کیا ہوگی۔ اس صورت میں بھی اخبارات کے مستقبل کے بارے میں فکرمند ہونا ضروری ہے۔ ویسے بھی انٹرنیٹ کی آمد سے بین الاقوامی سطح پر اخبارات کی Hand Copy کا تصور کم ہوتا جارہا ہے۔ امریکہ اور یورپ میں بہت حد تک اخبارات کے پرنٹ ایڈیشن بند ہوتے جارہے ہیں۔ اگرچہ ہندوستان میں ماہرین کا خیال ہے کہ یہاں اس قسم کی صورت حال پیدا ہونے میں بہت وقت لگے گا اور ہم ماضی قریب میں Paperless society کی طرف نہیں بڑھنے جارہے ہیں لیکن نوجوانوں کے انٹرنیٹ کے زمانے میں ان کے تقاضوں کو پورا کرنا اخبارات کے مالکان اور مدیروں کے لیے سب سے بڑا چیلنج ہوگا۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ یہاں اردو بلکہ انگریزی صحافت میں بھی عوامی سرمایہ کاری کا رجحان بالکل معدوم ہے۔ اسی لیے اس کے معیار میں بتدریج کمی واقع ہورہی ہے اور زیادہ سے زیادہ لوگ تعداد کو ہی ترجیح دیتے ہیں۔ جس طرح ''سہارا'' جیسے گروپ نے ایک مکمل اخبار کی بنیاد ڈالی اسی طرح کشمیر میں بھی ایک منظم طریقے سے اردو صحافت کو ایک ادارہ جاتی شکل دینے کی ضرورت ہے۔ اگر اردو صحافت میں سنجیدگی کے ساتھ بھرپور سرمایہ کاری کی جائے تو عجب نہیں کہ کم سے کم ریاست جموں و کشمیر میں اردو اخبارات ایک مثال بن کر ابھریں۔

آج کی تاریخ میں کشمیر میں اردو صحافت ایک تناور درخت کی شکل ضرور اختیار کرگئی ہے لیکن مسائل اور چیلنجوں کا اس قدر سامنا ہے کہ آنے والے وقت میں اس جمہوری سیٹ اُپ کو اپنی پہچان اور زیادہ مضبوط کرنے میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ جیسا کہ میں پہلے ہی عرض کرچکا ہوں کہ اردو اخبارات کو چلانے والوں کو اپنا محاسبہ کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ نئی نسل کی اردو کے ساتھ دلچسپی کم ہوتی جارہی ہے۔ اس لیے کچھ نئی چیزیں جن میں انٹرنیٹ اور ویب کے ساتھ اس کو جوڑنے کا عمل ان کی ترجیحات میں سرفہرست ہونا چاہیے۔ سرکار پر بھی اردو کو بحیثیت سرکاری زبان اپنا جائز مقام دلانے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ میں ان تمام مسائل اور چیلنجز کے باوجود مایوس نہیں ہوں اور میرا یقین ہے کہ کشمیر میں اردو صحافت کا مستقبل روشن ہوسکتا ہے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ سب لوگ اور ادارے جو اس کے ساتھ وابستہ ہیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس

کریں اور لوگوں تک بہتر سے بہتر طریقے میں خبریں، تجزیات اور دیگر دلچسپ مواد پہنچانے کی کوشش کریں۔ انھیں چاہیے کہ وہ روایتی سیاسی بیان بازی کو اپنی شہ سرخیاں نہ بنائیں بلکہ ایک نئی روایت قائم کرنے کی کوشش کریں جس کا تعلق براہ راست یہاں کے نوجوانوں کے مزاج اور مسائل کے ساتھ ہو تبھی ہم یہاں کی اردو صحافت کے روشن مستقبل کی امید کر سکتے ہیں۔

# اردو صحافت اور خبر رساں ایجنسیاں

نوشاد مومن

اخبار، خبروں کا مرقع ہوا کرتا ہے۔ خبر کا ذہن انسانی سے وہی تعلق ہے، جو قوت گویائی کا سماعت سے۔ انسان کو قوت گویائی کی ضرورت اس وقت پیش آئی جب وہ عالم بے خبری سے نکل کر خبر کی دنیا میں آیا اور اس نے اپنی زندگی کے کسی واقعے یا حادثے کو دوسرے تک پہنچانے کی کوشش کی۔ اخبارات کے ابتدائی نشانات میں خبر پہنچانے کا یہی جذبہ کارفرما رہا ہے۔ ہندوستان میں اس کی دیرینہ روایت کا اندازہ ہمیں عبداللہ یوسف علی کی اس عبارت سے ہوتا۔ موصوف لکھتے ہیں:

> ''ہم کو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ آج جو چھپے ہوئے اخبار ہم دیکھتے ہیں، انھی سے ہمارے دیس میں اخبار نویسی کی ابتدا ہوئی۔''

درج بالا عبارت کی روشنی میں جب ہم تاریخ کے اوراق الٹتے ہیں تو یہ حقیقت واشگاف ہوتی ہے کہ عہد رفتہ میں وقائع نویسوں کے قلمی اخبار کی صورت اس کا وجود تھا۔ بقول محمد عتیق صدیقی:

> ''اورنگ زیب کے زمانے میں شاہی محل کے لیے روزانہ ایک اخبار جاری

کیا جاتا تھا۔ یہ اخبار آج کی طرح چاندنی چوک میں آواز لگا کر بیچا نہیں جاتا تھا۔ مزید ان کے پیش رو مغل بادشاہوں کے وقت بھی ایک اخبار شاہی محل کے لیے جاری ہوتا تھا اور اس کی نقلیں دور دراز علاقوں کے امرا وغیرہ کو بھی بھیجی جاتی تھیں۔ مغل عہد کے کئی سو قلمی اخبارات لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔"

(ہندوستان میں اخبار نویسی/محمد عتیق صدیقی/ص30)

لیکن جہاں تک اردو صحافت کے باقاعدہ اور باضابطہ آغاز کا سوال ہے تو اکثریت اس امر پر متفق نظر آتی ہے کہ منشی سدا سکھ لال اور ہری ہر دت چودھری کے ہفت روزہ "جام جہاں نما" کلکتہ 1822 کی اشاعت سے ملک میں اردو صحافت کی بنیاد پڑی۔ تاہم بعض مورخین کا یہ اصرار ہے کہ ٹیپو سلطان نے 1794 میں "فوجی اخبار" کے نام سے ایک ہفت روزہ جاری کر کے اردو صحافت کی خشتِ اول رکھی تھی جو اس کی شہادت یعنی 4 رمئی 1799 تک مسلسل شائع ہوتا رہا۔ اس تمہید سے ہمیں یہ بتانا مقصود ہے کہ قدیم ہندوستان کے مختلف ادوار میں ہمارے حکمرانوں نے اخبار کی اہمیت اور اس کی افادیت کو بخوبی محسوس کر لیا تھا۔ ہمارا موضوع چونکہ "اردو صحافت اور خبر رساں ایجنسیاں" ہے اس لیے ہم اپنی گفتگو کو محدود کرتے ہوئے یہ عرض کرتے ہیں کہ خبر رساں ایجنسیاں، اخبارات کے لیے بڑے منظم طریقے سے خبریں فراہم کرتی ہیں۔ اخبار کو ان کی ضرورت اتنی ہی ہے جتنی زندگی کے لیے غذا کی۔ شاید اسی لیے یہ بات کہی جاتی ہے کہ خبر رساں ایجنسیاں، اخبارات کے پیٹ بھرنے کا سب سے آسان اور بہترین وسیلہ ہیں۔ اس کا سرا "خبر رسانی" سے ملتا ہے جو قدیم ہندوستان سے عہد وسطیٰ کے ہندوستان تک ایک فن کی شکل میں ترقی کر کے جدید ہندوستان میں "خبر رساں ایجنسی" کی صورت اختیار کر گئی۔ ایسے میں خبر رساں ایجنسیوں کی جڑیں ہمیں خبر رسانی میں تلاش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

کہتے ہیں کہ قدیم ہندوستان میں خبروں کی جانکاری کے لیے خبر رسانی کا سیدھا سادہ اور جمہوری نظام سب سے پہلے منو مہاراج نے قائم کیا تھا۔ ان کے عہد نظامی میں خبر رسانی کے ابتدائی نقوش ہمیں گاؤں میں ملتے ہیں۔

''گاؤں کا چودھری اپنے گاؤں کے نیک و بد کا پتہ دس گاؤں کے چودھری کو (دے) اور دس گاؤں والا بیس (گاؤں) والے چودھری کو دے اور بیس والا سو والے کو اور سو والا ہزار والے کو اطلاع دے۔''

(منقول: منوسمرتی / باب 7 دفعہ 117-116)

خبر رسانی کا یہی سلسلہ ہندوستان کے ہر دور میں دراز ہوتا گیا اور نت نئی شکل و صورت اختیار کر کے اپنے مقاصد کی تکمیل کی راہ پر گامزن رہا۔ عظیم حکمراں اشوک کے زمانے میں خبر رسانی کے بطن سے ہی 'جاسوسی کا مکمل نظام' سامنے آیا۔

''اشوک کے عہد میں جب مذہب اور سیاست کو ایک دوسرے میں ضم کر دیا گیا اور شہر یاری کا ایک ترقی یافتہ نظام ہمارے ملک میں قائم ہوا تو اس وقت خبریں حاصل کرنے کے متعدد ذرائع شہنشاہ کے پاس موجود تھے۔ لوگوں کی خفیہ سرگرمیوں اور باغیانہ حرکات کی اطلاعیں جاسوس لاتے تھے۔ دوسری طرف ہر محکمہ اپنی کارگزاریوں کی خبریں بھیجا کرتا تھا۔ نیز ہر محکمے کے ساتھ خفیہ نویس بھی متعین ہوا کرتے تھے۔ خانقاہیں شہنشاہ کو عوام کی مذہبی و سماجی سرگرمیوں سے باخبر رکھتی تھیں۔''

[History of Indian Journalism - Report of the Press Vol. II, Page -3 ]

ٹھیک اسی طرح شیر شاہ سوری نے بھی اپنے عہد حکمرانی میں خبر رسانی کی خشت پر 'ڈاک کا جامع نظام' قائم کیا تھا۔

''خبر رسانی کو جو معقول انتظام شیر شاہ نے کیا تھا وہ قابل رشک تھا۔ پنجاب اور بنگال کی آخری حدوں سے شیر شاہ کو روزانہ خبریں ملا کرتی تھیں۔ اس کے پاس خبروں کی فراہمی کے دو ذرائع تھے ایک تو سرکاری حکام برابر خبریں بھیجتے تھے دوسرے خفیہ خبر رسی کا بھی انتظام تھا۔ شیر شاہ کے خبر رساں ملک کے باہر کی مفید خبریں بھی اس کے پاس بھیجا کرتے تھے۔''

[ Qanungo, op cit, page 393 ]

ان حوالوں سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ہندوستانی حکمرانوں نے خبر رسانی پر خصوصی توجہ کی۔ خبر رسانی کی جو شکلیں ہندوستان میں رائج تھیں وہی ایشیا اور یورپ کے ملکوں میں بھی رائج تھیں۔ عہد مغلیہ میں خبر رسانی، اخبار نویسی اور وقائع نگاری بن کر مزید مستحکم ہوئی۔ اس عہد میں سلاطین کو وقائع نگار، سوانح نگار، خفیہ نویس اور ہرکارے سے مملکت کی خبریں موصول ہوا کرتی تھیں۔ سب کے الگ الگ مدارج تھے۔ وقائع نگار ریاست میں رونما ہونے والے ہر واقعے کو پابندی سے صوبے دار کے ذریعہ بادشاہِ وقت تک پہنچاتا جبکہ سوانح نگار خاص اور اہم واقعات سے مطلع کرتا۔ خفیہ نویس اپنی خبریں صیغۂ راز میں رکھتے اور براہ راست بادشاہ کو باخبر کرتے۔ ہرکارے اپنی خبریں داروغہ ڈاک چوکی کے ذریعہ بادشاہ تک بھیجتے تھے۔ مغلوں نے خبر رسانی کی اہمیت کو اس حد تک محسوس کر لیا تھا کہ ہر ضلع میں ایک اخبار نویس متعین کر دیا تھا جس کا کام یہ تھا کہ وہ اپنے علاقے کے زیر وزبر کی بے کم وکاست اطلاع بادشاہ اور اس کے وزرا کو دیا کرتے۔ آئین اکبری میں ابوالفضل لکھتے ہیں:

> ''واقعات سلطنت کا قلم بند کرنا نہ صرف مملکت و دولت کی ترقی اور انتظام کے لیے ضروری ہے بلکہ ہر طبقے اور ہر مجلس کی رونق کو بحال رکھنے کے لیے بھی ضروری ہے۔ اگر چہ قدیم زمانے میں بھی اس طریقے کا پتہ چلتا ہے۔ مگر اس کی اصل حقیقت سے اہل زمانہ کو اکبر کے مبارک عہد میں آگاہی ہوئی۔''
> (آئین اکبری-ابوالفضل-عثمانیہ،صفحہ:381)

مارگریٹا بارنس کے مطابق:

> ''یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ مغلوں کے عہد میں اخبارات کو بحث وتبصرے کی پوری آزادی حاصل تھی اور یہ ایک ایسی بات ہے جس کی مثال ان کے انگریز جانشینوں کے یہاں عنقا ہے۔''

[ Indian Press - Barns - P-3 ]

گویا اخبارات کے لیے آزادیٔ اظہار رائے کا خوش کن تصور مغلیہ سلطنت کی دین ہے۔ بہر حال وقت کے ساتھ حالات بھی بدلتے رہے۔ بدلتے حالات میں تہذیب وتمدن کا

ارتقا بھی لازم تھا۔ ارتقائے تہذیب نے نہ صرف یہ کہ انسانی شعور کو بالیدگی عطا کی بلکہ نظامِ سیاست و ریاست کا دائرہ بھی وسیع تر کیا۔ ترقی کے اس شامیانے میں انسان کی بالیدہ ذہنی نے 'خبر رسانی' کے دیرینہ اور تیز رو نظام کی وسعت و گہرائی سے بھرپور فیض اٹھایا اور ایسے ادارے کی تشکیل و تعمیر پر غور کیا جہاں سے اس کرۂ ارض پر ہر لمحہ پیش آنے والے واقعات و حالات کی تفصیلات نہایت کم وقت میں یکجا کر کے انھیں دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ کو پہنچایا جا سکے۔ باخبری کا یہی خیال ''خبر رساں ایجنسی'' کی بنیاد کا مقصد بھی قرار پایا۔

عالمی سطح پر باضابطہ اور باقاعدہ خبر رساں ایجنسی کی داغ بیل 1835 میں 'ایجنسی ہاوا' کے نام سے فرانس میں پڑی۔ یہ ایجنسی دوسری عالمی جنگ کے بعد ''ایجنسی فرانس پریس'' (اے ایف پی) کے نام میں تبدیل ہوگئی۔ ابتدا میں بظاہر یہ ایک خود مختار عوامی ایجنسی تھی لیکن اس کے بورڈ آف ڈائرکٹرس میں فرانسیسی اخبارات کے مالکان کا غلبہ تھا۔ مزید یہ کہ حکومتِ فرانس اس کے ڈائرکٹر جنرل کا انتخاب خود کیا کرتی اور اسے مالی استحکام بخشنے کے لیے اپنی طرف سے ہر سال ایک بجٹ بھی مختص کیا کرتی تھی۔ ایک اندازے کے مطابق دنیا کے کم و بیش 150 ممالک میں اس کے بیورو کام کرتے ہیں۔ پہلے پہل یہ ایجنسی فرانسیسی، عربی، انگریزی، جرمنی اور پرتگالی زبان میں خبریں فراہم کرتی تھی لیکن ادھر چند برسوں میں 'ایجنسی فرانس پریس' نے پاکستان کے 'انٹرنیشنل نیوز نیٹ ورک' سے اشتراک کر کے اردو زبان میں بھی خبروں کی ترسیل کی ذمہ داری لی ہے جو یقیناً ایک خوشگوار تبدیلی ہے۔ اس وقت اردو کے تقریباً 50 اخبارات کو یہ ایجنسی خبریں فراہم کر رہی ہے۔

تاریخی اعتبار سے دنیا کی دوسری خبر رساں ایجنسی کا قیام 1848 عمل میں آیا جسے ہم ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ کے نام سے جانتے ہیں۔ اس ایجنسی کا امتیاز یہ ہے کہ اس نے سب سے پہلے یہ اصول مرتب کیا کہ وہ کسی حکومت، اس کے فرد یا ادارے سے اپنا کوئی تعلق نہیں رکھے گی۔ اس نیوز ایجنسی کے تقریباً 100 ممالک میں بیورو موجود ہیں۔ یہ ایجنسی انگریزی میں خبریں ارسال کرتی ہے، جس کا ترجمہ ترقی یافتہ زبانوں کے اخبارات شائع کرتے ہیں۔ اے پی نیوز ایجنسی کا انفراد یہ ہے کہ یہ امداد باہمی یعنی کوآپریٹو ادارہ ہے جس کا مقصد منافع کمانا نہیں۔ ایجنسی کو

بورڈ آف ڈائرکٹرس کنٹرول کرتے ہیں جنھیں ادارے کے ارکان اپنے سالانہ اجلاس میں منتخب کرتے ہیں۔ بورڈ کی میعاد 3 ربرس کی ہوتی ہے تاہم بہتر کارکردگی پر مزید دو مکمل میعاد کی گنجائش بھی اس میں رکھی گئی ہے۔

1851 میں لندن (برطانیہ) میں رائٹر کے نام سے ایک نئی ایجنسی کی بنیاد پڑی۔ اس کے بنیادگزار پال جیولیس رائٹر ہیں جو ایجنسی ہاوا میں ملازمت کرتے تھے۔ اس وقت دنیا کی سب سے بڑی نیوز ایجنسی ہونے کا اعزاز بھی ''رائٹر'' کو حاصل ہے۔ دنیا بھر کے ایک سو ممالک سے اس کے نیوز بیورو، خبریں یکجا کر کے اخبارات کو بھیجتے ہیں۔ 1865 میں رائٹر باضابطہ طور پر ایک عوامی کمپنی میں تبدیل ہوگئی۔ اس طرح اس کی ملکیت فرد واحد میں نہ رہ کر اس کے شیئر ہولڈرز کو حاصل ہوگئی۔ رائٹر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس پر کسی بھی مفادات حاصلہ کا کوئی اثر نہیں۔ اس کی آزادانہ سرگرمیوں، غیر جانبدارانہ رویوں اور اس کی شفافیت پر شاید ہی کسی کو شک وشبہ ہو۔ یہی سبب ہے کہ دنیا کے تمام اخبارات ''رائٹر'' کی خبروں پر اپنا ایمان وایقان رکھتے ہیں۔

برٹش براڈ کاسٹنگ (بی بی سی) بھی ایک معروف ادارہ ہے۔ یہ ادارہ اپنے معیاری مواد اور تفتیشی انداز نظر کے لیے دنیا بھر میں اعتماد کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ایشیائی زبانوں کے اخبارات کے لیے یہ ایسے پارٹنر کے ساتھ اشتراک کر کے خبروں کی ترسیل کرتا ہے جو قارئین کے اعتماد و یقین پر کھرا اترتا ہو۔ بی بی سی اردو سروس اسی کی ایک کڑی ہے۔ بی بی سی اپنی اردو سروس کے لیے پاکستان کے سب سے بڑے اخباری پبلشر اور نیوز ایجنسی '' آج نیوز'' سے پارٹنرشپ کے اصول پر کاربند ہو کر ایشیائی، یوروپی اور مغربی ممالک کے اردو اخبارات کو خبریں ارسال کرنے کا فریضہ انجام دے رہی ہے۔

ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان (اے پی پی) پاکستان کی قومی خبر رساں ایجنسی ہے۔ اس کا مرکزی دفتر اسلام آباد میں ہے۔ یہ ایجنسی پاکستان کے علاوہ دیگر ایشیائی ممالک سمیت دنیا بھر میں شائع ہونے والے اردو اخبارات کو خبریں فراہم کرتی ہے۔ ہر چند کے ہندوستان میں یہ ایجنسی زیادہ مقبول نہیں تاہم پاکستان کی قومی خبریں اور وہاں کے اہم واقعات و سانحات اے پی پی کے حوالے سے ہمارے ملک کے اخبار کی زینت بنتے ہیں۔

ہندوستان میں نیوز ایجنسی کے بابا آدم ڈاکٹر کے سی رائے کو کہا جاتا ہے۔ انھوں نے ہمارے ملک کی پہلی نیوز ایجنسی ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا (اے پی آئی) کے نام سے قائم کی۔ 1948 میں اس کو نہ صرف یہ کہ ''پریس ٹرسٹ آف انڈیا'' (پی ٹی آئی) کا نیا نام دیا گیا بلکہ اسے کوآپریٹو کا جامہ پہنا کر ایک غیر تجارتی ادارے میں تبدیل بھی کر دیا گیا۔ ستمبر 1948 میں پی ٹی آئی کا 'رائٹر' کے ساتھ ایک معاہدہ ہوا، جس کے تحت یہ نیوز ایجنسی رائٹر کی شراکت دار بن گئی۔ لیکن پانچ سال کی مدت میں یہ معاہدہ ختم ہو گیا۔ 1954 میں پی ٹی آئی کو غیر جانبدار اور خود مختار بنانے کے لیے پریس کمیشن نے اسے پبلک کارپوریشن بنانے کی تجویز پیش کی، جو کامیاب تو نہ ہو سکی لیکن اس کے دستور العمل میں ترمیم ضرور کر دی گئی۔ اس ترمیم کا سب سے خوشگوار پہلو یہ تھا کہ ملک کی ایسی نامور شخصیتیں جن کا انسلاک کسی سیاسی جماعت سے نہ ہو، انھی کو پی ٹی آئی کے بورڈ آف ڈائرکٹر میں بحیثیت ڈائرکٹر نامزد کیا جائے۔ جن کی تعداد کم از کم چار ضرور ہو۔ پریس ٹرسٹ آف انڈیا کے دستور العمل میں یہ اسی تبدیلی کا ثمرہ ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے 'پی ٹی آئی' ملک کی سب سے بڑی اور اہم نیوز ایجنسی بن گئی۔ حتیٰ کہ امریکہ، برطانیہ، متحدہ عرب امارات اور ایشیائی ممالک کی خبر رساں ایجنسیاں بھی اسے قابل اعتنا سمجھنے لگیں اور اس کی خدمات حاصل کرنے لگیں۔ ہندوستان کے تقریباً 450 اخبارات اس ایجنسی سے وابستہ ہیں۔ یہ نیوز ایجنسی خبروں کے ساتھ مختلف امور پر فیچرس، مضامین اور تصویریں بھی اخبارات کو فراہم کرتی ہے۔

پریس انفارمیشن بیورو (پی آئی بی) خالص حکومتی نیوز ایجنسی ہے جو وزیر اعظم کے دفتر سے متعلق خبریں اخبارات کو بڑی پابندی سے ارسال کرتی ہے۔ 1959 میں مرکزی حکومت جب وزارت اطلاعات ونشریات کا قیام عمل میں لائی، اسی کے ماتحت پریس انفارمیشن بیورو کے نام سے ایک شعبہ بھی قائم کیا گیا۔ چونکہ یہ حکومت کا ادارہ ہے لہٰذا اس کا کام مرکزی حکومت کے ذریعہ کیے گئے متعدد پروگراموں، پالیسیوں اور منصوبوں کے علاوہ حکومت کے مختلف شعبہ جات کی کارکردگی کو مشتہر کرنا ہے۔ اپنے کام کو بخوبی انجام دینے کے لیے پی آئی بی نے ملک کی بیشتر ریاستوں کی راجدھانی میں اپنے دفاتر بھی قائم کیے ہیں تاکہ ریاستی سطح پر سرکاری اور غیر سرکاری زبان کے اخبارات کو وزارت عظمیٰ اور اس کے مختلف دفتروں کی کارکردگی کے ساتھ ساتھ دونوں

ایوانوں ( راجیہ سبھا اور لوک سبھا ) میں ہونے والی کارگزاریوں سے متعلق بھی اطلاعات بہم پہنچائی جا سکیں۔ دیگر ایجنسیوں کی طرح یہ ایجنسی اپنی اطلاعات کے لیے کوئی فیس نہیں لیتی اور تمام چھوٹے بڑے اخبارات کو خبریں مفت فراہم کرتی ہے۔ پی آئی بی اس بات پر خصوصی توجہ دیتا ہے کہ وزیراعظم کے کسی پروگرام، منصوبے یا منشور کی اطلاع ملک گیر سطح پر تمام زبانوں کے اخبارات کو بروقت پہنچے۔ کہہ سکتے ہیں کہ پریس انفارمیشن بیورو، مرکزی حکومت، اس کے اداروں اور عوام الناس کے درمیان ایک رابطے کا کام بھی کرتا ہے۔

یونائیٹڈ نیوز آف انڈیا (یو این آئی) کا شمار ہندوستان کی دوسری بڑی نیوز ایجنسی میں ہوتا ہے۔ 21/مارچ 1961 کو ملک کے 8/ممتاز اخبارات کے مالکان نے اس کی بنیاد دہلی میں رکھی۔ ابتدا میں اس نیوز ایجنسی کے صرف 13/خریدار تھے لیکن عصری تقاضوں کے تحت اس نے اپنے طریق کار بھی بدلے اور دائرۂ کار بھی۔ شاید اسی لیے یو این آئی کو ایشیا کی اولین 'کثیرلسانی خبر رساں ایجنسی' ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ یکم مئی 1982 کو اس نے متعدد زبانوں میں ''یو این آئی-وارتا'' کے نام سے ایک نئی سروس شروع کی، جس کے سبب جہاں اندرون ملک اس کے خریداروں کی تعداد میں اضافہ ہوا، وہیں بیرون ملک کے خریدار بھی اس ایجنسی کی طرف راغب ہوئے۔ 5/جون 1992 میں یو این آئی نے اردو سروس کے نام سے ایک نئی پہل کی جس کا افتتاح آنجہانی وزیراعظم نرسمہا راؤ نے کیا تھا۔ اردو اخبارات کے لیے یو این آئی کی مخصوص اردو سروس نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا اور چند ہی دنوں میں ہزاروں اخبارات اس کی گھنی چھاؤں میں پناہ لینے لگے۔ اعداد وشمار کے مطابق اس وقت ملک میں اردو کے تقریباً 100/اخبارات اور بیرونی ممالک کے 300/سے زائد اخبارات یو این آئی سے استفادہ کررہے ہیں۔ یو این آئی کے ہندوستان اور ہندوستان کے باہر سیکڑوں مراکز ہیں جہاں سے روز وشب اس کے ملازمین ہندی، اردو، انگریزی کے علاوہ بیشتر ترقی یافتہ زبانوں میں خبریں، فیچرس، مضامین اور تصویریں فراہم کرتے ہیں۔

انڈین ایشین نیوز سروس ( آئی اے این ایس ) کا قیام دہلی میں 1986 میں عمل میں آیا۔ یہ نیوز سروس انگریزی اور ہندی میں خبریں ترسیل کرنے کا کام کرتی ہیں۔ اس کا دائرہ کار

7 سا ایشیائی ممالک تک محدود ہے جن میں سری لنکا، افغانستان، پاکستان، بنگلہ دیش، نیپال، بھوٹان اور مالدیپ شامل ہے۔ متذکرہ ایجنسیوں کے علاوہ انٹرنیشنل نیوز سروس (آئی این ایس)، یونائیٹڈ نیوز نیٹ ورک (یو این این) اور پریس سروس آف انڈیا (پی ایس آئی) کے نام سے بھی کچھ ادارے اخبارات کو اپنی خدمات پیش کرتے ہیں۔ اول الذکر کا مرکزی دفتر دہلی میں ہے جبکہ آخر الذکر کا اورنگ آباد۔ تینوں اداروں کا امتیاز اردو میں بھی خبریں فراہم کرنا ہے، جبکہ پی ٹی آئی بھاشا، یو نی وارتا اور بھارتی ذو لسانی زبان میں خبریں ترسیل کرتی ہیں۔

اسلامک ری پبلک نیوز ایجنسی (آئی آر این اے) نے 24 رنومبر 2014 سے اپنی اردو سروس کا آغاز کیا۔ ایران کی یہ نیوز ایجنسی پہلے فارسی میں خبریں ارسال کرتی تھی لیکن اب فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں بالخصوص اسلامی ممالک کی خبریں ترسیل کرنے کا فریضہ انجام دیتی ہے۔

الجزیرہ، جس کا مرکزی دفتر قطر میں واقع ہے، نے عربی زبان سے اپنی خدمات کا آغاز کیا تھا لیکن اب اس نے بھی اردو میں خبروں کی ترسیل کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ نہ صرف اردو بلکہ ترکی، فرانسیسی اور اسپینی زبان میں بھی الجزیرہ نیوز نے خبروں کی ترسیل کی ذمہ داری اٹھا رکھی ہے۔

بہر حال، کل کے مقابلے عصرِ حاضر میں خبر رسانی تکنیکی سہولتوں کی وجہ سے تیز رفتار ہو گئی ہے۔ کمپیوٹر کی ایک کلک پر اخبارات کو خبروں کا ذخیرہ مل جاتا ہے۔ اردو اخبارات بھی اس سے مستفیض ہوتے ہیں۔ کچھ اداروں کی خبریں اردو زبان میں ہی مل جاتی ہیں اور جن کی خبریں اردو میں نہیں ہوتیں وہ کمپیوٹر میں ہی ''گوگل ٹرانسلیٹ'' کی مدد سے ترجمہ بھی کر لیتے ہیں اور پھر انھیں ایڈٹ کر کے شائع کرتے ہیں۔

لیکن تمام تر تکنیکی آسانیوں کے باوجود اردو صحافت کا یہ المیہ ہے کہ اس کے بیشتر ملازمین غیر تربیت یافتہ اور غیر سنجیدہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان سے پیشہ ورانہ انسیت کی توقع کرنا فضول ہے۔ یہی سبب ہے کہ بیشتر اخبارات کے تراجم کے زبان و بیان حد درجہ پست اور غیر متوازن ہوتے ہیں کہ جنھیں پڑھ کر عام قاری بھی بسا اوقات یہ کہتا دکھائی دیتا ہے کہ ہمیں جو تھوڑی بہت زبان آتی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ ان اخبارات کو پڑھ کر ہم وہ بھی بھول جائیں۔ مقامِ افسوس ہے کہ ادھر

چند برسوں سے اردو اخبارات دھڑلے سے ایسے الفاظ بھی استعمال کر رہے ہیں جن کا چلن ہندی میں عام ہے۔ مثلاً جذباتوں، تحقیقاتوں، ابھی حال میں وغیرہ وغیرہ۔ گویا اردو اخبارات، زبانِ اردو کو ہندی زدہ بنانے کی راہیں شعوری یا لاشعوری طور پر ہموار کر رہے ہیں، جو کسی بھی صورت قابل قبول نہیں بلکہ قابل مذمت بھی ہے۔ ان کے اس عمل سے اردو کی حلاوت اور دل آویزی کے ماند پڑنے کا شدید خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ ان دنوں یہ بھی دیکھا جا رہا ہے کہ معیاری اخبارات کی ملکیت بڑی صنعتی اور تجارتی کمپنیوں کے دائرۂ اختیار میں چلی گئی ہے۔ اردو اخبارات بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ ایسے میں جہاں اردو اخبارات کے ملازمین کی تنخواہ میں بہتری آئی ہے اور ان کا جسمانی و مالی استحصال کم ہوا ہے، وہیں ایک غلط رجحان بھی سامنے آیا ہے کہ بڑے صنعتی اداروں نے اپنے اخبارات کو ذاتی مفادات کے لیے بڑے شد و مد سے استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ اسی پر بس نہیں بلکہ جن خبروں سے مالکان کے کاروباری مفاد، سیاسی اور ذاتی تعلقات متاثر ہوتے ہیں وہ خبریں اخبار کا حصہ نہیں بن پاتیں۔ مالکان کا یہ ذہنی میلان آزادیٔ صحافت کی صحت مند روایت پر کہیں بدنما داغ بن کر نہ رہ جائے......؟ یہ ایک لمحۂ فکریہ سے کم نہیں!

# اردو صحافت کے اقتصادی مسائل، مشکلات اور حل

ڈاکٹر جوہر قدوسی

یہ کہنا بعید از حقیقت نہیں ہوگا کہ اردو صحافت روزِ اوّل ہی سے گوناگوں مسائل و مشکلات کا پوری ہمت اور حوصلے سے سامنا کرتی آرہی ہے۔ اس کے مسائل آج بھی موجود ہیں، صرف ان کی نوعیت بدل گئی ہے۔ ایک زمانے میں جہاں کتابت و طباعت اور سرکولیشن کے مسائل ہی اردو صحافت کے اہم مسائل تھے، وہاں آج اکیسویں صدی میں ہر آن بدلتے رجحانات و میلانات اور ہر گھڑی وجود میں آنے والی نت نئی ایجادات و اختراعات نے اس کے سامنے بے شمار نئے چیلنج لاکر رکھ دیے ہیں، جن میں معاشی و اقتصادی مسائل بھی شامل ہیں۔

یہاں پر 'اردو صحافت کے اقتصادی مسائل، مشکلات اور حل' کے موضوع پر کچھ کہنے سے قبل اس بات کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ آج کل صحافت کے بدلے 'میڈیا' کا لفظ اکثر و بیشتر استعمال کیا جاتا ہے، جو معنوی سطح پر بہت وسعت پا چکا ہے۔ اس میں پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کی تمام اقسام کے ساتھ ساتھ اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں وجود پذیر سوشل میڈیا کی انوکھی دنیا بھی شامل ہوگئی ہے۔ اب تو پرنٹ میڈیا بھی عملاً ملٹی میڈیا کی شکل اختیار کر چکا ہے اور کسی

بھی اخبار یا جریدے کی ویب گاہ پر مطبوعہ مواد کے ساتھ ساتھ آڈیو/ویڈیو لنکس بھی دستیاب رہتی ہیں۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ آنے والے وقت میں میڈیا کی طلسماتی دنیا کون سے اور گُل کھلائے گی اور اس کی کتنی نئی شکلیں سامنے آئیں گی۔ مقالۂ ہٰذا میں بات صرف اردو کے پرنٹ میڈیا یعنی مطبوعہ صحافت کے حوالے سے ہی ہوگی، جس میں اخبارات و رسائل و جرائد شامل ہیں۔

تاریخ کے اوراق پلٹ کر دیکھیں، تو ایک زمانہ وہ تھا جب اردو صحافت کی دنیا محدود تھی اور اس کے مسائل بھی زیادہ پیچیدہ نہیں تھے۔ مثلاً گزشتہ صدی کی ساتویں اور آٹھویں دہائی میں چھوٹے اردو اخبارات کو دیگر کئی مسائل کے ساتھ لیتھو پرنٹنگ کی اور لیتھو کتابت کا مسئلہ درپیش تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ لیتھو کتابت کی اُجرت کم ہوتی تھی اور کاتب و خوشنویس لیتھو کتابت کے برعکس آفسیٹ کتابت میں زیادہ اُجرت ملنے کے سبب لیتھو سے چھپنے والے اخبارات میں کام کرنے سے گریز کرتے تھے۔ پھر آٹھویں دہائی کے اختتام کے ساتھ ہی لیتھو طباعت کا دور بھی تقریباً ختم ہوگیا، تو آفسیٹ طباعت کے مسائل پیدا ہوگئے۔ کیونکہ بہت سے اخبارات مالی اعتبار سے آفسیٹ پرنٹنگ کا خرچہ اُٹھانے کے متحمل نہیں ہوتے تھے۔ اس طرح روزنامہ و ہفتہ وار اخبارات اور بالخصوص چھوٹے اخبارات کے لیے مسائل کا ایک انبار سامنے رہتا تھا۔ کتابت کا مسئلہ حل ہوجاتا تو طباعت کا مسئلہ پیدا ہوتا۔ طباعت کا مسئلہ حل ہوجاتا تو کاغذ کا مسئلہ سر اُٹھالیتا۔ کاغذ کے مسئلے کا حل نکل آتا تو اشتہارات کا مسئلہ کھڑا ہوجاتا اور جب یہ سب مسائل حل ہوجاتے، تو مالی مسئلہ سانپ کی طرح پھنکاریں مارنے لگتا۔

آج نہ لیتھو کتابت کا دور ہے اور نہ ہی لیتھو طباعت کا، بلکہ یہ دور فور کلر آفسیٹ پرنٹنگ اور برق رفتار ملٹی کلر ویب آفسیٹ پرنٹنگ کا ہے۔ آج برصغیر ہند و پاک اور اردو کی نئی بستیوں سے شائع ہونے والے بیشتر اخبارات و رسائل انتہائی دلکش، دیدہ زیب اور پُرکشش انداز میں منظر عام پر آتے ہیں۔ پیشکش، گیٹ اَپ اور رنگین طباعت کے معیار کے لحاظ سے ان کو کسی بھی زبان کے اخبارات کے مدِ مقابل رکھا جا سکتا ہے۔ ایک اور انقلابی تبدیلی اطلاعاتی اور مواصلاتی ٹیکنالوجی کے امتزاج سے وجود میں آئی ہے۔ آج کا پرنٹ میڈیا اپنی مطبوعات کو پرنٹ ایڈیشن تک ہی محدود رکھ کر اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتا، بلکہ انٹرنیٹ پر آن لائن ایڈیشن، بلاگ اور ای پیپر

وغیرہ کے ذریعے اپنی موجودگی کا پتہ دینا اس کے لیے ناگزیر بن گیا ہے۔ ساتھ ہی فیس بک، وہاٹس ایپ، ٹویٹر، وائبر اور دیگر دسیوں قسم کے سوشل میڈیا نیٹ ورک پر اخبارات کو چہار دانگ عالم میں دستیاب رکھنا بھی ضروری ہو گیا ہے۔ اردو کے بیشتر بڑے اخبارات نے اپنے خبری مواد کو انٹرنیٹ پر منتقل کرنے کا کام کافی عرصہ پہلے ہی کیا ہے۔ مبصرین کے مطابق یہ صورت حال جہاں دنیا بھر میں مطبوعہ صحافت کی مشکلات کو ظاہر کر رہی ہے، وہاں اس سے انٹرنیٹ جرنلزم کے فروغ کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ہر جگہ صحافت کا منظر نامہ تبدیل ہو رہا ہے، بھاری لاگت برداشت نہ کر سکنے والا خبری مواد مطبوعہ صفحات سے نکل کر انٹرنیٹ کی ویب سائٹس پر منتقل ہو رہا ہے۔ دراصل پوری دنیا میں میڈیا صارفین کا رویہ بدلتا جا رہا ہے۔ اب تو اکثر لوگ اگلے دن کے اخبار کا انتظار کرنے کے بجائے اسمارٹ فون، سوشل میڈیا یا نیوز ویب سائٹس کے ذریعے خبروں کا حصول زیادہ مناسب اور قابل اطمینان خیال کرتے ہیں۔ اخبارات کی تقسیم کاری، کاغذ کی گراں بازاری اور طباعت پر اٹھنے والے بھاری اخراجات کی وجہ سے مطبوعہ صحافت کا بڑا حصہ پہلے ہی انٹرنیٹ پر منتقل ہو چکا ہے۔ اس وقت سب سے بڑا چیلنج یہ بنا ہوا ہے کہ آن لائن مواد سے پیسہ کیسے کمایا جائے۔ اس کی ایک صورت یہ نکلی ہے کہ مرکزی حکومت اور متعدد صوبائی سرکاروں نے اپنی نئی میڈیا پالیسیوں کے تحت نیوز ویب سائٹس کے لیے سرکاری اشتہارات کا کوٹہ مقرر کرنے کی تجویز پہلے ہی منظور کر لی ہے اور کہیں کہیں اس پر عمل بھی ہو رہا ہے۔ یہ بات طے ہے کہ ملک میں آن لائن اردو جرنلزم سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ وہاٹس ایپ اور فیس بک پر نت نئے نیوز گروپس اور ویب پر نیوز ویب سائٹس روزانہ بنیادوں پر کھل رہی ہیں۔ نیوز ویب گاہوں پر ہر پل اور ہر لمحہ نیوز اَپ ڈیٹس کی فراہمی تھمنے کا نام نہیں لے رہی ہے۔ مطبوعہ صحافت کی ویب گاہوں پر ویڈیو نیوز کلپ دستیاب رکھنے کا آغاز کب کا ہو چکا ہے، لیکن اس سب کے باوجود اشتہاری اداروں کی زیادہ توجہ اردو ویب سائٹس کو میسر نہیں ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ اشتہار دینے والوں کا ایک نفسیاتی مسئلہ بھی ہوتا ہے۔ انھیں جو سکون اخبار میں چھپا اپنا اشتہار دیکھ کر حاصل ہوتا ہے، وہ شاید آن لائن میں نہیں ہوتا۔ دوسری طرف آن لائن جرنلزم سے صارفین کا خرچہ کم ہو گیا ہے۔ جو شخص اپنے گھر میں دس اخبار نہیں لگوا سکتا، وہ انٹرنیٹ پر

بیسیوں اخبار مفت میں پڑھ لیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہاٹس ایپ اور اس قبیل کی دیگر سہولتوں کے ذریعے ہر پل بدلتی دنیا کے بدلتے حالات کی خبریں تحریری، تصویری، سمعی اور ویڈیو شکل و صورت میں جیب کے اندر رکھے اسمارٹ فون میں لحہ بہ لحہ خود بخود منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ گویا ایک تیز و تند سیلاب ہے، جو بس امنڈتا ہی چلا آرہا ہے۔ بقول ایڈورڈ سعید:

> ''ہم خبروں کے ایک سمندر میں ڈوبے چلے جارہے ہیں، جو کبھی تو متضاد ہوتی ہیں اور زیادہ تر محض تکرار ہی تکرار''۔

ظاہر ہے کہ جب بچے سے لے کر بوڑھے تک ہر طبقۂ عمر کے مرد و خواتین اس طرح کی سبک رفتار، محیر العقول اور طلسماتی اثرات والی دنیا میں رات دن کھو جائیں تو اردو اخبارات سے جنون کی حد تک محبت کرنے والے اور ان کو حرز جاں بنانے والے دیوانے کہاں سے آجائیں گے، جبکہ یہی دیوانہ پن ایک زمانے میں اردو صحافت کی ترویج و اشاعت میں اہم کردار ادا کر چکا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ زندہ زبانیں روزگار کی بنیاد پر نہیں بلکہ جذبے کی بنیاد پر باقی رہتی ہیں اور ان کی شریانوں میں اقتصادیات و معاشیات کے لہو کے بجائے جوش اور جنون حرارت بن کر گردش کرتے ہیں۔

بقول پروفیسر محمد مصطفیٰ علی سروری:

> ''اردو زبان و ادب اور صحافت کے حوالے سے میرا ماننا ہے کہ اردو زبان دراصل دیوانوں کے شانوں پر چل رہی ہے''۔ [بحوالہ: پیش لفظ: 'اردو کے چھوٹے اخبارات کے مسائل و امکانات، از اعجاز علی قریشی، ص:5]

مولانا ظفر علی خان کے روزنامہ ''زمیندار'' کے حوالے سے یہ بات متعدد تاریخ نویسوں نے رقم کی ہے کہ جو لوگ پڑھ لکھ نہیں سکتے تھے، وہ اس اخبار کو ایک آنہ میں خرید لیتے اور مزید ایک آنہ جیب سے نکال کر اُس شخص کو ادا کرتے، جو انھیں یہ اخبار پڑھ کر سناتا۔ کیا آج کے دور میں ایسے کسی 'عاشقِ اخبار' کا تصور کیا جاسکتا ہے؟ چنانچہ آج نہ تو اردو زبان کے دیوانے کہیں نظر آتے ہیں اور نہ ہی اردو اخبارات کو خرید کر مفت بانٹنے والے۔ بلکہ اب تو اردو قارئین نے بھی اپنی ترجیحات کو بدل دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر میں اردو کے جتنے روزنامے، سہ روزہ اور ہفتہ وار

اخبارات، پندرہ روزہ، ماہنامے، دو ماہی، سہ ماہی، ششماہی، سالانہ مجلے، ہاؤس جرنلز اور پیشہ ورانہ رسائل وغیرہ شائع ہوتے ہیں، اُن کے خریداروں کی تعداد روز بروز کم ہوتی جارہی ہے۔ ہر جگہ مقامی لائبریریاں عموماً کم بجٹ کا بہانہ کر کے اردو رسائل واخبارات کی سالانہ خریداری سے انکار کردیتی ہیں۔ عوامی اور فلاحی ادارے چاہتے ہیں کہ ان کو اخبارات ورسائل اعزازی طور پر یعنی مفت مل جائیں۔ نئی نسل اردو جانتی نہیں۔ پھر اردو اخبارات ورسائل خریدے گا کون؟ یہاں سے اردو صحافت کے اقتصادی مسائل کی شروعات ہوتی ہیں۔ اردو صحافت میں تعدادِ اشاعت کا مسئلہ سب سے بڑا مسئلہ کل بھی تھا اور آج بھی ہے۔ اگرچہ اردو صحافت کے دورِ اوّل یعنی 1822 سے 1857 تک، اور دوسرے دور یعنی 1858 سے 1947 تک سرکولیشن کے مسئلے کو زیادہ اہمیت حاصل نہیں تھی، لیکن آج کسی بھی بڑے اخبار میں شعبۂ ادارت اور شعبۂ اشتہارات کے ساتھ ساتھ شعبۂ اشاعت کو بھی کلیدی اہمیت حاصل ہے۔ یہ بات طے ہے کہ اگر اشاعت میں توسیع ہوگی تو اخبار کی شہرت ومقبولیت میں بھی اضافہ ہوگا۔ اس کا براہِ راست نتیجہ یہ نکلے گا کہ اشتہارات کی تعداد اور ان سے ہونے والی آمدنی میں اضافہ ہونے کے سبب اخباری ادارے کی اقتصادی اور مالی حالت مستحکم ہوگی۔ غالباً اسی وجہ سے شعبۂ اشاعت کو اخبار کے پھیپھڑوں سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ آج کے دور میں صحافت کے ہر اہم شعبے کی طرح شعبۂ اشاعت کی کارکردگی کو بہتر بنانے اور اشاعت بڑھانے کے طریقوں پر کافی تحقیقی وعملی کام ہوا ہے۔ اگرچہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ تعدادِ اشاعت کا انحصار ریڈرشپ پر ہوتا ہے، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اردو جیسی ملک گیر اور مقبول عام زبان میں شائع ہونے والے اخبارات ورسائل وکتب کی ریڈرشپ ملک کی کئی علاقائی زبانوں کے اخبارات وکتب کے مقابلے میں بہت کم ہے، حالانکہ اردو اخبارات وجرائد کی تعداد کم نہیں ہے۔ مثلاً: رجسٹرار آف نیوز پیپرس فار انڈیا (RNI) کی رپورٹ کے مطابق ہندوستان میں اردو اخبارات ورسائل کی تعداد 5400 ہے، جو ہندی اخبارات کے بعد دوسری بڑی تعداد ہے۔ اتنی بڑی تعداد میں اخبارات ورسائل دستیاب ہونے کے باوجود اردو قارئین کی تعداد کئی علاقائی زبانوں کے اخباری قارئین کی تعداد کے مقابلے میں کم ہے۔

اردو اخبارات وجرائد کی تعدادِ اشاعت کا دائرہ محدود ہونے اور سکڑ جانے کے اسباب

وعوامل کی نشاندہی کرنے بیٹھ جائیں تو یہ تلخ حقیقت سامنے آتی ہے کہ خود اہلِ اردو بھی بڑی حد تک اس کے لیے ذمہ دار ہیں۔ 'مشتے نمونہ از خروارے' کے مصداق یہاں پر صرف ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں۔ دہلی میں اردو صحافت کی صورت حال معلوم کرنے کے لیے کچھ عرصہ قبل جواہرلال نہرو یونیورسٹی کے ایک ریسرچ اسکالر نے دہلی کے 50 افراد سے اخبارات کی خریداری سے متعلق سوالات کرکے یہ جاننے کی کوشش کی کہ ان کے گھروں میں اردو کا کون سا روزنامہ خریدا جاتا ہے؟ ان منتخبہ افراد کی فہرست میں اردو کے نمائندہ شاعروں، ادیبوں اور اساتذہ کے علاوہ سیاست داں، آئی اے ایس و آئی پی ایس آفیسرس، ڈاکٹرس اور انجینئرس کو بھی شامل کیا گیا تھا، تاکہ یہ پتہ چل سکے کہ اردو روزناموں کے ساتھ دہلی کے عام اردو خواں طبقے کا کیا رویہ ہے؟ اردو اخبارات کی خواندگی کا حال جاننے کی یہ کوشش اس غم انگیز نتیجے پر پہنچی کہ اردو اخبارات سے باشعور اردو قاری کا تعلق تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ متذکرہ بالا 50 منتخبہ افراد میں 10 بھی ایسے نہیں نکلے، جو پابندی کے ساتھ اردو اخبارات خریدتے ہوں۔ 6 صاحبان (جن میں ایک شاعرہ بھی شامل ہیں) اردو اخبار کے پابند قاری ہیں۔ 4 قارئین کا رشتہ اردو اخبارات سے اس حد تک وابستہ ہے کہ جب ان کی مرضی ہوئی کسی اسٹال سے اخبار خرید لائے (روزانہ نہیں) جبکہ باقی ماندہ 40 میں سے 31 افراد تو اردو اخبارات بالکل ہی نہیں خریدتے، کیونکہ (بقول ان کے) ایسا کرنا اُن کے ذوقِ سلیم کی تسکین کے لیے ناکافی یا نامناسب ہے۔ 50 میں سے 9 افراد ایسے بھی سامنے آئے، جو بعض اوقات اِدھر اُدھر سے (مفت میں) اردو اخبارات حاصل کرتے ہیں۔ یعنی ان کو اخبار بینی کی عادت تو ہے، لیکن وہ اردو اخبارات خرید کر پڑھنا اسراف تصور کرتے ہیں۔ یہ صورت حال ہندوستان کا دل کہلانے والی دلّی اور ملک کے دارالسلطنت کی ہے، جس سے ملک کے دیگر مقامات میں اردو ریڈرشپ کی صورت حال کا اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں۔ اس تحقیقی سروے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اردو اخبارات ورسائل ہی کو ترجیحاً زیرِ مطالعہ رکھنا، ان کو خرید کر پڑھنا اور پڑھنے کی عادت اپنے اندر پیدا کرنا، ایسا کچھ شاذ و نادر ہی اردو سماج کے اندر دیکھنے کو ملتا ہے۔ ہماری یعنی اردو والوں کی نئی نسل کا پورے ملک میں اردو اخبارات وجرائد کا مطالعہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ المیہ تو یہ ہے کہ اردو کی روزی روٹی سے پلنے والوں کی اولادیں بھی اس زبان سے نابلد ہیں،

چہ جائیکہ اردو اخبارات خرید کر پڑھ لیں۔ ایسے حالات میں اردو صحافت کو اقتصادی مشکلات کا سامنا کرنا ہی پڑے گا۔

محدود تعداد اشاعت کا ایک اور سبب خود اردو اخبارات و رسائل کے اندر پائی جانے والی خامیوں سے تعلق رکھتا ہے۔ انگریزی اور ہندی اخبارات کے مقابلے میں صفحات کی کم تعداد، خبروں کے صحیح انتخاب، انداز پیشکش اور فراہمی میں تساہل، خبروں کے علاوہ دیگر قسم کے معلوماتی مواد کی خاطر خواہ فراہمی کا فقدان اور اخبارات کی ہر جگہ ہر وقت دستیابی میں کوتاہی وغیرہ وہ چند مسائل ہیں، جو اخبارات کے خود پیدا کردہ ہیں۔ کوئی زمانہ تھا، جب اردو صحافت کو مقدس مشن سمجھا جاتا تھا۔ آج یہ مشن سے بڑھ کر کاروبار ہے۔ آج صحافت ایک ایسے پیشے کی حیثیت اختیار کر چکی ہے، جو ہمہ گیر اور ہمہ پہلو علوم و فنون کا احاطہ کرتے ہوئے جامعیت کے ساتھ قارئین کو صرف اطلاعات و معلومات ہی فراہم نہیں کرتی، بلکہ سماج کے ہر فرد کے ساتھ اپنی وابستگی جتاتے ہوئے ہر فرد کے جمالیاتی ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کرتی ہے۔ قارئین کی خوشی، رضامندی اور مسلسل سرپرستی اور سہارے کے بغیر اخبارات فروغ و اشاعت اور ترقی کی شاہراہ پر نہیں چل سکتے۔ اردو صحافت کے عظیم معمار مولانا محمد علی جوہر نے کہا تھا کہ وہ اپنے اخبار کو قاری کا ''رفیقِ سفر'' بنانا چاہتے ہیں۔ عصری اردو صحافت کے مزاج و معیار، انداز و اطوار اور رنگ و آہنگ کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا مشکل ہے کہ آج کے اردو اخبارات اپنے قارئین کے رفیقِ سفر ہیں۔ آج اس شعبے میں وہ لوگ بھی قدم رکھ چکے ہیں، جو اردو صحافت کی تاریخ کے نشیب و فراز سے واقفیت نہیں رکھتے اور وہ لوگ بھی اس سے وابستہ ہو گئے ہیں، جن کو اردو صحافت کے آداب و اقدار سے زیادہ اپنے ذاتی مفادات عزیز ہیں۔ پیشہ ورانہ مہارت کی بات کریں، تو اخبار کو سماج کے ہر فرد اور ہر خاندان کے لیے دلچسپی کا مرکز و محور بنانا ایک فن ہے۔ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے اخبارات اس مقصد کے لیے مختلف شعبہ ہائے حیات مثلاً تجارت، زراعت، صنعت و حرفت، ماحولیات، علم و ادب، مذہب، سیاست، موسیقی، کھیل کود، معماری، طرزِ زندگی، پکوان، کشیدہ کاری، فوٹوگرافی، سائنس و ٹیکنالوجی، تلاش روزگار، طب و صحت تعارف و تبصرۂ کتب وغیرہ سے متعلق روزانہ بنیادوں پر خاص صفحے یا خاص ایڈیشن شائع کرتے ہیں۔ ساتھ ہی موسم کا حال، وفیات، بازار کے بھاؤ، مقامی

ریڈیو و ٹیلی ویژن کے خاص پروگرام، ریل اور ہوائی جہازوں کے اوقات، شرح زرمبادلہ، اسٹاک ایکسچینج کی صورتحال، اہم کمپنیوں کے شیئرز کا احوال، ادبی وثقافتی اداروں کی تقریبات کی خبر، بچوں کا صفحہ، نسوانی صفحہ، تفریحی مواد وغیرہ جیسے عمومی دلچسپی کے مشمولات بھی شائع کیے جاتے ہیں۔ آپ کو کتنے اردو اخبارات اس معیار پر پورے اترتے نظر آتے ہیں؟ افسوس کہ چند ہی اردو اخبارات اس طرح کا اہتمام کرتے ہیں، ورنہ عام اخبارات تو یوں ہی اپنے صفحات کو اِدھر اُدھر کے مواد سے بھر دیتے ہیں، جس سے قارئین کی تعداد میں اضافے کی امید نہیں کی جاسکتی۔

تعداد اشاعت کی قلت کے ساتھ ہی دوسرا بڑا مسئلہ کمرشل اشتہارات کی کمیابی کا ہے۔ اشتہارات کو کسی بھی قسم کی میڈیا سرگرمی میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے۔ ان کے بغیر اخبارات کا تصور ہی ناممکن ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کسی بھی اخبار کے لیے اشتہارات سے حاصل شدہ آمدنی کل آمدنی کا دو تہائی حصہ ہوتی ہے، جو آمدنی کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ دوسری طرف اشتہاری شعبہ باصلاحیت افراد کی قدر افزائی میں اب ذرائع ابلاغ کے دیگر اداروں پر سبقت لیتا نظر آتا ہے۔ یہاں باصلاحیت مسوّدہ نگاروں، تصور گروں اور تزئین کاروں کو جیسے مشاہرے ملتے ہیں، ویسے مشاہرے ریڈیو، اخبارات اور ٹیلی ویژن کے کارکنوں کو بھی نہیں ملتے۔ اشتہارات نے ہماری عصری زندگی کو نئے انقلابات سے دوچار کر دیا ہے۔ اشتہار بازی بنیادی طور پر ابلاغ ہی کا عمل ہے۔ اس کے ذریعے اطلاع بھی دی جاتی ہے، تربیت بھی کی جاتی ہے، تفریح بھی فراہم ہوتی ہے اور رائے سازی بھی کی جاتی ہے۔ یہی ابلاغ کے بنیادی وظائف ہیں۔ خبر اور اشتہار کے پیغام میں نمایاں فرق معروضیت اور موضوعیت اور مقصد کا ہے۔ اشتہار بازی محض ابلاغ برائے ابلاغ نہیں، بلکہ یہ کاروباری منفعت کے لیے ابلاغ کا عمل ہے۔ ہر ملک میں کمرشل اشتہارات عام لوگوں کی نجی زندگیوں اور عام شعبہ ہائے حیات کو اپنے گہرے اثرات کی لپیٹ میں لیتے ہیں۔ اشتہارات جہاں ہر ملک کے اقتصادی ڈھانچے کا اہم حصہ ہوتے ہیں، وہاں یہ کسی بھی میڈیا ادارے کے لیے اقتصادی ڈھانچے کا مرکز ومحور ہوتے ہیں۔ اردو اخبارات کے لیے کمرشل اشتہارات کی فراہمی کا مسئلہ ہر دور میں ایک اہم مسئلہ بنا رہا ہے۔ ریاستی سرکاروں کے علاوہ مرکزی سرکار کی وزارت اطلاعات ونشریات کے زیر اہتمام برسرِ عمل DAVP کی جانب سے اگرچہ اردو

کے بڑے اخبارات کو کم وبیش اشتہارات ملتے رہتے ہیں، لیکن انگریزی اور ہندی اخبارات کے طرز پر وہ ملک کے کارپوریٹ سیکٹر کی جانب سے اشتہارات سے محروم ہیں۔ یہاں بات پھر آتی ہے تعداد اشاعت کی۔ ملک بھر کے اخبارات و رسائل میں اشتہارات دینے والی ملٹی نیشنل کمپنیاں اور مشہور تجارتی ادارے اخبارات کو براہِ راست اشتہارات بھیجنے کے بجائے معروف و معتبر ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں کے ذمے یہ کام سونپ دیتے ہیں۔ ان ایجنسیوں کے پاس اخبارات کی سرکولیشن جانچنے کے اپنے پیمانے اور معیار ہیں، جن پر بدقسمتی سے اردو اخبارات پورے نہیں اُترتے، الا ماشاء اللہ۔ یہی وجہ ہے کہ دہلی، حیدرآباد، پٹنہ، ممبئی، بنگلور، بھوپال، سرینگر اور دیگر شہروں سے شائع ہونے والے اردو کے بڑے اخبارات کو مشکل ہی سے ایسے اشتہارات کے حصول میں کامیابی ملتی ہے۔ یہ تو بڑے اور کثیر الاشاعت اخبارات کا حال ہے۔ اردو کے چھوٹے اخبارات کا حال تو دگرگوں ہے۔ ان کو معمولی تعداد میں ملنے والے سرکاری اشتہارات پر ہی اکتفا کرنا پڑتا ہے۔

اردو صحافت کا ایک دوسرا پہلو قدرے خوش کن ہے۔ وہ یہ ہے کہ سرکولیشن اور اشتہارات کے مسائل سے قطع نظر اردو صحافت پورے ملک میں وسعت پذیر ہے، ہر چند کہ اس کی شاندار روایات سے بہت سے معاصر صحافیوں کے ذریعے انحراف اور بہت سارے کارکن صحافیوں کے ہاتھوں اخلاقی اقدار کی پامالی پر کچھ مخلص ناقدین بجا طور پر معترض ہیں۔ یہ سب کچھ اپنی جگہ، اہم بات یہ ہے کہ دہلی، ممبئی، کولکاتہ، حیدرآباد، پٹنہ، بنگلور اور ملک کے دوسرے بڑے شہروں سے نئے نئے اخبارات منظرِ عام پر آرہے ہیں، جو صحافتی معیار اور جدید ترین تکنالوجی کا آئینہ دار ہیں۔ ای ٹی وی اردو چینل، دوردرشن پر 24 گھنٹے تک چلنے والا نیوز چینل ڈی ڈی اردو، سہارا گروپ کا عالمی سہارا، زی سلام، بیس ٹی وی اردو اور اخبار منصف کا منصف ٹی وی وغیرہ اردو کی توسیع میں نمایاں کردار ادا کررہے ہیں۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ٹیلی ویژن اور دیگر الیکٹرانک میڈیا کی طرف سے سخت مقابلے کے باوجود پرنٹ میڈیا نے اطلاعات کے شعبے پر اپنی گرفت مضبوط کرلی ہے اور اردو صحافت اس سے مستثنیٰ نہیں۔ اردو صحافت کے عصری منظرنامے پر معروف صحافی سہیل انجم کا یہ اظہار خیال اہمیت کا حامل ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''زبان و بیان اور معیار کے لحاظ سے اپنی زوال پذیری کے دور سے گزرنے کے باوجود آج بھی اردو صحافت کی اہمیت اور حیثیت مسلّم ہے۔ اگرچہ روزناموں میں اب ''قومی آواز'' جیسا اور ہفت روزہ اخباروں میں ''بلٹز'' جیسا کوئی اخبار نہیں رہ گیا اور صحافیوں میں حیات اللہ انصاری اور مولانا محمد عثمان فارقلیط جیسے جید صحافی نہیں رہ گئے، تاہم اس شعبے میں کارپوریٹ اداروں کی آمد، بعض روزناموں کی ملک گیر رسائی اور کچھ حقیقی اخباروں کی منظرِ عام پر موجودگی نے اردو صحافت میں نئے ابعاد جوڑے ہیں۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق (اگرچہ وہ مبالغہ آمیز ہیں) ہندوستان میں اردو صحافت تیسرے نمبر پر ہے۔ سرکولیشن کو اگر ہم نظر انداز کردیں تو اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو اخباروں کی تعداد حالیہ برسوں میں سیلاب کے پانی کی مانند بڑھی ہے، لیکن جس طرح سیلاب کا پانی اپنے ساتھ وبائی امراض کا تحفہ لے کر آتا ہے، اسی طرح کثرتِ اخبار بھی بہت سی صحافتی خرابیاں اور برائیاں وبائی شکل میں اپنے ساتھ لے کر آئی ہے۔ اب تو یہ بحث ہی بیکار ہے کہ اردو صحافت جو پہلے مشن تھی، اب کاروبار کیوں بن گئی ہے۔ وقت اور حالات کے تقاضے کے تحت اسے کاروبار بننا پڑا، ورنہ اس کی بقا کے لالے پڑ جاتے لیکن کاروبار کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں، کچھ آداب ہوتے ہیں۔ اگر ہم ان اصولوں اور آداب کو بالائے طاق رکھ دیں تو خواہ ہم کتنے بڑے اور کامیاب کاروباری کیوں نہ بن جائیں، اخلاقی محاذ پر ناکام ہی رہیں گے۔ آج یہ سوال بھی بے معنی ہوکر رہ گیا ہے کہ اردو اخبارات فکر کی سطح پر کتنے صحت مند ہیں، کیونکہ صحافت میں دولت کی فراوانی نے جس فکری زوال کو جنم دیا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس فکری زوال کے ذمہ دار ہم بھی ہیں اور حکومتیں بھی ہیں۔ اگر حکومتوں نے سرکاری امداد (بشکل اشتہار) کے لیے

اپنے ضابطوں کو اس قدر نرم نہ کیا ہوتا اور سیاسی مصلحت کوشیوں کے پیش
نظر ہرا یرے غیرے اخبار کی جھولی اشتہاروں سے بھرنی شروع نہ کی ہوتی
تو آج یہ فکری زوال نہ آیا ہوتا۔''

[مضمون: 'اردو صحافت'، روزنامہ 'کشمیر عظمیٰ' سرینگر]

مجموعی طور پر یہی کہا جاسکتا ہے کہ اردو اخبارات کو اپنی اقتصادی حالت کو بہتر کرنے کے لیے حلقۂ اشاعت کی توسیع و استحکام اور اس بنیاد پر زیادہ سے زیادہ اشتہارات کے حصول پر خاص توجہ دینی چاہیے۔

# جموں وکشمیر میں اردو صحافت اور روزگار

پروفیسر شہاب عنایت ملک

صحافت ایک فن ہے، جس کا تعلق معلومات سے ہے۔ صحافت کا مقصد عام اور خاص شہریوں کو روزمرہ کے سیاسی، سماجی، معاشی اور مذہبی نشیب وفراز کے بارے میں معلومات فراہم کرنا ہے۔ لیکن صحافت کا کام صرف معلومات فراہم کرنے تک ہی محدود نہیں بلکہ صحافت ضرورت کے مطابق عوام اور حکومت کو مشورے بھی دیتی ہے۔ خاص طور پر جمہوریت میں جہاں صحافت حکومت کے اچھے کاموں کی حمایت کرتی ہے وہیں اس کی اُن پالیسیوں کی نکتہ چینی بھی کرتی ہے جن سے ملک و قوم کو فائدہ پہنچنے کے بجائے نقصان پہنچنے کا خدشہ ہوتا ہے۔

چنانچہ جب ہم جموں وکشمیر میں اردو صحافت کا جائزہ لیتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ریاست جموں وکشمیر میں اردو صحافت کی ابتدا جموں سے ہوتی ہے۔ انیسویں صدی میں شائع ہونے والے بدیا بلاس سے قطع نظر اردو کا پہلا باضابطہ اخبار جموں سے ''رنبیر'' کے نام سے 1924 میں ملک راج صراف کی ادارت میں شائع ہوا۔ لیکن تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ریاست کے مشہور مورخ فکشن نگار، شاعر اور صحافی محمد دین فوق اس سے پہلے ہی ریاست سے اردو کا اخبار جاری کرنا

چاہتے تھے لیکن بار بار کی درخواست کے باوجود اُس وقت کی ڈوگرہ حکومت نے اُنھیں ریاست سے اخبار نکالنے کی اجازت نہیں دی۔ مجبوراً محمد دین فوق کو لاہور سے ''کشمیری میگزین'' کے نام سے اخبار جاری کرنا پڑا۔ اس کے علاوہ بھی انھوں نے ''پنجۂ فولاد'' اور کئی دیگر اخبارات جاری کیے۔ ''کشمیری میگزین'' میں علامہ اقبال کی بھی نگارشات شائع ہوتی تھیں۔ یہ بات دوہرانے کی ضرورت نہیں ہے کہ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں تحریکِ حریتِ کشمیر شروع ہونے کے بعد اس ریاست میں صحافت کو ایک جاندار تحریک ملی اور کئی نوجوان قلم کار فکر کی تازگی لیے ہوئے سامنے آنے لگے۔ اس دور کے آس پاس منظرِ عام پر آنے والے دیگر اخبارات میں ''کشمیر سنسار، مہلا پتریکا، قومی محاذ، جے جگت، کسان، کشمیر ایکسپریس، سرسالار، آواز جموں و کشمیر، ڈوگرا ویرا، امر جیت، صحت، اُستاد، صرافہ پتریکا، انکشاف، رتن، جاگری، ہموطن، صدائے ڈوگر، دیپک، ٹرانسپورٹ ڈرائیور گزٹ، کارواں، للکار، جواہر، وائس آف ملینز، آنند، امر سیوک، آوازِ خلق، بازگشت، جے کے پتریکا، ستارہ وائس، قومی سماچار، تحریک، مینارِ حق، لوک آواز، نصیحت، پونچھ وائس، سلامتی، ضمیرِ خلق، غلامی کو دور کرو، مظلوموں کی فریاد، سنہری شعاع، شیر جموں، یہ گلستاں ہمارا، پرستان ٹائمز، ہندو راج، رنبیر سماچار اور لیڈر'' وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ ان اخبارات میں سے بیشتر بند ہو چکے ہیں اور سوائے چند کے باقی بے قاعدگی شائع ہو رہے ہیں۔

آزادی کے بعد سے لے کر اب تک جو اخبارات ریاست جموں و کشمیر سے شائع ہو رہے ہیں ان میں سرینگر سے آفتاب، سرینگر ٹائمز، کشمیر عظمیٰ، چٹان، عقاب، بلند کشمیر، صبح کشمیر اور الصفا وغیرہ اہم ہیں۔ اسی طرح جموں میں رنبیر کے بعد جو اردو اخبارات جاری ہوئے اُن میں آزاد ہند، ریفارمر، آزاد، محاذ، کشمیر پوسٹ، وقت، منظر بہار ہند، فروغِ وطن، نوائے ڈگر، پیغامِ تانک، جلتا جموں، لوک آواز وغیرہ ساتویں دہائی تک شائع ہونے والے اہم اردو اخبار تھے۔ ان دنوں اُڑان، اذانِ سحر، تسکین، آسمان، روحِ وطن، دیہات ٹائمز وغیرہ شائع ہو رہے ہیں۔

اسی طرح تقریباً ایک صدی پر پھیلے ہوئے صحافت کے اس طویل سفر میں ریاست کے ہائر سیکنڈری اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور کئی ادبی تنظیموں کی جانب سے کئی سالنامے اور میگزین شائع ہوتے رہے۔ ان جرائد و رسائل کے ذریعے کئی نئے قلم کاروں کو اُبھرنے اور اپنی

شناخت بنانے کا موقع ملا۔ ایسے رسائل میں دھنک (راجوری)، چوگان (کشتواڑ)، شاہین (بھدرواہ)، سراج (ڈوڈہ)، رازور (راجوری)، نوائے فریدیہ (ڈوڈہ) لولاب (بانہال) صحرا اور پھول (راجوری) العطش (جموں)، نوید صبح (ڈوڈہ) اور روشنی کا سفر (ڈوڈہ) بازیافت (شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی) تسلسل (شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی) ترسیل (ڈی ڈی ایس کشمیر یونیورسٹی) تعمیر (انفارمیشن ڈپارٹمنٹ) وغیرہ تواتر سے شائع ہونے والے وہ رسائل وجرائد ہیں جنھوں نے ادبی صحافت کو مضبوط کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے اور اب بھی کر رہے ہیں۔ ریاستی کلچرل اکادمی سے شائع ہونے والا ماہنامہ ''اُردو شیرازہ'' اس وقت واحد اردو جریدہ ہے جو پوری ریاست کی علمی اور ادبی کاوشوں کی ترجمانی میں مصروف ہے اور اس کا شمار ملک کے نمائندہ اردو جرائد میں کیا جاسکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ان اخبارات میں ایڈیٹر، سب ایڈیٹر، نامہ نگار اور دفتری عملے کو روزگار ملتا ہے۔ لیکن شروع میں اکثر اخباروں میں ایک یا دو افراد ہی سارے کام کیا کرتے تھے۔ مالک، ایڈیٹر، کاتب یا کمپوزر کے فرائض عام طور پر ایک دو آدمی ہی انجام دیتے تھے۔ لیکن بیسویں صدی کے آخر تک آتے آتے صحافت ایک انڈسٹری میں تبدیل ہوگئی۔ چونکہ 1970 کے آس پاس سے انگریزی اور ہندی کے ساتھ ساتھ اردو اخبارات کی اہمیت بھی بڑھنے لگی، اس لیے اردو اخبارات میں روزگار کے مواقع بھی بڑھنے لگے۔ ایڈیٹر، سب ایڈیٹر، ترجمہ نگار، نامہ نگار، کمپوزر، ڈیزائنر وغیرہ کے علاوہ مضمون نگار اور کالم نگار وغیرہ کے لیے بھی اخباروں میں ملازمت کی گنجائش نکلنے لگی، لیکن یہاں مسئلہ یہ ہے کہ انگریزی اخباروں کے مقابلے اردو اخباروں کو سرکاری اداروں اور پرائیویٹ کمپنیوں کی طرف سے اشتہارات بہت کم ملتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اردو اخبارات میں کام کرنے والے ادارتی اور غیر ادارتی عملے کی تنخواہیں انگریزی اخباروں کے ملازمین کے مقابلے میں کم ہوتی ہیں۔ اس لیے اردو اخباروں میں صحافت کو پروفیشن کی طرح اپنانے والوں کی کمی بھی نظر آتی ہے۔ پھر بھی جو بڑے اخبارات ہیں مثلاً آفتاب، کشمیر عظمیٰ، تسکین، اُڑان، سرینگر ٹائمز وغیرہ وہ اپنے صحافیوں اور دیگر ملازمین کو معقول تنخواہ دینے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ اب یہ بات عام طور پر محسوس کی جانے لگی ہے کہ ریاست جموں وکشمیر کے اردو اخبارات کا مقابلہ

انگریزی اخباروں سے ہے۔ اس لیے اردو اخباروں کے مالکان بھی ایک طرف جہاں اخبار کے سیٹ اَپ اور گیٹ اَپ پر دھیان دے رہے ہیں وہیں تازہ ترین معلومات اور روزمرہ کی زندگی سے تعلق رکھنے والے مسائل پر مضمون، کالم اور تبصرہ وغیرہ لکھوانے پر بھی توجہ دے رہے ہیں لیکن ان سب کے لیے ضروری ہے کہ اخبار میں تربیت یافتہ کمپوزر اور ڈیزائنر بھی ہوں اور ایڈیٹر و سب ایڈیٹر بھی۔ اس لیے اب ان اخباروں میں صحافت، پرنٹنگ، ڈیزائننگ اور کمپوزنگ کا تجربہ رکھنے والوں کے لیے روزگار کی گنجائش بڑھتی جارہی ہے۔ لیکن یہاں ایک بات قابلِ ذکر ہے کہ ہندوستان کے دوسرے بڑے شہروں دہلی، ممبئی، حیدرآباد، کلکتہ وغیرہ کی طرح جموں وکشمیر میں تجربہ کار اور ماہر اخبار ڈیزائنر اور کمپوزر وغیرہ کی کمی ہے۔ اس لیے جموں وکشمیر کے اخباروں میں غیر ریاستی ماہرین کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں جنھیں اچھی خاصی تنخواہ بھی ملتی ہے۔ اسی طرح جموں وکشمیر کے اردو اخبارات میں قابل اور باصلاحیت صحافیوں کے لیے ملازمت کے دروازے بھی کھلے ہوئے ہیں۔ درحقیقت اس وقت جو اخبارات ریاست سے شائع ہو رہے ہیں ان میں تجربے کار اور ماہر صحافی تو ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔ اگر ان اخبارات میں نوجوان تربیت یافتہ اور باصلاحیت صحافی شامل ہو جائیں تو ان اخبارات کا معیار اور زیادہ بلند ہوسکتا ہے اور اس کے ساتھ ان اخبارات میں ملازمت اور روزگار کی گنجائشیں بھی نکل سکتی ہیں۔

ریاست کے نوجوان ذہین بھی ہیں اور باصلاحیت بھی اس لیے اُنھیں اپنے شوق اور مرضی کے مطابق صحافت کے الگ الگ شعبوں میں تربیت اور مہارت حاصل کرنے کی طرف توجہ دینی چاہیے کیونکہ صرف سرکاری ملازمتوں پر بھروسا کافی نہیں ہوگا۔ اگر اچھے اور معیاری مضامین اور کالم لکھنے کی مہارت حاصل کرلی جائے تو یہ بھی روزگار کا ایک ذریعہ ہوسکتا ہے لیکن اس کے لیے اخبار کے مالکان کو بھی معقول معاوضہ دینے کے لیے تیار رہنا ہوگا۔ اُنھیں یہ سمجھنا ہوگا کہ اگر آج کے مسائل کے بارے میں تعمیری مضامین یا کالم لکھوائے جائیں تو اس سے عام شہریوں کی تربیت بھی ہوگی اور اردو کے اخبارات انگریزی اخبارات کا مقابلہ بھی کر پائیں گے۔

اردو اخباروں میں انگریزی اور ہندی سے اردو میں ترجمہ کرنے والوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ خاص طور پر انگریزی اور ہندی کے اشتہاروں کا اردو میں ترجمہ کرنے والوں کی

ریاست میں کمی ہے۔ اس کے علاوہ خبر رساں ایجنسیوں پر بھیجی جانے والی خبروں کو بھی اردو میں ترجمہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر ترجمہ نگاری کے فن پر مہارت حاصل کر لی جائے تو روزگار کا مسئلہ بھی حل ہو سکتا ہے۔

جموں و کشمیر میں اردو اخبارات کو روزگار سے جوڑنے کے لیے ضروری ہے کہ ریاست میں صحافت کے الگ الگ شعبوں کی تربیت کے لیے انتظام کیا جائے۔ اس سلسلے میں کشمیر یونیورسٹی میں ماس میڈیا کا شعبہ اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ حال میں ہی شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی میں بھی صحافت کی تدریس کو شروع کیا گیا ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (NCPUL) اس سلسلے میں پوری ریاست میں کمپیوٹر سینٹر قائم کر کے اس ضرورت کو پورا کر رہی ہے۔ ان سینٹروں سے ہزاروں طلبہ و طالبات کمپوزنگ اور ڈیزائننگ، انٹرنیٹ کی تربیت حاصل کر رہے ہیں۔ انھیں اخبارات کے علاوہ ریڈیو اور ٹی وی میں بھی ملازمت اور روزگار حاصل کرنے میں مدد مل رہی ہے لیکن ریاست میں اگر اسی طرح کے کئی اور سرکاری و غیر سرکاری اداروں کو قائم کیا جائے تو رسائل و اخبارات میں نوجوانوں کو روزگار کے بہترین مواقع مہیا ہو سکتے ہیں۔

ریاست جموں و کشمیر اور لداخ میں آل انڈیا ریڈیو کی جانب سے اردو میں بھی پروگرام پیش کیے جا رہے ہیں اور ریاست کے شاعروں اور ادیبوں کو ریڈیو کے لیے پروگرام دینے کا موقع ملتا ہے جس کا انھیں معاوضہ بھی دیا جاتا ہے۔ اسی طرح ٹیلی ویژن میں علمی، ادبی اور سماجی موضوعات پر پروگرام پیش کیے جاتے ہیں اور ان میں شرکت کرنے والوں کو تنخواہ دی جاتی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے ڈرامے اور سیریل ڈرامے بھی نشر کیے جاتے ہیں اور ڈراما نگار، ہدایت کار، ٹیکنیشین کے علاوہ اداکاروں، گانے والوں اور موسیقاروں کو بھی اچھی خاصی رقم دی جاتی ہے۔ ریڈیو اور ٹی وی میں اچھی خبر پڑھنے والوں کی ریاست جموں و کشمیر میں کمی ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ہمارے یہاں جو افراد ٹی وی یا ریڈیو پر خبریں نشر کرتے ہیں نہ تو اُن کا تلفظ درست ہوتا ہے اور نہ خبریں پیش کرنے کا طریقہ۔ اس طرح اگر ملکی سطح پر قائم کیے گئے صحافتی اداروں سے کوچنگ حاصل کر لی جائے تو جموں و کشمیر میں اردو صحافت کا معیار بھی بلند ہو گا اور یہاں نوجوان صحافیوں اور نامہ نگاروں کو اچھی خاصی تنخواہ بھی ملے گی۔

بحیثیت مجموعی اگر دیکھا جائے تو ریاست جموں وکشمیر میں اردو صحافت، چاہے وہ پرنٹ میڈیا ہو یا برقی میڈیا لوگوں کو روزگار فراہم کرنے میں اہم کردار ادا کر رہی ہے اور اگر حکومت کی مہربانیاں بڑھ جائیں تو اخبار، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے اردو صحافت روزگار دینے والی ایک اہم انڈسٹری کا کردار ادا کرسکتی ہے۔

# اردو صحافت کی معاشیات

رضوان اللہ آروی

اردو صحافت کے سلسلے میں اگر یہ بات سچ ہے کہ اس کو ہر دور میں اقتصادی مشکلات کا سامنا رہا ہے تو دوسری طرف یہ بات بھی سچ ہے کہ آج اس میں کمی آئی ہے۔ دور حاضر، معاشی ترقی کا دور ہے جس کا اثر، زندگی کے تمام شعبوں کی طرح، اردو صحافت پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ کل جو اردو اخبارات ایک یا دو کمرے کے دفتر میں سکڑے سمٹے ہوئے تھے اور وہاں کے کارکن صحافی نیم تاریکی میں کام کرنے پر مجبور تھے، آج ان کے دفاتر بہترین فلیٹوں میں منتقل ہو چکے ہیں جو کمپیوٹر، ٹیلی پرنٹر اور انٹرنیٹ جیسے جدید آلات و وسائل سے مزین بھی ہیں اور بہترین کاغذ پر ان کی آفسیٹ طباعت بھی ہونے لگی ہے۔ یہ منظر نامہ اس بات کا مظہر ہے کہ اردو صحافت نے بہت حد تک مالی بحران پر قابو پا لیا ہے اور اب وہ، پہلے کی نسبت، اقتصادی طور پر آسودہ ہے۔ لیکن یہاں پر ایک سوالیہ نشان بھی ہے کہ ایسے کتنے اردو اخبارات ہیں جن پر اس آسودگی کا اطلاق ہوتا ہے۔ تجارتی گھرانوں سے وابستہ اردو کے چند معروف اخبارات کو الگ کر دیا جائے تو اقتصادی لحاظ سے آسودہ اردو اخبارات کی تعداد، دو چار سے زیادہ نہیں ہوگی۔ تصویر کے اس رخ سے قطع نظر، یہ تلخ

حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ بیشتر اردو اخبارات آج بھی اقتصادی بحران کا شکار ہیں اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انھیں نہ تو قاری میسّر ہیں اور نہ کمرشیل اشتہارات۔ یہ دونوں سے محروم ہیں۔ اعداد وشمار کے مطابق، پٹنہ سے روزانہ پچاس سے زیادہ اردو اخبارات شائع ہوتے ہیں۔ اگر یہ اعداد وشمار صحیح ہیں تو یہاں پر دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ پہلا سوال یہ کہ اردو صحافت کے نام پر ایسے اخبارات، جن کی صورت تک ہمیں نظر نہیں آتی، ان کی اشاعت کا کیا جواز ہے؟ اور دوسرا سوال یہ کہ ان اخبارات کو جن مشکلات کا سامنا ہے، کیا وہ اردو صحافت کے اقتصادی مسائل ہیں؟ یا پھر یہ ایک فرد کا اپنا ذاتی تجارتی اور کاروباری مسئلہ ہے جسے ان لوگوں نے، اردو صحافت کے اقتصادی مسئلے کا نام دے رکھا ہے۔ ان اخبارات کے بیشتر غیر صحافی مالکان اور مدیران بھی اس کے جواز کو ثابت نہیں کر سکتے۔ لیکن اگر ایسے اخبارات کو بند کرنے یا پھر انھیں اشتہارات سے محروم کرنے کا فیصلہ صادر کر دیا گیا تو Survival of the fittest کا مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔ یعنی جو fit ہوگا وہی survive کرے گا۔ لہٰذا، جو چل رہا ہے، چلنے دیجیے کہ جینے کھانے کا سب کو حق ہے لیکن، فائل کی زینت بننے والے ان اخبارات کے اقتصادی مسائل کو، اردو صحافت کے اقتصادی مسئلے کا نام دینا کسی طور پر مناسب نہیں ہے۔

اردو صحافت کے اقتصادی مسائل کے تناظر میں عام طور پر یہ شکایت اکثر سننے کو ملتی ہے کہ اردو اخبارات کو اشتہارات نہیں ملتے اور اس سلسلے میں جانبدارانہ اور متعصبانہ رویہ اپنایا جاتا ہے۔ اس شکایت کی درستگی یا نادرستگی کی بحث سے قطع نظر، اس سے یہ بات تو واضح ہو ہی گئی کہ آج کی تجارتی اردو صحافت کی اوّلین ترجیح، اشتہارات کا حصول ہے۔ قارئین کی تعداد اور اخبار کا سرکولیشن بڑھانا، ان کی ترجیحات میں کہیں شامل ہے ہی نہیں، جبکہ یہ حقیقت ہے کہ کسی بھی زبان کے اخبار و رسائل کی مالی مشکلات پر قابو پانے اور انہیں خود کفیل بنانے میں اس کے قارئین کی کثرت تعداد کا بڑا اہم رول ہوا کرتا ہے۔ اردو سے قطع نظر، ملک کی دیگر زبانوں، مثلاً بنگلہ وغیرہ کے اخبارات و رسائل کو دیکھا جائے تو اس کی صداقت کا اندازہ ہوگا۔ خود کفالت کے اس تیر بہدف نسخہ کو اپنا کر دیگر زبانوں کے اخبارات و رسائل، سرکاری اور تجارتی اشتہارات پر اپنا انحصار بہت حد تک کم کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جبکہ اردو اخبارات کا المیہ یہ ہے کہ یہ نئے

قارئین تو کیا پیدا کرتے، یہ تو اپنے روایتی قارئین تک پہنچنے میں بھی کامیاب نہیں ہوتے۔ یہ وہ قارئین ہیں جو ریاستی راجدھانیوں سے دور، مختلف اضلاع کے چھوٹے چھوٹے شہروں کے باشندے ہیں اور ان کا تعلق اس طبقۂ اعلیٰ سے بھی نہیں ہے جو اردو اخبار خرید نا یا پڑھنا کسرِ شان سمجھتا ہے۔ ان قارئین کی شکایتیں اکثر اردو اخبارات میں مراسلے کی شکل میں دیکھنے کو ملتی ہیں کہ انھیں پابندی سے اردو اخبار نہیں ملتا جبکہ وہ اردو اخبار کے مستقل قاری ہیں اور خرید کر پڑھتے ہیں۔ اس سے واضح ہوا کہ ایسے اردو اخبارات کے پاس ذرائع کی بے حد کمی ہے جن کا تعلق کارپوریٹ ہاؤسز سے نہیں ہے۔ یہ صورتحال اردو صحافت کے وسائل کے فقدان کی عکاس تو ہے ہی، لیکن اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ ہندی اخباروں کی طرح، اردو اخباروں کو دور دراز کے گاؤں تک پہنچانے کے لیے، جس عزم، سرمائے اور افرادی قوت کی ضرورت ہے اس کا ہمارے یہاں نام ونشان بھی نہیں۔ حالانکہ مانگ اور فراہمی کے قدیم تجارتی اصول کو سامنے رکھ کر، ہمیں اس سچائی کو تسلیم کرنا ہوگا کہ اردو کا قاری صرف دہلی یا پٹنہ تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا سلسلہ شہری حدود سے بہت آگے، قصباتی حدود تک پھیلا ہوا ہے۔ لیکن وہاں تک پہنچنے کے لیے اور اردو اخبار کو وہاں پہنچانے کے لیے ہمیں اس طریقے کو اختیار کرنا ہوگا جو آج ہندی اخباروں نے اختیار کیا ہے اور جو دراصل، اردو اخبارات کی اقتصادی مشکلات کے حل کی بھی کلید ہے۔ میں عام ہندی صحافت کی بات نہیں کر رہا ہوں، البتہ چند ایک ایسے ہندی اخبارات، جن کی پشت پر مضبوط اور مستحکم تجارتی گھرانوں کا ہاتھ ہے، انھوں نے دور دراز کے قارئین تک پہنچنے کے لیے بہترین منصوبہ بندی کی ہے۔ انھوں نے ہر ضلع کے صدر دفاتر اور مختلف چھوٹے چھوٹے شہروں میں بھی، ہر قسم کے جدید وسائل سے آراستہ اپنے دفاتر قائم کر رکھے ہیں اور ملازمت کے ضابطوں کے ساتھ، اچھی شرح تنخواہ پر ایسے صحافیوں اور دیگر ملازمین کی تقرری کی ہے، جو قارئین کے مطالبات کے ساتھ، اخبار کی تجارتی ضرورتوں کو بھی پورا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مختلف شہروں میں واقع ان دفاتر میں وہاں کے مقامی صفحات وہیں ترتیب دیئے جاتے ہیں، وہاں کی مقامی خبریں وہیں اکٹھا کی جاتی ہیں اور وہاں کے اشتہارات بھی وہیں سے حاصل کیے جاتے ہیں اور ان اخباروں کو انھی شہروں سے منسوب ایڈیشن قرار دے کر شائع بھی کیا جاتا ہے۔ اس سے ضلعی صدر دفاتر سمیت دور دراز شہروں

کے قارئین کو وہاں کی مقامی خبریں آسانی سے دستیاب ہو جاتی ہیں جس میں ان کی دلچسپی بھی ہے اور ضرورت بھی ہے ۔ بہار ہی کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس نہج پر یہاں کے کئی ہندی اخبارات کے مختلف ایڈیشن، مثلاً گیا، بھاگلپور، آرہ، بکسر اور مظفر پور وغیرہ سے بیک وقت شائع ہو کر منظر عام پر آ رہے ہیں۔ مارکیٹنگ کا یہ کامیاب طریقہ، سرمایہ کاری کے بغیر ممکن نہیں اور بیشتر اردو اخبارات، جب سرمائے ہی سے محروم ہیں تو پھر وہ سرمایہ کہاں سے لگائیں گے۔ البتہ چند ایک ایسے اردو اخبارات، جن کا تعلق تجارتی گھرانوں سے ہے، وہ یہ کر سکتے ہیں تاہم جب ان اخبارات کے ہندی ایڈیشن سے ان کی ضرورتوں کی تکمیل ہو جاتی ہے تو پھر ان کو اردو صحافت میں مزید سرمایہ کاری کی کیا ضرورت ہے۔ اس طریقۂ کار کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ خالص تجارتی مشن کے ساتھ بہترین منصوبہ بندی اور کامیاب مارکیٹنگ ہو تو اردو صحافت تو کیا، کسی بھی زبان کی صحافت کا اقتصادی مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ اور جب ہم تجارتی مشن کی بات کرتے ہیں تو اس سے مراد سرکاری اور تجارتی اشتہارات کا حصول ہی ہوتا ہے جو ظاہر ہے اردو صحافت کا بھی بنیادی مقصد ہے اور جس پر بہت حد تک اس کے وجود اور بقا کا انحصار بھی ہے ۔ اس کے لیے لازماً ہمیں اشتہاری ایجنسیوں کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرنا ہوگا۔ لیکن سوال وہی ہے کہ اشتہاری ایجنسیاں اردو صحافت کی طرف متوجہ کیوں اور کیسے ہوں گی، جب انھیں پتہ ہے کہ دو چار کو چھوڑ کر تقریباً تمام اردو اخبارات فائل کی زینت بن کر رہ جاتے ہیں۔ ایجنسیاں اشتہار جاری کرتے وقت اگر یہ دیکھتی ہیں کہ آپ کی سرکولیشن کہاں تک ہے تو اس میں غلط کیا ہے؟ اگر آپ کے مقابلے میں کسی دوسری زبان کا کوئی اخبار بیک وقت کئی ایڈیشن چھاپ رہا ہے اور اسی کے ساتھ وہ آن لائن بھی ہے تو اس کو آپ کے مقابلے میں ترجیح تو ملے گی ہی اور ملنا بھی چاہیے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ First deserve then desire تو اس اصول کا اطلاق اردو صحافت پر کیوں نہیں ہو سکتا؟ مطالبہ کرنے اور کچھ پانے سے پہلے ہمیں اردو صحافت کو مطلوب بلندی تک لے جانا ہوگا، ہمعصر ہندی صحافت سے مقابلہ کرنا ہوگا اور اشتہاری ایجنسیوں کو یہ باور کرانا ہوگا کہ ان کے اشتہارات فائل کی زینت نہیں بنیں گے بلکہ اردو داں آبادی کی آخری صف میں کھڑے ہوئے آخری آدمی تک پہنچیں گے۔ لیکن یہ سب اسی وقت ممکن ہے جب اردو صحافت کو بہترین افرادی قوت کے ساتھ سرمایہ کار

بھی میسّر ہوں۔ جبکہ یہاں حال یہ ہے کہ اردو اخبارات میں نہ تو ملازمت کا کوئی ضابطہ مقرر ہے، نہ کارکن صحافیوں کی تعلیم و تربیت کا کوئی پیمانہ متعیّن ہے، نہ باعزّت شرح تنخواہ ہے اور نہ ہی ملازمت کے تحفظ کی کوئی ضمانت۔ ایسی صورتحال میں اچھے صحافیوں اور تجربے کار ملازمین کا تصور بھی محال ہے۔ اور آج کی تاریخ میں جب ہم تجربے کار ملازمین کی بات کرتے ہیں تو اس سے مراد صرف روایتی تجربہ نہیں ہوتا بلکہ نئے زمانے کا وہ تجربہ ہوتا ہے جو، آج کی جدید ہائی ٹیک نسل کو مطمئن کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

اردو صحافت کی اقتصادی مشکلات کا ایک بڑا سبب اس کا ہائی ٹیک نہ ہونا بھی ہے۔ اردو کے چند ایک کارپوریٹ ہاؤسز سے قطع نظر تو آج کتنے اردو اخبارات آن لائن ہیں؟ جبکہ اسی صوبہ بہار کے چھوٹے چھوٹے شہروں سے منسوب، مختلف ہندی اخبارات کے ایڈیشن آن لائن ہو چکے ہیں اور اپنے ایسے قارئین کی ضرورتوں کی تکمیل کر رہے ہیں جو، ان شہروں میں گئے بغیر، وہاں کی خبریں پڑھنا چاہتے ہیں اور انھیں گھر بیٹھے یہ خبریں ان کے کمپیوٹر اسکرین پر دستیاب ہیں۔ اس تکنیک سے ان اخبارات کو بیک وقت دو فائدے ہو رہے ہیں۔ ایک تو یہ کہ نیٹ دوست طبقہ تیزی سے ان کے ساتھ جڑتا جا رہا ہے اور دوسرا فائدہ یہ کہ اب آن لائن اشتہارات کی ان کی دعویداری کو ایک مستحکم جواز بھی مل گیا ہے۔ اردو صحافت کی یہ نارسائی نہیں تو اور کیا ہے کہ ہم اب تک زمین کی سطح پر بھی اشتہارات حاصل کرنے میں پورے طور پر کامیاب نہیں ہوئے ہیں جبکہ ہندی کو ہواؤں میں بھی اشتہار ملنے لگے ہیں۔

اردو صحافت سے وابستہ حضرات کو اس حقیقت سے آنکھیں نہیں چرانا چاہیے کہ موجودہ زمانے میں اردو اخبار یا کسی بھی زبان کے اخبار کا خریدار قاری سے زیادہ ایک صارف ہے اور آج کے صارف سماج میں مقبولیت کا انحصار صرف اس بات پر ہے کہ آپ کے پروڈکٹ کا معیار کیا ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ معیار اور مواد کے لحاظ سے اپنے اخبار کو اس بلندی تک لے جائیں کہ وہ قارئین کم صارفین کے لیے ناگزیر بن جائے، اتنا ناگزیر کہ اردو اخبار پڑھے بغیر نہ تو ان کی پیاس بجھے اور نہ ان کی ضرورتوں کی تکمیل ہو اور یہ سب اسی وقت ممکن ہے جب اردو اخبار تمام شعبہ ہائے زندگی کا احاطہ کرتا ہو اور اردو صحافت کو ایسے افراد میسّر ہوں جو زندگی کے مختلف

شعبوں پر تخصص کا درجہ رکھتے ہوں۔ ایک چھوٹی سی مثال سے اس بات کی صراحت مناسب ہوگی۔

میں آرہ کا باشندہ ہوں اور ویر کنور سنگھ یونیورسٹی کے ایک کالج سے وابستہ ہوں۔ یونیورسٹی میں روزانہ کیا کچھ ہو رہا ہے، ظاہر ہے، اس میں ہماری دلچسپی بھی ہے اور اس سے باخبر رہنا ہماری مجبوری بھی۔ افسوس ہے کہ اردو کا کوئی اخبار ہماری اس ضرورت کو پورا نہیں کرتا۔ خواہ وہ تجارتی گھرانے کا اخبار ہو یا غیر تجارتی گھرانے کا۔ البتہ ہندی کے ایک معروف روزنامہ کے آرہ ایڈیشن نے، اپنا تقریباً آدھا صفحہ، روزانہ صرف یونیورسٹی رکالج کی خبروں کے لیے مخصوص کر رکھا ہے۔ میرے جیسے ان تمام لوگوں کے لیے یہ اخبار ناگزیر ہے جن کا کسی نہ کسی حیثیت سے، اس یونیورسٹی سے تعلق ہے۔ ہندی اخبار کا یہ آرہ ایڈیشن آن لائن بھی ہے۔ چنانچہ جب کبھی ہم آرہ سے باہر ہوتے ہیں تو لازماً اس اخبار کو نیٹ پر دیکھتے ہیں تاکہ یونیورسٹی کی سرگرمیوں کی اطلاع ملتی رہے۔ یہ تو ہوا تصویر کا ایک رخ۔ تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ یہ اخبار، خود یونیورسٹی کے لیے بھی ناگزیر بن گیا ہے جو اسے اپنی خبریں اور اشتہارات فراہم کرنے کے لیے مجبور ہے، چونکہ وہاں کے ذمہ داران کو پتہ ہے کہ اس کے توسط سے ان کی اطلاعات کی ترسیل وہاں تک ہو رہی ہے جہاں تک وہ چاہتے ہیں۔ تو ایک طرف مانگنے سے بھی نہیں ملتا اور دوسری طرف بلا کر دیا جاتا ہے۔ پیشہ ورانہ اور غیر پیشہ ورانہ صحافت کا یہی فرق ہے جس نے اردو صحافت کے اقتصادی مسئلے کو اب تک حل طلب بنا رکھا ہے۔

اردو صحافت کو اس مسلسل آزمائش اور اقتصادی بحران سے باہر نکالنے کے لیے ہمیں طویل مدتی منصوبہ بنانا ہوگا اور اردو صحافت کو صحافتی کریئر کے بطور نہیں بلکہ بزنس کریئر کے طور پر اپنانا ہوگا۔ مادری زبان سے محبت اور اردو کے لیے قربانی جیسے کھوکھلے اور جذباتی نعروں سے نہ تو پہلے کبھی بھلا ہوا ہے اور نہ آئندہ کبھی بھلا ہونے والا ہے۔ اردو صحافت کی عظمت رفتہ کے قصے بہت ہو چکے۔ اب ہمیں فکر کا زاویہ اور سوچ کا انداز بدلنا ہوگا اور اردو صحافت کو ہمعصر صحافت کے اصل دھارے میں لانے سے زیادہ یہ سوچنا ہوگا کہ اردو صحافت کو ہمعصر تجارت وصنعت کے دھارے میں کیسے لایا جائے۔ اس کے لیے سب سے پہلے ان امور میں خودکفیل ہونے کی ضرورت ہے جو

اخبار کی طباعت و اشاعت سے لے کر اسے قارئین کے ہاتھوں تک پہنچانے کے لیے ضروری ہوتے ہیں اور اس باب میں اپنا پرنٹنگ پریس میل کے پتھر کی حیثیت رکھتا ہے، جس سے بیشتر اردو اخبارات محروم ہیں جبکہ اردو صحافت ہمارا کُل وقتی مشغلہ ہے۔ دوسری طرف تجارتی گھرانوں کو دیکھا جائے تو اردو صحافت ان کے تجارتی پیشے کا صرف ایک جزو ہے کُل نہیں لیکن اس کے باوجود انھوں نے اس کے لیے ضروری انفرااسٹرکچر کو ترقی دے کر اور کثیر المقاصد بنانے میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ہے۔ یہاں پر قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ یہ کامیابی اس وقت حاصل ہوئی ہے جب، بشمول اردو صحافت، انھوں نے اپنے کاروبار کو انفرادی ہاتھوں سے نکال کر اجتماعیت کا حصہ بنا دیا۔ ان کی اسی حکمت عملی کے سبب، ان کے وسیع تر کاروبار پر اب کسی فرد کی اجارہ داری اگر مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی تو بہت حد تک کم ضرور ہوئی ہے۔ جبکہ ہمارے یہاں اردو صحافت اب تک کسی نہ کسی فرد کے ہاتھوں کا کھلونا بنی ہوئی ہے اور بیچارے کارکن صحافی، ان سے زیادہ ذی علم اور باصلاحیت ہونے کے باوجود، ان کے اشاروں پر ناچنے پر مجبور ہیں۔ ان افراد کی دلچسپی صرف اس بات میں ہے کہ اخبار پر ان کی بالادستی اور اجارہ داری برقرار رہے۔ حالانکہ ان کی صبحوں کا اجالا، کس کس کے دیدۂ نمناک کا رہین منت ہے، انھیں اس کا احساس تک نہیں ہے۔

میرے خیال میں اب وقت آ گیا ہے کہ اردو صحافت کو انفرادی ہاتھوں سے نکال کر اجتماعیت کا حصہ بنایا جائے اور ایک ایسے گروپ کی تشکیل کی جائے جس میں صحافت کے ماہرین کے ساتھ تجارت وصنعت اور معاشیات کے ماہرین بھی شامل ہوں اور اس سلسلے میں سرمائے کا رونا رونے کے بجائے مختلف بینکوں سے اور حکومت کی مختلف اسکیموں سے فائدہ اٹھا کر اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کی کوشش کی جائے اور اس خالص تجارتی اور کثیر الجہت مشن میں اردو صحافت کو صرف ایک جہت یا Offshoot کی حیثیت دی جائے جیسا کہ آج کل کارپوریٹ ہاؤسز کی بزنس پالیسی میں دیکھنے میں آرہا ہے۔ تجارتی گھرانوں میں پرنٹنگ پریس کی مثال کو سامنے رکھ کر اس کی وضاحت کی جاسکتی ہے۔ ان گھرانوں میں پریس کی تنصیب یا (Installation) کا بنیادی مقصد نہ تو صحافت کا فروغ ہے اور نہ اردو اخبار کی اشاعت۔ بلکہ ان کے بیشتر پریس ایک بڑے پبلشنگ ہاؤس کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ یہاں سے ہندی یا اردو اخبار کی اشاعت تو ضمنی حیثیت

رکھتی ہے۔ بہار کے تناظر میں تو یہ بات زیادہ اہمیت کی حامل ہے کہ اب تک یہاں اردو کا کوئی بڑا پبلشنگ ہاؤس وجود میں نہیں آیا ہے۔ اسی طرح مختلف اضلاع کے قارئین تک اخبار کی ترسیل کے لیے اگر ہم گاڑیاں خریدتے ہیں تو ان کا بھی کثیر الجہت استعمال ممکن ہے اور مختلف تجارتی گھرانے اور کمپنیاں یہ کام ایسے منظم طور پر کر رہی ہیں کہ یہ الگ سے ایک منفعت بخش کاروبار بن گیا ہے۔

اردو صحافت کو اقتصادی بحران سے نکالنے کے راستے کھلے ہوئے ہیں۔ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ اردو صحافت سے وابستہ حضرات، یک جان اور یک قالب ہو کر، پریکٹیکل اور اسٹریٹجک ہوں، دور رس نتائج کی حامل حکمت عملی بنائیں اور فوری طور پر نتائج کی امید نہ رکھتے ہوئے ثبات و استقامت کے ساتھ اپنی پیش رفت جاری رکھیں اور یہ کام اپنی موجودہ مصروفیات اور سرگرمیوں کو جاری رکھتے ہوئے بھی کیا جا سکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ سارے کاموں کو تیاگ کر بس اسی کا ہو رہا جائے۔ نقش قدم پر ہم بہت چل چکے، نقش راہ کیسے بنیں، اب یہ سوچنے کی ضرورت ہے۔

دل میں یقین صبح کی لو جو ذرا بلند ہو  تو گرہ غم کی کشود کوئی مشکل نہیں

# اردو صحافت اور اشتہارات

مشتاق احمد نوری

اردو صحافت دو سو سال کا سفر مکمل کرنے جا رہی ہے۔ دورِ حاضر کی اردو صحافت پر اگر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی جائے اور سرکاری اعداد و شمار کو پیمانہ مان لیا جائے تو ایک خوش کن رپورٹ سامنے آتی ہے۔ RNI کے اعداد و شمار کے مطابق اردو پڑھنے والوں کی تعداد ساڑھے تین کروڑ تک پہنچ گئی ہے۔ بظاہر یہ اعداد و شمار خوش کن اور متحیر کر دینے والے، لیکن سچائی اس کے برعکس ہے۔

ہم اگر زمینی سطح پر اس سچائی کو پرکھیں تو مایوسی ہی ہاتھ آتی ہے۔ اگر ہم ریاست بہار سے نکلنے والے اردو روز نامہ کا جائزہ لیں تو سرکاری اعداد و شمار اس طرح سامنے آتے ہیں۔ روز نامہ راشٹریہ سہارا 61054، قومی تنظیم 70550، فاروقی تنظیم 72330، پندار 66249، سنگم 68125، انقلاب جدید 66466، دیش بدیش 66934، حالات بہار 61025، پیاری اردو 54400، گرم ہوا 66875، ہمارا سماج 55483، امین 26786۔ RNI کی یہ رپورٹ 01-01-2014 تک کی ہے۔ اعداد و شمار یہ بتا رہے ہیں کہ اردو اخبارات کی تعداد ضرورت سے زیادہ ہے اور ان کی اشاعت کافی ہے، لیکن زمینی سچائی یہ ہے کہ ان میں بہت سے اخبارات ایسے ہیں جن کی اشاعت 500 سے

زیادہ نہیں ہوتی ہے۔ صرف کچھ اخبار ہیں جن کی تعداد یقیناً اچھی ہے، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ یہ جتنی تعداد بتاتے ہیں، ان سے آدھی ہی اشاعت ہوتی ہوگی۔ اب سوچنا یہ ہے کہ آخر ان اعداد وشمار کا کیا مطلب ہے؟

دراصل بہت سے اخبارات صرف سرکاری اشتہار حاصل کرنے کے لیے نکلتے ہیں اور اپنی تعداد من مانے طور پر دکھاتے ہیں۔ سرکار نے جو طریقہ اپنایا ہے، اس میں چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ کی رپورٹ بڑی اہم ہوتی ہے۔ اسی رپورٹ کی بنیاد پر RNI ان کے اعداد وشمار کا حساب رکھتی ہے۔ زمینی سچائی جاننے کا ان کے پاس کوئی پیمانہ نہیں ہوتا اور سرکاری محکمہ میں بھی انھی غلط اعداد وشمار پر یقین کرلیا جاتا ہے۔

اتفاق سے میں محکمۂ اطلاعات وتعلقات عامہ میں مختلف عہدوں پر فائز رہ چکا ہوں۔ ایک بار پریس سیکشن کا بھی انچارج تھا۔ ایک اردو اخبار کو اشتہار کے لیے منظور کیا جانا تھا اور اس کی تعداد اشاعت ہزاروں میں دکھائی گئی تھی۔ میں نے جب اس میں کچھ جانکاری چاہی کہ اخبار کی اتنی تعداد کن کن ضلعوں میں کتنی جاتی ہے اور کتنے ہاکر کام کر رہے ہیں تو اس فائل کے نیچے جاتے ہی میری شکایت اوپر پہنچ گئی اور اس زمانے کے ڈائریکٹر نے مجھے ہدایت دی کہ اتنا پوچھ تاچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے، پھر بھی میں نے اس اخبار کے بارے میں منفی رپورٹ دی تو مجھے کافی کچھ سننے کو ملا۔ اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اشتہارات کے لیے اخبار نکالنے والے کسی بھی حد تک جاسکتے ہیں۔ کیونکہ یہ ایک ایسی تجارت ہے جس میں کم پونجی میں زیادہ منافع کمایا جاسکتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ 72000، 70000، 68000، 66000، 60000، 50000 تک شائع ہونے والے اخبارات بازار میں نظر کیوں نہیں آتے۔ ہزاروں کاپیوں کی ترسیل کہاں ہورہی ہے۔ مارکیٹ میں یہ اخبار اپنی اشاعت کے تناظر میں نظر کیوں نہیں آتے۔ راشٹریہ سہارا، قومی تنظیم، فاروقی تنظیم، پندار اور سنگم تو جابجا دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ اس میں انقلاب کا ذکر نہیں آیا۔ کیونکہ یہ بزنس گھرانے کا اخبار ہے۔ یہ اپنی تعداد اشاعت بڑھا کر نہیں دکھا سکتے کہ اتنی آمدنی بھی دکھانی ہوگی اور اس پر ٹیکس بھی دینا ہوگا۔ اسی لیے بہار میں انقلاب کا DAVP ریٹ ابھی تک

طے نہیں ہوا ہے۔ جبکہ یہ اخبار پٹنہ سے نکلنے والے کسی بھی اہم اخبار سے زیادہ شائع ہوتا ہے۔

سرکار کی اشتہارات کی پالیسی کی بنیاد ہی کمزور ہے اور عام اردو اخبار بغیر سرکاری اشتہار کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ اشتہار کے لیے ریٹ جتنا زیادہ ہوگا، آمدنی اتنی ہی اچھی ہوگی اور ریٹ بڑھانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اخبار کی تعداد اشاعت کو کافی بڑھا چڑھا کر دکھایا جائے۔ ''دیش بدیش''، ''گرم ہوا''، ''حالات بہار''، ایسے اخبارات ہیں جو 200 سے بھی کم شائع ہوتے ہیں لیکن ان کی تعداد 65-60 ہزار تک دکھائی گئی ہے۔ جب RNI اس تعداد کے ساتھ اس کی شرح کو مان لیتا ہے تو پھر اشتہار دینے والے محکمے کے سامنے اشاعت کی نقلی سچائی کوئی معنی نہیں رکھتی، وہ بھی اتنے ہی اشتہار حاصل کر لیتا ہے جتنے ان اخبارات کو ملتے ہیں جن کی اشاعت کی تعداد اچھی خاصی ہوتی ہے۔ اردو اخبارات میں صرف سرکاری اشتہارات شائع ہوتے ہیں، باقی مارکیٹ سے انھیں بہت کم اشتہار ملتے ہیں۔ ہاں کبھی کبھی الکشن کے زمانے میں کچھ سیاسی اشتہار مل جاتے ہیں جن سے اچھی خاصی کمائی ہو جاتی ہے۔ اردو اخبارات کی تعداد اشاعت کی یہ مضحکہ خیز کیفیت صرف بہار تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ دہلی کے علاوہ اور بھی صوبوں میں کم و بیش یہی صورت پائی جاتی ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ صرف یہ اردو اخبار کے ساتھ ہی نہیں ہے بلکہ ہندی کے علاوہ دوسری زبانوں کے اخبارات کی صورتِ حال اردو سے مختلف نہیں ہیں۔ ہر زبان میں کچھ اخبار پابندی سے ضرور شائع ہوتے ہیں اور انھیں پڑھنے والے قارئین بھی ملتے ہیں، لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جو صرف سرکاری اعداد و شمار پر زندہ رہتے ہیں۔

سچ پوچھیے تو بہار میں اردو صحافت بظاہر گھریلو صنعت میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ بہار میں تو اردو اخبارات کی تعداد 38 ہے، لیکن بڑی ریاست اتر پردیش میں DAVP کی ویب سائٹ پر 225 سے زائد اردو روزناموں کو اشتہاری چینل میں جگہ ملی ہوئی ہے۔ صرف لکھنؤ سے اردو کے 90 روزنامے شائع ہو رہے ہیں جنھیں اشتہاری چینل میں شامل کیا گیا ہے جنھیں وہاں کی سرکار اشتہار فراہم کرتی ہے۔ اگر صرف اخباروں کی تعداد پر نظر ڈالیں تو ریاست بہار میں اردو صحافت کے فروغ کا رجحان پایا جا رہا ہے، لیکن سچائی یہ ہے کہ بہار، دہلی یا یوپی میں اردو صحافت اطمینان بخش صورتِ حال پیش نہیں کر رہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جن اخبارات کا تعلق

کارپوریٹ گھرانوں سے ہوتا ہے، ان اخبارات کی چمک دمک دور سے ہی پہچان لی جاتی ہے۔

اردو اخبارات کے لیے کوئی دوسری صورت بھی نظر نہیں آتی۔ ان کے پاس لے دے کے سرکاری اشتہار ہی ہوتا ہے جس پر ان کا انحصار ہوتا ہے۔ جس مہینے میں اشتہار کی کمی ہو جاتی ہے تو اخبار میں کام کرنے والے صحافیوں پر بھی اس کا اثر ہوتا ہے۔ ہندی اور انگریزی اخباروں میں اشتہار کی بھرمار ہوتی ہے۔ ان کا انحصار صرف سرکاری اشتہار پر نہیں ہوتا بلکہ انھیں بازار سے اتنے اشتہار مل جاتے ہیں کہ وہ ہر معاملے میں خودکفیل ہو جاتے ہیں۔ اردو اخبار کے لیے ایسی کوئی صورت پیدا نہیں ہو رہی اس لیے یہ سرکاری اشتہار کے علاوہ کسی اور طرف دیکھ بھی نہیں سکتے دو سو سال کی صحافت میں کلکتہ سے نکلنے والے ''جام جہاں نما'' پہلے اردو اخبار سے لے کر آج کے ''انقلاب''، ''راشٹریہ سہارا''، ''قومی تنظیم'' اور ''پندار''، فاروقی تنظیم''، ''سنگم'' نکلنے والے اردو اخبار کو دیکھنے سے اس بات کا اندازہ نہیں ہوتا کہ واقعی اردو صحافت 200 سال کا سفر مکمل کرنے جا رہی ہے۔ اردو صحافت کا عصری منظرنامہ ابھی بھی گھٹنے گھٹنے چلتا نظر آ رہا ہے۔ منظرنامہ بالکل مایوس کن بھی نہیں ہے، لیکن پھر بھی تسلی بخش نظر نہیں آتا۔ اگر ایمانداری سے اردو صحافت نے اپنی اُڑان جاری رکھی تو یہ دوسری زبانوں کے مقابلے اپنا قد اونچا کرنے میں کامیاب ہو سکتی ہے۔

# اردو صحافت اور ایڈورٹائزنگ

عظمت جمیل صدیقی

اردو زبان و ادب کا ذکر آتے ہی ذہن میں لکھنؤ اور دہلی کی تصویر ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ آج بھی لکھنؤ والے خود کو اہل زبان قرار دیتے ہیں مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ 20 ویں صدی تک لکھنؤ اور دہلی نے بلاشبہ اردو کی پرورش کی مگر 21 ویں صدی آتے آتے سب سے پہلے دہلی نے اردو سے رشتہ توڑا اور پھر لکھنؤ والوں نے اردو کو چھوڑ کر ہندی کو اپنا لیا اب حالت یہ ہے کہ لکھنؤ والوں کے یہاں صرف اردو بولی رہ گئی اور اردو رسم الخط غائب ہو چکا ہے۔

دہلی اور لکھنؤ میں اردو کے زوال کے بعد 21 ویں صدی میں اردو دنیا کے نقشے پر جن نئے شہروں کا ظہور ہوا ان میں حیدرآباد، ممبئی اور کولکاتا سرفہرست ہیں اور ان تینوں شہروں میں ملک کے دیگر مقامات کے مقابلے زیادہ اچھی اردو بولی اور پڑھی جاتی ہے۔ ورنہ بہار کی حالت یہ ہے کہ اردو پر ہندی غالب ہے۔ بات زبان کی ہو تو صحافت کا ذکر لازمی ہے۔ اس لیے کہ کسی بھی زبان کو زندہ رکھنے میں اس زبان کی صحافت کا اہم رول ہوتا ہے۔ میرا یہ ماننا ہے کہ ممبئی، حیدرآباد اور کولکاتا سے شائع ہونے والے اخبارات زبان و بیان کے اعتبار سے دوسرے شہروں سے شائع

ہونے والے اخبارات سے بہتر ہوتے ہیں۔

مغربی بنگال کی آبادی 9 کروڑ 30 لاکھ کے قریب ہے۔ ان میں سے 30 فیصد آبادی مسلمانوں کی ہے۔ اس 30 فیصد والی آبادی میں 28 فیصد مسلمانوں کی مادری زبان بنگلہ ہے۔ ان میں سے کچھ لوگ جن کی تعلیم مدرسوں میں ہوئی ہے وہ اردو سے واقف ضرور ہیں مگر سچ تو یہ ہے کہ مغربی بنگال کی صرف 2 فیصد آبادی ہی اردو جانتی ہے اور یہ آبادی مغربی بنگال کے کولکاتا، شمالی و جنوبی 24 پرگنہ ہوڑہ، ہگلی اور بردوان میں آباد ہے۔ دیگر مقامات پر اردو بولنے والوں کی آبادی ہے مگر وہ بہت کم ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے آبا و اجداد دیگر ریاستوں سے آکر مغربی بنگال میں ملازمت و روزگار کے سلسلے میں بس گئے اور کچھ یہیں کے ہو کر رہ گئے اور کچھ نے اب تک اپنا رشتہ ان ہی ریاستوں سے برقرار رکھا ہے۔

جب بات اخبارات و رسائل کی آتی ہے تو اشتہارات کا ذکر ہونا بھی لازمی ہے۔ اس لیے کہ کسی بھی اخبار یا رسالے کی اشتہارات ہی ریڑھ کی ہڈی ہوتے ہیں۔ جہاں تک مغربی بنگال کے اردو اخبارات میں اشتہارات کا معاملہ ہے، اس شہر کا ایک بھی اخبار ایسا نہیں ہے جو ABC سے سند رکھتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ بڑی کارپوریٹ کمپنیوں کے اشتہارات تک اردو اخبارات کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ آج تک راقم الحروف نے کسی اردو اخبار میں کوکا کولا، پیپسی، ووڈافون، ایئرٹیل، ریلائنس، ویڈیوکون، ماروتی وغیرہ کے اشتہارات نہیں دیکھے۔

مغربی بنگال میں اردو اخبارات کا انحصار ڈی اے وی پی، حکومت مغربی بنگال ریلوے اور نجی اشتہارات پر ہوتا ہے۔ بہت سے اخبارات DAVP کے سہارے زندہ رہتے ہیں۔ البتہ ان کو مزید اشتہارات ملنے چاہئیں۔ ریلوے کے اشتہارات بھی اردو اخبار والوں کو مغربی بنگال میں کم ملتے ہیں۔ حالانکہ مشرقی اور جنوب مشرقی ریلوے کے صدر دفاتر کولکاتا میں ہیں۔

حکومت مغربی بنگال کے اشتہارات انگریزی، بنگلہ اور ہندی کے اخبارات میں بھرپور چھپ رہے ہیں اور اردو میں صرف ایک ہی اخبار کو یہ اشتہار ملتا ہے وہ بھی اس لیے کہ یہ اخبار حکمراں جماعت کا اخبار ہے۔ سابقہ بایاں محاذ کی حکومت میں بھی ایک روزنامے کو بہت زیادہ اشتہارات ملتے تھے اور دیگر اخبارات کو بہت کم تعداد میں اشتہارات جاری ہوتے تھے۔ مگر نئی

حکومت نے اردو کے دیگر اخبارات کو اشتہارات جاری کرنا بھی بند کر دیا۔

مغربی بنگال میں عوامی اشتہارات کا ایک اچھا خاصا بازار ہے۔ لیکن یہ اشتہارات صرف رمضان میں ہوتے ہیں۔ بقیہ دنوں میں اردو کے اخبارات خالی خالی ہی نظر آتے ہیں۔ پھر بھی اشتہارات کے اعتبار سے مغربی بنگال کی زمین بہت زرخیز ہے۔

# اردو اخبارات اور خبر رساں ایجنسیاں

احمد جاوید

اردو صحافت اپنی تاریخ کی دوسری صدی مکمل کر رہی ہے۔ اس عرصے میں اس نے کئی کروٹیں لیں، کئی منزلیں طے کیں اور کئی معرکے سر کیے۔ خبر رساں ایجنسیوں کی ابتدا بھی ان ہی دنوں میں ہوئی جب اردو میں صحافت کا ابتدائی زمانہ تھا۔ دونوں کا تشکیلی دور تقریباً ایک ہی ہے، انیسویں صدی کا تیسرا عشرہ اور اس کے بعد کے ماہ و سال۔ اس لحاظ سے اردو میں اخبار نویسی اور صحافت کے شعبے میں خبر رساں ایجنسیاں چھوٹی بڑی بنتیں ہیں لیکن اردو میں خبر رساں ایجنسی کی خدمات کا سلسلہ بہت دیر سے بیسویں صدی کے اواخر میں شروع ہوا اور یہاں یہ سلسلہ اب بھی بہت کمزور ہے۔ گنتی کی چند ایجنسیاں ہیں جو اپنی خدمات اردو میں بھی پیش کرتی ہیں لیکن ان کا کاروبار بہت محدود ہے۔ ہم یہاں پہلے خبر رساں ایجنسیوں کے آغاز اور ارتقا، ان کی تاریخ، خدمات اور ضرورت پر روشنی ڈالیں گے۔ پھر اردو اخبارات کے حوالے سے ان پر گفتگو کریں گے تاکہ تاریخی ترتیب برقرار رہے اور باتوں میں کوئی الجھاؤ یا التباس نہ پیدا ہو۔

**تعریف، تاریخ اور خدمات:**

صحافت کی اصطلاح میں خبر گزاری یا نیوز ایجنسی اس تنظیم کو کہتے ہیں جو خبروں کو جمع کرتی، ان کو لکھتی اور ان کو خبروں کی نشر و اشاعت کا کاروبار کرنے والے اداروں کو بیچ دیتی ہے۔ یہ ادارے اخبارات، رسائل و جرائد، ریڈیو اور ٹیلی ویژن بھی ہو سکتے ہیں اور غیر روایتی میڈیا مثلاً انٹرنیٹ اور موبائل نیوز الرٹ سروس بھی۔ نیوز ایجنسی کو وائر سروس، نیوز وائر یا نیوز سروس بھی کہتے ہیں[1]۔

ایجنسیاں عموماً خبروں کی نشر و اشاعت کا کام خود نہیں کرتیں بلکہ اپنے خریداروں (Subscribers) کو خبریں مہیا کراتی ہیں جس سے خرچ بٹ جاتا ہے اور ان کو کم قیمت میں خبریں مل جاتی ہیں۔ آج کل تقریباً سارے ذرائع ابلاغ معمول کی خبروں کے لیے ایجنسیوں پر منحصر ہیں یہاں تک کہ وہ گنے چنے ادارے بھی جن کی خبروں کے حصول کے اپنے ذرائع کافی وسیع ہیں۔ بعض بڑے شہروں میں معمول کی خبروں کے حصول کے لیے اخبارات، ریڈیو، ٹی وی آپس میں مل کر کام کرتے ہیں مثلاً پولیس، عدالتوں، سرکاری دفاتر اور اسی طرح کی دوسری جگہوں سے ملنے والی معمول کی خبروں کے لیے الگ الگ وسائل کا استعمال نہیں کرتے۔ اس طریقے سے وہ اپنے قارئین/سامعین/ناظرین کو کم سے کم وسائل میں زیادہ سے زیادہ خبریں دے پاتے ہیں۔ قومی ایجنسیاں اپنے کوریج کے دائرے کو اسی طریقے پر توسیع دے کر اسٹاک مارکیٹ، کھیل کے میدان اور انتخابات وغیرہ میں دور دراز علاقوں اور گاؤں تک لے جاتی ہیں۔ یہ سلسلہ بڑھتے بڑھتے خبروں کے تجزیے، ان پر تبصرے، خصوصی کالموں، متعلقہ تصاویر، ریڈیو/ ٹی وی کے لیے آڈیو/ویڈیو ریکارڈنگز تک پھیل گیا ہے۔ کئی ایجنسیاں تعاون باہمی (کوآپریٹو) کے اصول پر کام کرتی ہیں۔ اس طریق کار میں رکن ادارے اپنے حلقۂ اشاعت کی خبریں عام استعمال کے لیے ایجنسی کو مہیا کراتے ہیں جبکہ بڑے مراکز میں اہم واقعات کی کوریج کے لیے ایجنسی اپنے نمائندے رکھتی ہے جو خبروں کی تقسیم کے نظام اور اس کے دفاتر کو بھی سنبھالتے ہیں۔ عام نیوز ایجنسی کے علاوہ خاص شعبے کی (Specialized) ایجنسیاں بھی اب کافی رواج پا چکی ہیں۔ تنہا ریاستہائے متحدہ امریکہ میں اس نوعیت کی سو سے زائد ایجنسیاں ہیں جن میں سائنس سروس،

ریلیجیس سروس، جیوش ٹیلی گرافک ایجنسی اور نیوز ایکشن سروس جیسی بڑی ایجنسیاں بھی شامل ہیں۔ دوسرے ممالک کی اسپیشلائزڈ نیوز سروسز میں دو ایجنسیاں بطور خاص قابل ذکر ہیں ایک سوئٹزرلینڈ کی کیتھولک انٹرنیشنل پریس ایجنٹیو رجورومن کیتھولک عیسائیوں کی خصوصی دلچسپی کی خبریں دیتی ہے اور دوسری پاکستان کی اسٹار نیوز ایجنسی جو انگریزی اور اردو میں مسلمانوں کی خبریں مہیا کراتی ہے۔

صحافت میں خبر رساں ایجنسی کا تصور 1830 کے عشرے میں فرانس نے متعارف کرایا۔ پیرس کے ایک ترجمہ نگار و اشتہار کار چارلس لوئی ہواس نے 1835 میں غیر ملکی خریداروں کو فرانس کی خبریں مہیا کرانے کے لیے آجنس ہواس قائم کیا۔ 1840 کے عشرے میں فرانس کی دوسری ایجنسیوں کو ہواس نے اپنی ایجنسی میں ملا لیا اور آگے چل کر یہ آجنس فرانس پریس (اے ایف پی) بن گئی۔ جبکہ 1846 میں جنگ میکسیکو کی خبروں کی ترسیل پر آنے والے خرچ کو بانٹنے کے لیے امریکہ میں نیویارک کے پانچ اخباروں نے ایسوسی ایٹڈ پریس بنائی۔ اے ایف پی کے دو ملازمین برنہارڈ وولف اور پاؤل جولیس ریوٹر نے بالترتیب 1849 میں برلن سے وولف ٹیلی گرافکس بیورو اور 1851 میں لندن سے ریوٹرز شروع کیں۔ گوگلیلمو سٹیفانی نے تیورن میں 1853 میں ایجنزیا اسٹیفانی قائم کیا جو انیسویں صدی کے وسط سے دوسری جنگ عظیم تک دنیا کی اہم ترین نیوز ایجنسی تھی[2]۔

1850 کی دہائی میں ٹیلی گراف کی ایجاد نے انگلینڈ، جرمنی، آسٹریا اور امریکہ میں طاقتور قومی ایجنسیوں کے فروغ کی راہیں ہموار کیں۔ امریکہ میں اخباروں کی تعداد بڑھی تو ایسوسی ایٹڈ پریس[3] کو یونائٹیڈ پریس ایسوسی ایشن اور اخباروں کے ایک ناشر ولیم رینڈولف ہیئرسٹ کی انٹرنیشنل نیوز سروس کا مقابلہ کرنا پڑا۔ یہ دونوں ایجنسیاں بالترتیب 1907 اور 1909 میں قائم ہوئی تھیں۔ پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں اس شعبے میں غیر معمولی تبدیلیاں آئیں، سنسرشپ کے باعث ریوٹرز کمزور ہوئی تو اخباروں کی کوآپریٹو نیوز ایجنسیوں اور ایشیائی ملکوں میں قومی نیوز ایجنسیوں کے رجحان کو فروغ حاصل ہوا۔ چھوٹے اخباروں اور قلیل سرمائے سے کام کرنے والے اداروں کے لیے اس سے بڑی آسانی پیدا ہوگئی۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران اور اس سے قبل و بعد کے زمانے میں خبر رساں ایجنسیوں کا دائرہ بے پناہ بڑھتا چلا گیا لیکن یہ مظاہر

(Phenomena) برصغیر ہندوستان اور ہماری ملکی زبانوں میں بہت دیر سے شروع ہوئے۔ حالانکہ یہاں دیسی زبانوں کے اخبارات و جرائد کی کثرت تھی اور وہ سب کے سب چھوٹے یا منجھولے اخبارات تھے اور اسی ضرورت کے پیش نظر خبر رساں ایجنسیاں وجود میں آئی تھیں کہ ہر اخبار یا ریڈیو رٹی وی اپنے مقام اشاعت سے دور مختلف شہروں اور علاقوں میں نامہ نگار رکھنے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔

کمیونسٹ ملکوں میں نیوز ایجنسیاں اپنے ملکوں کی حکومتوں سے گہرا تعلق رکھتی ہیں بلکہ ان میں ہر بڑے ملک کی اپنی قومی ایجنسی ہے اور ہر ایجنسی سرکار کے کنٹرول میں ہے۔ تاس (TASS) سوویت یونین کی اہم ایجنسی اور سوویت یونین اور اس کے حلیف ملکوں کی عالمی خبروں کا اہم ذریعہ رہی ہے۔ اسی طرح چین اور دوسرے ملکوں کی بھی سرکاری نیوز ایجنسیاں ہیں۔ چین کی زنہوا (ZINHUA) بیسویں صدی کے اواخر سے کسی بھی کمیونسٹ ملک کی سب سے بڑی ایجنسی ہے۔ دوسرے ممالک بھی اپنی ایک یا ایک سے زائد ایجنسیاں رکھتے ہیں۔ ایسی بعض ایجنسیاں ایک سے زائد ملکوں میں اپنا نیٹ ورک رکھتی ہیں مثلاً عرب نیوز مشرق وسطیٰ کے کئی ملکوں کی خبریں دیتی ہے۔ ارنا (IRNA) بھی اسی نوعیت کی ایک قابل ذکر ایجنسی ہے۔ رٹز واس بیورو آف ڈنمارک (1866) اور پریس ایسوسی ایشن (برطانیہ) قومی اخباروں کی کوآپریٹو سوسائٹیز ہیں۔ پریس ایسوسی ایشن برطانیہ کے صوبائی اخباروں نے 1868 میں قائم کی[4] جو بلا تخصیص لندن کے روز ناموں، ہفت روزہ اخباروں، صوبائی اخبارات، تجارتی جرائد اور دوسرے رسائل و جرائد کی خبریں مہیا کراتی ہے۔ خود ہندوستان کی دو سب سے بڑی نیوز ایجنسیاں پی ٹی آئی اور یو این آئی بھی اخباروں کی کوآپریٹو تنظیم ہی ہیں۔ یہ رجحان دوسری جنگ عظیم اور اس کے بعد کے زمانے میں زیادہ بڑھا اور پھیلتا چلا گیا۔ لیکن ہماری دیسی زبانوں بالخصوص اردو میں جس کو سب سے زیادہ ضرورت تھی، یہ بیل ہنوز منڈھے نہیں چڑھی۔ خبروں کی جلد از جلد ترسیل کی صلاحیت بیسویں صدی میں اس وقت بے پناہ بڑھ گئی جب ریڈیو ٹیلی پرنٹرز نے دور دراز علاقوں میں خبروں کی خود کار ترسیل کو ممکن بنا دیا یہاں تک کہ ریڈیو اور ہائی فیڈلیٹی وائر کے ذریعے تصویروں کی ترسیل بھی بہت بہتر ہوگئی۔ بڑی ایجنسیوں نے ٹیلی ٹائپ سیٹر سروس تک مہیا کرانا شروع کر دیا جس میں اولیت کا سہرا ایسوسی ایٹڈ پریس (AP) کے سر جاتا ہے۔ اکیسویں صدی آتے آتے اکثر نیوز

ایجنسیوں نے اپنی خدمات کمپیوٹر پر منتقل کر لیں اور اب یہ خدمات خبروں کی ترتیب و تہذیب اور تبصرے و تجزیے پر مبنی مضامین کی فراہمی (ٹریٹمنٹ آف نیوز اور نیوز پیپر فیچر سنڈیکیٹ) تک پہنچ چکی ہیں۔

## برصغیر اور اردو میں خبر نگاری:

برصغیر میں نیوز ایجنسی اور اردو صحافت میں اس کی خدمات کا جائزہ لیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری صحافت بہت دیر تک غیر ملکی ایجنسیوں اور انگریزی سے ترجمے پر منحصر رہی ہے۔ برصغیر میں بشمول اردو ملکی زبانوں کے اخبارات 1830 کے عشرے سے اپنے وجود کا احساس دلانے لگے تھے۔ 1850 کے عشرے میں تو ان کا کردار اتنا موثر ہو چکا تھا کہ ان پر ملک کے عوام کو انگریزوں کے خلاف آمادۂ پیکار کرنے کا الزام آیا اور دہلی اردو اخبار (1834) کے مدیر مولوی محمد باقر کو انقلاب 1857 کی ناکامی کے بعد توپ سے اُڑا کر اس جرم کی سزا دی گئی۔ بیسویں صدی کی پہلی دہائی آتے آتے، الہلال، ہمدرد اور زمیندار جیسے کثیر الاشاعت اخبارات کی اشاعت کی راہیں ہموار ہو چکی تھیں لیکن یہاں خبروں کی فراہمی کے لیے اپنی کسی ایجنسی یا کوآپریٹو ادارے کی ضرورت اس پورے سوسوا سو سال کی مدت میں شاید کبھی محسوس نہیں کی گئی۔ قومی و بین الاقوامی خبروں کے لیے ہم رپوٹرز، اے ایف پی، اے پی اور بی بی سی پر منحصر تھے اور مقامی خبروں کے لیے نامہ نگاروں کے پوسٹ کارڈ، ریڈیو کی خبروں اور انتہائی ہنگامی حالات میں ٹیلی فون اور ٹیلی گراف سے کام چلاتے تھے۔ ہمارے یہاں آزادی کے بعد 27 اگست 1947 کو مدراس میں پریس ٹرسٹ آف انڈیا (پی ٹی آئی) اور اس کے کئی سال بعد کراچی میں ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان (اے پی پی) قائم ہوئی۔ اس سے قبل کے سی رائے نے 1910 میں ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا (اے پی آئی) کے نام سے ایک نیوز ایجنسی قائم کی تھی جو ہندوستان کی پہلی نیوز ایجنسی تھی لیکن اس کی زبان بھی انگریزی تھی اور یہ تجربہ کتنا حوصلہ افزا اور کتنا دیرپا ثابت ہوا، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ 1919 میں یہ رپوٹرز کو بیچ دی گئی جواب بھی کریڈٹ لائن میں اے پی آئی استعمال کرتی تھی[5]۔ پی ٹی آئی جو ہندوستانی اخباروں کا کوآپریٹو ادارہ ہے، آزادی کے بعد کے بدلے ہوئے حالات

میں اس نے اے پی آئی کو ٹیک اوور کیا اور صحیح معنوں میں یہ اے پی آئی کا ہی دوسرا جنم تھا۔ اس نے یکم فروری 1949 سے کام شروع کیا لیکن اب بھی رویٹرز سے اس کا رشتہ برقرار تھا۔ 1953 میں یہ ایک آزاد و مختار ایجنسی بنی اور رویٹرز پر اس کا انحصار ختم ہوا۔ 1961 میں یونائٹڈ نیوز آف انڈیا (یو این آئی) کا قیام عمل میں آیا۔ اس نے 21 / مارچ 1961 سے انگریزی اور ہندی (یونی وارتا) دونوں زبانوں میں اپنی خدمات شروع کی تھیں۔ یہ بنیادی طور پر خبر گزاری کے شعبے میں پی ٹی آئی کا بلاشرکت غیر اجارہ ختم کرنے کے لیے قائم کی گئی تھی۔ پہلے پریس کمیشن (54-1952) نے بھی اپنی رپورٹ میں ایک دوسری نیوز ایجنسی کی ضرورت پر زور دیا تھا لیکن پریس کونسل (پی سی آئی) کی سرپرستی میں وجود میں آنے والی یونائٹڈ پریس آف انڈیا (یو پی آئی) نے بمشکل تین چار سال میں دم توڑ دیا۔ اب ملک کے آٹھ بڑے اخباروں[6] نے مل کر یو این آئی شروع کی اور یہ ابتدا میں یو پی آئی کے پرانے اور زنگ خوردہ ٹیلی پرنٹرز استعمال کرتی تھی جو 1958 سے استعمال میں نہیں تھے۔

ایمرجنسی کا زمانہ ہندوستان میں صحافت اور اس کی آزادی کے لیے بڑی آزمائش کا دور تھا۔ فروری 1976 میں پی ٹی آئی، یو این آئی، سماچار بھارتی اور ہندوستان سماچار نے حکومت کے دباؤ میں خود کو تحلیل کر کے ''سماچار'' بنائی لیکن ایمرجنسی کے بعد اپریل 1978 میں ان ایجنسیوں نے پھر آزادانہ طور پر الگ الگ کام شروع کیا اور ان کی خدمات میں تیز رفتار توسیع ہوئی۔ اپریل 1985 میں پی ٹی آئی نے اپنی ہندی سروس (بھاشا) شروع کی جو اس سے قبل سماچار بھارتی شروع کر چکی تھی۔ یونائٹیڈ نیوز آف انڈیا (یو این آئی) 21 / مارچ 1961 سے انگریزی اور ہندی (یونی وارتا) دونوں زبانوں میں کام کر رہی تھی جبکہ 1992 میں اس نے اردو سروس شروع کی اور وہ اردو میں خبریں دینے والی دنیا کی پہلی نیوز ایجنسی بن گئی۔ ہندوستان میں ان دو بڑی ایجنسیوں کے علاوہ اے این آئی اور آئی اے این ایس بھی قابل ذکر ایجنسیاں ہیں اور یہ بھی جزوی طور پر اردو میں خبریں دیتی ہیں۔ بعض دوسری ایجنسیاں بھی اردو میں خدمات پیش کرتی ہیں لیکن یا تو ان کی خدمات کا دائرہ بہت ہی محدود ہے یا وہ ابھی اپنی تشکیل کے بالکل ابتدائی مراحل میں ہیں۔

ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان (اے پی پی) نے 1980 میں اردو سروس شروع کی تھی اس لیے وہ اردو میں پہلی نیوز ایجنسی ہونے کا دعویٰ کر سکتی ہے لیکن اس کی کارگزاری صرف سرکاری

خطبات و اعلانات اور برسراقتدار سیاستدانوں کی تقاریر تک محدود تھی۔ کیونکہ عموماً اردو میں کی جانے والی تقریریں ایجنسی کے ذریعے انگریزی میں منتقل کی جاتی تھیں اور اخبارات ان کو پھر اردو میں منتقل کرتے تھے جس سے بڑی گڑبڑ ہوتی تھی۔ اس مسئلے کے حل کے لیے ان کے اردو میں ہی جاری کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا لیکن اردو میں اس کے کام کا دائرہ ہنوز اتنا بھی نہیں ہے جتنا ہمارے یہاں پی آئی بی (Press Information Bureau) کا ہے۔ اس لیے اردو میں باضابطہ پہلی نیوز ایجنسی ہونے کا سہرا یو این آئی کے سر باندھنا غلط نہیں ہے۔ گرچہ اس کی کارگزاری بھی ستر اسی فیصد ترجمے پر منحصر ہے اور اس کا معیار کیا ہے اس سلسلے میں کچھ کہنا تحصیل حاصل ہوگا۔ یاد آتا ہے کہ اردو کے معروف صحافی پروانہ رودلوی نے غالباً 2004 میں لکھا تھا کہ اس ایجنسی نے اردو میں صحافت کی رہی سہی کسر بھی نکال دی ورنہ ہم ترجمہ کرتے وقت یا انگریزی میں دستیاب معلومات کو سامنے رکھ کر خبر نگاری کرتے وقت نہ صرف انتہائی محتاط رہتے تھے بلکہ مقابلے کا جذبہ بھی کارفرما رہتا اور اگلی صبح دوسرے اخباروں سے اپنی کارگزاری کا موازنہ کیا کرتے تھے جس سے ہر دن ہمارے کام میں نکھار آتا جاتا تھا۔

## ایک تصویر کے دو رُخ:

نیوز ایجنسی اور انٹرنیٹ نے دوسری زبانوں کی صحافت میں ترسیل کی رفتار کو تیز کیا، وقت کی بچت ہوئی تو ان کا معیار بلند ہوا لیکن اردو میں کم از کم ہندوستان کی حد تک اس سے گراوٹ آئی۔ ہاں! اس کا فائدہ یہ ہوا کہ خبروں میں یکسانیت (uniformity) آگئی اور اخباروں کی اشاعت بہت آسان ہوگئی۔ اب جو غلطی ایک اخبار میں ہوتی ہے وہی دوسرے اخباروں میں بھی ہوتی ہے۔ اس صورت حال کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ خبر گزاری کا کام بنیادی طور پر اطلاعات کی جلد از جلد ترسیل ہے، کئی دفعہ ایجنسیاں خبر قسطوں میں دیتی ہیں یا ایک ہی واقعہ سے متعلق معلومات الگ الگ دیتی جاتی ہیں۔ ان کی ترتیب، تہذیب، پیشکش اور درستگی اخبار (Publication) کی ذمہ داری ہے۔ اپنے قارئین کے تئیں ہم ذمہ دار ہوتے ہیں نہ کہ ایجنسی لیکن دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ جس زمانے میں ایجنسیاں اخباروں کو بنے بنائے صفحات اور ڈیزائن تک مہیا کراتی ہیں اس

عہد میں آپ خام مواد بھی درست اور املا کی غلطیوں سے پاک مہیا نہیں کرا پار ہے ہیں۔ میرے نزدیک یہ احساس ذمہ داری کی کمی اور وقت کی رفتار کے ساتھ قدم سے قدم ملانے کے جذبے کے فقدان کا مسئلہ بھی ہے۔ رپوٹرز، اے ایف پی اور اے پی کے تو کیا کہنے، خود ہماری پی ٹی آئی اور یو این آئی ہندی اور انگریزی میں ہر دن اتنا مواد فراہم کراتی ہے کہ آپ آسانی سے بغیر مزید کسی تگ و دو کے اخبار کے سوسوا سو صفحات تیار کر سکتے ہیں لیکن اردو کی کوئی بھی ایجنسی آج کے اس اطلاعاتی ٹکنالوجی کے دور انقلاب میں بھی چار پانچ صفحات کا مواد بھی مہیا نہیں کرا پاتی ہے۔ پھر ان کا بیشتر مواد سیاسی و سماجی واقعات اور جرائم سے متعلق ہوتا ہے۔ دلچسپی کے دوسرے شعبے مثلاً سائنس، ٹکنالوجی، اقتصادیات وغیرہ تو آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہوتے۔

اس سے قطع نظر کہ دنیا میں کتنی اور کس کس نوعیت کی نیوز ایجنسیاں کام کر رہی ہیں اور ہندوستان کی دیسی زبانوں بالخصوص اردو میں کیا صورت حال ہے، اخباروں اور چینلوں میں اہمیت کے ساتھ جگہ پانے والی خبریں عموماً چند بڑی ایجنسیوں کی ہی ہوتی ہیں۔ ان میں بھی تین سب سے بڑی ایجنسیاں ریاستہائے متحدہ امریکہ کی ایسوسی ایٹڈ پریس (اے پی)، برطانیہ کی ریوٹرز اور فرانس کی آجنس فرانس پریس (اے ایف پی) زیادہ اہمیت کی حامل ہیں[7]۔ یہ ذکر پہلے ہی آچکا کہ بڑی ایجنسیاں ایک دوسرے سے اور کئی قومی و مقامی ایجنسیوں کے ساتھ اشتراک بھی کرتی ہیں۔ مثلاً ریوٹرز، اے ایف پی، اے پی اور یونائٹڈ پریس انٹرنیشنل جیسی دنیا کی بڑی ایجنسیاں پاکستان کی خبروں کے لیے اے پی پی اور ہندوستان کی خبروں کے لیے پی ٹی آئی، یو این آئی، اے این آئی یا اے این ایس اے سے تعاون کرتی ہیں لیکن اردو صحافت میں اس طرح کے تعاون کی کوئی روایت کل تھی نہ آج ہے۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ شریک کار، ہم پیشہ یا کاروباری حریف کے بجائے مخالف اور دشمن کا سا تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے یہاں صالح مقابلہ ہے نہ باہمی تعاون اور نہ پیشہ ورانہ رقابت (اس لیے بڑے پیمانے پر ذہن سازی اور تربیت کی ضرورت ہے)۔ یہاں پر یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کا ہے کہ دنیا بھر کی اَن گنت اور اطلاعات و معلومات کے ہر شعبے کو محیط نیوز ایجنسیوں میں آجنس فرانس پریس (اے ایف پی)، ایسوسی ایٹڈ پریس (اے پی) اور ریوٹرز تین سب سے بڑی ایجنسیاں ہیں لیکن ان تینوں کی بنیادی سوچ یا فلسفہ ایک ہے۔ یہ اس واحد

نقطۂ نظر کے تحت کام کرتی ہیں کہ ان کو اپنے ہر قسم کے صارفین کو ہر طرح کی خبریں دینا ہیں۔ اخبارات روشن خیال ہوں یا قدامت پرست، یہ ان کو الگ الگ خبریں نہیں دیتیں [8]۔ اور بلاشبہ یہی ان کی کامیابی کا راز ہے۔ دنیا کے ہر حصے میں کئی کئی نیوز ایجنسیاں کام کر رہی ہیں جن میں بڑی بڑی قابل ذکر ایجنسیوں کی تعداد بھی سو سے کم نہیں لیکن ان میں اردو کی ایک بھی ایسی نیوز ایجنسی نہیں ہے جس کا اس شعبے میں بڑا نام ہو یا جس کو ہم کسی بڑی نیوز ایجنسی کے مقابل پیش کر سکیں یا کم از کم جس نے اپنے بزنس میں کوئی قابل ذکر کارنامہ انجام دیا ہو۔ یہ اس شعبے میں اردو کی بے بضاعتی کا ایک بڑا عبرت ناک واقعہ ہے لیکن شاید ہم نے کبھی جائزہ نہیں لیا کہ اس کے اسباب و عوامل کیا ہیں؟

ہندوستان میں اردو کے اخبارات اب بھی اپنا دائرہ زیادہ بڑھا نہیں سکے ہیں اور یہ چھوٹے یا اوسط اخبارات کے زمرے میں ہی آتے ہیں جن کو اپنا معیار اور کوریج بڑھانے کے لیے نیوز ایجنسی کی زیادہ ضرورت تھی لیکن یہ تجربہ یہاں کامیاب و نتیجہ خیز نہیں ہوا جس کے اسباب و عوامل پر سنجیدہ غور و فکر اور حوصلہ افزا اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سے اردو صحافت کو یقیناً بڑی تقویت ملے گی، ہمارے اخبارات کا معیار بہتر اور اردو صحافت کا وقار بحال ہوگا مگر شرط ہے کہ ہمارے ناشرین اب بھی سنجیدہ ہوں۔

حوالے:

۱- انسائیکلو پیڈیا برٹینکا
2- وکی پیڈیا
3- امریکہ کے نان پرافٹ کوآپریٹو نیوز ایجنسی، جس کے صدر دفاتر نیویارک میں ہیں۔ نیویارک کے 5 روزناموں نے میکسیکو، امریکہ جنگ کی خبروں کی کشتی، گھوڑے اور ٹیلی گراف کے ذریعے ترسیل پر آنے والے خرچ کو بانٹنے کے لیے 1846 میں قائم کی تھی۔
۴- اس نے 5 رفروری 1870 سے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ جب پوسٹل سروس نے پرائیویٹ ٹیلی گراف

کمپنیوں کو ٹیک اوور کیا جو علاقائی اخبارات بھی سپلائی کرتی تھیں۔

5- 1945 میں رپوٹرز نے اسے ایک ہندوستانی پرائیویٹ لمیٹڈ کمپنی کے زمرے میں رجسٹرڈ کرالیا تھا جس کی کل ملکیت رپوٹرز کے پاس تھی۔

6- دی ہندو، ٹائمز آف انڈیا، دی اسٹیٹسمین، امرت بازار پتریکا، ہندوستان ٹائمز، ہندوستان اسٹینڈرڈ، دکن ہیرالڈ اور آر یہ ورت۔

7- یہ اور چند دوسری ایجنسیاں دنیا کے ہر حصے میں تجربے کار نامہ نگار رکھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے ہر جگہ ایک بہت ہی بہتر منظم ٹرانسمیشن سسٹم چاہیے جو ہر کسی کے پاس نہیں ہوتا۔

8- انسائیکلو پیڈیا برٹینکا۔

# اردو قارئین کی قوتِ خرید

محمد شبیب عالم

اردو اخبارات کے بازار کا ذکر کیا جائے تو یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ اردو اخبارات کا بازار سب سے پیچھے ہے، مطلب ہماری زبان سب سے پیچھے ہے، ہماری کمیونیکیشن کا واسطہ پیچھے ہے۔ اس کی وجہ کسی حد تک ہم سب کو معلوم ہے۔ اس کے اثرات سے بھی ہم سب ناواقف نہیں مگر اس کے لیے جو ضروری اقدامات ہونے چاہئیں وہ نہیں ہو پاتے۔ اردو اخبارات کے قارئین لگ بھگ سو فیصد مسلم ہی ہیں اس لیے اردو زبان، اردو اخبارات یا پھر اردو صحافت کی ترقی بھی انھی کے ہاتھ میں ہے۔ مگر تمام مسلمان اردو اخبار ہی نہیں پڑھتے ہیں وہ اردو اخبار سے کہیں زیادہ دوسری زبانوں میں شائع ہونے والے اخبارات پڑھتے ہیں۔ اس کی اگر وجہ تلاش کی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان کی ضرورتوں کو اردو اخبارات سے زیادہ دوسرے اخبارات پورا کرتے ہیں اور یہ بات سچ بھی ہے مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کون اردو اخبارات کو اس قابل بنائے گا کہ وہ لوگوں کی ضروریات کو پورا کریں۔ ظاہری بات ہے کہ ہمیں ہی پورا کرنا پڑے گا مگر اس کے لیے کچھ مخصوص لوگوں کو آگے آنا ہوگا جو اپنے فائدے کی پروا کیے بغیر اردو زبان کے لیے اپنے وقت کی قربانی

دے سکیں۔ ہم اگر یہ سوچیں کہ تمام اردو قارئین اس میں بالواسطہ طور پر حصہ لیں تو یہ ممکن نہیں ہے مگر کچھ مخصوص لوگ اردو اخبارات کو مالا مال کر دیں، یعنی اس کے اندر وہ مواد بھر دیں جس کی تلاش میں قارئین دوسرے اخبارات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، تو اردو اخبارات کی ترقی یقینی ہے۔

ہم اگر ایسا کچھ کریں کہ سرکار اردو زبان کا حق دینے پر مجبور ہو جائے تو بات بن سکتی ہے۔ اس کے لیے، اردو زبان کی ترقی کے لیے اردو اخبارات گھر لانے ہوں گے۔ یہ بات بالکل غلط ہے کہ اردو قارئین کی قوتِ خرید اس قابل نہیں کہ وہ اخبار خرید سکیں، ضرورت ہے اردو زبان سے محبت کی۔ اردو زبان کی ترقی کی غرض سے تمام اردو والوں کو چاہیے کہ کم سے کم ایک اخبار روزانہ گھر پر لائیں۔ طالب علموں کو بھی چاہیے کہ وہ اردو اخبارات سے دلچسپی پیدا کریں۔ کسی بھی شے کی ترقی میں معیشت کا بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔ اردو کے قارئین اگر معاشی طور پر مضبوط ہوتے تو اردو اخبارات کی ترقی کے بارے میں کچھ سوچنا ہی نہیں پڑتا۔ مثال کے طور پر انگریزی اخبارات سب سے زیادہ ترقی پر ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان کے قارئین کی معاشی حالت مضبوط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی زبان ترقی کا انتہائی بلند مقام حاصل کر چکی ہے اور ابھی بھی ترقی کے راستے پر آگے ہی بڑھ رہی ہے۔ ہمارے اردو معاشرے میں بھی ایسا دیکھا گیا ہے کہ معاشی طور پر لوگ مستحکم ہونے کے بعد اردو سے رشتہ ہی توڑ لیتے ہیں، اردو اخبار خریدنا تو دور کی بات ہے اردو بولنا بھی چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ اس قانون کی پیروی کرنے لگتے ہیں کہ بھاری شے ہلکی شے کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ انگریزی زبان نے اچانک اتنی ترقی نہیں کی اسے بھی ترقی کی راہ پر چلتے چلتے یہ مقام ملا ہے۔ ہماری اردو زبان، اردو اخبارات کے لیے بھی ترقی کی راہ پر چلنا ناممکن نہیں ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ صحیح راستے پر چلایا جائے۔ ہندوستان میں مختلف مذاہب، مختلف زبان کے بولنے والے لوگ آباد ہیں۔ ہم مسلمان اپنے آپ کو سب سے اعلیٰ سمجھتے ہیں۔ ہم لوگ بخوبی واقف ہیں کہ ایک مسلمان کے کیا فرائض ہیں۔ اگر ہم اپنے فرائض کو انجام دیتے ہوئے اپنے آپ کو اعلیٰ سمجھتے ہیں تو یہ بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن اگر ہم اپنے فرائض کو انجام دیے بغیر اپنے آپ کو سب سے اعلیٰ سمجھ کر دوسرے مذاہب کے لوگوں سے مخاطب ہوتے ہیں تو اثر اُلٹا ہوتا ہے۔ دوسری قوم کے لوگ بھی ہمارا ساتھ دینے میں ہچکچاتے ہیں۔ سرکار بھی کسی حد تک اسی وجہ سے ہمارا

ساتھ نہیں دیتی۔ اس لیے اس کہاوت پر ہمیں عمل کرنا چاہیے کہ جتنی چادر ہو اتنا ہی پیر پھیلانا چاہیے۔

اردو زبان، اردو اخبارات کی ترقی نہ کرنے کے پیچھے جو باریکیاں ہیں وہ پورے عوام کو سمجھانا مشکل ہے۔ مگر اس زبان کو معلومات کے خزانے سے مالا مال کر کے عوام کو بھی اس کی ترقی کی راہ پر لایا جاسکتا ہے۔ اردو سے تعلق رکھنے والے ایسے لوگ جو معاشی طور پر مضبوط ہیں انھیں اردو کی ترقی کے لیے آگے آنا ہوگا۔ تب سرکار بھی اردو کا حق دینے کے لیے مجبور ہو جائے گی۔ قدرت کا ایک اصول ہے کہ جو جاندار قدرت کے قوانین کی پیروی نہیں کر پاتے ہیں وہ ناپید ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان میں ریزرویشن کا سلسلہ کمزوروں کو مضبوط بنانے کے لیے ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ ہم اردو زبان بولنے والوں کے لیے ہندوستان میں ریزرویشن نہیں ہے۔ اس کے دفاع کے لیے ہمیں آپ کو مضبوط مان لینا ہوگا لیکن صرف مان لینے سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا، کام بھی کرنا پڑے گا۔ اے پی جے عبدالکلام ہم میں سے ہی تھے۔ ایک ایسی شخصیت جن کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اپنے ملک کے لیے ان کی قربانیاں ناقابل فراموش ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ اب ایسی شخصیت دوبارہ جنم نہیں لے گی۔ ہمیں یقین ہے کہ ابھی ہمارے بیچ بھی ایسی بہت سی شخصیتیں موجود ہیں جو اردو زبان، صحافت اور اخبارات وغیرہ کو ترقی کی بلندیوں تک پہنچا سکتی ہیں۔ مگر اس عمل میں اردو کے تمام قارئین کو بھی پیش پیش رہنا ہوگا۔

اردو صحافت ہندوستان کی قدیم ترین اور تاریخی اعتبار سے موثر صحافت ہے۔ ملک کی معاشرتی زندگی میں اردو صحافت نے تعمیری اور یادگار کردار ادا کیا ہے۔ آج کی صحافت محض فطری قوت تحریر ہی نہیں بلکہ اسے صحافت کے اصولوں، فن طباعت، زبان، تاریخ، جغرافیہ، شہریت، بین الاقوامی سیاست، اقتصادیات، علم انتظامیہ، آئینی قانون، عمومی اور صحافتی قوانین، عمرانیات ایسے مختلف موضوعات کا ادراک بھی ہے۔ مگر صحافت آج ایک بڑی تجارت بن گئی ہے۔ سخت ضرورت ہے کہ صحیفہ نگاری بہتر بنائی جائے، مالی وسائل کو وسعت دی جائے اور تعداد اشاعت میں ترقی کی مخلصانہ کوشش جاری رکھی جائے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ مالی وسائل کی وسعت میں بالکل ترقی نہیں ملی ہے۔ ملی تو ضرور ہے مگر مخلصانہ طور پر نہیں ساتھ ہی کوئی بھی اخبار اپنی خوشنمائی، خبروں

اور تبصروں کی تازگی اور تربیت یافتہ عملے کی چابک دستی کے اوصاف سے معمور ہے تو قاری، اشاعت اور آمدنی خود اس کے دروازے پر دستک دیں گے۔ مگر آج بھی کہنا غلط نہ ہوگا کہ گھر میں آگ لگی گھر کے چراغ سے۔ آج ہندوستان میں اردو صحافت کسی لسانی سرحد کی پابند نہیں ہے۔ انگریزی کے علاوہ اردو زبان کے بھی جرائد و اخبارات ملک کے تقریباً تمام حصوں سے شائع ہو رہے ہیں۔ مگر اس وسعت کے باوجود بھی اردو صحافت منظم نہیں ہے۔ یہ کئی بدبختیوں کی شکار ہے۔ اردو صحافت عرصۂ دراز سے اقلیت اور اقلیتی زبان کے مسائل کی ترجمانی کر رہی ہے۔ اپنی کم مائیگی کے باوجود اردو صحافت ہر دور، ہر ماحول اور ہر صورت میں ذمہ دار رہی، اس کا دامن عجیب مصائب اور مسلسل دشواریوں کی حالت میں بھی پاکیزہ رہا ہے۔ اردو صحافت کی درخشاں تاریخ ہے۔ مگر کئی لحاظ سے ایک مستحکم، منظم اور ترقی یافتہ صحافت کی صورت میں اُبھرنے کے لیے اردو صحافت کو لگاتار اور زوردار کاوش کرنی چاہیے۔ ہمیں مایوس ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اردو صحافت کی صلاحیتوں پر اعتماد کیا جائے۔ آج بہت افسوس ہوتا ہے کہ اردو صحافت اور اس کے صحافی تنگ نظری کے شکار ہیں، اس کی وجہ ہمارے اپنے ہی لوگ ہیں۔ ایک اہم بات بتاتا چلوں کہ اردو زبان اور اس کی بھینی خوشبو سے زیادہ تر ہم اردو زبان والے یا اردو کے نام پر روٹیاں توڑنے والے دور بھاگ رہے ہیں۔ ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ اردو زبان سے خوشبو کے بجائے بدبو آنے لگی ہو۔ مگر ملک میں ذات، دھرم، مذہب کے نام پر ایک دوسرے کو بانٹنے کی لگاتار کوشش ہو رہی ہے۔ اسی درمیان چند اپنے بھی لوگ ہیں جو اردو زبان میں وہ شہد کی مٹھاس محسوس کر رہے ہیں۔ ایسا محسوس کرنے والے وہ لوگ نہ ہی اردو کی کھاتے ہیں اور نہ ہی اردو والے ہیں۔ اس کی تازہ مثال ہے مغربی بنگال میں گزشتہ سات ماہ سے شائع ہونے والا اردو روزنامہ اخبار ''نوائے بنگال'' اس اخبار کے مالک غیر مسلم ہیں، ان کا نام سُریش مشرا ہے۔ ان سے لوگوں نے سوال کیا کہ آپ ایک غیر مسلم ہو کر بھی اس نفرت کے دور میں اردو اخبار نکال رہے ہیں؟ اس پر ان کا جواب تھا کہ مجھے افسوس ہے کہ مجھے اردو پڑھنی نہیں آتی مگر میں ہگلی کے علاقے میں جہاں رہتا ہوں وہاں مسلمان بھائیوں کی آبادی 47 فیصد ہے اور میں یہاں گزشتہ گیارہ سالوں سے چاپدانی میونسپلٹی پر چیئرمین کی حیثیت سے ہوں۔ میں مسلمان بھائیوں کے درمیان اردو بول چال کے

دوران اتنی مٹھاس محسوس کرتا ہوں کہ میں بیان نہیں کرسکتا ساتھ ہی میں نے سوچا کہ اپنے مسلمان بھائیوں کے لیے میں کوئی خاص کام کروں تو خیال آیا کہ کیوں نہ اردو زبان کی ترقی کے لیے ایک اردو اخبار ہی نکالوں اور چند دوستوں سے مشورے کے بعد میں کامیاب ہوگیا۔ اردو اخبار عوام کے ہاتھ میں ہے۔ آگے ریاستی اور مرکزی حکومت سے گزارش کروں گا کہ اخبار کو مزید اونچائی اور عمر دراز کرنے میں مدد کریں۔ ایک اور اہم بات مغربی بنگال میں نئے اردو اخبارات کو آج بچانا بہت ہی مشکل ہوگیا ہے خاص طور پر اُن اخباروں کو جن کی مالی حالت مضبوط نہیں ہے اور جن کا رشتہ موجودہ سیاسی جماعت سے بالکل قریب نہیں ہے۔ بہت افسوس کی بات ہے کہ روزنامہ اردو اخبارات کی اشاعت میں مغربی بنگال بے حد پیچھے ہے، بہار، یوپی، دہلی کے بہ نسبت۔ اس صورت حال کے ذمہ دار حکومت کے ساتھ ساتھ اردو قاری بھی ہیں۔ اردو اخبار خرید کر پڑھنے کے معاملے میں ہم دیگر زبانوں کے قاری سے بالکل ہی پیچھے ہیں یا یوں کہا جائے کہ ہم اُن کی فہرست میں ہی نہیں ہیں۔ ایک بنگالی بنگلہ زبان جاننے والا اس سے محبت کرنے کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ کچھ بھی نہیں تو فیملی میں ایک بنگلہ روزنامہ تو ضرور آتا ہے اور ایسے کئی گھروں میں دیکھا جاتا ہے کہ ایک سے زائد اخبار اپنے گھر میں منگواتا ہے۔ مگر وہیں ہم اردو کا شور مچانے والے اردو اخبار کی اہمیت تک نہیں سمجھتے۔ بہت سے لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ نام تبدیلی کا نوٹس دینے کے لیے کسی بنگلہ، انگریزی یا ہندی کے اخباروں کے دفتر جاتے ہیں۔ ان کو لگتا ہے کہ اردو اخبار میں اگر اس قسم کا اعلان یا نوٹس لگتا ہے تو اعلیٰ حکام، سرکاری دفتر کے افسران اسے قبول نہیں کریں گے۔ یہاں تک کہ زیادہ تر سرکاری دفاتر کے افسران سختی سے ہدایت دیتے ہیں کہ کسی انگریزی یا بنگلہ زبان کے اخبار میں ہی نام تبدیلی کا اشتہار قبول کیا جائے گا۔ بھلا بتائیں کہ ایسے میں کون اردو کے بارے میں سوچے گا۔ اس کے علاوہ جو لوگ اردو سے محبت رکھنے والے ہیں بھی تو وہ چائے یا پان کی دُکان پر بیٹھ کر اردو اخبار چائے کی چُسکی کے ساتھ پڑھ کر گھر چلے جاتے ہیں۔ گھنٹوں چائے پان کی دُکانوں میں بیٹھ کر ایک اخبار پر جھکے رہتے ہیں۔ اس دوران کئی پیالیاں چائے کی چُسکی لے لیتے ہیں۔ مگر ایک اخبار خرید کر اپنے گھر نہیں لے جاتے، شاید ایسا کر کے وہ لوگ گناہ بٹورنا نہیں چاہتے۔ اکثر ایسے لوگوں سے سنا گیا ہے کہ اردو اخبار گھر میں رکھیں گے تو اُس میں پیر لگے گا، ان

اخباروں میں اللہ کا نام لکھا ہوتا ہے، دین کا ذکر رہتا ہے۔ ایسے ہی اردو اخبار خرید کر کیوں مصیبت مول لیں۔ جب زیادہ جمع ہو جائے گا تو اسے فروخت کرنا مشکل ہوگا۔ آخر میں کسی ندی یا تالاب یا دریا میں پھینکنا ہوگا۔ اب ظاہری بات ہے ایسا اخبار ہوگا تو ہم اخبار اور اردو کی ترقی کے بارے میں امید تو کر ہی نہیں سکتے۔ مگر ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ کیا کسی انگریزی اخبار میں GOD کا ذکر نہیں ہوتا ہے یا گاڈ نامی الفاظ کا ذکر نہیں ہوتا، ہم اللہ لکھے ہونے کی پروا کر رہے ہیں مگر گاڈ لکھا ہے تو اس کی بے حرمتی کریں، اسے پیروں تلے مسل دیں۔ آپ کی سوچ تو یہی ثابت کرتی ہے۔ ہمیں اس سوچ کو بدلنا ہوگا۔ میری آرزو ہے کہ اردو صحافت اور صحافی تنگ نظری سے باہر نکل آئیں۔ جدید صحافت کی پرچھائیاں دیکھیں اور عملی صحافت کے معیار کو نئی بلندیوں پر لے جانے کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیں۔ ساتھ ہی حکومتی نظام و اردو شعبے کے افسران سے گزارش ہے کہ اردو اخبار و صحافت کو تنگ نظری سے محفوظ رکھیں۔ دیگر دوسرے تمام زبان کے اخبارات کی سہولت کے ساتھ اردو اخبار و صحافت کو بھی مزید سہولتیں مہیا کرائیں۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو انشاء اللہ ہم اپنے آپ کو اپنے ہی ملک میں غلام کبھی محسوس نہیں کریں گے اور نہ ہی اردو صحافت کے لیے تنگ نظری کا الزام لگائیں گے۔

# اردو اخبار کا قاری

سید فیروز اشرف

جس طرح صحافت جمہوریت کا ایک اہم ستون ہے، اسی طرح اخبار پڑھنے والا قاری بھی صحافت کا ایک اہم ستون ہے۔ قاری کے بغیر اخبار کا تصور نہیں کیا جا سکتا ہے۔ دونوں کا اٹوٹ رشتہ ہوتا ہے۔ ویسے بھی اخبار یا رسالے کے مالک اور ایڈیٹر کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ اس کا اخبار یا رسالہ زیادہ سے زیادہ قارئین تک پہنچے۔

کئی اخبار زیادہ سے زیادہ تعداد میں قارئین کو لبھانے اور اُن تک رسائی کے لیے ایک سے بڑھ کر ایک قدم اُٹھاتے ہیں۔ اسی سلسلے سے وہ اشتہاری ایجنسیوں کی خدمات بھی حاصل کرتے ہیں۔ اشتہاری ایجنسیاں صابن، ٹوتھ پیسٹ اور چاکلیٹ کے اشتہارات کی طرح اخبارات کی پبلسٹی کرتی ہیں۔ چنندہ مقامات پر دلکش بورڈ لگائے جاتے ہیں۔ اب تو ٹی وی چینل بھی اپنے چینل کے پروگرام کے لیے اپنے مدمقابل چینلز میں اشتہار دیتے ہیں۔ کئی اخبار اپنے قارئین کا دائرہ بڑھانے کے لیے چھوٹے موٹے تحائف بھی دیتے ہیں۔ اردو اخبارات بھی، وسیلے کی کمی کے باوجود اپنے قارئین کو نئے سال پر اردو انگریزی کیلنڈر دینا نہیں بھولتے ہیں۔

لیکن اردو اخبارات کے قارئین کو صرف کیلنڈر دے کر ہی نہیں بہلایا جا سکتا ہے۔ اُسے اردو اخبار میں ایک مکمل اخبار چاہیے جو بدقسمتی سے اُسے نہیں ملتا ہے۔ اُسے اردو اخبار میں اور بھی بہت کچھ نہیں ملتا ہے۔ اس لیے وہ مایوس ہو کر انگریزی یا دوسری زبان کے اخبار کو ترجیح دیتا ہے یا پھر اخبار پڑھتا ہی نہیں ہے۔ ویسے بھی اُسے اخبار پڑھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ہے۔ وہ اپنے موبائل کا بٹن دباتا ہے یا پھر ٹچ کرتا ہے اور لمحوں میں سارے عالم کی خبر اُس کی مٹھی میں ہے۔ وہ جب چاہتا ہے، اس چار چھ انچ کے عجوبے ڈبے کے ذریعہ ہر طرح کی انفارمیشن کے ساگر میں غوطے لگاتا ہے۔ لیکن پھر بھی اخبار، اخبار ہے۔ خواہ اردو کا ہو یا انگریزی کا یا کسی اور زبان کا۔ اردو سمیت کسی بھی زبان کے قاری کے لیے اخبار اُس کا دوست ہے، سرپرست ہے، اُستاد ہے، رہبر ہے اور اگر لت پڑ گئی تو یہ معشوق ہے۔ قاری کو اخبار کے لیے بہت زیادہ رقم خرچ کرنا نہیں پڑتی۔ چارجنگ کے لیے بجلی کی ضرورت نہیں۔ بیٹری کی ضرورت نہیں۔ کھو جانے یا چوری ہو جانے کا ڈر نہیں۔ صبح صبح چائے کے پیالے کے ساتھ اخبار کا قاری کے ساتھ جو جذباتی رشتہ ہوتا ہے، اسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ کمیٹڈ (Commited) قاری ہی کسی تہوار اور جشن کے موقع پر اخبار کے شائع نہ ہونے کا ناقابلِ بیان درد محسوس کرتا ہے۔ پھر بھی کسی صبح نہیں آنے پر قاری گزرے ہوئے کل کے اخبار کے اشتہارات، کارٹون وغیرہ دیکھ پڑھ کر تسلی کر لیتا ہے۔

لیکن اہم سوال یہ ہے کہ کیا ہمارا اردو اخبار اپنے قاری کو، کسی دن شائع نہ ہونے پر بے چین کرا سکتا ہے؟ اس سے بھی الگ ایک سوال! اردو اخباروں میں کیا کچھ ایسا ہوتا ہے، جس کے نہیں پڑھنے سے قاری بے چین ہو جائے؟ ایسا بھی نہیں کہ اردو اخبار اپنے قارئین کو دوسرے اخباروں سے الگ، خصوصاً انگریزی اخباروں سے ہٹ کر کچھ نیا اور کچھ مختلف دینے کی کوشش نہیں کرتے۔ یقیناً اُن میں ''اردو قوم'' کے متعلق ڈھیروں خبریں، تبصرے، مقالے اور مضامین ہوتے ہیں۔ قوم کے جلسے، جلوس، چھوٹے بڑے مسائل، طرح طرح کی پریشانیاں، ناانصافیاں وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ اردو کے شاعروں، مصنفوں، ادیبوں، مشاعرے کی رپورٹ، اردو ادب سے متعلق ایک سے بڑھ کر ایک مقالے اور بہت کچھ۔ اردو اخبار عالم اسلام کو بھی بھرپور کور کرتے ہیں۔ چند اخبار کبھی کبھی انگریزی یا دوسری زبانوں کے اخباروں کے مقالے اور مضامین بھی شائع

کرتے ہیں۔ اردو اخباروں میں سیاسی، سماجی، اقتصادی، فلم، فیشن، صحت، سائنس اور خصوصی طور پر ان دنوں اور پہلے کا بھی مقبول، اسپورٹس کی خبریں، تبصرے وغیرہ دیکھے جاسکتے ہیں۔ لیکن کُل ملا کر وہ صرف 'اردو قوم' کے ہی اخبار لگتے ہیں۔ ہمیں اس سچائی کو بیان کرنے سے انکار نہیں کہ دوسری زبان کے اخبارات بھی ایک خصوصی سماج، طبقے اور زبان دانوں کی بہت حد تک نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔ اس میں اردو اخباروں کا ہی کیا قصور؟ بالآخر مراٹھی اخبار کون پڑھے گا؟ ظاہر ہے کہ مراٹھی بولنے والے ہی۔ اسی طرح گجراتی، کنڑ، تیلگو، بنگالی وغیرہ۔ علاقائی زبانوں کے اخبار بھی اُسی زبان کے بولنے والوں پر منحصر ہیں۔ وہی اُس کے قاری ہیں۔ اس لیے اُن زبانوں کے اخبار بھی اُن کی ہی روایتوں، کلچر، سماجی زندگی وغیرہ کی نمائندگی کریں گے۔ اس طرح اگر اردو اخبار بھی 'اردو قوم' کی نمائندگی کرتے ہیں تو اس میں غلط کیا ہے۔ لیکن افسوس اس بات پر ہے کہ دوسرے سبھی علاقائی زبانوں کے اخباروں کو قارئین کے ساتھ ساتھ اُس زبان کے صوبے سے بھی اخباروں کو بھر پور سرکاری اور دیگر اشتہارات ملتے ہیں۔ بدقسمتی سے اور چند دیگر وجوہات کی بنا پر ہمارے اردو اخبارات کو ایسی کوئی معاشی مدد نہیں ملتی یا بہت ہی کم ملتی ہے۔

دوسری طرف تقریباً ہر علاقائی زبان کے اخباروں کو اُس کے قارئین کا تعاون حاصل ہے۔ ملیالم، بنگالی، تمل، کنڑ، تیلگو اور مراٹھی وغیرہ کے قارئین بہت بڑی تعداد میں اپنی زبان کا اخبار خریدتے ہیں اور پڑھتے ہیں۔ کیرالا جیسے بہت ہی چھوٹے صوبے میں غریب سے غریب آدمی، ویسے وہاں غربت کم ہے اور عوام تعلیم یافتہ ہیں، کم سے کم دو اخبار تو خریدتا ہی ہے۔ اس لیے اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ کیرالا کا ''ماتر بھومی'' روزنامہ کئی لاکھ کی تعداد میں شائع ہوتا ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ غیر اردو زبان کے اخباری قارئین، اپنی زبان کے اخباروں کے ستون ہیں۔ اُن کی اشاعتی تعداد کی وجہ سے اشتہاری ایجنسیاں اُنھیں اشتہار دیتی ہیں۔

یہ ایک کڑوا سچ ہے کہ اردو اخبار کو قارئین کی مدد حاصل نہیں ہے۔ ایسا بھی نہیں کہ قاری پانچ چھ روپے کا روزانہ اخبار خرید نہیں سکتا اور یہ بھی نہیں کہ وہ اخبار پڑھنا نہیں چاہتا۔ اِتنا تو ماننا پڑے گا کہ زبان کے معاملے میں، خصوصی طور پر اردو کے معاملے میں وہ بے حد حساس ہے۔ موقع بے موقع وہ اردو کے لیے بڑی سے بڑی نہیں تو چھوٹی سی بھی قربانی دینے کو تیار ملے گا۔ دراصل

بچپن میں جب وہ روایت کے مطابق محلے کی مسجد سے ملحق مکتب، مدرسے میں مولوی صاحب یا گھر پر آپاؤں یا والدین سے عربی پڑھنا شروع کرتا ہے تو اُس کے ساتھ ساتھ وہ اردو بھی پڑھتا جاتا ہے۔ بھلے ہی کئی لوگ الف بے زبر سے آگے نہیں پڑھ پائیں، لیکن بڑی تعداد میں کچھ نہ کچھ اردو کی شُد بد ضرور رکھتے ہیں۔ چند صوبوں کو چھوڑ کر ملک کے دوسرے کئی صوبوں میں پھیلے ہوئے سیکڑوں گاؤں دیہاتوں میں چھوٹی سی تعداد میں ہی سہی، لیکن عربی کے ساتھ ساتھ اردو پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ آج بھی قائم ہے۔ ان گاؤں، دیہاتوں کے علاوہ چھوٹے موٹے قصبوں، شہروں اور ممبئی، دلّی، کولکاتا، حیدرآباد وغیرہ کے جھونپڑوں، جھگیوں میں رہنے والے اردو سماج کے طلبہ طالبات اپنی تعلیم کا آغاز عربی کے ساتھ ساتھ اردو سے بھی کرتے ہیں۔ آج بھی ممبئی کارپوریشن اور کئی پرائیویٹ اردو میڈیم کے اسکولوں میں اردو پڑھنے والے طلبہ طالبات کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ ہم اِس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ اسکول، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ہی اردو پڑھا لکھا طبقہ ہے۔ ویسے بھی ہمارے ملک میں جھونپڑے، جھگیوں میں رہنے والوں کو پڑھا لکھا نہیں سمجھا جاتا ہے۔ تعلیم یافتہ کی گنتی میں یہ غریب غربا نہیں آتے۔ حالانکہ معاشی اعتبار سے پچھڑے ہوئے لوگ ہی اردو سماج کی اکثریت ہیں۔ آپ کبھی بھی اُن کی جانب اردو اخبار کا کوئی صفحہ تھما کر دیکھیے۔ وہ نظریں گڑا کر غور سے اُسے پڑھنے کی کوشش کریں گے۔ افسوس ہمارے اخباروں نے اس طبقے کو نظرانداز کیا ہے۔ اِس طبقے کو قارئین کی صف میں لانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اردو اخبار اور اُس کے قاری، دو مختلف قطبین پر ہیں۔ اِس خلیج کو پُر کرنے کے لیے اخبار کو تبدیلی لانی ہوگی۔ اردو اخبار کے منتظمین کو سمجھنا ہوگا کہ اُس کے اصلی اور وفادار قارئین کون اور کہاں ہیں۔ یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی، ہندی یا کوئی اور زبان جاننے والا قاری سب سے پہلے انگریزی اخبار کو ترجیح دیتا ہے۔ خصوصی طور پر اردو سماج کا کھاتا پیتا متوسط اور نچلا متوسط طبقہ اردو جاننے پر بھی انگریزی اخبار کو ہی ترجیح دیتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے اور جو میرا مشاہدہ ہے اردو اخبار ویسے ہی انگریزی داں طبقے کو دھیان میں رکھتے ہیں۔ اخبار کے لیے وہی لوگ ہی اُس کے قاری ہیں۔ اُن میں انگریزی دانوں کے علاوہ چھوٹے بڑے سماجی، سیاسی، مذہبی، کیمونٹی لیڈران، تاجر، دُکاندار، اسکول کالج کے ٹیچر، وکیل، ڈاکٹر اور ایسے ہی چند

دوسرے کھاتے پیتے لوگ۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ اُس وقت اردو اخبار خریدتے ہیں جب چھوٹے بڑے فنکشن، نشستوں، جلسے جلوسوں، مذاکرے وغیرہ میں اُن کی شرکت کے متعلق رپورٹ یا تصویر شائع ہوتی ہے۔ یا بہت ہوا تو اخبار کا جمعہ اور اتوار ایڈیشن خرید لیا۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان میں بھی کتنے لوگ مکمل تو دور کی بات ہے اخبار کا چوتھائی حصہ بھی پڑھتے ہیں اور اُس پر اپنا ردِّ عمل ظاہر کرتے ہیں۔ وہ تو دُور کی کوڑی لانے کے برابر ہے۔ قابل غور ہے کہ اردو سماج کی یہ چھوٹی سی اقلیت ہے۔ چونکہ وہ صاحب رُسوخ بھی ہیں۔ اس لیے ظاہر ہے کہ اخبار اُن کی ہی سنے گا۔ لیکن کُل ملا کر سچ کچھ اور ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ جہاں اردو سماج کا قاری ہے، اخبار کی پہنچ وہاں تک نہیں ہے اور اگر اخبار وہاں پہنچتا بھی ہے تو قاری کی اکثریت اُسے نہیں خریدتی ہے۔

اِس مقالے کے سلسلے میں جب ہم نے اپنے رہائشی علاقے جوگیشوری میں چند لوگوں سے ملاقات کی تو دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ یہاں ایک اندازے کے مطابق تقریباً ایک لاکھ اردو داں طبقہ ہے۔ معاشی اعتبار سے اُن کی اکثریت اتنی بھی کمزور نہیں کہ چار پانچ روپے میں اردو اخبار نہیں خرید سکیں۔ لیکن ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہی جب مقامی ایجنٹ، ہاکرس اور گھروں میں اخبار پہنچانے والوں سے پتہ چلا کہ ممبئی سے شائع ہونے والے اردو اخبارات ڈیڑھ دو ہزار سے زیادہ فروخت نہیں ہوتے۔ اب آپ اسی سے اندازہ لگایئے کہ قاری کی تعداد کتنی ہو سکتی ہے۔ ہم نے جب چند لوگوں سے دریافت کیا کہ وہ اردو اخبار کیوں نہیں خریدتے؟ تو اُن میں سے ایک نے پلٹ کر پوچھا: ''کیوں خریدیں''؟ ہم نے آگے کچھ اور پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ بات سمجھ میں آ گئی۔ آگے بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔

اردو کا قاری خواہ اخبار کا ہو یا رسالے کا ہو یا کتابوں کا اپنے چاروں طرف طرح طرح کے انفارمیشن کے اُمنڈتے ہوئے مہاساگر کو دیکھ سُن رہا ہے۔ اُسے بٹن دبانے یا ٹچ کرنے سے ہی اُس کی ضرورت کی خبر اور معلومات مل جاتی ہے تو پھر وہ کاہے کو اخبار خریدے گا؟ اس سچائی کو بھی سمجھنا ہوگا کہ تیزی سے روز بروز بدلتے ہوئے سائنسی ایجادات اور تکنیک کے دَور میں جب انفارمیشن ٹیکنالوجی نے دُنیا کو محض ایک گلوبل ولیج میں تبدیل کر دیا ہے تو انسانی سماج کی ڈھیروں ویلیوز (Values) بھی روایتی اقدار سے آزاد ہو کر ایک جدید ترین طرزِ زندگی میں تبدیل ہو گئی

ہیں۔ اخبار ہی نہیں، ادب اور فکر وفن بھی اس بدلاؤ کا شکار ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے جب بہت کچھ بدلے گا تو قارئین کیوں نہ بدلیں گے۔ قارئین کا ذوق بھی بدلتا جارہا ہے۔ چنانچہ اس تبدیلی کے پیش نظر مُلک کے کئی مقبول انگریزی اور علاقائی زبانوں کے اخبارات اپنا چولا بدلتے رہے ہیں۔ گذشتہ صدی کی آخری دہائی سے جب گلوبلائزیشن کا روبوٹ سارے عالم پر حاوی ہونے لگا تو یوروپ امریکہ کے ساتھ ساتھ ہمارے یہاں بھی صحافتی میدان میں ایک جدید رُجحان دیکھنے کو ملنے لگا۔ اس رجحان میں خبروں سے لےکر اداریے، کالم، خصوصی مضامین وغیرہ میں مارکیٹ یعنی بازار چھانے لگا۔ پیج تھری Page three، الگ سے چمکتے دمکتے فلمی سپلیمنٹ، کارپوریٹ دُنیا کی ہلچل، فیشن، ہیلتھ وغیرہ کے ضمیمے اخبار کے ساتھ قاری کو پیش کیے جانے لگے۔

اس بھیڑ چال میں مُلک کے ایک مقبول ہندی روزنامے نے تو اپنی روش بدل کر رومن اسکرپٹ کے ساتھ دیوناگری میں بھی سرخیاں لگانے لگے ہیں اور اُن کی اخباری زبان رفتہ رفتہ اپنی روایت سے الگ ایک اور ہی ہندی ہوتی جارہی ہے۔ اُن پر اُنگلیاں اُٹھائی جاتی ہیں لیکن اخبار والوں کا کہنا ہے کہ وہ بدلتے ہوئے پاٹھکوں یعنی قاری کی پسند کا خیال کر کے ایسا کرنے پر مجبور ہیں، لیکن نہ جانے ہندی اخباروں کی ایسی کیا مجبوری تھی کہ ہماری اردو کے لفظ مخالفت کو دھڑلے سے خلافت میں تبدیل کر دیا۔

صحافتی فضا میں بدلاؤ ضروری ہے۔ کیا بدلنا ہوگا، کیسے بدلنا ہوگا، اِس پر خود اخبار سے جُڑے لوگ ہی فیصلہ کریں تو بہتر ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ آپ کو اپنے قاری کو بھی ساتھ لینا ہوگا۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بتایا، اردو اخبار سماج کے کس طبقے کا ہے، اُس کی سماجی، معاشی، ذہنی، علمی ترجیحات کو غور کرتے ہوئے اخبار کی سرخیاں، خبریں، کالم، تبصرے وغیرہ ہوں تو بہتر ہے۔ اُس کی روزانہ زندگی کی جدوجہد اور کاوشیں اخبار کے صفحات پر ہوں تو اُسے محسوس ہوگا کہ اخبار اُس کا اپنا اخبار ہے۔ اردو سماج کا قاری اپنے سماج کے اندرونی حالات سے اچھی طرح واقف ہے۔ وہ اپنے آس پاس کے اُن لوگوں کی ٹولیوں کو جانتا ہے جنھیں سوشل ورکر وغیرہ کہا جاتا ہے۔ اُس کی گلیاں اور نالیاں ہفتوں صاف نہیں کی جاتی ہیں۔ اُس کے علاقے میں روزانہ پانی کے لیے مارا ماری ہوتی ہے۔ پبلک ٹوائلٹ کا بُرا حال ہے۔ گندگی، بدبو، مچھر، مکھی، چوہے کے ساتھ اُسے

اور اس کے بال بچوں کو گزارہ کرنا پڑتا ہے۔ ایسے ماحول اور حالات میں سخت ضرورت ہے ایک ایسے ترجمان کی جو مسلسل اُسے ایک مناسب ڈھنگ کی زندگی جینے کی راہ بتائے۔ حکام اور حکومت کا دھیان دلائے۔ اس کے علاوہ بھی اردو اخبار کے اِس قاری کو بے روزگاری، صحت، مہنگائی، بچوں کی تعلیم وغیرہ وغیرہ کا سامنا کرنا ہی ہے۔ آسمان میں ڈھیروں سوراخ ہیں کم سے کم دو چار تو بھرنے ہی ہوں گے ورنہ آسمان پھٹ پڑے گا۔

اردو داں طبقے کے اردو قاری سے اخباروں کو مسلسل رابطہ بنائے رکھنا پڑے گا۔ سال دو سال میں کسی مشاعرے یا کسی کی تقریر سے کچھ نہیں ہوگا۔ البتہ یہ کام قاری سے ہی کرانا ہوگا۔ اخباروں کے ذریعہ، قارئین کے چھوٹے چھوٹے اصلاحی گروپ بنانے ہوں گے۔ بستیوں میں ان کے مسائل کے حل کے لیے اخبار کے صفحات استعمال کرنے ہوں گے۔ ایسی ساری کارکردگی کے لیے اخبار اور قاری کی مشترکہ کوشش ہونی چاہیے لیکن اس کا آغاز تو اخبار کو ہی کرنا پڑے گا۔ چونکہ بالآخر اسے تو ہر حال میں قاری کی ضرورت ہے۔ یقیناً کسی بھی اخبار کا قاری، اگر اخبار کے لیے سب کچھ نہیں ہے، تو بہت کچھ ضرور ہے۔

# اردو صحافت اور مالی مشکلات

جہانگیر قاطمی

جب بھی اردو زبان کی بقا کا تذکرہ ہوتا ہے زیادہ تر لوگ حد درجہ جذباتی انداز اختیار کرتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح اردو صحافت کے مسائل پر بھی عام طور پر معروضی نقطۂ نظر کے بجائے جذباتی انداز اختیار کیا جاتا ہے۔ اردو کے کسی عام صحافی یا اردو اخبارات ورسائل کے کسی عام قاری سے اگر آپ اردو صحافت کی موجودہ صورت حال کا احوال پوچھیں گے تو وہ اردو زبان کے ساتھ اردو صحافت کے حق میں ایک ایسی خیالی تصویر پیش کرے گا جیسے اردو صحافت ملک کی دیگر زبانوں کی صحافت کے مقابلے واقعی بہت ترقی یافتہ ہے۔ لیکن مجھ جیسے لوگ، جن کی زندگی کا بیشتر حصہ صحافتی دشت کی سیاحی میں گزرا ہے اور جن کا کام ہی خاص وعام تک خبروں کی ترسیل رہا ہے، خود اردو صحافت سے متعلق کسی ایسی خبر کو ترستے رہ جاتے ہیں جس سے اپنے قلب وجگر کی تسکین کا سامان کشید کر سکتے۔ اسے تاریخ کا جبر کہیں یا حالات کی ستم ظریفی کہ جس دن ملک پر آزادی اور جمہوریت کا در فضیلت کھلا تھا اسی دن اردو زبان اور اردو صحافت پر خود مختاری اور بااختیاری کا

باب فوقیت بند ہوگیا۔ جس زبان نے اپنی صحافت کے ذریعہ 1857 کی پہلی جنگ آزادی سے لے کر اگست 1947 کو یوم آزادی تک یعنی پورے 90 برس تک ملک کی آزادی، یکجہتی، خودمختاری اور جمہوریت کے لیے سب سے سخت جدو جہد کی اور سب سے زیادہ قربانیاں پیش کیں وہی زبان اور وہی صحافت آج اپنے ہم وطنوں کی بدگمانیوں اور بد اندیشیوں بلکہ نفرت کی شکار ہوکر اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی ہے۔ اس دور میں ہم یہ المیہ بھی دیکھ رہے ہیں اور برداشت کر رہے ہیں کہ فلموں اور ٹی وی کے ذریعہ اردو زبان ملک کے طول وعرض میں مقبولیت کی نئی منازل طے کر رہی ہے لیکن اس مقبول ہوتی ہوئی زبان پر اردو کی جگہ ہندی کا لیبل لگا ہوا ہے، اسے ملک کی لسانی اکثریت کلیجے سے لگائے ہوئے ہے اور حکومت بھی اپنی مہربانیوں اور بخششوں کے دروازے کھولے ہوئے ہے۔ اگر چہ یہ موضوع ہمارے مقالے کا سرنامہ نہیں ہے لیکن اردو زبان وادب کی ترویج اور اردو صحافت کی ترقی سے یہ اس قدر روابستہ و پیوستہ ہے کہ اسے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ بات بالکل سیدھی ہے کہ جو مسائل اردو زبان وادب کی ترقی میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں کم وبیش وہی مسائل اردو صحافت کے پاؤں کی بیڑی بنے ہوئے ہیں۔ یہاں ہمیں یہ اعتراف بھی کرنا ضروری ہے کہ آزادی کے بعد 68 برس کے طویل عرصے میں آتی جاتی حکومتوں نے اردو کو سہارا بھی دیا ہے۔ مختلف ریاستوں میں قائم اردو اکیڈمیاں، مرکزی حکومت کی سرپرستی میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ساہتیہ اکیڈمی جیسے ادارے اس کی گواہی کے لیے کافی ہیں۔

تاہم ان تمام باتوں کے باوجود موجودہ دور کے ساجی وسیاسی نیز معاشی مسائل کے پس منظر میں اردو اخبارات یا رسائل کا نکالنا اور انھیں مستقل چلانا وادیِ پُر خار میں آبلہ پائی کے مترادف ہے۔ آج کے زمانے میں اردو صحافت کو کئی قسم کے مسائل اور مشکلات کا سامنا ہے۔ ایک طرف وہ مسائل ہیں جن کا تعلق اگر چہ راست صحافت سے نہیں ہے لیکن پھر بھی انھیں نظر انداز کر کے اردو جرائد اور روز ناموں کو چلانا ممکن نہیں۔ دوسری قسم کے مسائل وہ ہیں جن کا تعلق راست صحافت سے ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ صحافت کی دنیا کے اندرونی مسائل ہیں۔ تیسری

قسم کے مسائل کو ہم روز مرہ کی مشکلات کہیں تو زیادہ صحیح ہوگا کیونکہ یہ تکنیکی نوعیت کے ہیں اور ان میں وہ مشکلات بھی شامل ہیں جو کام کرنے والی افرادی قوت سے نسبت رکھتی ہیں۔ یہ تمام مشکلیں دراصل اقتصادی مسائل سے وابستہ ہیں۔

اردو صحافت کا سب سے بڑا مسئلہ سرمائے کی کمی ہے۔ دہلی یا جنوبی ہند کے مقابلے میں مغربی بنگال کے حوالے سے یہ مسئلہ زیادہ سنگین ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تقریباً سبھی اخبارات اور رسائل کی ملکیت کسی فرد یا خاندان کے قبضے میں ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ کولکاتا یا مغربی بنگال میں اردو داں طبقے میں دولت مند افراد کی بہت کمی ہے۔ اگر چہ دو چار افراد ایسے ضرور ہیں جو ایک روز نامے کی کفالت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں مگر انھیں اردو صحافت سے کوئی دلچسپی نہیں کیونکہ اردو صحافت ان کے لیے کسی بھی طرح سے نفع بخش سودا ثابت نہیں ہوسکتی۔ آج کے دور میں جب نیوز پرنٹ، طباعت کے اخراجات، انفرا اسٹرکچر اور صحافیوں کے لئے تنخواہیں اور دیگر لوازمات بھاری سرمائے کا تقاضا کرتے ہیں جس کے لیے اوسط درجے کے کاروباری طبقے سے توقع نہیں کی جاسکتی ہے کہ وہ اردو کے لیے عشق کے اس بھاری پتھر کو اٹھا سکے۔ آج کی دنیا میں کاروبار میں کافی مسابقت ہے اور کوئی سرمایہ دار رقم کی واپسی کی توقع کے بغیر کہیں سرمایہ نہیں لگاتا۔

اس صورت حال کا واحد حل اشتراکی یا کوآپریٹو سسٹم ہے۔ کسی ایک سرمایہ دار پر انحصار نہ کر کے چند اوسط درجے کے کاروباری یا سرمایہ دار مل کر سرمایہ کاری کریں تو ایک معیاری روز نامہ نکال سکتے ہیں جو ایک طرف سو سے زائد افراد کو بلا واسطہ یا بالواسطہ روزگار فراہم کرسکتا ہے تو دوسری طرف اردو زبان اور صحافت کو بھی اس سے فروغ مل سکتا ہے۔

اردو اخبارات اور رسائل کا دوسرا سب سے بڑا مسئلہ اشتہارات کا ہے۔ چونکہ اخبارات کی اشاعت مسلسل سرمایہ چاہتی ہے اس کے لیے اشتہارات ہی کسی اخبار کے لیے سرمائے کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں۔ اردو اخبارات کو پرائیویٹ اشتہار تو ملتے نہیں لیکن سرکاری اشتہارات بھی دوسری زبانوں کے مقابلے میں کم ہی ملتے ہیں۔ عام طور پر مرکزی اور ریاستی

حکومتیں لسانی بنیاد پر اشتہارات کا ایک کوٹہ مقرر کر دیتی ہیں جس میں اردو کا کوٹہ کم رہتا ہے۔ سرکاری اشتہارات سرکولیشن کی بنیاد پر دیے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں عام طور پر اردو اخبارات کا سرکولیشن کم ہوتا ہے لیکن مغربی بنگال میں یہ تشویشناک حد تک کم ہے۔ یوں تو شائع ہونے والے روزناموں کی تعداد کم از کم 8 ہے لیکن ان میں کسی کی سرکولیشن دس ہزار سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ ایک دائمی مسئلہ ہے۔ اردو قارئین دیگر زبانوں کے قارئین کے مقابلے میں بہت کم اخبارات کتابیں یا رسالے خرید کر پڑھتے ہیں۔ سرکولیشن کم ہونے کی وجہ سے نجی اشتہارات تو ملتے نہیں البتہ جو سرکاری اشتہارات ملتے ہیں ان کا ریٹ بھی بہت کم ہوتا ہے۔ اس طرح اردو اخبارات کو سرمایہ نہیں ملتا جو اخبار کے معیار کو بلند کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ باوجود کوششوں کے اسے اب تک دور نہیں کیا جاسکا۔ تاہم ایک صورت اس کے حل کی یہ ہوسکتی ہے کہ اخبارات میں کلاسیفائیڈ اشتہارات کو فروغ دیا جائے جو کم ہی سہی لیکن اخبار کے لیے مسلسل سرمائے کا ایک ذریعہ بن سکتے ہیں۔

اردو صحافت کو درپیش دیگر مسائل میں انفرااسٹرکچر کی کمی کے ساتھ انتظامی امور کے لیے ماہر افراد اور اچھے صحافیوں کی کمی بھی ہے۔ یہ تمام مسائل اقتصادی یا مالی پہلو سے جڑے ہوئے ہیں۔ لہٰذا جب تک مالی مسائل حل نہیں ہوتے دیگر مسائل بھی حل نہیں ہوسکتے۔ اردو صحافت کی ترقی کے لیے اردو دانوں کے تقریباً ہر طبقے کو اپنے اپنے حصے کی قربانی دینی پڑے گی اس کے بغیر نہ اردو ترقی کرسکتی ہے اور نہ اردو صحافت۔

# اردو صحافت

## بحوالہ زبان، معیار، ترجمہ اور ادارت

اشرف استھانوی

صحافت خبروں کی ترسیل اور ابلاغ کا ایک ایسا فن ہے جو کئی اعتبار سے چیلنجنگ ہوتے ہوئے ترقی کے راستے پر رواں دواں ہے۔ اس کے لیے کافی محنت اور جفاکشی درکار ہے۔ ایک صحافی کو بیک وقت بہت سی پر خار وادیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس فن میں کمال اور شہرت حاصل کرنے کے لیے ذہنی بیداری، حقیقت پسندی، بلند خیالی، اعلیٰ تعلیمی لیاقت، زبان و بیان پر عبور، ترجمہ نگاری میں مہارت اور معلومات عامہ سے پوری واقفیت کے ساتھ ساتھ حالات حاضرہ پر گہری نظر کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ صحافت صرف خبروں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دینے کا نام نہیں ہے بلکہ خبریں کہاں سے آئیں، کیسے آئیں، زبان کیسی ہو، انداز بیان کیا ہو ان ساری باتوں کا خیال رکھے بغیر صحت مند صحافت کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا ہے۔

اخبار صرف خبروں کا مجموعہ نہیں ہوتا اور نہ ہی اسے صرف خبروں کے حصول کے لیے پڑھا جاتا ہے۔ اس ترقی یافتہ دور میں صحافت کا دائرہ کافی وسیع ہو چکا ہے۔ اخبار کے اداریے،

کالم، مضامین، تجزیے اور تبصرے، علمی اور پُر مغز ہوں۔ خبروں کی زبان بھی سہل اور صاف ستھری ہونی چاہیے۔ اخبار چونکہ معمولی پڑھے لکھے انسان سے لے کر اعلیٰ تعلیم یافتہ تک بھی پڑھتے ہیں اس لیے اس کی زبان ایسی ہونی چاہیے جسے عام قاری سمجھ سکتا ہو۔ اخبار میں اگر پیچیدہ، مشکل اور مبہم الفاظ استعمال کیے جائیں، تو عام قاری کے لیے نا قابل فہم ہو جائے گا۔ اس کے برعکس اگر زبان سادہ، آسان اور قابل فہم ہوگی تو ہر ایک اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے گا۔ آسان زبان ترسیل کے لیے بہت موثر ہوتی ہے۔ صحافتی زبان کیسی ہونی چاہیے اس کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر مسکین علی حجازی رقم طراز ہیں:

> ''عام تحریر خواہ کتنی بھی عموی نوعیت کی ہو، وہ بہر حال پڑھنے والوں کے مخصوص گروہ کے لیے ہوتی ہے۔ کسی علمی موضوع پر لکھا ہوا مضمون بنیادی طور پر انھیں لوگوں کے لیے ہے، جو اس میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ کوئی ادب پارہ متعلقہ صنف سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ہی ہوتا ہے اور یہ متعلقہ مخصوص گروہ مطلوبہ تعلیمی اور ذہنی سطح کے ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس خبر بہت سے اور عام لوگوں کے لیے ہوتی ہے اور ان لوگوں میں ہر تعلیمی اور ذہنی سطح کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔ چنانچہ خبر کی زبان کو زیادہ سے زیادہ آسان بنانے کی ضرورت ہے۔ عام تحریر میں مواقع کے مطابق طول کلام، تکرار، تشبیہ و استعارہ اور رمز و کنایہ کے استعمال اور بالواسطہ بات کہنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ مگر خبر کی تحریر میں ان باتوں کی گنجائش نہیں ہوتی۔ خبر میں معروضیت کو ملحوظ رکھنا ہوتا ہے اور صرف خبر کو کم سے کم اور سادہ سے سادہ الفاظ میں بیان کرنا ہوتا ہے۔'' (فن ادارت)

صحافتی زبان سادہ، عام فہم اور چست درست ہونی چاہیے۔ زبان کے اصول وقواعد، محاورے، ضرب الامثال اور الفاظ کی ساخت و پرداخت کا خاص خیال رکھنا ضروری ہے۔ خالص ادبی الفاظ کے استعمال سے پرہیز کیا جائے لیکن اس کا خیال رہے کہ زبان سادہ اور عام فہم ہونے کے باوجود تحریر کی شگفتگی اور چاشنی باقی رہے اور قاری کے لیے بیزاری کا باعث نہ بنے۔ رہنمائے

صحافت کے مصنف ادبی اور صحافتی زبان کے فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ادیب ہو یا صحافی الفاظ کے ذخائر دونوں کے پاس ہوتے ہیں، لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ ادیب تخیلات کی دنیا میں پرواز کرتا ہے، وہ اپنی تحریر میں حسن و جمال پیدا کرنے کے لیے مسجع و مقفع الفاظ، استعارے و تمثیلات کا سہارا لے کر خالصتاً ادبی اسلوب میں پیش کرتا ہے جبکہ صحافی حقیقت شناسی سے کام لیتا ہے۔ اس کی تحریر میں حسن کے ساتھ ساتھ سچائی، سادگی، روانی اور بیباکی ہوتی ہے۔ صحافی کا حسن سادگی اور اختصار ہے اور ادیب کا طول کلام اور الفاظ کی ظاہری ٹیپ ٹاپ ہی اس کی اصلی خوبی بھی جاتی ہے۔'' (رہنمائے صحافت: ص191)

صحافت کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ ادب کی طرح جامد نہیں ہوتی۔ اسے وقت کی رفتار کے ساتھ چلنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی ہوا کے رخ کے ساتھ اور بعض اوقات ہوا کے رخ کے مخالف بھی۔ اردو صحافت کا ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اب بھی اپنے کو زمانے کے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں کر سکی ہے۔ یو این آئی کے علاوہ جتنے بھی قومی و بین الاقوامی اہم خبر رساں ادارے ہیں وہ انگریزی یا دوسری زبانوں میں خبریں بھیجتے ہیں۔ ان خبروں کو شائع کرنے کے لیے پہلے ان کا ترجمہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے یہ کام وقت طلب ہے۔ اس کی وجہ سے خبروں کی ترسیل میں قدرے تاخیر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کے قارئین تک پہنچنے سے پہلے وہ دوسری زبانوں کے قارئین تک پہنچ چکی ہوتی ہیں۔ اردو کے قارئین کو عموماً یہ شکایت ہوتی ہے کہ اردو کے مقابلے میں ہندی اور انگریزی اخبارات کی خبریں زیادہ تازہ ہوتی ہیں۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ ہندی اور انگریزی اخبارات کو راست طور پر ہندی اور انگریزی زبان میں قومی و بین الاقوامی خبریں موصول ہو جاتی ہیں جس کی وجہ سے وہ ترجمہ نگاری کے وقت طلب امر سے بچ جاتے ہیں اور خبریں بروقت قارئین تک پہنچ جاتی ہیں۔

اردو صحافت نے بھی حال کے پندرہ بیس برسوں کے دوران ترقی کی مختلف منزلیں طے کی ہیں۔ لیکن صورت حال ابھی بھی اطمینان بخش نہیں ہے۔ سب سے پہلی بات اردو صحافت

میں باصلاحیت اور مستعد افراد کی کمی ہے۔ جو ہیں بھی انھیں اپنی صلاحیت کو نکھارنے کے مواقع حاصل نہیں ہیں۔ وہاں کسی صحافتی مہم کے لیے اپنے صحافیوں کو تیار کرنے کی بات سے قطع نظر صحافت کے روزمرہ کے کاموں کو بہتر ڈھنگ سے انجام دینے کے لیے کوئی ورکشاپ بھی نہیں ہوتی ہے۔ بیشتر اردو اخبارات کے مالکان کی نگاہ اپنے اخبارات کے معیار سے زیادہ اس کی آمدو خرچ پر رہتی ہے۔ کم خرچ اور زیادہ منافع کے چکر سے اردو صحافت جب تک باہر نہیں نکلے گی، عصری تقاضوں سے عہدہ برآ ہونا اس کے لیے آسان نہ ہوگا۔

معیاری اردو صحافت کے لیے اخباروں اور رسالوں کا گیٹ اپ اتنا زیادہ اہم نہیں جتنا کہ اس کی زبان۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی اردو اخبارات بالخصوص روزناموں کی حالت بہت اچھی نہیں ہے۔ جو خبریں ترجمے کے ذریعہ حاصل کی جاتی ہیں وہ مفہوم کے اعتبار سے اکثر ناپختہ ہوتی ہیں اور ویسا تاثر پیدا نہیں کر پاتی ہیں جیسا کہ ہونا چاہیے۔ یہ سب کچھ ان افراد کی صلاحیت اور ان کے تجربے پر مبنی ہوتا ہے جو ترجمہ جیسے اہم کام پر مامور ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی اخبار کے ادارتی شعبے کے ذمہ داروں پر بھی جو ان خبروں کو آخری شکل دیتے ہیں اس جانب متوجہ ہونا ضروری ہے۔ کسی بھی مواد کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنا آسان کام نہیں ہے۔ مگر ایک تجربے کار اور زبان پر عبور رکھنے والا صحافی اس طرح ترجمہ کرتا ہے کہ اصل تحریر کی روح متاثر ہوئے بغیر مقصد اور مفہوم بالکل واضح ہو جاتا ہے، جملہ بے ربط ہوتا ہے اور نہ ہی تحریر کی دلکشی اور شگفتگی میں کمی واقع ہوتی ہے۔

گذشتہ چند دہائیوں سے اردو اور دوسری سرکاری زبانوں کے ترجمے کا دائرہ کافی وسیع ہوا ہے۔ اطلاعاتی ٹکنالوجی کے انقلاب نے اردو اخبارات و رسائل کے علاوہ آن لائن نیوز سروس سے انگریزی اور ہندی سمیت دوسری زبانوں کی صحافت کو بھی ترجمے کی تحریک دی ہے۔

ترجمہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ اردو زبان کے ساتھ جس زبان سے ترجمہ کر رہا ہو اس پر بھی عبور رکھتا ہو۔ حالات و واقعات پر گہری نگاہ ہو۔ تیز رفتار اور مستعد ہو۔ اشارتی نوٹ کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ انگریزی زبان کی اصطلاحات اور مختصرات سے واقفیت رکھتا ہو۔ ویسے اب ترجمہ نگاری کے فن میں کافی نکھار پیدا ہوا ہے۔ اس کو جدید تکنیک سے ہم آہنگ کرنے

کی کوشش کی جارہی ہے۔ کمپیوٹر میں ایسے سافٹ ویئر آچکے ہیں جن کے ذریعہ ترجمہ کا کام بہت حد تک آسان ہو گیا ہے۔ اخبارات کے دفاتر میں اس سے کام بھی لیے جارہے ہیں۔ لیکن کمپیوٹر کے ذریعہ ترجمے کو تصحیح کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس میں ترمیم و اضافہ کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ کمپیوٹر میں بعض دفعہ ترجمے غلط ہوتے ہیں یا لفظی ترجمے موقع کے مطابق نہیں ہوتے ہیں جن سے جملے بے ربط ہو جاتے ہیں اور مفہوم کے سمجھنے میں دشواری پیدا ہوتی ہے۔ مترجم کو لفظی ترجمے کے بجائے مفہوم کی ادائیگی پر دھیان دینا چاہیے۔ لفظ بہ لفظ اور سطر بہ سطر ترجمہ کرنے سے گریز کرنا چاہیے پورا پیراگراف یا پھر پوری خبر ایک بار پڑھ کر اچھی طرح سمجھ کر اس کو اپنی زبان میں لکھ دینا چاہیے۔

نامور صحافی شکیل حسن شمسی ترجمے کے حوالے سے تحریر کرتے ہیں:

> ''ترجمہ تکنیکل ہونا چاہیے۔ یعنی کسی بھی خبر کا لفظ بہ لفظ ترجمہ کرنا یا کسی عبارت کا لفظ بہ لفظ ترجمہ نہ کرکے اصل زبان میں بیان کیے گئے مفہوم کو اپنے قارئین تک پہنچانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ لفظی ترجمہ اکثر و بیشتر مفاہیم کو ادا کرنے کے بجائے قارئین کو کنفیوژن میں ڈال دیتا ہے۔ اس لیے ترجمہ ہمیشہ تکنیکی ہونا چاہیے۔''　(اردو میڈیا۔ ص:252)

ترجمہ نگاری کے اصولوں پر عبدالمجید سالک نے اس طرح روشنی ڈالی ہے:

> ''اخباری ترجمے میں سب سے مقدم مصلحت یہ ہے کہ مطلب بالکل واضح اور عبارت قطعی طور پر سلیس ہو تا کہ قاری کو کوئی الجھن نہ ہو۔ اس کے لیے اپنی زبان کا محاورہ سب سے بہتر اور معاون ہے۔ اگر اخباری مترجم سادگی، سلاست اور محاورۂ اردو کو مدنظر رکھ کر ترجمہ کرے تو خود بھی آرام سے رہے اور پڑھنے میں ذہن بھی نہ الجھے۔ ہونا یہ چاہیے کہ جہاں انگریزی فقرے کی ترکیب پیچیدہ اور طویل ہو وہاں اس کی چیر پھاڑ کردے۔ پیچیدہ فقروں کو چند سادہ فقروں میں تقسیم کردے اور ترجمہ کرنے کے بعد ایک بار ضرور نظر ثانی کرلے''۔

پاکستان کے نامور صحافی چودھری رحم علی ہاشمی اپنی کتاب 'فنِ صحافت'' میں ترجمے کے

اصولوں سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''انگریزی زبان سے سلیس اردو زبان میں ترجمہ کرنے کا ایک یہ گر مترجم کو سیکھنا لازم ہے کہ جو، جس اور جن سے فقرے کو پیچیدہ نہ بنائے۔ چونکہ ان کی انگریزی میں بڑی کثرت ہوتی ہے۔ ہماری زبان میں ربط و ضبط کی دوسری تدبیریں کام میں لائی جاتی ہیں۔ بیان کے متعینہ و شگفتہ اور متعدد پیرائے اردو میں موجود ہیں۔ سوائے فنی اصطلاحات کے۔ بلیغ اور پر معنیٰ الفاظ کا ذخیرہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ البتہ انھیں برتنے کے لیے مترجم کی علمی استعداد بلند اور معیاری ادب سے اسے خوب واقفیت ہونی چاہیے۔''

ترجمے کے بعد خبر کو آخری شکل مدیر کے قلم سے دی جاتی ہے۔ خبر سازی کے اس مرحلے میں لفظوں کے انتخاب اور جملوں کی ترکیب پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ خبروں کی اہمیت کے اعتبار سے ان کے لیے جگہ کے تعین کے ساتھ ساتھ ان پر سرخی لگانے کا کام بھی اسی مرحلے میں کیا جاتا ہے۔ اس کام میں بھی کافی مہارت درکار ہوتی ہے۔ خبروں کی اہمیت کی سمجھ کا انحصار بھی خاص فکر و نظر پر ہوتا ہے۔ مدیر قارئین سے کیا توقع کرتا ہے وہ اس کی پیش کش کے انداز سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحافی کی فکر و نظر کی پوری عکاسی اس کے زبان و بیان اور لفظوں کے انتخاب، جملوں کی ترکیب، خبروں کے تعین اور انتخاب اور ان پر لگائی گئی سرخی سے ہوتی ہے۔

خبر کی سرخی بھی بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ اس کے بغیر خبر مکمل نہیں ہوتی ہے۔ انگریزی کے مشہور صحافی اوپی ورما اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

''کم سے کم الفاظ اور اک سطری سب سے اچھی سرخی ہوتی ہے۔ اسے یاد رکھا جا سکتا ہے۔ اور لوگ اسے پسند بھی کرتے ہیں۔ جب اندرا گاندھی کو قتل کیا گیا تھا تو اس وقت نو بھارت ٹائمس نے ایک لفظی سرخی ''مہا شوک'' لگائی تھی اور جب ان کی آخری رسومات ادا کی گئیں تو اسی اخبار نے صرف ''مہایاترا'' کی سرخی لگائی تھی۔ لوگوں کو اب بھی یہ سرخی یاد

ہے۔ اسی طرح حال ہی میں چلتی کار میں عورت کی عصمت دری پر ایک اخبار نے سرخی لگائی ''شرم''۔

وہ آگے اچھی سرخی کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

i۔ فعل ماضی کے بجائے ہمیشہ فعل حال کو ترجیح دیں۔ ii۔ سرخی ہمیشہ مختصر اور کم سے کم الفاظ پر مشتمل ہو۔ iii۔ سرخی ایسی ہونی چاہیے جو اسٹوری کے اہم نکتے کو واضح کرے۔ iv۔ سرخی عام ہونے کے بجائے خاص ہونی چاہیے۔ v۔ ذو معنی یا ہتک آمیز الفاظ سے گریز کرنا چاہیے۔ vi۔ سرخی ایسی ہو جو قاری کو اسٹوری پڑھنے پر مجبور کرے۔ vii۔ سرخی میں ''محمد'' یا مذہبی دیوتاؤں کے ناموں کے استعمال سے گریز کرنا چاہیے۔ viii۔ سرخی میں اے، این یا اسی طرح کے الفاظ استعمال نہیں کرنے چاہئیں۔ ix۔ سرخی صفحے کے ڈیزائن اور گٹ اپ کی مناسبت سے ہونی چاہیے۔ (اردو میڈیا۔ ص:31-130)

الختصر اخباروں اور رسالوں میں مدیر کا کام بڑی ذمہ داری کا ہوتا ہے۔ کسی بھی تحریر کو بہتر اور خوبصورت بنا کر پڑھنے کے قابل بنا دینے کو ادارت کہتے ہیں۔ یہ بھی ایک فن ہے۔ اس کے لیے تربیت اور تجربے کی ضرورت پڑتی ہے۔ جو صحافی اس کام پر مامور ہوتا ہے اسے مدیر اور اس کے معاون کو سب ایڈیٹر کہا جاتا ہے۔ ایڈیٹنگ میں املے، جملے، گرامر اور اصطلاحوں کی ساخت وغیرہ کو درست کرنا، خبروں کو اہمیت اور صفحے کی مناسبت سے ترتیب دینا وغیرہ شامل ہے۔ سب ایڈیٹر کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ خبروں کو درست کر کے اس طرح تیار کرے کہ وہ بالکل منصفانہ، غیر جانبدارانہ اور درست ہوں۔ وہ کسی قسم کی توہین کا باعث اور نہ ہی وہ کسی اشتعال کا باعث ہوتی ہوں۔ کون سی خبر کس درجے کی ہے، اسے اخبار میں کون سا مقام ملنا چاہیے یہ فیصلہ مدیر کرتا ہے۔ خبریں چھوٹی بڑی، اہم اور غیر اہم ہر طرح کی ہوتی ہیں۔ مدیر کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ حقائق و واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے خبر کی اہمیت کو پہچان کر اسے مناسب جگہ پر لگائے۔

صحافت میں ایڈیٹنگ بہت ہی اہم کام ہے، کیونکہ اخبار کی اصل روح خبر ہوتی ہے۔

اس میں کمی آجانے سے اخبار کی شبیہ مجروح ہوتی ہے اور قارئین کا اعتماد اٹھنے لگتا ہے۔ ہر روز اخبارات کے دفاتر میں بے شمار خبریں ای میل، فیکس، پریس ریلیز وغیرہ کی صورت میں موصول ہوتی ہیں ۔ ظاہر ہے انھیں بنانے، سنوارنے ، سرخیاں لگانے اور قابل اشاعت بنانے کی ذمہ داری مدیر کی ہوتی ہے۔ بڑے اخبارات میں مدیر کی معاونت کے لیے کئی کئی سب مدیر ہوتے ہیں۔ سبھوں کو ان کی دلچسپی کے مطابق کام تقسیم ہوتا ہے۔ مثلاً سیاسیات ، اقتصادیات، تعلیمات، سماجیات، خواتین و اطفال، اسپورٹس اور ادب و ثقافت وغیرہ۔ چونکہ بیشتر اردو اخبارات کے مالکان کم پونجی میں زیادہ منافع کمانے کے خواہاں ہوتے ہیں اس لیے ان کے یہاں عملے کی کمی ہوتی ہے نتیجتاً اردو اخبارات و رسائل کے دفتروں کا صحافتی نظام خاطر خواہ ڈھنگ سے بہتر اور چست درست نہیں رہتا۔ مناسب اجرت نہ ملنے کی وجہ سے باصلاحیت افراد اردو صحافت میں آنے سے بھی گریز کرتے ہیں۔ جو عملہ کام کرتا ہے اسے بھی وقت پر تنخواہ نہیں مل پاتی۔ انہماک اور دلجمعی کے ساتھ کام کا ماحول نہیں بن پاتا۔ یہی وہ صورت حال ہے جو اردو صحافت کو صحافت کے عصری تقاضوں کی تکمیل اور اس کے مطلوبہ معیار تک پہنچنے کی راہ میں حائل ہے۔ اردو صحافت کو معیاری بنانے اور دیگر ترقی یافتہ زبانوں کی صحافت کے مقابل کھڑا کرنے کے لیے ان رکاوٹوں کو دور کرنا ہی پڑے گا۔

# اردو صحافت کے چند ناخوشگوار پہلو

پروفیسر مصطفیٰ حسین

میرا تعلق نہ تو پیشۂ صحافت سے ہے اور نہ ہی میں اردو ادبیات کا ماہر ہوں۔ میرا پیشہ بنیادی طور پر علومِ عمرانیات ہے اور ہر چند کہ میں نے کئی برسوں تک ڈینش ذرائع ابلاغ میں اور یورپی میڈیا میں تارکین وطن اور اسلام کے بارے میں لکھے یا پیش کیے جانے والے سواد پر باضابطہ تحقیق کی ہے اور اس سلسلے میں ایک جامع کتاب لکھی اور سائنسی جریدوں میں متعدد مقالہ جات کا مصنف بھی ہوں۔ تاہم اردو صحافت کے بارے میں میری تحقیق یا تجزیہ بے حد محدود ہے۔

اردو ذرائع ابلاغ اور پیشہ ورانہ صحافت کے بارے میں میری دلچسپی یا توجہ اس وقت مبذول ہوئی جب 1994 میں جناب نصر ملک صاحب کی سفارش اور رابطے کی بنا پر مجھے ڈنمارک کے سرکاری ریڈیو، ریڈیو ڈنمارک کے شعبۂ اردو میں کام کرنے کا موقع میسر ہوا اور ہندوستانی، پاکستانی اردو اخبارات کا مطالعہ پیشہ ورانہ معمول بن گیا۔ یاد رہے کہ یہ وہ دَور تھا جس کے دوران انٹرنیٹ میڈیا یا آن لائن اردو میڈیا منظرِ عام پر نہیں آیا تھا۔

لیکن چند ہی برسوں بعد آن لائن اردو میڈیا نے صحافت کے پیشے میں ایک طوفان برپا

کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اب ہر ایک ایرا غیرا یا تو صحافی یا پھر مدیر بنتا گیا اور بن رہا ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب میں ڈنمارک ریڈیو میں ملازمت کر رہا تھا تو ایک بار ہمارے مدیر اعلیٰ نے خبر یا نیوز کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اگر ایک کتا کسی انسان کو کاٹ لے تو یہ واقعہ کوئی نیوز یا خبر نہیں ہے۔ البتہ اگر ایک انسان کسی کتے کو کاٹ لے تو یہ ایک خبر ہے اور اسے کسی بھی خبر نامے یا اخبار کے سرورق پر شائع کرنے کے لیے کوئی بھی صحافی بے خبر نہیں ہو سکتا۔ بہر حال 1995 کے بعد میں نے ریڈیو صحافت کو خیر باد کہتے ہوئے سوشیالوجی یا علوم عمرانیات میں پی ایچ ڈی کی تعلیم حاصل کرنے پر توجہ مرکوز کر دی اور اسی نسبت سے میں نے ڈینش میڈیا کو تنقیدی انداز میں دیکھنا، پڑھنا اور اس طرح کی صحافت کے معاشرے پر پڑنے والے منفی اثرات کو اپنے پی ایچ ڈی تھیسس کا عنوان منتخب کیا۔ انگریزی میں اور سوشل سائنسی اصطلاح میں اسے سوشیالوجی آف ماس کمیونیکیشن کہا جاتا ہے۔

بہر حال آیئے اور واپس لوٹتے ہیں کہ اردو جرنلزم میں آج کل کیا وطیرہ چل نکلا ہے۔ اولاً تو میرے مشاہدات پاکستانی میڈیا اور دوئم یورپ میں شائع یا نشر ہونے والے اردو میڈیا تک محدود ہیں۔ ان مشاہدات کے پس منظر میں مختصراً چند پہلوؤں کا احاطہ کر پاؤں گا جو میں یہ سمجھتا ہوں کہ اردو زبان کے فروغ و ترقی میں شامل احباب کے لیے بھی باعث فکر ہونا چاہیے:

1- اردو جو کہ ایک انتہائی پیاری اور شائستہ زبان ہے۔ وہ اَن گنت ٹی وی اور ریڈیو چینلز اور آن لائن میڈیا کے ہاتھوں تنزلی کا شکار ہوئی جا رہی ہے اور یہ بھی ایک اہم وجہ ہے کہ ہماری نئی نسلیں اس اردو میڈیا سے دور ہوئی جا رہی ہیں۔
2- انٹرنیٹ میڈیا کی عام رسائی کے بعد ہر کوئی صحافی اور مدیر بنتا جا رہا ہے اور اِس روش یا انگریزی میں جسے Trend کہتے ہیں، اس کی بنا پر اردو صحافت کا بیڑا غرق ہو رہا ہے۔
3- مبالغہ آرائی اور چربہ سازی اردو ادب اور صحافت کے نام پر معمول بنتی جا رہی ہے اور یہ ہماری پیاری اور شائستہ زبان کی ترویج و ترقی کی راہ میں ایک اہم المیہ ہے، جس کا سد باب کیا جانا وقت کی ایک اہم ضرورت ہے اور اس کا اہم حل ان چربہ سازوں اور نام نہاد اور ذاتی مفاد پرستوں کو بے نقاب کرنا ضروری ہوتا جا رہا ہے جو محض شہرت حاصل کرنے کی

کاوش میں ضمیر تو کیا خود سے اعلان کر دیتے ہیں:

ے ہم ہیں متاعِ کوچہ و بازار کی طرح

4 ۔ ایک اور اہم پہلو جو ہم فروغ اردو کے لیے کبھی نہ بھولیں۔

''زبانیں زندہ رہتی ہیں، زبان کے عام فہم استعمال سے نہ کہ...... پیچیدہ سائنسی اصطلاحات یا مرکبات سے جو کہ تجزیاتی وتنقیدی مقاصد کے لیے وجود میں آتے ہیں۔ اردو میڈیا کی زبان کو پیچیدہ فارسی یا عربی مرکبات کے استعمال سے دور رکھا جائے۔''

# اردو صحافت اور مالی بحران

شکیل رشید

ہری ہر دت کی ملکیت اور سدا سکھ لعل کی ادارت میں اردو کا پہلا عوامی اور مطبوعہ اخبار 'جام جہاں نما' شہر کلکتہ سے 8 مارچ (ایک تحقیق کے مطابق 27 مارچ) 1822 کو شروع ہوا، اور 23 جنوری 1828 کو یعنی چھ سال کے بعد بند ہو گیا۔ 'جام جہاں نما' فارسی زبان میں بھی شائع ہوتا تھا اور اردو زبان میں بند ہونے کے بعد بھی عرصے تک چھپتا رہا۔

'جام جہاں نما' کے مالک اور مدیر نے اخبار کی اشاعت بند ہونے کی دو وجوہات بیان کی ہیں۔ ایک تو قارئین کی عدم دلچسپی اور دوسری، سرکاری مراعات کا فقدان، جسے آسان اور سادہ زبان میں 'اقتصادی بحران' کہا جا سکتا ہے۔ آج 'جام جہاں نما' کی اشاعت کو بند ہوئے تقریباً 188 سال بیت چکے ہیں مگر ان گزرے ہوئے برسوں میں اردو زبان کے بے شمار اخبارات، رسالے ہفت روزہ اور پندرہ روزہ قارئین کی عدم دلچسپی اور سرکاری مراعات کے فقدان یعنی اقتصادی بحران کے سبب بند ہو چکے ہیں۔ میں یہاں بات صرف شہر ممبئی کی کرنا چاہوں گا۔ اس شہر میں اردو صحافت کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور 1834 سے 1914 تک،

دوسرا دور 1915 سے 1947 تک اور تیسرا دور 1948 سے تا حال۔ ان تین ادوار میں ممبئی کے اردو اخباروں پر کیا بیتی اور وہ کن مراحل سے گزرے اور کیسے ان کی سانسیں ٹوٹ گئیں، اس کا ذکر آگے آئے گا مگر اس سے پہلے اردو صحافت کے 'اقتصادی مسائل'، پر قدرے تفصیلی بات کرنا ضروری ہے۔

جہاں تک اردو صحافت کے 'اقتصادی مسائل' کا سوال ہے تو یہ مسائل دوسری زبانوں کے اخبارات سے کچھ الگ نہیں ہیں۔ آج گلوبلائزیشن کے اس دور میں دنیا ایک چھوٹے سے گاؤں میں تبدیل ہو چکی ہے۔ آزاد معیشت اور 'کھلے بازار' کا چلن ہے۔ 'کھلی منڈی' نے سرکاروں کے رویے کو بھی بڑی حد تک تبدیل کیا ہے۔ اب ان سرکاری مراعات کا سلسلہ بند ہو چکا ہے جو پہلے حاصل تھیں۔ اب سرکار کی طرف سے پہلے کی طرح 'سبسڈی' کی چھوٹ نہیں دی جاتی۔ اخبارات کو کاغذ، طباعت کے انتظام، ٹرانسپورٹ کے اخراجات حتیٰ کہ تنخواہوں کے تعلق سے بھی کوئی خصوصی رعایت حاصل نہیں ہے۔ پہلے اسٹیٹ ٹریڈنگ کارپوریشن (STC) کے ذریعے اخبارات کو درجہ بندی کے لحاظ سے مراعات فراہم کی جاتی تھیں۔ رعایت دی جاتی تھی۔ چھوٹے اخبارات درجہ بندی کے لحاظ سے رعایت پاتے تھے۔ اب چونکہ 'کھلی منڈی' ہے لہٰذا چھوٹے اور بڑے اخبارات ایک ہی لاٹھی سے ہانکے جاتے ہیں۔ سب کو ہی منڈی سے کاغذ بھی لینا ہے اور دوسری اخباری ضرورتیں بھی وہیں سے پوری کرنی ہیں لہٰذا اخبار چاہے اردو زبان کا ہو کہ ہندی، مراٹھی، گجراتی، انگریزی یا کسی اور زبان کا اس کی طباعت پر لاگت تقریباً یکساں ہی آتی ہے۔ اس کا نتیجہ خسارے کی شکل میں نکلتا ہے۔ مثلاً اگر آٹھ صفحات کا اخبار شائع کرتا ہے تو اوسطاً ایک اخبار چھ روپے میں تیار ہوتا ہے لیکن اسے چھ روپے میں بیچا نہیں جاسکتا۔ قیمت دو سے تین روپے ہی رکھنی ہوتی ہے لہٰذا ہر اخبار کی ایک کاپی پر تین سے چار روپے کا خسارہ آتا ہے۔ جس اخبار کی اشاعت جتنی زیادہ ہوگی خسارہ بھی اسی قدر زیادہ ہوگا اور جس اخبار کی اشاعت کم ہوگی خسارہ بھی اسی قدر کم ہوگا۔

سوال یہ ہے کہ خسارہ کم کیسے کیا جاسکتا ہے؟ اس کا سب سے اہم ذریعہ اشتہارات ہیں۔ خسارے کو اشتہارات سے ہونے والی آمدنی کے ذریعہ کم کیا جاسکتا ہے اور اردو اخبارات

یہیں پر آ کر دوسری زبانوں کے اخبارات کے مقابلے پچھڑ جاتے ہیں۔ انگریزی، مراٹھی اور ہندی دگجراتی وغیرہ زبانوں کے اخبارات خسارے کو پورا کرنے کے لیے اشتہارات حاصل کر لیتے ہیں، ان میں بھی سرکاری اشتہارات کا کردار سب سے اہم ہوتا ہے، مگر اردو کے اخبارات کو خسارے کو پورا کرنے کے لیے ادھر اُدھر دیکھنا پڑتا ہے۔ یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ اردو زبان کے اخبارات کو صنعت کاروں سے بھی کوئی تعاون نہیں ملتا۔ اردو والوں کے پاس ویسے بھی اتنی صنعتیں نہیں ہیں اور جن کے پاس صنعتیں ہیں وہ اردو اخباروں کی مدد اور تعاون کرنے کے بجائے دوسری زبانوں کے اخباروں اور رسالوں کا تعاون کرتے ہیں۔ ان کا اسی میں فائدہ ہے۔ رہی مرکزی سرکار اور ریاستی سرکاریں تو ان کی نظر کرم اردو اخبارات پر پڑتی ہے مگر کم۔

جہاں تک اردو اخبارات کی 'مشکلات' کا سوال ہے تو ان کے سامنے سب سے بڑی مشکل ہنر مند، ہونہار اور خود کو وقف کرنے والے صحافی حضرات، کمپیوٹر آپریٹر، پرنٹنگ مشینوں کے فورمین اور مارکیٹنگ کے گنوں سے واقف پروفیشنل حضرات کا نہ ہونا ہے۔ خال خال ہی باصلاحیت اور ہنر مند افراد اردو صحافت میں نظر آتے ہیں۔ ظاہر ہے اس کے اثرات اخبار کے معیار پر مرتب ہوتے ہیں۔ اس کا اثر بالخصوص اخبارات کے مشمولات کے تنوع پر پڑتا ہے۔ مثلاً اگر ہم اردو اخبارات پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ اقتصادیات اور معاشیات پر لکھنے والے موجود نہیں ہیں۔ اسپورٹس کے ماہرین کا فقدان ہے۔ فلمی صحافت جو اپنے آپ میں ایک مکمل دنیا ہے، اس سے جڑے ہوئے لوگ نہیں ملتے حالانکہ ماضی میں اردو کی فلمی صحافت انگریزی کی فلمی صحافت سے ٹکر لیتی تھی۔ 'شمع' کو 'فلم فیئر' کے مقابلے پر کھڑا کیا جاتا تھا۔ اردو میں ایسے صحافتی حضرات نہیں ملیں گے جو سیر و سیاحت پر یا اچھے کھانوں اور اچھے ہوٹلوں کی 'قدر پیمائی' پر کچھ لکھ سکیں۔ سچ تو یہ ہے کہ سیاسی امور پر لکھنے والوں کے یہاں بھی معروضیت کم جذباتیت زیادہ نظر آتی ہے۔ اردو والوں میں مارکیٹنگ کے ہنر مند تو نظر ہی نہیں آتے!

مارکیٹنگ کی دنیا ایسی دنیا ہے جہاں نوجوان لڑکے ایک جاب سے دوسری جاب تک چھلانگ لگانے کے لیے چھ مہینے کا بھی انتظار نہیں کرتے، انھیں صرف اپنی تنخواہوں کے پیکج سے سروکار ہوتا ہے۔ یہ وادی اردو والوں کے لئے بڑی سنگلاخ ہے۔ مالکان پر انگلیاں اُٹھتی ہیں،

استحصال کے الزامات عائد کیے جاتے ہیں۔ الزامات میں کچھ سچائی ضرور ہوتی ہے مگر سب سے بڑا سچ یہ ہے کہ اردو اخبارات کے مالکان خسارے کے بوجھ تلے دب کر کام کرتے ہیں۔ انھیں اپنے پیر چادر دیکھ کر ہی پھیلانے ہوتے ہیں۔ ان سے غلطیاں اور کوتاہیاں ہوتی ہیں، وہ استحصال بھی کرتے ہیں مگر اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اردو والوں کا کوئی ایسا نظام نہیں ہے جہاں اجتماعی کوشش سے کسی مسئلے کا حل نکالا جا سکے۔

'اقتصادی مسائل' اور 'مشکلات' کے 'حل' کی بات بھی کریں گے مگر اس سے پہلے ممبئی کے اردو اخباروں کا کچھ ذکر ہو جائے۔ اردو اخبارات کے پہلے دور یعنی 1834 سے 1914 کے درمیان ممبئی سے نوے اخبارات شائع ہوتے تھے جن میں چھ روزنامے تھے، باقی کے ہفت روزہ، پندرہ روزہ اور دس روزہ اخبارات تھے۔ 'آئینۂ سکندری' ممبئی سے نکلنے والا اردو کا سب سے قدیم اخبار مانا جاتا ہے۔ اس کی اشاعت 26 اپریل 1822 کو یعنی اسی سال شروع ہوئی جس سال کلکتہ سے 'جام جہاں نما' شروع ہوا تھا۔ مزید اخبارات تھے جیسے کہ 'کشف الاخبار'، 'محمدی'، 'برق خاطف'، 'عمدۃ الاخبار' وغیرہ۔ تمام ہی اخبارات 'اقتصادی مسائل' کا شکار رہے اور نتیجہ یہ نکلا کہ پہلی جنگ عظیم کے آغاز 1914 کے آخر میں اردو کے صرف چار اخبار ہی باقی رہ گئے جن کے نام ہیں 'اسلامک میل'، 'مفید روزگار'، 'مسلم ہیرلڈ' اور 'اتحاد'۔

ممبئی کے اردو اخبارات کا دوسرا دور 1915 سے 1947 تک کا ہے۔ اس دور میں ممبئی سے اردو کے اخبارات بڑی تعداد میں جاری ہوئے مگر ان میں ہفت روزہ اور پندرہ روزہ اخباروں کی تعداد ہی زیادہ تھی، روزنامے کم تھے۔ اکثر اخبار تھوڑے ہی دنوں میں سرمائے کی قلت یا انتظامی دشواریوں کے شکار ہو گئے۔ 'خلافت'، 'اتحاد'، 'اجمل'، 'ہلال'، 'اقبال'، 'آفتاب'، 'انقلاب' اور 'ہندوستان' اس دور کے اہم اخبارات تھے۔ ان میں سے دو 'ہندوستان' اور 'انقلاب' آج تیسرے دور میں جو 1948 سے شروع ہوتا ہے، پوری آب و تاب سے چل رہے ہیں۔ اردو کے کئی بڑے اخبارات مثلاً 'اردو رپورٹر'، 'خلافت'، 'شام'، 'آج'، 'اقبال'، 'جمہوریت' وغیرہ چمکے اور بجھ گئے۔ کہیں پارٹنر شپ کا مسئلہ رہا، کہیں خانگی تنازعہ، ایک اخبار ایسا تھا جس نے فلمی صنعت میں یعنی فلمیں بنانے میں روپیہ پیسہ لگایا جو ڈوب گیا، ایک اخبار اس لیے بند ہوا کہ اس کے ذمے داران

نے سیاست کی خار دار وادی میں قدم رکھ دیا تھا۔ اکثر اخبار اس لیے بند ہوئے کہ انھیں سرکاری اور غیر سرکاری اشتہارات یا تو ملتے ہی نہیں تھے یا بھیک کے کٹورے میں پھینکے گئے کسی سکّے کی طرح ملتے تھے۔ ویسے تمام اخبارات کے بند ہونے کی بنیادی وجہ 'اقتصادی مسائل' ہی تھے، چاہے یہ مسائل انتظامی شکل میں سامنے آئے ہوں یا پارٹنر شپ کے جھگڑے کی شکل میں۔

سوال یہ ہے کہ اردو اخبارات کے 'اقتصادی مسائل' اور 'مشکلات' کا 'حل' کیا ہے؟ اس سوال کا جواب کوئی مشکل نہیں ہے۔ دوسری زبانوں کے اخبارات نے جو 'حل' نکالا ہے اردو والوں کے لیے بھی بنیادی طور پر 'مسائل' اور 'مشکلات' کا وہی 'حل' ہے۔ حل یہ ہے کہ اردو والوں کو اخبارات کے اخراجات پورے کرنے کے لیے ایسے مستقل ذرائع آمدنی تیار کرنا ہوں گے جن کی ابتدا اخبار کی وجہ سے ہو مگر جن کے کام کا دائرہ اخبار سے باہر ہو۔ تمام ہی بڑے اخبارات، ایسے لوگ یا ایسے ادارے چلاتے ہیں جن کا واحد ذریعہ آمدنی 'اخبار' نہیں ہے، بلکہ اخبارات ان کی دیگر کاوشوں کو مہمیز فراہم کرتے ہیں اور ان کاوشوں سے ہونے والی آمدنی اخبارات میں صرف کی جاتی ہے۔ مثلاً بہت سے ایسے اخبار ہیں جن کے 'حصص' کمپنیوں میں ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ذرائع آمدنی 'دو نمبر' کے ہوں یا 'وصولی' کی بنیادوں پر ہوں بلکہ جو بھی جائز طریقے ہیں ان کو ہی بروئے کار لا کر اردو کے اخبارات اپنے معیار کو بہتر کر سکتے ہیں۔ انگریزی اور مراٹھی کے ممبئی کے اخباروں کی مثالیں لے لیں، 'فری پریس جرنل' اور 'انڈین ایکسپریس' کی اپنی کثیر منزلہ عمارتیں ہیں جو ریاستی سرکار کی زمینوں پر ہیں۔ 'ہندوستان ٹائمز' کی اپنی عمارت ہے جو سرکاری ادارے نے فراہم کی ہے۔ شیوسینا کے ہندی اور مراٹھی ترجمان 'سامنا' کو سرکاری تعاون ملا، اس نے بھی اپنی عمارت کھڑی کر لی۔ افسوس کہ اردو والوں کے یہاں سرکار سے مانگنے اور لینے کا انتظام نہیں ہے۔ اردو والوں کی سوچ روڈ ویز کی بسوں کے پاس اور ریلوے کے ٹکٹ لینے کی حد تک اخبارات کے استعمال کی ہے! سرکار سے جائز طریقے سے کیسے فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے اسے سیکھنا ہوگا اور اس کے لیے تمام ہی اخبارات کو متحد ہو کر کام کرنا ہوگا۔

ایک حل پروفیشنل اور تجربے کار یعنی ماہر صحافی حضرات کی کمی کو پورا کرنا، مارکیٹنگ کے لیے ہنر مند افراد فراہم کرنا اور پریس نے ترقی کی سمت جو جست لگائی ہے اس کے ساتھ قدم بہ

قدم چلنا ہے۔ اردو اخبارات کو مشمولات میں تنوع لانا ہوگا۔ ہر شعبے کے ماہرین کی خدمات حاصل کرنا ہوں گی۔ اچھے کاغذ کا استعمال کرنا ہوگا۔ غیر معیاری طباعت سے اب قارئین نہیں بہلنے والے۔ قارئین کا معاملہ اب پہلے جیسا نہیں رہا، آج عام طور پر قارئین 'ملٹی لنگول' ہوتے ہیں اور جیسی ان کی پسند ہوتی ہے ویسا ہی اخبار پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ مذہب سے دلچسپی لینے والا یا مسلم مسائل سے دلچسپی لینے والا تو اردو اخبار پڑھنے کے لیے لے گا، مگر وہ جسے عالمی امور سے، معاشی معاملات سے اور حالات حاضرہ سے دلچسپی ہے وہ کسی دوسری زبان خصوصاً انگریزی کے اخبار کی طرف متوجہ ہوگا۔ دنیا جیسے سکڑ رہی ہے ویسے ہی اردو کے قارئین بھی سکڑ رہے ہیں، قارئین کو دوبارہ اپنی طرف کھینچنے کے لیے معیار بلند کرنا، تنوع لانا اور اخبار کو عالمی معیار کے مطابق نکالنا اردو والوں کے لیے اوّلین شرط ہے۔ یہی بقا کا فارمولہ ہے۔

# کتابیات صحافت

(ناتمام فہرست)

حیدر علی

این۔سی۔پی۔یو۔ایل، نئی دہلی نے اپنی دوراندیشی کا ثبوت دیتے ہوئے اس خواہش کا اظہار کیا کہ صحافت سے متعلق کتابوں کی فہرست بھی اس کتاب میں شامل ہوجائے تو یہ کتاب اپنی نوعیت کی حوالہ جاتی کتاب ہو جائے گی۔ان کی اس علمی خواہش پر مجھے مولوی عبدالحق کے حوالے سے ایک بات یاد آئی کہ وہ بھی ہر موضوع پر اس طرح کی ببلوگرافی چاہتے تھے۔دراصل اس ببلوگرافی سے ادب اور تحقیق کو معتبر بنانے میں کتنی مدد حاصل کی جاسکتی ہے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ موضوع کی مناسبت سے یہاں کتابیات کے باب میں بعض باتیں عرض کر رہا ہوں۔اس کے بعد صحافت سے متعلق تمام اہم کتابوں کی فہرست دی جائے گی۔

ہمارے ہاں علمی تحقیق کا اب اتنا رواج نہیں رہا۔ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام علمی شعبوں میں لکھی گئی کتابوں کے بارے میں معلومات پر مبنی ایک انسائیکلو پیڈیا مرتب کی جائے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی اسکالر کسی موضوع پر کالم، مضمون، ڈاکومینٹری یا کتاب لکھنا چاہے تو اسے متعلقہ کتابوں کی فہرست ایک جگہ پر مرتب شکل میں مل جائے۔اکثر تحریریں اس لیے پھیکی اور بے معنی

ہوتی ہیں کہ لکھنے والا اس موضوع پر لکھی گئی اہم کتابوں سے ناواقف ہوتا ہے اور سامنے کی کتابوں سے استفادہ کرتا ہے۔ ریسرچ ایک ایسا شعبہ ہے جس پر قوموں کی ترقی کا دارومدار ہوتا ہے۔ اس لیے نئے زمانے کی ضرورت کے تحت ہر موضوع پر کتابوں کی تیار شدہ فہرست کی فراہمی کو کمپیوٹر پر بھی ممکن بنایا جائے اور ایک ایسی ویب سائٹ تیار کی جائے جس میں کتاب کی شکل میں موجود انسائیکلوپیڈیا، بٹن دباتے ہی اسکرین پر آجائے۔

کتابیات کی اصطلاح اس فہرست کتب و مقالات کے لیے استعمال ہوتی ہے، جو خاص مقصد کے لیے مرتب کی جاتی ہے۔ اس مقصد میں عام طور پر موضوع کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ اس میں شخصی حوالے، کتب خانے، ذخیرے یا کسی اور مناسبت سے بھی کتابیں، مقالات اور دیگر نوعیتوں کا مواد شامل ہوتا ہے۔

## (الف) صحافت سے متعلق اہم کتابیں

| مصنف/مرتب | کتابیں | پبلشرز | شہر | سن اشاعت |
|---|---|---|---|---|
| ابوسلمان شاہجہانپوری | پاکستان کے اردو اخبارات و رسائل (کتابیات) | مقتدرہ قومی زبان | اسلام آباد | 1985 |
| ابوسلمان شاہجہانپوری | مولانا محمد علی اور ان کی صحافت | پاک اکیڈمی بک سیلرز | | 1983 |
| احتشام احمد خان | جدید صحافت | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس | دہلی | 2014 |
| احسن اختر ناز | صحافتی ذمہ داریاں | مقتدرہ قومی زبان | اسلام آباد | 1990 |
| احمد ابراہیم علوی | اردو صحافت کا جائزہ | مکتبہ دانش محل | لکھنؤ | 2000 |
| احمد ابراہیم علوی | اردو صحافت کا مطالعہ | اسلامک سروسز | لکھنؤ | 2008 |
| احمد جمال پاشا | شوکت تھانوی کی مزاحیہ صحافت | پنچ پبلشرز کچا احاطہ | لکھنؤ | 1967 |
| احمد سعید ملیح آبادی | عظیم صحافی، عظیم رہنما ابوالکلام آزاد | مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن | دہلی | 2013 |
| احمد نسیم سندیلوی | خبر نگاری | مقتدرہ قومی زبان | اسلام آباد | 1993 |
| احیدالدین نظامی | پرانے رسائل اور کتب کی ڈائریکٹری | نظامی بک ایجنسی | بدایوں | 1857 |
| اخلاق اثر | نشریات اور آل انڈیا ریڈیو | مکتبہ جامعہ لمیٹڈ | دہلی | 198[illegible] |
| اخلاق احمد آہن | ہندوستان میں فارسی صحافت کی تاریخ | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس | دہلی | 2011 |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| ارتضی کریم | دہلی اردو اخبار-1841 | شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی | دہلی | 2010 |
| ارتضی کریم | دہلی اردو اخبار-1857 | شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی | دہلی | 2010 |
| ارتضی کریم | اردوئے معلی غالب نمبر جلد اول | شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی | دہلی | 2011 |
| ارتضی کریم | اردوئے معلی غالب نمبر جلد دوم | شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی | دہلی | 2011 |
| ارشد عالم | ہندوستانی صحافت | کتابی دنیا | دہلی | 2011 |
| اشتیاق عارف | مدھیہ پردیش میں اردو صحافت | | | |
| اشفاق محمد خان | عوامی ذرائع ترسیل | لبرٹی آرٹس پریس | دہلی | 1989. |
| اصغر عباس | سرسید کی صحافت | انجمن ترقی اردو ہند | دہلی | 1975 |
| اطہر مسعود خاں | اشاریہ نیا دور | | | |
| اعجاز ارشد قاسمی | من شاہ جہانم | کتب خانہ نعیمیہ | دیوبند | 2002 |
| اعجاز علی قریشی | اردو کے چھوٹے اخبارات کے مسائل وامکانات | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس | دہلی | 2013 |
| افضل اقبال | جنوبی ہند کی اردو صحافت | | | |
| افضل مصباحی | اردو صحافت: آزادی کے بعد | | | |
| افضل مصباحی | اکیسویں صدی کے سیاسی اور سماجی مسائل: دستاویز کے حوالے سے | آر آر پرنٹنگ ایجنسی، ذیامحل | دہلی | 2009 |
| اقبال زبیری | محسن صحافت | ادارہ مشرف | لاہور | 1976 |
| امام اعظم | اکیسویں صدی میں اردو صحافت | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس | دہلی | 2016 |
| امداد احمد میاں | خبر نویسی اور ابتدائی حالات | مقتدرہ قومی زبان | اسلام آباد | 1991 |
| امداد صابری | تاریخ صحافت اردو (جلد چہارم) | یونین پریس اردو بازار | دہلی | 1974 |
| امداد صابری | تاریخ صحافت اردو (جلد، اول، دوم اور سوم) | ریختہ سائٹ دہلی | | 1953 |
| امداد صابری | تاریخ صحافت اردو | مطبوعہ جدید پرنٹنگ پریس | دہلی | 1962 |
| امداد صابری | روح صحافت | مکتبہ شاہراہ | دہلی | 1968 |
| امداد صابری | اردو کے اخبار نویس، جلد 01 | صابری اکیڈمی | دہلی | 1973 |
| انور سدید | پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ | اکادمی ادبیات پاکستان | اسلام آباد | 1992 |
| انور حسن اسرائیلی | اردو صحافت میں مرادآباد کا حصہ | | لال مسجد روڈ مرادآباد | 2010 |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| انور علی دہلوی | اردو صحافت | اردو اکادمی | دہلی | 1987 |
| انیس صدیقی | کرناٹک میں اردو صحافت | افلاک پبلی کیشنز | گلبرگہ | 2003 |
| اوم پرکاش سونی | باتیں اخبار نویسوں کی | | | |
| ایاز محمد | صحافتی ضابطہ اخلاق اور قرآن | نگارشات میاں | لاہور | 2002 |
| ایس۔ایم۔ناز | اخبار نویسی کی مختصر ترین تاریخ | سنگ میل پبلی کیشنز | لاہور | 1988 |
| ایم چلاپتی راؤ | صحافت (دی پریس) | نیشنل بک ٹرسٹ | دہلی | 1987 |
| آر۔کے۔چٹرجی | عوامی ترسیل (مترجم) عرفان صدیقی | نیشنل بک ٹرسٹ | دہلی | 1984 |
| بدر شکیب | اردو صحافت | | | 1952 |
| بلجیت سنگھ مطیر | اخبار نویسی کے بنیادی اصول | ادبی سنگم، بہادر گڑھ | رہتک | 1978 |
| تنزیل اطہر | الیکٹرانک میڈیا اور اردو صحافت | | | |
| توحید خاں | جہانِ ابلاغ | | | |
| پروانہ ردولوی | اردو صحافت کا استغاثہ | حیا پبلشنگ ہاؤس | دہلی | 1994 |
| جاوید جمال الدین | عبدالحمید انصاری: انقلابی صحافی | انقلاب پبلی کیشنز | ممبئی | 2002 |
| جاوید حیات | مبادیات صحافت | مکتبہ آزاد، گلزار باغ | پٹنہ | 1995 |
| جمیل اختر | اشاریہ 'آج کل' | اردو اکادمی | دہلی | 2012 |
| جے۔نٹراجن | ہسٹری آف انڈین جرنلزم | دی پبلی کیشنز ڈویژن | دہلی | 1955 |
| حسن عابدی | اردو جرنلزم میڈیا، قانون اور سماج | | | |
| حسن مثنیٰ | ریڈیو نشریات: آغاز و ارتقا | ایلیا پبلی کیشنز | دہلی | 2006 |
| حسن نظامی | غدر دہلی کے اخبار، حصہ 06 | کارکن حلقہ المشائخ | دہلی | 1920 |
| خالد محمود | ادب اور صحافتی ادب | مکتبہ جامعہ لمیٹڈ | دہلی | 2015 |
| خالد محمود، سرور الہدیٰ | اردو صحافت ماضی اور حال | مکتبہ جامعہ لمیٹڈ | دہلی | 2012 |
| خواجہ احمد فاروقی | دہلی اردو اخبار | شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی | دہلی | 1973 |
| خواجہ اکرام الدین (مرتب) | اردو میڈیا | قومی کونسل | دہلی | 2012 |
| خواجہ عبدالمنتقم | پریس کی آزادی اور صحافیوں کے لیے ضابطہ اخلاق | ایم آر پبلی کیشنز | دہلی | 2011 |
| دیوندر اسر | عوامی ذرائع ابلاغ و ترسیل، شاہد پرویز (مترجم) | قومی کونسل | دہلی | 2002 |
| راحت سہیل | اردو اداریہ کا ارتقا | رنگ محل پبلی کیشنز | لاہور | 1987 |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| رحم علی الہاشمی | فن صحافت | انجمن ترقی اردو ہند | دہلی | 1943 |
| رشید تاثیر | نقوش صحافت | محافظ پبلی کیشنز | سری نگر | 1989 |
| رضوان اللہ | کلکتہ کی اردو صحافت اور میں | مکتبہ اشاعت القرآن | دہلی | 2007 |
| رفعت سروش | آل انڈیا ریڈیو اور اردو | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس | دہلی | 2012 |
| روشن آرا راؤ | مجلاتی صحافت کے ادارتی مسائل | مقتدرہ قومی زبان | اسلام آباد | 1989 |
| زبیر شاداب | ریڈیو نشریات، تاریخ، اصناف اور پیش کش | ایجوکیشنل بک ہاؤس | علی گڑھ | 2008 |
| ساجد ذکی | عبدالرزاق ملیح آبادی اور اردو صحافت | البلاغ پبلی کیشنز | کلکتہ | 2013 |
| ساجد علی | اردو صحافت سہارا گروپ کے حوالے سے | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس | دہلی | 2013 |
| سجاد حیدر | ریڈیائی صحافت | مقتدرہ قومی زبان | اسلام آباد | 1989 |
| سلطان شاہد | میں اور میری صحافتی زندگی | عفان پبلی کیشنز | کولکاتا | 2014 |
| سلطانہ فاطمہ واحدی | اودھ اخبار کی ادبی اور علمی خدمات | مکتبہ جامعہ | نئی دہلی | 2015 |
| سلیم الدین قریشی (مرتب) | دہلی کے اخبارات و رسائل (1925 تا 1947) 'ایک توضیحی فہرست' | مقتدرہ قومی زبان | کراچی | 2009 |
| سمیع احمد | اردو صحافت اور تحریک آزادی | موڈرن پبلشنگ ہاؤس | دہلی | 2009 |
| سمیع الرحمٰن | رپورٹنگ فن اور طریقہ کار | علامہ عبدالعزیز اسلامک ریسرچ سینٹر | دہلی | 2006 |
| سمیع اللہ | اردو صحافت اور تحریک آزادی | موڈرن پبلشنگ ہاؤس | علی گڑھ | 2009 |
| سہیل انجم | احوال صحافت | شوبی آفسیٹ | نئی دہلی | نئی دہلی |
| سہیل انجم | اردو میڈیا اور جدید رجحانات | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس | دہلی | 2010 |
| سہیل انجم | عظیم صحافی مولانا محمد عثمان فارقلیط کے منتخب اداریے | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس | دہلی | 2014 |
| سہیل انجم | میڈیا روپ اور بہروپ | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس | دہلی | 2007 |
| سی سید خلیل احمد | صحافت و تجارت | بمبئی بک ہاؤس شموگہ | | 2005 |
| سید احمد قادری | اردو صحافت بہار میں | الائیڈ پرنٹنگ سروس | دہلی | 2003 |
| سید اختیار جعفری | آگرہ میں اردو صحافت | مرزا غالب ریسرچ اکیڈمی | آگرہ | 2014 |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| سید اقبال قادری | رہبر اخبار نویسی | ترقی اردو بیورو | دہلی | 2000 |
| سید سلیمان اختر | الکٹرونک میڈیا | کتابی دنیا | دہلی | 2010 |
| سید شاہد رضا | جدوجہد آزادی 1857 اور برصغیر میں آزادی صحافت | شعبہ ابلاغ عامہ | کراچی | 2012 |
| سید صفی اللہ | تمل ناڈو میں اردو صحافت | سرمدی پبلی کیشنز | مدراس | 2004 |
| سید ضیاء اللہ | اردو صحافت ترجمہ وادارت | کرناٹک اردو اکیڈمی | بنگلور | 1994 |
| سید عبد الباری | بہار اور جھارکھنڈ میں اردو صحافت کا ارتقا | ماہ نور پبلی کیشنز | دہلی | 2007 |
| سید عبید اسلام ذہنی | اسلامی صحافت | مکتبہ اسلامی | لاہور | 1990 |
| سید فاضل حسین پرویز | اردو میڈیا: کل آج کل | ہدیٰ پبلی کیشنز | حیدرآباد | 2015 |
| سید محمد اشرف نقوی | سوانح عمری اخبارات (اختر شاہنشاہی) | اختر پریس | لکھنؤ | 1888 |
| سید ممتاز مہدی | حیدرآباد کے اردو روزناموں کی ادبی خدمات | قومی کونسل | دہلی | 1998 |
| شافع قدوائی | خبر نگاری | نصرت پبلشرز، امین آباد | لکھنؤ | 1988 |
| شانتی رنجن بھٹاچاریہ | بنگال میں اردو صحافت کی تاریخ | مغربی بنگال اردو اکیڈمی | کولکاتہ | 2003 |
| شاہد الاسلام | دہلی میں عصری اردو صحافت۔ تصویر کا دوسرا رخ | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس | نئی دہلی | 2016 |
| شریف الدین | اردو صحافت اور حسرت موہانی | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس | نئی دہلی | 2005 |
| شعائر اللہ خاں وجیہی | انیسویں صدی کے اردو اخبارات | رام پور رضا لائبریری | رام پور | 2005 |
| شعیب رضا وارثی | آزادی کے بعد دہلی میں اردو کے ادبی رسائل کا تنقیدی جائزہ | | | 1997 |
| شفیع احمد عثمانی | رسالہ 'زمانہ' کی ادبی خدمات | اتر پردیش اردو اکادمی | لکھنؤ | 2009 |
| شکیل احمد خاں شکیل | صد سالہ صحافت ضلع بجنور | اوجل پرکاشن | بجنور | 2013 |
| شکیل حسن شمسی | ٹیلی ویژن کی صحافت | تکسی تھیٹر، حضرت گنج | لکھنؤ | 2003 |
| شگفتہ یاسمین | اردو کی مجلاتی صحافت اور غیر ملکی ادارے | عرشیہ پبلی کیشنز | دہلی | 2014 |
| شفیق جالندھری | صحافت اور ابلاغ | | | |
| شمع افروز زیدی | اردو صحافت کا نیر تاباں رحمٰن | بیسویں صدی بک ڈپو | دہلی | 2013 |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| شہاب الدین انصاری | اشاریہ رسالہ 'جامعہ' 1947-1923 و 1960-2008 | ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ | دہلی | 2012 |
| صالح عبداللہ | اردو صحافت میں اظہار و ابلاغ کے مختلف پیرائے کا تنقیدی جائزہ | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس | دہلی | 2006 |
| صباح الدین عمر | تاریخ صحافت | | | |
| ضمیر نیازی | صحافت پابند سلاسل | ایجوکیشنل پریس، پاکستان چوک | کراچی | 1994 |
| ضمیر الدین قریشی | ادبی صحافت | مسلم ایجوکیشنل پریس | علی گڑھ | ندارد |
| ضیاء الدین انصاری | مندرجات 'تہذیب الاخلاق' | مولانا آزاد لائبریری | علی گڑھ | 1987 |
| ضیاء الرحمٰن صدیقی | تحریک آزادی میں اردو صحافت کا حصہ | سویرا آفسیٹ پرنٹرس | اورنگ آباد | 2003 |
| ضیاء اللہ کھوکھر (مرتب) | بچوں کی صحافت کے سو سال (200 رسائل کی فہرست) | عبدالمجید کھوکھر یادگار لائبریری | گوجرانوالا | 2004 |
| طاہر مسعود (مرتب) | اردو صحافت کی ایک نادر تاریخ (فہرست اخبارات ہند) مغربی پاکستان | اردو اکیڈمی | لاہور | 1992 |
| طاہر مسعود | ابلاغیات | ادارہ ابلاغیات | کراچی | 1986 |
| طاہر مسعود | اردو صحافت انیسویں صدی میں | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس | دہلی | 2009 |
| طیب انصاری | حیدرآباد میں اردو صحافت | اعجاز پرنٹنگ پریس | حیدرآباد | 1980 |
| ظ انصاری | گلدستہ صحافت | بزم ادب کامٹی | | 1987 |
| ظفر انور | بہار و بنگال کے صحافی | آر آر بی ایچ میڈیا | دہلی | 2016 |
| ظفر انور | دلّی کے اردو صحافی: آزادی کے بعد | اصیلہ آفسٹ پریس | دہلی | 2013 |
| ظفر انور | دہلی کے 50 صحافی | اصیلہ آفسٹ پریس | دہلی | 2015 |
| ظہور الدین | فن صحافت | انٹرنیشنل اردو پبلیکیشنز | دہلی | 2006 |
| ظہیر علی صدیقی | اقتباسات روزنامہ ہمدرد | اتر پردیش اردو اکیڈمی | لکھنؤ | 2007 |
| عابد رضا بیدار | اردو کے اہم ادبی رسالے اور اخبار | رام پور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز | رام پور | 1969 |
| عابد صدیقی | ادب اور صحافت | | | 1974 |
| عابدہ سمیع الدین | اخبار جمہور | دریا گنج | دہلی | 1995 |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| عابدہ سمیع الدین | قومی محاذ آزادی اور یوپی کے مسلمان صحافی | انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز | نئی دہلی | |
| عابد سہیل | اردو کے ادبی رسالوں کے مسائل | | | |
| عبدالسلام خورشید | فن صحافت | مرکزی اردو بورڈ | لاہور | 1966 |
| عبدالسلام خورشید | صحافت پاکستان و ہندوستان | مجلس ترقی ادب | لاہور | 1963 |
| عبدالسلام خورشید | کاروان صحافت | انجمن ترقی اردو پاکستان | کراچی | 1989 |
| عبدالسلام | صحافت میں سرسید کا کردار | | | |
| عبدالحی | اردو صحافت اور سرسید احمد خاں | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس | دہلی | 2008 |
| عشان انجم | ہندوستان میں اردو صحافت آزادی کے بعد | | | |
| عبدالرزاق فاروقی | اودھ پنچ کی ادبی خدمات | شاہین کلب کرنول | آندھرا پردیش | 1982 |
| عبدالستار دلوی | اقبال اور بمبئی (روزنامہ خلافت، بمبئی کے حوالے سے) اور دیگر مضامین | انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ | بمبئی | 2012 |
| عدنان عادل | ٹیلی ویژن صحافت | | | |
| عرفان صدیقی | رابطہ عامہ | مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ | دہلی | 1977 |
| عشرت علی صدیقی | اردو صحافت، صداقت اور آزادی رائے | سید عابد حسین میموریل ٹرسٹ | نئی دہلی | 1994 |
| غضنفر اقبال | اردو بک ریویو کے اداریے اور تجزیے | کلاسک آرٹ پرنٹرس | دہلی | 2006 |
| غلام حیدر | اخبار کی کہانی | ترقی بیورو | دہلی | 1980 |
| فاروق انصاری | اشاریہ ایوان اردو | | | |
| فرخندہ ہاشمی | مبادیات اخبار نویسی | ملک بک ڈپو | لاہور | 1987 |
| فرزانہ خلیل | رسالہ 'جامعہ' کا تنقیدی مطالعہ | تخلیق کار پبلشرز | دہلی | 2013 |
| فریدہ انور | مغربی بنگال میں اردو صحافت | | کولکاتا | 2009 |
| فضل الحق (مرتب) | اردو ماس میڈیا | ثمر آفسٹ پریس | دہلی | 1993 |
| ذریہ چودھری | اردو کی مزاحیہ صحافت | سنگ میل پبلی کیشنز | لاہور | 2000 |
| قریشی عبدالودود | چند اہم اخبارات ورسائل | ادارہ تحقیقات اردو | پٹنہ | 1993 |
| قطب اللہ | مولانا آزاد کا نظریہ صحافت | اتر پردیش اردو اکیڈمی | لکھنؤ | 1988 |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| قمر جمالی | اردو صحافت ابتدا اور ارتقا | مادھو راؤ سپرے اسمرتی | بھوپال | 1989 |
| قمر جمالی/شوکت رموزی | مدھیہ پردیش میں اردو صحافت ابتدا اور ارتقا | مادھو راؤ سپرے اسمرتی | بھوپال | 1989 |
| قیصر شمیم | اردو ادب پر ذرائع ترسیل عامہ کے اثرات | اردو اکیڈمی | دہلی | 1989 |
| کمال احمد صدیقی | اردو ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ترسیل و ابلاغ کی زبان | قومی کونسل | دہلی | 1998 |
| گارساں دتاسی | خطبات گارساں دتاسی (اردو ترجمہ) | انجمن ترقی اردو | اورنگ آباد | 1935 |
| گربچن چندن | اردو صحافت | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس | دہلی | 2007 |
| گربچن چندن | جام جہاں نما | مکتبہ جامعہ لمیٹڈ | دہلی | 1992 |
| ماجد قاضی | ممبئی کے اردو اخبارات (1834 تا 2005) | بزم محبان اردو، کلیان | ممبئی | 2010 |
| مالک رام | ہفتہ وار کوہ نور، لاہور | تحقیقی مضامین مکتبہ جامعہ | نئی دہلی | 1984 |
| محبوب الرحمٰن فاروقی | آج کل اور صحافت | پبلی کیشن ڈویژن | دہلی | 2000 |
| محمد ابوذر | اردو صحافت 1960 تا حال | موڈرن پبلشنگ ہاؤس | دہلی | 2011 |
| محمد اسحاق صدیقی | فن تحریر کی تاریخ | انجمن ترقی اردو ہند | علی گڑھ | 1962 |
| محمد اسلم | مشترکہ پنجاب کے اردو اخبارات | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس | دہلی | 2015 |
| محمد اسلم | ادبی صحافت کے اولین نقوش | | | |
| محمد اشرف کمال | اشاریہ اخبار اردو (جولائی 1981 تا دسمبر 2009) | مقتدرہ قومی زبان | کراچی | 2010 |
| محمد افتخار کھوکھر | تاریخ صحافت | مقتدرہ قومی زبان | اسلام آباد | 1995 |
| محمد افضل الدین اقبال | جنوبی ہند کی اردو صحافت (1857 سے پیشتر) | معین پبلیکشنز جام باغ روڈ | حیدرآباد | 1981 |
| محمد اکرام چغتائی (مرتب) | 1857 کے روزنامچے، معاصر تحریریں، یادداشتیں | سنگ میل پبلی کیشنز | لاہور | 2007 |
| محمد انور الدین | حیدرآباد دکن کے علمی و ادبی رسائل | شاداب ریڈرز | حیدرآباد | 1997 |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| محمد زاہد سعید بدر | صحافت سے ابلاغیات تک | | | |
| محمد شاہد حسین | ابلاغیات | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس | دہلی | 2003 |
| محمد شاہد حسین راظہار عثانی | اردو عوامی ذرائع ابلاغ | اردو اکادمی | دہلی | 2007 |
| محمد شکیل اختر | اردو میں نشریاتی ادب | فرید بک ڈپو | نئی دہلی | 2007 |
| محمد عتیق صدیقی | اٹھارہ سو ستاون کے اخبارات و دستاویزیں | مکتبہ شاہراہ | دہلی | 1966 |
| محمد عتیق صدیقی | صوبہ شمال و مغربی کے اخبارات | انجمن ترقی اردو | علی گڑھ | 1961 |
| محمد عتیق صدیقی | ہندوستانی اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں) | انجمن ترقی اردو | علی گڑھ | 1957 |
| محمد فرقان سنبھلی | اردو صحافت اور ضلع مرادآباد | | | |
| محمد محبوب فرید | حیدرآباد کی صحافتی کہکشاں | | | |
| محمد مصطفیٰ علی سروری | اردو صحافت کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ (اکیسویں صدی میں) | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس | دہلی | 2011 |
| محمد مصطفیٰ علی سروری | برقی صحافت | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس | دہلی | 2013 |
| محمد یوسف | دلی میں اردو صحافت کے ابتدائی نقوش: دہلی اردو اخبار | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس | دہلی | 2008 |
| محمد نثار | ہندوستان میں بچوں کے رسائل | | | |
| محمد ناظم علی | حیدرآباد کے ادبی رسائل آزادی کے بعد سے حال تک | | | |
| مرغوب صدیقی | اخبارات اور معاشرہ | | | 1963 |
| محمود الٰہی | الہلال کے تبصرے | | | 1982 |
| مرزا سجاد علی خاں | دور اول کا اودھ پنچ | ثمر آرا کالج | لکھنؤ | 1976 |
| مسکین علی حجازی | فن ادارت | مرکزی اردو بورڈ | لاہور | 1976 |
| مسکین علی حجازی | اداریہ نویسی | مرکزی اردو بورڈ | لاہور | 1970 |
| مسکین علی حجازی | پاکستان و ہند میں مسلم صحافت کی مختصر ترین تاریخ | سنگ میل پبلی کیشنز | لاہور | 1989 |
| مشاورتی کمیٹی (مرتب) | اردو زبان اور ابلاغ عامہ | شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ | نئی دہلی | 2016 |
| مشتاق صدف | اردو صحافت زبان، تکنیک، تناظر | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس | دہلی | 2010 |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| مصباح الحسن قیصر | اردو طنز و ظرافت اور منشی سجاد حسین | نیو یونائیٹڈ پریس | لکھنؤ | 1978 |
| مصباح الحسن قیصر | معاونین اودھ پنچ | نامی پریس | لکھنؤ | 1984 |
| مطیع اللہ خاں | اشاریہ ماہنامہ تحریک | موڈرن پبلشنگ ہاؤس | نئی دہلی | 2011 |
| مظہر حسنین | سائبر دنیا میں اردو | عرشیہ پبلی کیشنز | دہلی | 2012 |
| معصوم عزیز کاظمی | مولانا محمد علی جوہر: ایک عہد ساز شخصیت | خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری | پٹنہ | 2011 |
| معصوم مرادآبادی | اردو صحافت کا ارتقا | اردو اکادمی | دہلی | 2013 |
| معصوم مرادآبادی | اردو صحافت اور جنگ آزادی 1857 | خبردار پبلی کیشنز | دہلی | 2008 |
| معصوم مرادآبادی | اردو صحافت کا منظر نامہ | اردو اکادمی | دہلی | 2013 |
| منشی محمد عبدالعزیز | فہرست اخبارات ہند | | | 1904 |
| مناظر عاشق ہرگانوی | ہمعصر اردو رسائل: جائزہ | اصنام پبلی کیشنز | وشاکھاپٹنم | 2014 |
| مناظر عاشق ہرگانوی | اردو میڈیا: فاضل حسین پرویز کے حوالے سے | اصنام پبلی کیشنز | وشاکھاپٹنم | 2015 |
| مناظر عاشق ہرگانوی | اردو میڈیا: کل اور آج تنقیدی جائزہ | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس | دہلی | 2015 |
| مناظر عاشق ہرگانوی | رضوان احمد: صحافی اور افسانہ نگار | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس | دہلی | 2015 |
| منظور الامین | ٹیلی ویژن دنیا کا آٹھواں عجوبہ | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس | دہلی | 2014 |
| منصور خوشتر | بہار میں اردو صحافت سمت و رفتار | | | |
| مولانا ابوالکلام آزاد | البلاغ | اترپردیش اردو اکیڈمی | یوپی | 1989 |
| مولانا ابوالکلام آزاد | الہلال | اترپردیش اردو اکیڈمی | یوپی | 1989 |
| مولانا ابوالکلام آزاد (ایڈیٹر) | (عکسی اشاعت) ابوسلمان شاہجہانپوری (تعارف) لسان الصدق، کلکتہ | مولانا آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ | کراچی | 1996 |
| مولوی چراغ علی | مضامین 'تہذیب اخلاق' | تاجر کتب قومی بازار کشمیری | لاہور | 1894 |
| مولوی محبوب عالم | اردو صحافت کی ایک نادر تاریخ ''فہرست اخبارات ہند'' | مغربی پاکستان اردو اکیڈمی | لاہور | 1992 |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| مہدی حسن | تصویری صحافت | مقتدرہ قومی زبان | اسلام آباد | 1990 |
| مہدی حسن | جدید ابلاغ عامہ | مقتدرہ قومی زبان | اسلام آباد | 1990 |
| نادر علی خان | ہندوستانی پریس | اتر پردیش اردو اکیڈمی | لکھنؤ | 1990 |
| نادر علی خاں | اردو صحافت کی تاریخ | ایجوکیشنل بک ہاؤس | علی گڑھ | 1987 |
| نایاب حسن | دارالعلوم دیوبند کا صحافتی منظرنامہ | | | |
| نفیس بانو | تہذیب الاخلاق: تحقیقی و تنقیدی مضامین | آرٹ ایکسپریس | وارانسی | 2004 |
| نورالاسلام ندوی | رہنمائے صحافت | بک ایمپوریم سبزی باغ | پٹنہ | 2012 |
| نورالحسن ہاشمی | اردو میں ایک نادر روزنامچہ | ادارہ فروغ اردو | لکھنؤ | 1954 |
| نورالہدیٰ | قدیم رسائل اور اداریہ نگاری | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس | دہلی | |
| نوشاد منظر | رسالہ شاہراہ: تجزیاتی مطالعہ اور اشاریہ | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس | دہلی | 2014 |
| نیناجوگن | ظفر علی خان: شاعر اور صحافی | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس | دہلی | 2015 |
| ہمایوں ادیب | تفتیشی خبرنگاری | مقتدرہ قومی زبان | اسلام آباد | 1990 |
| ہمایوں اشرف | اردو صحافت: مسائل اور امکانات | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس | دہلی | 2006 |

## (ب) رسائل میں مضامین

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| ابوسلمان شاہجہانپوری | انجمن ترقی اردو کے رسائل | اخبار اردو | اسلام آباد | فروری 1986 |
| ایم اے عالمگیر | احسن مفتاحی: عالم، صحافی اور شاعر | آجکل | دہلی | اگست 2007 |
| ایس ایف شیرانی | اردو کے چند ابتدائی اخبار | اخبار اردو | اسلام آباد | دسمبر 1994 |
| ایس ایف شیرانی | اردو کے چند ابتدائی اخبار | اخبار اردو | اسلام آباد | دسمبر 1994 |
| احمد سہیل | اردو کے دو عہد ساز ادبی جرائد 'ادب لطیف' (لاہور)، 'شاعر' (ممبئی) | اردو دنیا | دہلی | مئی 2016 |
| احمد سہیل | برقیاتی ابلاغ قاری اور مصنف | ادب ساز | دہلی | 2009 |
| ابرار رحمانی | آل احمد سرور کے اداریے | آجکل | دہلی | جون 2002 |
| انعام الحق جاوید | امریکہ، برطانیہ اور کینیڈا کے اردو اخبارات | اخبار اردو | اسلام آباد | جنوری 2003 |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| انور سدید | صحافت اور ادب کا روشن ستارہ | تخلیق | لاہور | دسمبر 2011 |
| انور سدید | مولانا صلاح الدین احمد کی ادبی صحافت | اوراق | لاہور | جون۔جولائی 1988 |
| انور سدید | شیخ عبدالقادر کا رسالہ 'مخزن' | مخزن | لاہور | جلد 1، شمارہ 2 |
| انور سدید | ادب کے فروغ میں رسائل | مخزن | برطانیہ | شمارہ 5۔2006 |
| اعجاز عبید | آن لائن ادبی رسائل و جرائد | مجلہ دستاویز اہم ادبی رسائل و جرائد نمبر | | 2011-12 |
| احمد سلیم | سر عبدالقادر اور رسالہ 'مخزن' | رسالہ جامعہ | نئی دہلی | جولائی۔ستمبر 2015 |
| اسلم صدیقی | اردو کا پہلا اخبار | اردو | اورنگ آباد | جنوری 1947 |
| اسد فیض | اردو کے اہم ادبی جرائد کے اولین شمارے | اردو نامہ | ممبئی | اکتوبر 2014 تا مارچ 2015 |
| اقبال حسن کھوریا | خلیج میں اردو صحافت کا کردار | اخبار اردو | اسلام آباد | اکتوبر۔نومبر 1990 |
| احراز نقوی | اردو کا سب سے پہلا ماہنامہ | آجکل | نئی دہلی | اکتوبر 1961 |
| ایس اے رحمٰن | اردو رسائل اور کتابوں کی تقسیم | آجکل | نئی دہلی | دسمبر 1977 |
| امداد صابری | اردو اخبارات و رسائل کا قومی کردار | آجکل | نئی دہلی | اگست 1986 |
| احمد سعید ملیح آبادی | اردو صحافت اور کتابت | آجکل | نئی دہلی | نومبر۔دسمبر 1983 |
| ایم نسیم اعظمی | ماہنامہ معارف اور اعظم گڑھ | بزم سہارا | نئی دہلی | ستمبر 2011 |
| ایم ایم شیخ | اردو صحافت: اخبارات کا آغاز و ارتقا | فنون | اورنگ آباد | جولائی 2010 |
| آصف جیلانی | برطانیہ میں اردو صحافت | مخزن | برطانیہ | 2005 |
| آصف جیلانی | اردو صحافت | مخزن | برطانیہ | 2007 |
| افسر کاظمی | گوپال متل اور ماہنامہ 'تحریک' | اردو دنیا | دہلی | فروری 2016 |
| انصار الحق صدیقی | مطبع اودھ اخبار کی کہانی: اودھ اخبار کی زبانی | نیا دور | لکھنؤ | نومبر۔دسمبر 1980 |
| احمد ابراہیم علوی | نیا دور: پچاس سال کا سفر | نیا دور | لکھنؤ | مارچ۔اپریل۔مئی 1995 |
| امیر احمد صدیقی | نیا دور: کچھ یادیں | نیا دور | لکھنؤ | مارچ۔اپریل۔مئی 1995 |
| احمد ابراہیم علوی | اردو صحافت اور جدید ٹیکنالوجی | نیا دور | لکھنؤ | جون۔جولائی 2011 |
| اسد رضا | صحافتی ترجمہ کے مسائل | اردو دنیا | نئی دہلی | مارچ 2010 |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| اسد رضا | اولین شہید صحافی مولانا محمد باقر | اردو دنیا | نئی دہلی | دسمبر 2015 |
| ابرار رحمانی | قاضی عبدالودود کا معیار | فکر و تحقیق | نئی دہلی | جنوری۔مارچ 2002 |
| ابوالکلام قاسمی | ادبی صحافت اور ہمارے ادبی رویے | اردو دنیا | نئی دہلی | اکتوبر 2009 |
| ابوسلمان شاہجہاں پوری | مجلہ الجامعہ کلکتہ | آجکل | نئی دہلی | نومبر 1988 |
| احسان اللہ دانش | تعمیری سوچ کا ایک منفرد صحافی محمود ایاز | اردو دنیا | نئی دہلی | جولائی، 2010 |
| ارتضیٰ کریم | خواجہ احمد عباس ایک باکردار صحافی | اردو دنیا | نئی دہلی | جون 2014 |
| اسعد فیصل فاروقی | طبی صحافت کے ذریعہ فروغ اردو | اردو دنیا | نئی دہلی | دسمبر 2015 |
| اسعد فیصل فاروقی | اردو میں سائنسی صحافت | اردو دنیا | نئی دہلی | جولائی 2005 |
| اکبر حیدری کاشمیری | اودھ اخبار اور سرسید | فکر و تحقیق | نئی دہلی | جولائی۔ستمبر 2003 |
| اکبر حیدری کاشمیری | اردو کے دو قدیم رسالے مراۃ الہند لکھنؤ اور حسن حیدرآباد | فکر و تحقیق | نئی دہلی | جنوری۔مارچ 2004 |
| اکبر حیدری کاشمیری | اقبال اور رسالہ صوفی | فکر و تحقیق | نئی دہلی | اکتوبر۔دسمبر 2005 |
| اکبر حیدری کاشمیری | ریاض الاخبار اور سرسید احمد خان | فکر و تحقیق | نئی دہلی | جولائی۔ستمبر 2002 |
| اکبر حیدری کاشمیری | اردو کا پہلا ادبی رسالہ مخزن الفوائد | فکر و تحقیق | نئی دہلی | جولائی۔دسمبر 1997 |
| اکبر حیدری کاشمیری | منشی نول کشور اور اودھ اخبار | نیا دور | لکھنؤ | نومبر۔دسمبر 1980 |
| اکبر حیدری کاشمیری | سرتیج بہادر سپرو اور کشمیر درپن الہ آباد | فکر و تحقیق | نئی دہلی | جولائی۔ستمبر 2000 |
| اکبر حیدری کاشمیری | شاہ دلگیر اکبر آبادی اور رسالہ نقاد آگرہ | فکر و تحقیق | نئی دہلی | اکتوبر۔دسمبر 2000 |
| اکبر حیدری کاشمیری | اردو کا ایک اہم مزاحیہ اخبار 'پنچ' پٹنہ | فکر و تحقیق | نئی دہلی | جنوری۔مارچ 2002 |
| اکبر حیدری کاشمیری | مرزا غالب اور اودھ اخبار | فکر و تحقیق | نئی دہلی | جنوری۔مارچ 2000 |
| امام اعظم | متھلا میں اردو صحافت | تمثیل نو | دربھنگہ | جولائی 2015 تا جون 2016 |
| اخلاق احمد آہن | 1857 اور فارسی اخبارات | آجکل | نئی دہلی | مئی 2007 |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| اے، ایم صدیقی | اردو صحافت: اجمالی جائزہ | اردو دنیا | نئی دہلی | دسمبر 2010 |
| امتیاز احمد راشد | مغربی بنگال کی اردو صحافت | تمثیل نو | دربھنگہ | جولائی 2013 تا جون 2014 |
| ابرار عبدالسلام | اودھ اخبار اور تفتہ کی وفات کی تاریخیں | فکر و تحقیق | نئی دہلی | جولائی۔ستمبر 2016 |
| برج پریمی | تحریک آزادی میں اردو ادب کا حصہ | نیا دور | لکھنؤ | جنوری۔مارچ 1989 |
| برج موہن دتاتریہ کیفی | ادب سے آدھی صدی پہلے کے اردو اخبارات | اردو | اورنگ آباد | اپریل 1935 |
| بالمکند گپتا | اردو اخبارات | زمانہ | کان پور | جولائی۔اگست 1904 |
| بالمکند گپتا | اردو اخبارات | زمانہ | کان پور | اکتوبر 1904 |
| بالمکند گپتا | اردو اخبارات | زمانہ | کان پور | نومبر 1904 |
| بالمکند گپتا | اردو اخبارات | زمانہ | کان پور | دسمبر 1904 |
| بیگ احساس | جدید ذرائع ابلاغ اور اردو | کتاب نما | نئی دہلی | فروری 2004 |
| پی۔سی۔جوشی | الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا (ایک انٹرویو) | آجکل | نئی دہلی | مارچ 1994 |
| پروانہ ردولوی | ہندوستان کا پہلا شہید صحافی مولوی محمد باقر | نیا دور | لکھنؤ | 1994 |
| تنزیل اطہر | کارٹون نگاری اور اردو اخبار | اردو دنیا | نئی دہلی | مئی 2012 |
| تنزیل اطہر | آن لائن اردو صحافت | اردو دنیا | نئی دہلی | اکتوبر 2008 |
| تنزیل اطہر | موبائل اور ایس ایم ایس صحافت | اردو دنیا | نئی دہلی | ستمبر 2016 |
| تسلیم غوری بدایونی | اردو صحافت میں بدایوں کا حصہ | ہماری زبان | نئی دہلی | 15/مئی 1995 |
| تمکین کاظمی | حیدرآباد دکن کے اردو اخبارات ورسائل | معارف | اعظم گڑھ | مارچ۔اپریل۔مئی 1937 |
| ثاقب عمران | رسالہ خاتون دکن | کتاب نما | نئی دہلی | جون 2009 |
| جگن ناتھ آزاد | صحافت میں میرا اعلیٰ ظرف رہبر جمنا داس اختر | عالمی اردو ادب | دہلی | 2010 |
| جمنا داس اختر | پنجاب میں اردو صحافت | آجکل | نئی دہلی | جولائی 1986 |
| جاوید دانش | شمالی امریکہ کا پہلا اردو اخبار | اردو دنیا | دہلی | اپریل 2016 |
| حامد رضا صدیقی | اردو صحافت میں غیر مسلم صحافیوں کی خدمات | اردو دنیا | نئی دہلی | دسمبر 2015 |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| حسن فرخ | اردو صحافت کا علمی پہلو | اردو دنیا | نئی دہلی | جنوری 2012 |
| حسن نظامی دہلوی | اردو، ہندی اور رسالہ زمانہ | زمانہ | کان پور | فروری 1928 |
| حسین الحق | صحافتی زبان کے بدلتے روپ | اردو دنیا | نئی دہلی | فروری 2002 |
| حبیب احمد | مولانا آزاد کی صحافت | اردو دنیا | نئی دہلی | اگست 2012 |
| حبیب فخری | مدھیہ پردیش میں اردو اخبارات ورسائل | اخبار اردو | اسلام آباد | جون 1994 |
| حقانی القاسمی | ادبی رسائل ترتیب اور عالمی منظرنامہ | نیا دور | لکھنؤ | جون۔جولائی 2011 |
| حقانی القاسمی | معاصر ادبی صحافت: مسائل و امکانات | مخزن | برطانیہ | 2006 |
| حقانی القاسمی | برطانیہ میں اردو کی مشعل مخزن | عالمی سہارا | نئی دہلی | 15 رجنوری 2011 |
| حقانی القاسمی | مسائل، مجبوریاں اور مجلات | کتاب نما | نئی دہلی | جنوری 2005 |
| حنیف نقوی | اودھ اخبار کی ادبی قدر و قیمت | نیا دور | لکھنؤ | نومبر 2003 |
| حمیرا خاتون | غالب اور اشرف الاخبار | تحریک | نئی دہلی | اپریل 1978 |
| حسن مثنیٰ | دہلی اردو اخبار تحریک آزادی | آجکل | دہلی | اگست 2013 |
| خواجہ جاوید اختر | نئے ادب کا روشن ترین باب 'شب خون' | روشنائی | کراچی | جولائی۔ستمبر 2013 |
| خواجہ احمد حسین | اردو کا سب سے پہلا اخبار | معارف | اعظم گڑھ | اپریل 1951 |
| خورشید حیات | اردو ادب و صحافت کے خوبہ | اردو دنیا | دہلی | جون 2014 |
| دیانرائن نگم | اردو رسالے | زمانہ | کان پور | نومبر۔دسمبر 1903 |
| دیانرائن نگم | اردو اور ہندی کے نئے رسالے | زمانہ | کان پور | جنوری 1911 |
| دیانرائن نگم | ادبی رسالے | زمانہ | کان پور | دسمبر 1924 |
| دیانرائن نگم | اردو اخبارات کی مشکلات اور ان کی نئی ذمہ داریاں | زمانہ | کان پور | اپریل 1937 |
| ڈاکٹر عبدالحق | انیسویں صدی میں مدراس کے اخبار | اردو | اورنگ آباد | اپریل 1941 |
| ڈاکٹر ریاض الحسن | اودھ اخبار اور اس کے چند ایڈیٹر | نیا دور | لکھنؤ | نومبر۔دسمبر 1998 |
| ذکاء اللہ | دہلی کے قدیم اردو اخبار | زمانہ | کان پور | نومبر 1904 |
| رفیق احمد | فکر کا صحافتی انداز | آجکل | دہلی | 2015 |
| راحت سلطانہ | بیسوی صدی کے آغاز میں خواتین کی اردو صحافت | اردو دنیا | نئی دہلی | اکتوبر 2011 |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| رام پرکاش کپور | رسالہ رہنمائے تعلیم کا ادبی سفر | اردو دنیا | نئی دہلی | اکتوبر 2005 |
| رشید الدین | حیدرآباد اور اردو صحافت | اردو دنیا | نئی دہلی | مئی 2005 |
| رضوان احمد | جدوجہد آزادی میں اردو صحافت کا کردار | فکر و تحقیق | نئی دہلی | اپریل۔جون 2001 |
| رضوان احمد | پرنٹ میڈیا کا بحران | آجکل | دہلی | جون 1994 |
| رضوان احمد | اردو صحافت (1947) تک | آجکل | دہلی | دسمبر 1983 |
| رضیہ سلطان جہاں | گنج شایگاں دفتری اردو کا پہلا جریدہ | اخبار اردو | اسلام آباد | اگست 2003 |
| ریاض احمد | کیرالہ کے اخبارات | اردو دنیا | نئی دہلی | ستمبر 2012 |
| رام دیال سکینہ | زمانہ کی سلور جوبلی | زمانہ | کان پور | فروری 1928 |
| رئیس احمد جعفری | بمبئی کی اردو صحافت | اردو | اورنگ آباد | اکتوبر 1945 |
| رفیق اشفاق | دہلی میں اردو صحافت | ادبی گزٹ | مئوناتھ بھنجن | شمارہ 5 |
| رئیس الدین فریدی | اردو اخبارات اور قومی یکجہتی | آجکل | دہلی | نومبر۔دسمبر 1983 |
| رضا نقوی | اردو صحافت اور ظریفانہ شاعری | آجکل | دہلی | نومبر۔دسمبر 1983 |
| ریاض عظیم آبادی | اردو صحافت تکنیک کے نئے تجربے اور مسائل | آجکل | دہلی | دسمبر 1984 |
| ریاض عظیم آبادی | اردو صحافی حال، مسائل اور مستقبل | آجکل | دہلی | نومبر 1987 |
| رتن لال کھنہ | صحافت نگاری میں انٹرویو کا آرٹ | آجکل | دہلی | یکم نومبر 1949 |
| زادیہ نفیس | اردو اخبارات کی حالت | زمانہ | کان پور | اکتوبر۔نومبر 1907 |
| زیب النساء | پاکستان کے معاصر ادبی رسائل | مجلہ دستاویز دوم | دوحہ | 2011-2012 |
| ساجد ذکی فہمی | عبدالرزاق ملیح آبادی اور اخبار ہند | جہان اردو | دربھنگہ | جنوری۔جون 2016 |
| ساجد ذکی فہمی | مدینہ اور نوآبادیاتی ہندوستان | آجکل | دہلی | دسمبر 2016 |
| ساجد ذکی فہمی | مولانا ظفر علی خاں اور اخبار ستارہ صبح | اردو دنیا | نئی دہلی | دسمبر 2012 |
| سبط محمد نقوی | نیا دور کے ادارت کار | نیا دور | لکھنؤ | مارچ تا مئی 1995 |
| سید طلحہ نقشبندی | اکولہ کے قدیم اخبارات و رسائل | اردو دنیا | دہلی | دسمبر 2014 |
| سلمان فیصل | امداد صابری اور روح صحافت | کتاب نما | نئی دہلی | دسمبر 2013 |
| سلمان فیصل | شہسوار میدان صحافت مولانا ظفر علی خان | پیش رفت | نئی دہلی | جنوری 2015 |
| سلمان فیصل | مولانا امداد صابری اور 'روح صحافت' | کتاب نما | دہلی | دسمبر 2013 |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| سلمان فیصل | آن لائن اردو صحافت | اردو دنیا | نئی دہلی | اکتوبر 2012 |
| سلمان علی خاں | ہندی کا پہلا اخبار: اودنت مارتنڈ | نیا دور | لکھنؤ | اپریل۔مئی 2004 |
| سنجر بھارتی | تحریک آزادی اور اردو صحافت | نیا دور | لکھنؤ | 1999 |
| سمیع الرحمٰن | ٹیلی ویژن کے لیے لکھنا | اردو دنیا | دہلی | مئی 2012 |
| سلیمان اطہر جاوید | حیدرآباد کے ادبی رسائل | نیا دور | لکھنؤ | مارچ تا مئی 1995 |
| سلیم اختر | خبر رسانی: ایک نظر میں | نیا دور | لکھنؤ | مارچ 2012 |
| سلیم حامد رضوی | بھوپال میں اردو صحافت | ایاز | بھوپال | بھوپال نمبر |
| سلیم قدوائی | مولانا محمد علی بحیثیت صحافی | آجکل | دہلی | دسمبر 1978 |
| سر شیخ عبدالقادر | 'زمانہ' اور ترقی اردو | زمانہ | کان پور | فروری 1928 |
| سجاد ظہیر | حیات کے پانچ سال | حیات | نئی دہلی | 17 نومبر 1968 |
| سجاد ظہیر | اردو میں کمیونسٹ صحافت | حیات | نئی دہلی | 11 نومبر 1973 |
| سوم آنند | اردو صحافت (1900 تک) | آجکل | دہلی | دسمبر 1983 |
| سید فضل اللہ مکرم | سب ایڈیٹر: ایک گمنام صحافی | اردو دنیا | دہلی | اپریل 2013 |
| سید وقار عظیم | اودھ پنچ کا پہلا دور | رسالہ جامعہ | نئی دہلی | جون 1934 |
| سلمان علی خاں | سرسید کی صحافت | نیا دور | لکھنؤ | اکتوبر 2005 |
| سلمان عبدالصمد | اردو صحافت چند بکھری دلچسپ باتیں | تمثیل نو | دربھنگہ | 2016 |
| سلمان عبدالصمد | متھلا میں اردو صحافت | اردو دنیا | نئی دہلی | اپریل 2016 |
| سید احمد قادری | بہار کے اولین اردو اخبارات | اردو دنیا | نئی دہلی | دسمبر 2008 |
| سید فضل اللہ مکرم | اخبار کے فیچر اور اس کے اقسام | اردو دنیا | نئی دہلی | جنوری 2010 |
| سید فضل اللہ مکرم | فن صحافت پر پہلی کتاب | اردو دنیا | نئی دہلی | فروری 2002 |
| سید سجاد حسین | تمل ناڈو میں اردو صحافت | اردو دنیا | نئی دہلی | اپریل 2014 |
| سید سجاد حسین | تمل ناڈو میں اردو صحافت | فکر و تحقیق | نئی دہلی | اپریل۔جون 2007 |
| سید طلحہ نقش بندی | اکولہ کے قدیم اخبارات و رسائل پر ایک نظر | اردو دنیا | نئی دہلی | دسمبر 2014 |
| سیدہ روبینہ تسنیم قادری | اردو صحافت اور خواتین سے متعلق تحریریں | اردو دنیا | نئی دہلی | نومبر 2003 |
| سہیل انجم | اردو صحافیوں کی تربیت کا مسئلہ | اردو دنیا | نئی دہلی | اگست 2010 |
| سیفی سرونجی | ماہنامہ انشاء کی ادبی خدمات | انشاء | کولکاتا | نومبر۔دسمبر 2013 |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| سید نذیر زیدی | مولانا ظفر علی خان کی صحافت نگاری | تہذیب الاخلاق | لاہور | نومبر 1994 |
| شعائر اللہ خان | اردو اخبارات پر خام سواد | اخبار اردو | اسلام آباد | دسمبر 1993 |
| شعائر اللہ خان | اردو صحافت کی گمنام تاریخ | آجکل | نئی دہلی | مئی 1993 |
| شیخ عمران | اردو صحافت کی عظیم شخصیت: عابد علی خان | اردو دنیا | دہلی | جنوری 2012 |
| شیخ عمران | اردو صحافت کا ایک اہم ستون سلیمان اطہر جاوید | انشاء | کولکاتہ | نومبر۔دسمبر 2013 |
| شمس کنول | اردو کتب ورسائل | آجکل | دہلی | مارچ 1994 |
| شبنم حمید | اردو کی ادبی صحافت | اردو دنیا | دہلی | اگست 2016 |
| شائستہ خان | رسائل: مشاہیر ادبیات اردو کے لیے اہم ترین ماخذ | فکر و تحقیق | دہلی | اپریل۔مئی، جون 2014 |
| شکیل اختر | کمیونٹی ریڈیو اور اردو | اردو دنیا | دہلی | اپریل 2012 |
| شمسہ عارف | مولانا برکت اللہ بھوپالی بحیثیت صحافی | کتاب نما | دہلی | اپریل 2011 |
| شانتی رنجن بھٹاچاریہ | ہکی: ہندوستان کا پہلا صحافی | آجکل | دہلی | اکتوبر 1971 |
| شانتی رنجن بھٹاچاریہ | بنگال میں اردو صحافت | آجکل | دہلی | جنوری 1985 |
| شانتی رنجن بھٹاچاریہ | جام جہاں نما اور ہری دت | آجکل | دہلی | جون 1963 |
| شاہدہ صدیقی | صحافت ادب اور خواتین | نیا دور | لکھنؤ | جون۔جولائی 2011 |
| شاہد الرحمٰن | وہاب اشرفی کی صحافتی خدمات | تمثیل نو | دربھنگہ | جولائی 2015 تا جون 2016 |
| شمس جلیلی | اکیسویں صدی میں اردو صحافت بہار کے ادبی مراکز میں | تمثیل نو | دربھنگہ | جون 2015 تا جولائی 2016 |
| شہزاد انجم | کلام حیدری کی صحافتی خدمات | اردو جرنل | پٹنہ | 1 |
| شافع قدوائی | جدیدیت سے ہم آہنگی کے امکانات اور سرسید کی صحافت | تہذیب الاخلاق | علی گڑھ | جولائی 2014 |
| شاہنواز فیاض | 'معارف' ایک صدی کا قصہ | آجکل | دہلی | ستمبر 2016 |
| شمشیر عالم زاہد | آزادی کے بعد اردو کے چند مقبول ادبی رسائل | نیا ادب | بنگلور | شمارہ 2 |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| شرفی عثمان | ممتاز صحافی مولانا ابو سعید بزمی | آجکل | دہلی | دسمبر 1984 |
| شہباز حسین | اردو صحافت اور ٹریننگ کا مسئلہ | آجکل | دہلی | نومبر۔دسمبر 1983 |
| شاہین نظر | سرور عثمانی اور مفاہیم | اردو دنیا | نئی دہلی | ستمبر 2015 |
| شکیل اختر | اردو اخبارات کے لسانی وتہذیبی سروکار | اردو دنیا | نئی دہلی | اگست 2009 |
| شکیل الرحمٰن | کشمیر میں اردو صحافت | ماہنامہ اردو دنیا | نئی دہلی | جولائی 2003 |
| شفقت رضوی | اردوئے معلی | فکر و تحقیق | نئی دہلی | اکتوبر۔دسمبر 2007 |
| شوکت علی فہمی | خواجہ حسن نظامی بحیثیت صحافی | آجکل | دہلی | فروری 1977 |
| صلاح الدین عثمانی | تحریک آزادی میں اردو ادب کا حصہ | نیا دور | لکھنؤ | اگست 1997 |
| صابر علی سیوانی | ساقی کے مدیر شاہد احمد دہلوی | اردو دنیا | نئی دہلی | دسمبر 2014 |
| صباح الدین عبدالرحمٰن | الہلال | معارف | اعظم گڑھ | نومبر 1958 |
| صفدر امام قادری | اردو کے ادبی جرائد | ابجد | ارریا | اپریل۔جون 2013 |
| صفیہ عزیز | نسوانی صحافت پر ایک طائرانہ نظر | ماہ نو | پاکستان | جولائی 1984 |
| صالحہ ناز | اردو کے نامور صحافی | آجکل | دہلی | نومبر۔دسمبر 1983 |
| ضیاء الدین انصاری | اردو صحافت کے فروغ میں رامپور کا حصہ | رامپور رضا لائبریری | رامپور | جرنل-4 |
| ضیاء الدین برنی | صوبہ ممبئی کے اردو فارسی اور عربی اخبارات | اردو | اورنگ آباد | اکتوبر 1954 |
| طاہر تونسوی | اردو ادب کی ترویج میں رسائل | نایاب | کوٹ | جنوری 1986 |
| ظہیر انور | اردو صحافت پر قدغن اور اس کے معتوب صحافی | اردو دنیا | نئی دہلی | دسمبر 2015 |
| ظہیر انور | مغربی بنگال میں اردو صحافت کا مزاج | مژگاں | کولکاتہ | جنوری 2001 تا جون 2001 |
| ظہیر الدین اظہر | تصویر اور رسالے | زمانہ | کان پور | مئی 1933 |
| ظ۔انصاری | اردو صحافت کا مزاج | آجکل | دہلی | نومبر۔دسمبر 1983 |
| عابد رضا بیدار | ہندوستانی صحافت 1866-67 میں | تحریک | نئی دہلی | فروری 1958 |
| عابد رضا بیدار | ہندوستانی صحافت 1860-70 میں | تحریک | نئی دہلی | نومبر 1958 |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| عابد رضا بیدار | انجمن پنجاب کا پہلا رسالہ اور محمد حسین آزاد کی قدیم ترین تحریریں | تحریک | نئی دہلی | اگست 1960 |
| عتیق احمد صدیقی | ہندوستانی صحافت کے دو سو سال | آجکل | دہلی | جنوری 1980 |
| عبدالقوی دسنوی | آزاد: وادیٔ صحافت میں (1908) | ایوان اردو | دہلی | دسمبر 1988 |
| عبدالقوی دسنوی | بھوپال کی اردو صحافت کا ایک تابناک ستارہ — محمود الحسینی | ہماری زبان | نئی دہلی | 15 / جولائی 1993 |
| عبدالقوی دسنوی | نو عمر صحافی ابوالکلام آزاد | آجکل | دہلی | مارچ 1988 |
| عبدالقوی دسنوی | لسان الصدق | اردو ادب | علی گڑھ | 1959 |
| عبدالقوی دسنوی | مولانا ابوالکلام آزاد اور ہفتہ وار 'پیغام' | آجکل | دہلی | دسمبر 1984 |
| عبدالسلام خورشید | دہلی کے رسائل | آجکل | دہلی | جولائی 1962 |
| علی جواد زیدی | اردو صحافت اور آئین | آجکل | دہلی | نومبر۔دسمبر 1983 |
| علی جواد زیدی | نیا دور کا زریں دور | نیا دور | لکھنؤ | مارچ۔مئی 1995 |
| عارفہ بشری | جموں و کشمیر میں اردو صحافت | اردو دنیا | دہلی | جنوری 2016 |
| عبدالقدوس ہاشمی | مولانا محمد علی جوہر کی صحافت نگاری | تہذیب الاخلاق | لاہور | جنوری 2000 |
| عرفان عباسی | نیا دور کے پچاس سال | نیا دور | لکھنؤ | مارچ۔مئی 1995 |
| عمیر منظر | 'معارف' کے سو برس | اردو دنیا | دہلی | اگست 2016 |
| عشرت علی صدیقی | 1857 کی جنگ آزادی میں اودھ کا محاذ | نیا دور | لکھنؤ | فروری۔مارچ 1994 |
| عبدالرزاق راشد | اب سے آدھی صدی پہلے کے اردو اخبارات | اردو | اورنگ آباد | اکتوبر 1935 |
| عزیز الدین احمد | ہمارے اردو اخبارات | زمانہ | کان پور | مارچ 1904 |
| عبدالستار صدیقی | ہندوستان کے پرانے اخبار | ہندوستانی | الہ آباد | اکتوبر 1944 |
| عبدالعلیم قدوائی | ہفتہ وار سچ، ایک تعارف | آجکل | دہلی | ستمبر 2001 |
| عباس رضا نیر | 1857 کی تحریک آزادی اور مولانا محمد باقر | نقش نو | الہ آباد | دسمبر 2008 |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| عابد سہیل | ماہنامہ کتاب اور احتشام حسین | غالب نامہ | نئی دہلی | جنوری 2014 |
| عابد سہیل | روزنامہ کی صحافت چند مسائل | اردو دنیا | نئی دہلی | جولائی 2011 |
| عابد سہیل | حیات اللہ انصاری بطور صحافی | اردو دنیا | نئی دہلی | دسمبر 2011 |
| عابد سہیل | دیا نرائن نگم کی ادبی صحافت | آجکل | دہلی | دسمبر 1984 |
| عارف عزیز | اردو صحافت مسائل و امکانات | اردو دنیا | نئی دہلی | مارچ 2005 |
| عاصم راجا | رامپور کے اردو رسائل و اخبارات | رامپور رضا لائبریری | رام پور | 14-15 |
| عبدالعلیم قدوائی | مولانا عبدالماجد دریابادی کی صحافتی خدمات | اردو دنیا | نئی دہلی | اپریل 2005 |
| عبدالغفار شکیل | میسور میں اردو صحافت کا ابتدائی دور | ہماری زبان | علی گڑھ | یکم جولائی، 1957 |
| عشرت علی صدیقی | اردو صحافت کی اصول سازی میں قومی آواز کا کردار | نیا دور | لکھنؤ | جون۔جولائی 2011 |
| علیم صبا نویدی | تمل ناڈو میں اردو صحافت | فکر و تحقیق | نئی دہلی | جنوری۔مارچ 2011 |
| غلام محی الدین | احمد علوی: پچاس سالہ صحافتی زندگی (انٹرویو) | ارتقا، شمارہ 38 | کراچی | مارچ 2005 |
| غضنفر اقبال | اردو ذرائع ابلاغ عہد حاضر میں | آجکل | دہلی | ستمبر 2016 |
| فرزانہ شاہین | پہلی جنگ آزادی میں صحافت کا حصہ | آجکل | دہلی | مئی 2007 |
| فرحت شاہین | بہار میں اردو صحافت | آجکل | دہلی | جنوری 1985 |
| ف۔س اعجاز | فرض شناس اردو صحافت کے فرائض | انشاء | کولکاتہ | جولائی 2009 |
| ف۔س اعجاز | ہندوستانی صحافت کی سماجی ذمہ داری | انشاء | کولکاتہ | جولائی 2009 |
| فضل المتین | راجستھان میں اردو صحافت | آجکل | دہلی | جنوری 1985 |
| فاروق ارگلی | جمناداس اختر | اردو دنیا | نئی دہلی | نومبر 2009 |
| فیروز احمد | ماہنامہ شاعر ابتدائی شماروں کی روشنی میں | شاعر | ممبئی | |
| فیاض احمد وجیہ | ادبی صحافت، آئیڈیلک ڈسکورس اور اداریہ نویسی | تمثیل نو | دربھنگہ | جولائی 2015 تا جون 2016 |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| قاضی عبدالغفار | اردو صحافت کا ابتدائی دور | شاہراہ | نئی دہلی | ستمبر 1950 |
| قاضی حبیب احمد | ٹمل ناڈو کا قدیم ترین اردو روزنامہ 'مسلمان' | اخبار اردو | اسلام آباد | فروری 2008 |
| قیصر شمیم | الیکٹرانک میڈیا اور مطبوعہ صحافت | آجکل | دہلی | مارچ 1994 |
| قمر اعظم ہاشمی | پریم چند کی اردو صحافت | تمثیل نو | دربھنگہ | اپریل 2011 تا مارچ 2012 |
| قیصر نجفی | 'مخزن' شعر و سخن کے آئینے میں | مخزن | برطانیہ | 2009 |
| کلیم اختر | کشمیر میں صحافت کا تاریخی ارتقا | ادبی دنیا | لاہور | مارچ۔اپریل 1966 |
| کلثوم ابوالبشر | بنگلہ دیش کے اہم جرائد | اخبار اردو | اسلام آباد | نومبر 1991 |
| گربچن چندن | ہم عصر اردو صحافت | نیا دور | لکھنؤ | مارچ۔مئی 1995 |
| گربچن چندن | ہندوستان کا پہلا شہید صحافی مولوی محمد باقر | نیا دور | لکھنؤ | مئی 1994 |
| گربچن چندن | اردو صحافت اور دور جدید کے تقاضے | آجکل | دہلی | جنوری 1976 |
| گربچن چندن | اردو کی ادبی صحافت | آجکل | دہلی | دسمبر 1984 |
| گربچن چندن | عصری اردو صحافت اور مسائل | آجکل | دہلی | نومبر۔دسمبر 1983 |
| گربچن چندن | قومی صحافت کا معمار اول مولوی محمد باقر | اردو دنیا | نئی دہلی | دسمبر 2006 |
| گربچن چندن | پہلے پریس ایکٹ کا محرک | آجکل | نئی دہلی | جنوری 2004 |
| گربچن چندن | اردو صحافت اکیسویں صدی کے اوائل میں | اردو دنیا | نئی دہلی | فروری 2005 |
| گربچن چندن | ہندوستان میں اردو صحافت | اردو دنیا | نئی دہلی | دسمبر 2005 |
| گربچن چندن | تحریک آزادی میں اردو صحافت کا حصہ | فکر و تحقیق | نئی دہلی | جنوری۔مارچ 2000 |
| گربچن چندن | جموں و کشمیر میں اردو صحافت | فکر و تحقیق | نئی دہلی | اکتوبر۔دسمبر 2000 |
| گربچن چندن | چھاپے کی آمد سے قلمی صحافت کا چلن | فکر و تحقیق | نئی دہلی | اکتوبر۔دسمبر 1998 |
| لئیق رضوی | الہ آباد میں ادبی صحافت | فکر و تحقیق | نئی دہلی | اپریل۔جون 2009 |
| لئیق رضوی | الہ آباد میں اردو صحافت | آجکل | دہلی | ستمبر 2016 |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| شفیق رضوی | ترقی پسند ادبی صحافت | فکر و تحقیق | نئی دہلی | جولائی۔ستمبر 2014 |
| لطیف احمد | بنگلہ دیش میں اردو صحافت | اخبار اردو | اسلام آباد | فروری 2008 |
| لطیف سبحانی | اردو صحافت کا قومی کردار | ہندوستانی زبان | ممبئی | جولائی۔ستمبر 2010 |
| ماجد قاضی | ظ۔انصاری میدانِ صحافت کا قلندر | اردو دنیا | نئی دہلی | مئی 2013 |
| مالک رام | مولانا آزاد بحیثیت صحافی | آجکل | دہلی | نومبر 1988 |
| محمود مصری | مولانا آزاد کی صحافت اور جمہوریت | نیا دور | لکھنؤ | جنوری 2005 |
| محمد اسماعیل پانی پتی | ٹیپو سلطان اور اردو صحافت | اخبار اردو | اسلام آباد | اکتوبر 2005 |
| محمد ایوب قادری | اردو کے چند قدیم اور نادر رسالے | اخبار اردو | اسلام آباد | اگست 1982 |
| محمد یوسف | اردو صحافت اور دہلی | ایوان اردو | دہلی | دسمبر 2011 |
| محمد اختر | جدید اردو صحافت اور مولانا آزاد | فکر و تحقیق | دہلی | اکتوبر۔دسمبر 2012 |
| محمد وصی اللہ حسینی | قاضی عدیل عباسی کی صحافت | اردو دنیا | دہلی | ستمبر 2016 |
| محمد فرہاد | مولانا آزاد کا صحافتی سفر | فکر و تحقیق | دہلی | اکتوبر۔دسمبر 2015 |
| محمد جابر زماں | ہندوستانی خبر رساں ایجنسیاں | اردو دنیا | دہلی | مارچ 2012 |
| مجید بیدار | مولانا ابوالکلام آزاد کی ادبی صحافت | تمثیل نو | دربھنگہ | اپریل تا دسمبر 2009 |
| مہرین قادر حسین | رسائل اور خواتین کی خدمات | اردو دنیا | دہلی | جولائی 2016 |
| معصوم مرادآبادی | صادق الاخبار اور پیام آزادی | آجکل | دہلی | اگست 2007 |
| محمد شاہد حسین | تحریک آزادی اور اردو صحافت | آجکل | دہلی | اگست 2004 |
| محمد اکبر | راشد الخیری کی صحافتی خدمات | اردو دنیا | نئی دہلی | دسمبر 2015 |
| محمد الیاس ندوی | اردو کا پہلا اخبار | اردو دنیا | نئی دہلی | نومبر 2010 |
| محمد انوار الدین | اختر شیرانی کی ادبی صحافت | اردو دنیا | نئی دہلی | اگست 2010 |
| محمد رضوان خان | 'تیرھویں صدی' ادب لطیف کا نمائندہ رسالہ | اردو دنیا | نئی دہلی | دسمبر 2015 |
| محمد شرافت علی | روزنامہ ملت ہمدرد کا نقش ثانی | اردو دنیا | نئی دہلی | دسمبر 2015 |
| محمد عامر بدر | اردو میں صحافتی ترجمہ نگاری | اردو دنیا | نئی دہلی | دسمبر 2012 |
| محمد عامر بدر | تصویری صحافت کی اہمیت | اردو دنیا | نئی دہلی | جنوری 2012 |
| محمد شاہد حسین | خبر نگاری | اردو دنیا | نئی دہلی | ستمبر 2003 |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| محمد شکیل | تو انین صحافت کمپنی کے عہد میں | اردو دنیا | نئی دہلی | دسمبر 2015 |
| محمد وصی اللہ حسینی | اردو صحافت کے تقاضے اور مسائل | اردو دنیا | نئی دہلی | اپریل 2011 |
| محمد یوسف وانی | جدید اردو صحافت کے معمار حیات اللہ انصاری | اردو دنیا | نئی دہلی | دسمبر 2010 |
| محی الدین قادری زور | آج کل کے اردو رسالے | سب رس | حیدرآباد | اگست 1940 |
| محی الدین قادری زور | اردو کے علمی وادبی رسائل | آجکل | نئی دہلی | اگست 1950 |
| مخمور سعیدی | آزادی کے بعد اردو کی ادبی صحافت | اردو دنیا | نئی دہلی | جولائی 2004 |
| مخمور سعیدی | آزادی کے بعد اردو کی ادبی صحافت | اردو دنیا | نئی دہلی | اگست 2004 |
| معصوم مرادآبادی | اردو صحافت کل اور آج | اردو دنیا | نئی دہلی | فروری 2009 |
| معصوم مرادآبادی | اردو کے میقاتی اخبارات ورسائل | اردو دنیا | نئی دہلی | مئی 2001 |
| معصوم مرادآبادی | اردو صحافت کی جدید کاری | اردو دنیا | نئی دہلی | مئی 2003 |
| مطیع الرحمٰن صدیقی | رپورٹنگ اردو اخبارات کا کمزور شعبہ | اردو دنیا | نئی دہلی | اکتوبر 2011 |
| میر بدرالدین علی | اردو اخبارات میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کا استعمال | اردو دنیا | نئی دہلی | اپریل 2002 |
| محمد شمشیر علی | دہلی اردو اخبار اور جنگ آزادی 1857 | جہان اردو | دربھنگہ | |
| مجیر احمد آزاد | دربھنگہ میں ادبی صحافت | تمثیل نو | دربھنگہ | جولائی 2015 تا جون 2016 |
| مظفر رئیس | بھوپال میں اردو صحافت | ایاز | بھوپال | بھوپال نمبر |
| محمد اظہار الحسن | اردو کا ایک قدیم رسالہ | ہندوستانی | الہ آباد | جنوری 1933 |
| محمد اظہار الحسن | اردو کا پہلا رسالہ | ہندوستانی | الہ آباد | جولائی 1934 |
| مولوی محمد رفیع | رسالوں پر تبصرے | ہندوستانی | الہ آباد | اپریل 1944 |
| محمد ایوب واقف | ممبئی میں اردو جرائد ورسائل (آزادی کے بعد) | انتساب سرونج | ممبئی | اپریل۔جون 2013 |
| محمد صغیر خاں | کشمیر میں اردو صحافت | اخبار اردو | اسلام آباد | اکتوبر 2003 |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| معین الدین عثمانی | اردو صحافت اور اخلاقیات | توازن | مالیگاؤں | شمارہ 44 |
| ماجد قاضی | عصر حاضر میں اخبارات کی اہمیت وافادیت | نئی کتاب | نئی دہلی | جنوری۔ مارچ2008 |
| محسنہ خاتون | دلی میں ادبی مجلات کی ابتدا وارتقا | کتاب نما | نئی دہلی | جنوری 2010 |
| مرزا صادق | جام جہاں نما | معارف | اعظم گڑھ | جنوری 1951 |
| محمد یعقوب | اسلامی دنیا کے اخبار ورسائل | معارف | اعظم گڑھ | اپریل۔ مئی1932 |
| محمد ضیاء الدین انصاری | اردوئے معلیٰ کے مضامین کی فہرست | آجکل | دہلی | اگست۔ ستمبر 1981 |
| محمد عتیق صدیقی | جام جہاں نما اردو کا پہلا اخبار | آجکل | دہلی | فروری 1956 |
| محمد عتیق صدیقی | اکمل الاخبار | آجکل | دہلی | ستمبر1960 |
| محمد احسن فاروقی | ادب اور صحافت | آجکل | دہلی | 15/ اگست 1949 |
| م۔ک۔ مہتاب | اردو اخبارات اور اشتہارات | آجکل | دہلی | جولائی 1986 |
| مرزا خاطر زانیف تاش | اردو اخبارات میں ہندی الفاظ | آجکل | دہلی | دسمبر1969 |
| منمو بن تلخ | اردو صحافت اور قلم | آجکل | دہلی | نومبر۔ دسمبر 1983 |
| محمود انصاری | اردو صحافت کا فروغ اور علاقائی اخبار | آجکل | دہلی | نومبر۔ دسمبر 1983 |
| مہدی عباس حسینی | صحافت کا کاروباری پہلو | آجکل | دہلی | دسمبر1984 |
| محمد رضا انصاری | ہفتہ وار طلسم (ایک صدی پرانا اخبار) | آجکل | دہلی | جون 1951 |
| نادم سیتاپوری | ہندوستانی صحافت کی پہلی تاریخ | آجکل | نئی دہلی | جولائی1958 |
| ناز انصاری | اردو اخبار میں ترجمہ کے مسائل | آجکل | دہلی | دسمبر1983 |
| نثار احمد | بچوں کے رسائل آزادی کے بعد | ادیب | بنگلور | مئی 2014 |
| نثار اختر انصاری | ڈاکٹر امبیڈکر اور صحافت | نیا دور | لکھنؤ | اپریل 2008 |
| نوشاد منظر | رسالہ 'شاہراہ' کے اداریے | اردو دنیا | دہلی | جنوری 2013 |
| نند لال وائل | کشمیر میں صحافت کی تاریخ | آجکل | دہلی | فروری 1972 |
| نند کشور وکرم | جمنا داس اختر | عالمی اردو ادب | دہلی | 2010 |
| نند کشور وکرم | اردو صحافت آزادی کے بعد | آجکل | دہلی | اگست 1986 |
| نند کشور وکرم | اردو میں بچوں کے رسائل | آجکل | دہلی | جنوری1979 |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| تسیم عارفی | اردو صحافیوں کی تربیت کا مسئلہ | اردو دنیا | نئی دہلی | اپریل 2005 |
| تسیم عارفی | پرنٹ میڈیا اور اردو معاشرہ | کتاب نما | نئی دہلی | جون 2004 |
| تسیم عارفی | اردو صحافت اور صحافیوں کی تربیت کا مسئلہ | کتاب نما | نئی دہلی | مارچ 2005 |
| نصیر الدین ازہر | سجاد ظہیر بحیثیت صحافی | فکر و تحقیق | نئی دہلی | جولائی۔ستمبر 2000 |
| نصرت جہاں | مغربی بنگال کی اردو صحافت | تمثیل نو | دربھنگہ | جون 2015 تا جولائی 2016 |
| نصرت ظہیر | اردو رسائل: مسائل و سائل | ادب ساز | نئی دہلی | اکتوبر۔دسمبر 2006 |
| نصیر الدین ہاشمی | رسالہ مخزن اور اردو کے شہ پارے | رسالہ جامعہ | نئی دہلی | جولائی 1930 |
| نقاد لکھنوی | اردو رسائل کا حصہ نظم | زمانہ | کان پور | جولائی 1913 |
| نقاد لکھنوی | اردو رسائل کا حصہ نظم | زمانہ | کان پور | اگست۔ستمبر 1913 |
| نقاد لکھنوی | اردو رسائل کا حصہ نظم | زمانہ | کان پور | اکتوبر 1913 |
| نند لعل وائل | جموں کشمیر میں اردو صحافت | آجکل | نئی دہلی | جنوری 1985 |
| نور الہدیٰ | رسالہ 'عصمت' | فکر و تحقیق | دہلی | جنوری۔مارچ 2012 |
| نور الہدیٰ | مخزن: بیسویں صدی کا اولین صحیفہ ادب | فکر و تحقیق | نئی دہلی | اکتوبر۔دسمبر 2002 |
| نور الہدیٰ | رسالہ دل گداز لکھنؤ | فکر و تحقیق | نئی دہلی | اپریل۔جون 2004 |
| نور الہدیٰ | زمانہ کانپور: ایک تاریخ ساز جریدہ | فکر و تحقیق | نئی دہلی | اکتوبر۔دسمبر 2004 |
| نور الہدیٰ | ہمایوں لاہور | فکر و تحقیق | نئی دہلی | اپریل۔جون 2005 |
| نور الہدیٰ | نیرنگِ خیال لاہور | فکر و تحقیق | نئی دہلی | اکتوبر۔دسمبر 2005 |
| نیاز فتحپوری | مولانا آزاد کی صحافتی عظمت | آجکل | دہلی | جولائی 1958 |
| نیر مسعود | ایک بادشاہ کے شب و روز اخبار دربار نصیر الدین حیدر | فکر و تحقیق | نئی دہلی | جنوری۔مارچ 2002 |
| وہاب قیصر | 'الہلال' اور تحریک آزادی | نیا دور | لکھنؤ | اگست 2009 |
| وقار خلیل | جامع الاخبار مدراس | آجکل | دہلی | جون 1973 |
| ہاجرہ بانو | سائنس ٹکنالوجی اور صحافتی ادب | نقیب تعلیم | ممبئی | جولائی۔ستمبر 2014 |
| ہاجرہ بانو | ادبی رسائل کا کردار | رہبر اورنگ آباد | اورنگ آباد | 30 دسمبر 2012 |
| ہاجرہ بانو | ادبی رسائل کے مسائل | امنگ راشٹریہ سہارا | نئی دہلی | 12 رمئی 2013 |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| ہربھگوان شاد | جموں کی اردو صحافت | شیرازہ | سری نگر | جنوری 1962 |
| یحییٰ نشیط | ادبی رسائل قلمکار اور مستقبل | مخزن | برطانیہ | 2006 |
| یحییٰ نشیط | 'مخزن' ایک سرسری جائزہ | مخزن | برطانیہ | شمارہ 10 |


## (ج) کتابوں میں مشمولہ مضامین


| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| اطہر فاروقی | ہندوستان میں معاصر اردو صحافت | مشمولہ نامکمل، اطہر فاروقی انجمن ترقی اردو ہند | نئی دہلی | 2010 |
| امام اعظم | شمع: ادبی اوصاف سے مزین فلمی جریدہ | مشمولہ گیسوئے تحریر، امام اعظم شاہد پبلی کیشنز | نئی دہلی | 2012 |
| امام اعظم | متھلا میں اردو صحافت | مشمولہ گیسوئے تنقید ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس | نئی دہلی | 2008 |
| امتیاز احمد انصاری | چھتیس گڑھ میں اردو صحافت | مشمولہ ہندوستان میں اردو صحافت: آزادی کے بعد، مرتبہ عثمان انجم | وشاکھاپٹنم | 2013 |
| ایم زیڈ خاں | جھارکھنڈ میں اردو صحافت | مشمولہ ہندوستان میں اردو صحافت: آزادی کے بعد مرتبہ عثمان انجم | وشاکھاپٹنم | 2013 |
| ایم حبیب خاں | تخلیقی ادب (حصہ اول و دوم) | مشمولہ مشفق خواجہ ایک مطالعہ، مرتبہ خلیق انجم | نئی دہلی | |
| پرویز عادل | اردو صحافت اور ضلع بجنور | مشمولہ دبستان بجنور، مرتبہ شیخ نگینوی | دہلی | 2015 |
| جاوید اشرف قاسمی | اسلامی صحافت میں علمائے دیوبند کا حصہ | مشمولہ فیضان دارالعلوم دیوبند | | |
| حقانی القاسمی | گلوبل معاشرہ اور ادبی رسائل | مشمولہ خوشبو، روشنی، رنگ | نئی دہلی | 2009 |
| حقانی القاسمی | مدارس کے مجلات | مشمولہ خوشبو، روشنی، رنگ | نئی دہلی | 2009 |
| حقانی القاسمی | میڈیا کا میٹا مورفوسس | مشمولہ خوشبو، روشنی، رنگ | نئی دہلی | 2009 |
| حقانی القاسمی | دیوبند کا صحافتی سیاق | مشمولہ دارالعلوم دیوبند: ادبی شناخت نامہ | نئی دہلی | |
| حقانی القاسمی | ادبی صحافت کا عصری منظر نامہ | مشمولہ ادب کولاژ | نئی دہلی | 2014 |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| حقانی القاسمی | صحافت، صارفیت اور صہیونیت | مشمولہ بہار میں اردو صحافت سمت و رفتار مرتب منصور خوشتر | نئی دہلی | 2016 |
| حنیف نقوی | اودھ اخبار کی ادبی قدر و قیمت | مشمولہ تحقیق و تعارف، حنیف نقوی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان | نئی دہلی | 2013 |
| حلیمہ فردوس | سوغات کے اداریے | مشمولہ ارج، حلیمہ فردوس | بنگلور | 2015 |
| خاور نقیب | اڑیسہ میں اردو صحافت | مشمولہ ہندوستان میں اردو صحافت، مرتبہ عثمان انجم | وشاکھاپٹنم | 2013 |
| خلیل الرحمٰن | باہر کی بستیوں میں اردو صحافت | مشمولہ اردو کی نئی بستیاں | | |
| رحمان اختر | اردو صحافت اور پنجاب | مشمولہ ادب پنجاب، رحمان اختر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس | دہلی | 2015 |
| رشید افروز | گجرات میں اردو صحافت | مشمولہ ہندوستان میں اردو صحافت آزادی کے بعد مرتبہ عثمان انجم | وشاکھاپٹنم | 2013 |
| رضا علی عابدی | باہر کی بستیوں میں اردو صحافت | مشمولہ اردو کی نئی بستیاں مرتبہ گوپی چند نارنگ، ساہتیہ اکادمی | نئی دہلی | 2006 |
| سیفی سرونجی | مدھیہ پردیش میں آزادی کے بعد اردو صحافت | مشمولہ تنقید شناسی، سیفی سرونجی، انتساب سرونج | | 2014 |
| سیفی سرونجی | ماہنامہ شاعر کی 75 سالہ خدمات | مشمولہ تنقیدی تاثراتی مضامین انتساب سرونج | | 2008 |
| سیفی سرونجی | پاکستانی رسائل پر نظر | مشمولہ تنقیدی تاثراتی مضامین | | 2008 |
| سیفی سرونجی | ہندوستان میں اردو رسائل کی ادبی خدمات | مشمولہ نئی تحریریں، سیفی سرونجی، مدھیہ پردیش اردو اکادمی | بھوپال | 2011 |
| سیفی سرونجی | ماہنامہ انشاء کی ادبی خدمات | مشمولہ نئی تحریریں | | 2011 |
| سہیل انجم | اردو صحافت کے مسائل | مشمولہ بازیافت | | 2005 |
| سہیل انجم | اردو کے فروغ میں غیر مسلم صحافیوں کی خدمات | مشمولہ اردو کے فروغ میں غیر مسلم قلم کاروں کا کردار، مرتبہ: اسعد مختار | نئی دہلی | 2015 |
| سید تقی عابدی | باہر کی بستیوں میں اردو صحافت | مشمولہ اردو کی نئی بستیاں | | |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| شاہد اختر انصاری | حیات اللہ انصاری - ایک عظیم صحافی | مشمولہ حیات اللہ انصاری شخصیت اور کارنامہ، مرتبہ: سجاد اختر | نئی دہلی | 2013 |
| شمس بدایونی | ہفتہ وار پنچ، لکھنؤ | مشمولہ مولانا عبدالماجد خدمات و آثار، مرتبہ مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی | نئی دہلی | 2006 |
| شمیم احمد قاسمی | دلی کے اردو اخبارات | مشمولہ دہلی میں اردو کا احتجاجی ادب، ایم آر پبلی کیشنز | نئی دہلی | 2015 |
| شہباز حسین | تخلیقی ادب کے پانچ شمارے | مشمولہ مشفق خواجہ - ایک مطالعہ، مرتبہ خلیق انجم مکتبہ جامعہ لمیٹڈ | نئی دہلی | 1985 |
| صابر سیوانی | ماہنامہ شگوفہ کی تاریخ ساز ظرافتی خدمات | مشمولہ دکن میں شعر و ادب ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس | دہلی | 2015 |
| صابر سیوانی | محبوب حسین جگر | مشمولہ دکن میں شعر و ادب | | |
| صفدر امام قادری | اردو کے ادبی جرائد | مشمولہ ذوق مطالعہ | نئی دہلی | 2014 |
| طاہر تونسوی | اردو ادب کی ترویج میں رسائل کا کردار | مشمولہ لمحہ موجود۔ ادب اور ادیب، طاہر تونسوی | مقبول اکیڈمی لاہور | 1992 |
| ظل ہما | رام پور کے اخبارات و رسائل | مشمولہ رام پور تہذیب و تاریخ کے آئینے میں | نئی دہلی | 2014 |
| عابد انور | صحافت اور سامراجیت 1857 کے تناظر میں | مشمولہ تناظرات | | |
| علیم صبا نویدی | تمل ناڈو میں اردو صحافت | مشمولہ تمل ناڈو میں اردو کی سمت و رفتار، تمل ناڈو پبلی کیشنز | چنائی | 2014 |
| عبدالقوی دسنوی | قاضی عبدالودود اور سہ ماہی نوائے ادب | مشمولہ قاضی عبدالودود سمینار کے مقالے، بہار اردو اکادمی | پٹنہ | 1996 |
| عبدالقوی دسنوی | اودھ پنچ اور اس کی طنزیہ مزاحیہ شاعری | مشمولہ اودھ آئینہ ایام میں مرتبہ سید امجد حسین | | مارچ 1996 |
| عبدالقوی دسنوی | آزاد کے صحافتی سفر کی پہلی منزل | مشمولہ ابوالکلام آزاد، بہار اردو اکادمی | پٹنہ | 1988 |
| عتیق جیلانی سالک | قدیم اخبارات اور ریاست رام پور | مشمولہ رام پور شناسی | نئی دہلی | 2012 |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| عتیق جیلانی سالک | رامپور کا ایک ادبی رسالہ نیرنگ | مشمولہ رام پور شناسی | نئی دہلی | 2012 |
| عتیق جیلانی سالک | رام پور کی صحافت پر سرسری نظر | مشمولہ رام پور شناسی | نئی دہلی | 2012 |
| فاروق ارگلی | سماجی قدروں وادبی وصحافتی اخلاقیات کا پیکر جمنا داس اختر | مشمولہ اردو ہے جس کا نام / فاروق ارگلی۔ایم آر پبلی کیشنز | نئی دہلی | 2010 |
| فاروق ارگلی | عصری اردو صحافت کا محسن: گربچن چندن | مشمولہ اردو ہے جس کا نام / فاروق ارگلی۔ایم آر پبلی کیشنز | نئی دہلی | 2010 |
| فاروق ارگلی | اردو صحافت کی خاتون اول: نور جہاں ثروت | مشمولہ اردو ہے جس کا نام / فاروق ارگلی۔ایم آر پبلی کیشنز | نئی دہلی | 2010 |
| فرحت شہزاد | باہر کی بستیوں میں اردو صحافت | مشمولہ اردو کی نئی بستیاں | | |
| قدوس جاوید | جموں کشمیر میں اردو صحافت | مشمولہ ہندوستان میں اردو صحافت: آزادی کے بعد۔ مرتبہ عثمان انجم۔ادارہ | وشاکھاپٹنم | 2013 |
| محمد نعمان خاں | اردو اخبارات میں زبان کا معیار ومزاج | مشمولہ تلاش وتجزیہ / محمد نعمان خاں | بھوپال | 2006 |
| محمد نعمان خاں | بھوپال میں اردو صحافت انضمام کے بعد | مشمولہ بھوپال میں اردو / نعمان خاں۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس | دہلی | 2006 |
| محمد نعمان خاں | اردو صحافت میں غیر مسلموں کا حصہ | مشمولہ تفہیم وتاثر | بھوپال | 2008 |
| معین الدین عثمانی | اردو صحافت اور اخلاقیات | مشمولہ ادبی معاصرین کا مطالعہ / معین الدین عثمانی | مالیگاؤں | 2009 |
| مشرف عالم ذوقی | اردو ہندی اخبارات کی دنیا اور تقسیم کا منظرنامہ | مشمولہ سلسلہ روز وشب / ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس | دہلی | 2014 |
| محمود الٰہی | مشرقی اتر پردیش کا ایک قدیم اخبار | مشمولہ بازیافت / پروفیسر محمود الٰہی، دانش محل | لکھنؤ | 1965 |
| محمد انور الدین | حیدرآباد میں بچوں کے رسائل | مشمولہ فکر ونظر / محمد انور الدین | حیدرآباد | 1995 |
| ناظم الدین منور | تہذیب الاخلاق کی معنویت | مشمولہ گل ادب / ناظم الدین منور، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس | دہلی | 2013 |
| ناظم الدین منور | اداریہ نگاری | مشمولہ گل ادب | | |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| نایاب حسن | اردو صحافت کے فروغ میں غیر مسلم صحافیوں کا کردار | مشمولہ اردو کے فروغ میں غیر مسلم قلمکاروں کا کردار، مرتبہ: اسعد مختار | نئی دہلی | 2015 |
| ہاجرہ بانو | صحافت اور ادبی صحافت | مشمولہ تنقیدی تلازمے، ہاجرہ بانو، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس | دہلی | 2013 |

## (د) جامعات کے تحقیقی مقالے

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| ایس حمید الدین شرفی | اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں روزنامہ سیاست کا حصہ | پی ایچ ڈی مقالہ گلبرگہ یونیورسٹی | گلبرگہ | 1991 |
| انجم سعید | بھوپال کے بابائے صحافت حکیم قمر الحسن شخصیت اور ادبی خدمات | پی ایچ ڈی مقالہ برکت اللہ یونیورسٹی | بھوپال | |
| اطہر مسعود خاں | اشاریہ رسالہ نیا دور 1900 تا 2001 | روہیل کھنڈ یونیورسٹی | | |
| انعام الرحمٰن رفیق | دعوت اسلامی کی ترسیل و ترویج میں دعوت اخبار کا کردار | پی ایچ ڈی مقالہ جامعہ ملیہ اسلامیہ | نئی دہلی | |
| آفتاب عالم | اشاریہ تہذیب الاخلاق | ایم۔ فل، مسلم یونیورسٹی | علی گڑھ | |
| پروین جہاں | توضیحی اشاریہ شاہراہ | ایم۔ فل، مسلم یونیورسٹی | علی گڑھ | |
| جاوید اختر | اشاریہ مخزن | ایم فل، مسلم یونیورسٹی | علی گڑھ | |
| ریشمہ خانم | رسالہ زیب النساء کا وضاحتی اشاریہ | مقالہ ایم۔ فل حیدرآباد یونیورسٹی | حیدرآباد | 2007 |
| روحینہ فاطمہ | رسالہ شاعر میں مشمولہ افسانوں کا تنقیدی جائزہ | مقالہ ایم۔ فل حیدرآباد یونیورسٹی | حیدرآباد | |
| زینت بیگم | رہنمائے دکن کی ادبی خدمات | مقالہ ایم۔ فل گلبرگہ یونیورسٹی | گلبرگہ | 1994 |
| سردار پاشاہ | محمود ایاز اور سوغات کا دور سوم | مقالہ ایم۔ فل گلبرگہ یونیورسٹی | گلبرگہ | 2006 |
| سیدہ شہناز رضوی | رسالہ ساقی کا وضاحتی اشاریہ | مقالہ ایم۔ فل حیدرآباد یونیورسٹی | حیدرآباد | 2006 |
| سید مصطفیٰ | الہلال کا اشاریہ | مقالہ ایم۔ فل حیدرآباد یونیورسٹی | حیدرآباد | 2006 |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| سعید بن محمد | رسالہ الموسیٰ کا وضاحتی اشاریہ | مقالہ ایم۔ فل حیدرآباد یونیورسٹی | حیدرآباد | 2009 |
| سعادت علی خاں | مولوی محب حسن کی صحافتی خدمات | مقالہ ایم۔ فل حیدرآباد یونیورسٹی | حیدرآباد | |
| شاہین | رسالہ حسن اور حسن کار کا وضاحتی اشاریہ | مقالہ ایم۔ فل حیدرآباد یونیورسٹی | حیدرآباد | 2009 |
| شیخ عائشہ | رسالہ مخزن کا وضاحتی اشاریہ | مقالہ ایم۔ فل حیدرآباد یونیورسٹی | حیدرآباد | 2009 |
| شیخ وسیم | بیدر میں اردو صحافت کا آغاز وارتقا | مقالہ ایم۔ فل حیدرآباد یونیورسٹی | حیدرآباد | 2010 |
| ظفر آمنہ | رسالہ زیب النساء کا اشاریہ | مقالہ ایم۔ فل حیدرآباد یونیورسٹی | حیدرآباد | 2006 |
| عبدالباری | روزنامہ منصف کی علمی وادبی خدمات | مقالہ ایم۔ فل گلبرگہ یونیورسٹی | گلبرگہ | 1996 |
| عظمت سلطانہ | شب خون کی پچیس سالہ تدوین اور خدمات | مقالہ ایم۔ فل گلبرگہ یونیورسٹی | گلبرگہ | 2013 |
| عامر علی | اشاریہ الہلال والبلاغ | مقالہ ایم۔ فل مسلم یونیورسٹی | علی گڑھ | |
| عائشہ | رسالہ سب رس میں مشمولہ افسانوں کا تنقیدی جائزہ | مقالہ ایم۔ فل حیدرآباد یونیورسٹی | حیدرآباد | 2010 |
| غلام نبی کمار | دہلی یونیورسٹی سنٹرل لائبریری میں موجود رسائل وجرائد کا وضاحتی اشاریہ | ایم فل، دہلی یونیورسٹی | دہلی | 2016 |
| فیروز عالم | مولانا حسرت موہانی بحیثیت صحافی | مقالہ ایم۔ فل جواہر لال نہرو یونیورسٹی | نئی دہلی | 1997 |
| لئیق النساء | معلم نسواں کا وضاحتی اشاریہ | مقالہ ایم۔ فل حیدرآباد یونیورسٹی | حیدرآباد | 2005 |
| محمد عاقل خاں | اشاریہ اردوئے معلیٰ | مقالہ ایم فل مسلم یونیورسٹی | علی گڑھ | |
| محمد نعمت | اشاریہ آجکل | مقالہ ایم۔ فل مسلم یونیورسٹی | علی گڑھ | |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| محمد یونس | اشاریہ ماہنامہ الناظر | مقالہ ایم۔ فل بنارس ہندو یونیورسٹی | بنارس | |
| محمد عبدالرؤف | رسالہ دبدبہ آصفی کا اشاریہ | مقالہ ایم۔ فل حیدرآباد یونیورسٹی | حیدرآباد | 2008 |
| محمد علیم الدین | پیام تعلیم کا وضاحتی اشاریہ | مقالہ ایم۔ فل حیدرآباد یونیورسٹی | حیدرآباد | 2010 |
| محمد احتشام الحق | رائل سیما میں اردو صحافت | مقالہ ایم۔ فل حیدرآباد یونیورسٹی | حیدرآباد | |
| محبوب بی شیخ | مولانا ظفر علی خاں بحیثیت صحافی | مقالہ ایم۔ فل حیدرآباد یونیورسٹی | حیدرآباد | |
| محمد انورالدین | حیدرآباد کے ادبی رسائل و جرائد | پی ایچ ڈی مقالہ حیدرآباد یونیورسٹی | حیدرآباد | 1984 |
| مکرم سید فیض اللہ | اردو فن صحافت سے متعلق کتابوں کا تنقیدی و نظریاتی مطالعہ | پی ایچ ڈی مقالہ حیدرآباد یونیورسٹی | حیدرآباد | 1993 |
| محمود مصری | تحریک آزادی سے وابستہ نامور اردو صحافیوں کی ادبی خدمات | پی ایچ ڈی مقالہ حیدرآباد یونیورسٹی | حیدرآباد | 2001 |
| محمد فیض احمد | حیدرآباد کے اردو اخبارات میں اردو زبان سے متعلق نمائندگیاں اور ان کے اثرات | پی ایچ ڈی مقالہ مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی | حیدرآباد | |
| محمد محبوب علی | آندھرا پردیش میں اردو صحافت: 1965 تا 2006 | پی ایچ ڈی مقالہ مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی | حیدرآباد | |
| محمد حسین ساجد | ملتان میں اردو صحافت کا ارتقا | مقالہ برائے ایم اے اردو زکریا یونیورسٹی | ملتان | |
| محبوب الٰہی | قومی آواز اور راشٹریہ سہارا کا تقابلی جائزہ | مقالہ ایم فل جامعہ ملیہ اسلامیہ | نئی دہلی | |

اس امر کے لیے کسی شہادت کی ضرورت نہیں کہ اردو اخبارات کا ماضی نہ صرف تابناک رہا ہے بلکہ اس نے جنگِ آزادی میں ہراول دستے کا کردار ادا کیا ہے۔ ملک کے ہر چہار جانب سے شائع ہونے والے اردو اخبارات نے انگریز مخالفت کو اپنا ایمان سمجھ رکھا تھا اور حکومتِ وقت کی ہزاروں پابندیوں کے باوجود اس جنگ کے کسی بھی مرحلے میں اردو اخبارات نے اپنے ضمیر اور قلم کا سودا نہیں کیا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اردو صحافت کے وسیع تر کردار سے روشناس کرانے کے لیے ہندوستان کے مختلف شہروں (کولکاتا، سری نگر، پٹنہ، ممبئی) میں جشنِ صحافت کے علاوہ 'اردو صحافت کے دو سو سال' کے موضوع پر عالمی اردو کانفرنس (5 تا 7 فروری 2016) کا بھی انعقاد کیا۔ جس میں ملک و بیرونِ ملک کے ماہرین صحافت اور دانشورانِ ادب و ثقافت نے پرمغز مقالے پڑھے۔ یہ کتاب صحافت پر منعقدہ مختلف سیمیناروں میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ ہے۔

اس کتاب کے مرتب پروفیسر ارتضیٰ کریم یوں تو اردو دنیا میں بطور فکشن کے ناقد مشہور و مقبول ہیں لیکن صحافت سے ان کو خاص شغف ہے۔ اس سے قبل انھوں نے ''دہلی اردو اخبار'' کو دو جلدوں میں مرتب کیا ہے۔ اس کے علاوہ نامور صحافی و ادیب خواجہ احمد عباس کی کلیات پر بھی وہ کئی برسوں سے کام کر رہے ہیں جو کئی ہزار صفحات پر مشتمل ہے اور منظر عام پر آیا ہی چاہتا ہے۔ ان کی تیس سے زائد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں اور ان میں ''عجائب القصص: تنقیدی مطالعہ''، ''اردو فکشن کی تنقید''، ''انتظار حسین: ایک دبستان''، ''قرۃ العین حیدر: ایک مطالعہ''، ''جوگندر پال: فکر، فن اور فنکار''، اردو میں پاپولر لٹریچر بے حد مقبول ہیں۔

ISNB: 978-93-5160-184-5
9 789351 601845
NCPUL
New Delhi
₹ 435/- (Set)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی، 33/9،
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔ 110025